ضدی
طاہر جاوید مغل

پھولوں، خوشبوؤں، تتلیوں ایسے محبت کے لطیف، نرم و نازک جذبات کے تاروں میں گندھی ہوئی ایک منفرد تحریر

ضدی

طاہر جاوید مغل

اسٹاکسٹ:-
مکتبہ القریش ◎ سرکلر روڈ
اردو بازار. لاہور ۲۔ فون: ۷۶۶۸۹۵۸

پیش لفظ

کہتے ہیں کہ نفرت سے نفرت جنم لیتی ہے اور پیار سے پیار...... ایک شخص کی ضد دوسرے شخص میں بھی ضد کو اُبھارتی ہے اور اسی طرح تسلیم و رضا کا جذبہ بھی ہمارے اردگرد کے لوگوں میں تسلیم و رضا کو پروان چڑھاتا ہے۔ یہ کہانی اسی آفاقی سچائی کے گرد گھومتی ہے۔ حالات کی ستم گری نے اسد میں خود پسندی، سرکشی اور ضد جیسے منفی جذبات پیدا کیے۔ انہی جذبات کے زیر اثر اُس نے اپنی محبت ...... شمیم...... کو آزمائش کی ایک ایسی سولی پر لٹکایا جس کی اذیت ہر روز بڑھتی چلی گئی۔

بے شک ضد کے جذبے نے اسد کو زندگی میں کئی کامیابیوں سے بھی ہمکنار کیا۔ وہ اپنے قصبے کے چھوٹے سے میدان میں کرکٹ کھیلتے کھیلتے اگر ملک گیر شہرت کا حامل کھلاڑی بنا تو اس میں ضد اور انا کی کارفرمائی بھی شامل تھی۔ لیکن اپنی جذباتی زندگی میں اس وطیرے نے اسد کو گوناگوں مشکلات کا شکار کیا۔ اُس کی محبت جو پانی کا ایک شفاف دھارا تھی، ایک بدبودار جھیل بن گئی جس میں جنون کے مگرمچھ تیرنے لگے۔ دھیرے دھیرے اسد پر انکشاف ہونا شروع ہوا کہ جن تلخ جذبات نے اُس کی اور شمیم کی زندگی کو اجیرن کر رکھا ہے اُن کی جڑیں دُور بہت دُور اُس کے ماضی میں پیوست ہیں۔ وہ ایک ایسی کہانی کا کردار ہے جو قریباً پون صدی پہلے شروع ہوئی تھی...... پون صدی پہلے جو کچھ کہا گیا، جو کچھ سنا گیا تھا اور جو کچھ جھیلا گیا تھا، وہ ایک بازگشت کی صورت میں اسد کی سماعت کا تعاقب کر رہا تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر ایک کٹھ پتلی کی طرح ایک نادیدہ ڈور سے بندھا ہوا تھا اور اس ڈور کا دوسرا سرا ''ماضی'' کے ہاتھ میں تھا...... ایک وقت آتا ہے کہ ایک برگزیدہ ہستی کے طفیل اسد اپنے اصل مسئلے کو پہچانتا ہے۔ وہ اپنے اندر کا میل صاف کرتا ہے۔ اور جب یہ میل صاف ہوتا ہے تو سب کچھ اُجلا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ وہی آفاقی سچائی، نفرت سے نفرت جنم لیتی ہے اور پیار سے پیار۔ مگر اپنی فطرت سے لڑ کر اپنے اندر کی مثبت تبدیلیوں کو

انجام تک پہنچانا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ اس میں اپنے آپ کو مار کر اپنی ہی لاش کے سر پر پاؤں رکھنا پڑتا ہے۔

ٹھوس حقائق کی دُھوپ اور اسرار کی دُھند میں لپٹی ہوئی میری یہ نئی تحریر آپ القریش پبلی کیشنز کی وساطت سے پڑھ رہے ہیں۔ برادرم محمد علی قریشی صاحب نے اس کہانی کو خوبصورت انداز میں شائع کیا ہے، اُمید ہے کہ آپ کو یہ کہانی پسند آئے گی۔ کیونکہ یہ ہمارے آس پاس ہی کی کہانی ہے۔ اس کہانی کے مرکزی کردار اسد کی طرح آپ بھی اپنے اِردگرد دیکھیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو بھی کوئی بھایا جی نظر آ جائے جو محبت کی نازک ریشمی چادر کو ضد اور انا کے کانٹوں پر ڈال کر کھینچ رہا ہو۔ اُس کا ہاتھ روک دیجئے۔

طاہر جاوید مغل

وہ اپریل کی ایک چمکیلی اور خوشگوار صبح تھی۔ اسد کو شاید اس لئے بھی زیادہ خوشگوار لگ رہی تھی کہ وہ آج ہی انٹر کے امتحانات دے کر فارغ ہوا تھا۔ اب ڈیڑھ دو ماہ کے لئے فراغت ہی فراغت تھی۔ اُس نے صبح کی تازہ ہوا میں چند گہرے سانس لئے اور مٹی کی بنی ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر جانے کا ارادہ کیا۔ ابھی وہ چند سیڑھیاں ہی چڑھا تھا کہ اُس کی نگاہ چچا کے گھر کے صحن کی طرف اُٹھ گئی...... شمیم کا رُخ گھر کے بیرونی دروازے کی طرف تھا۔ وہ انگڑائی لے رہی تھی۔ اُس وقت اسد کو پتہ چلا کہ وہ جوان ہو چکی ہے...... اسد کی نگاہ چند سیکنڈ تک بے اختیار اُس کی طرف اُٹھی رہی۔ پھر اُس نے نگاہ کو کھینچ تان کر واپس سیڑھیوں پر مرکوز کیا اور چھت پر چلا آیا۔

اُس کی خواہش تھی کہ شمیم اُسے نہ ہی دیکھے تو اچھا ہے۔ مگر اُس کی نظر سے بچنا اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ اپنی چھوٹی بہن نازو کو زور سے پکار کر بولی۔ ''اوئے نازو! جلدی سے آؤ۔ دیکھو انڈے میں سے بچہ نکل آیا ہے۔''

اسد سمجھ گیا کہ یہ اشارہ اُسی کی طرف ہے۔ وہ شمیم کی طرف متوجہ ہوا اور جل کر بولا۔

''اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے؟ انڈے سے بچہ ہی نکلتا ہے، پوری مرغی تو نہیں نکل آتی...... نان سینس۔''

''پوری مرغی بھی نکل آتی تو میں اتنی حیران نہ ہوتی جتنی اب ہو رہی ہوں۔ یہ جو بچہ نکلا ہے، بڑا پڑھا کو قسم کا ہے۔ نکلتے ہی انگریزی کے لفظ بول رہا ہے۔''

اتنے میں دس سالہ نازو بھی دوڑتی ہوئی آ گئی۔ ''باجی! کہاں ہے بچہ؟'' وہ مرغیوں کے ڈربے میں جھانکتے ہوئے بولی۔

شمیم نے کہا۔ ''پورے پینتالیس دن بعد نکلا ہے بھئی! بہت گھبرایا ہوا ہے۔ نکلتے ساتھ ہی تازہ ہوا لینے چھت پر چلا گیا ہے۔''

بات نازو کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اُس نے چھت پر اسد کو دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس دی۔ اتنے میں امی بھی صحن میں آ گئیں۔ اُنہیں ذرا کم سنائی دیتا تھا۔ وہ بولیں۔ ''ہائے ہائے کیا شور مچا رکھا ہے تم دونوں نے؟ کس کا بچہ گم ہو گیا ہے؟''

''بچہ گم نہیں ہوا، مل گیا ہے امی جان!'' شمیم نے بڑی ادا سے جواب دیا۔ ''ڈیڑھ مہینے پہلے کتابیں لے کر کھیتوں میں پڑھنے کے لئے گیا تھا۔ آج واپس آیا ہے۔ ماں باپ تو خوشی سے نہال ہو رہے ہیں۔''

''کھیتوں سے کیا توڑنے گیا تھا؟'' امی نے کان کے پیچھے ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''بھنڈی توری توڑنے گیا تھا۔'' شمیم نے کہا۔ پھر ایک دم اسد سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''بھنڈی توری سے یاد آیا، تمہاری صحت اتنی کمزور کیوں ہو گئی ہے اسد؟''

زچ ہو کر اسد چھت سے نیچے آ گیا اور کمرے میں چلا گیا۔ دانت پیس کر اُس نے شمیم کے الفاظ بڑبڑانے والے انداز میں دُہرائے۔ ''بھنڈی توری سے یاد آیا، تمہاری صحت اتنی کمزور کیوں ہو گئی ہے؟''

صبح سویرے خوشگوار موڈ کو شمیم اور نازو نے برباد کر دیا تھا۔ شمیم تو جیسے ہر وقت اُس سے ''پیچ'' ڈال کر رکھنا چاہتی تھی۔ کسی نہ کسی بہانے چھیڑ چھاڑ جاری رکھتی تھی۔

شہر سے بہت دُور دیہاتی آب و ہوا میں یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ یہاں اسد اپنے والدین کے ساتھ رہتا تھا۔ اُس کے والد محمد حیات زمینداراکرتے تھے۔ دو مربعے زمین تھی۔ ایک مربعہ ٹھیکے پر دے رکھا تھا، دوسرے مربعے پر کھیت مزدوروں کے ذریعے کاشت کرواتے تھے۔ گزر بسر ہو رہی تھی۔ اسد کے چچا شوکت صاحب ساتھ والے گھر میں رہتے تھے۔ دراصل تین چار سال پہلے تک یہ ایک ہی وسیع حویلی تھی۔ بعد ازاں درمیان میں دیوار ہو گئی۔ بہر حال یہ دیوار صرف زمین پر تھی، دلوں میں نہیں تھی۔ دونوں گھرانوں کے افراد اب بھی ایک ہی گھرانے کی طرح رہتے تھے۔ صرف محمد حیات اور شوکت کی بیویوں میں تھوڑی سی چپقلش پائی جاتی تھی۔ مگر دیوار ہونے کے بعد یہ چپقلش بھی کم ہو گئی تھی۔ سیانے لوگ درست کہتے ہیں کہ کبھی کبھی تھوڑا سا فاصلہ بھی قربت کا سبب بن جاتا ہے۔ جس طرح محمد حیات اور شوکت آپس میں سگے بھائی تھے اسی طرح ان کی بیویاں بھی سگی بہنیں تھیں۔ کہتے ہیں کہ خاتونِ خانہ اپنی عملداری میں مداخلت

برداشت نہیں کرتی، چاہے مداخلت کرنے والی سگی بہن ہی کیوں نہ ہو۔ ان دونوں بہنوں کے سلسلے میں بھی یہ بات درست ہی ثابت ہوئی تھی۔

اسد کے والد کے برعکس شمیم کے والد نے اپنے حصے کی بیشتر زمین بیچ ڈالی تھی اور چاولوں کے دو شیلر لگا لئے تھے۔ اُن کا یہ فیصلہ اچھا رہا تھا۔ اب اُن کی مالی حالت اپنے بڑے بھائی کی نسبت قدرے بہتر تھی۔ دونوں بھائی ہر معاملے میں صلاح مشورہ کرتے تھے۔ شوکت اپنے بڑے بھائی محمد حیات کو اکثر مشورہ دیتا رہتا تھا کہ وہ بھی کچھ زمین بیچ ڈالیں اور چاولوں کا کاروبار شروع کر دیں۔ جواب میں محمد حیات بس ہوں ہاں کر کے رہ جاتا تھا۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھا جب بندہ چاہتا ہے کہ وہ کسی نئے کام میں ٹانگ نہ پھنسائے اور جو کچھ اب تک کرتا رہا ہے وہی کرتا رہے۔ اسد وغیرہ کل چار بہن بھائی تھے۔ دو بڑی بہنیں بیاہی جا چکی تھیں۔ ایک اسد سے چھوٹا بھائی تھا۔ وہ شمیم کی چھوٹی بہن نازو سے کچھ ہی بڑا ہو گا یعنی اُس کی عمر بارہ سال کے لگ بھگ تھی۔ اولاد کے معاملے میں شوکت اپنے بڑے بھائی محمد حیات سے تھوڑا سا پیچھے ہی رہا تھا۔ اُس کا بڑا بچہ پیدائش کے صرف دو ماہ بعد ہی فوت ہو گیا تھا۔ اب اُس کی صرف دو بیٹیاں تھیں، شمیم جو سولہ سال کے لگ بھگ تھی اور میٹرک کا امتحان دے چکی تھی۔ نازو جس کی عمر نو دس سال تھی اور جو چوتھی جماعت کی طالبہ تھی۔ نازو کی پیدائش کے وقت شوکت کی بیوی سلطانہ بیگم کافی بیمار ہو گئی تھیں۔ زچگی کی کچھ پیچیدگیوں کے سبب ڈاکٹروں کو سرجری کرنا پڑی تھی۔ اس سرجری کے نتیجے میں سلطانہ بیگم آئندہ ماں بننے کی صلاحیت سے محروم ہو گئی تھیں۔

شمیم والدین کی بڑی لاڈلی تھی۔ خاص طور سے والد کی۔ دوسری طرف اسد بھی لاڈلا تھا۔ شمیم اور اسد اکٹھے کھیل کود کر جوان ہوئے تھے۔ آپس میں اُن کا میل جول بالکل بہن بھائیوں جیسا تھا۔ خاص طور سے اسد تو اس معاملے میں بالکل سیدھا تھا۔ وہ ایک طرح سے شمیم کو بہن ہی سمجھتا تھا۔ بہن اور کزن کے درمیان جو مہین سا فرق ہوتا ہے وہ اُس کی نگاہوں سے بالکل اوجھل تھا۔ شمیم کے ساتھ تو تکار کرنا، ہاتھا پائی اور کُشتیاں کرنا اُس کا معمول تھا۔ اس دھینگا مُشتی میں کبھی کبھی نازو اور علی بھی شامل ہو جاتے تھے۔ گھر میں خوب اودھم مچتا تھا۔ گھر کے بڑے چیختے رہ جاتے تھے لیکن اُن کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی تھی۔ دو تین سال پہلے جب اسد نے قد کاٹھ نکالا تھا اور شمیم بھی ذرا بڑی

بڑی نظر آنے لگی تھی تو اسد کی والدہ نے ایک دو دفعہ اسد کو ٹوکا تھا کہ وہ اس طرح شمیم کے ساتھ ہاتھا پائی نہ کیا کرے۔ اچھا نہیں لگتا۔ مگر یہ بات اسد کے سر کے اُوپر سے گزر گئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس کا ذہن دیہی آب و ہوا کی طرح بالکل صاف ستھرا تھا۔ اُس کے لئے شمیم، نازو، علی سب بہن بھائی ہی تھے۔ جب اسد کی والدہ نے دیکھا کہ اُس کی بات کا اسد پر کوئی اثر نہیں ہوا اور نہ ہی اسد کے رویّے میں کوئی جھجک نمودار ہوئی ہے تو انہوں نے بھی اس بات کو نظر انداز کر دیا تھا اور سمجھ لیا تھا کہ ابھی بچوں کی سوچ بچگانہ ہی ہے۔

اُس روز صبح سویرے اسد نے شمیم کو اپنے گھر کے صحن میں انگڑائی لیتے دیکھا تھا اور اُسے اندازہ ہوا تھا کہ اب وہ بڑی ہوگئی ہے۔ یہ خیال دو تین روز اسد کے ذہن سے چپکا رہا۔ لیکن پھر یوں غائب ہو گیا جیسے دُھوپ پڑنے پر اوس ہری ہری گھاس پر سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ ایک بار پھر وہی چھیڑ چھاڑ، وہی دھینگا مُشتیاں شروع ہو گئی تھیں....

کرکٹ اسد کا پسندیدہ کھیل تھا۔ اس چھوٹے سے گاؤں نما قصبے میں اس شوق کے پھلنے پھولنے کا کوئی ایسا خاص ذریعہ نہیں تھا۔ بس سکول کی چھوٹی سی ٹیم تھی جس میں میٹرک تک اسد کھیلتا رہا تھا۔ اب بھی قصبے سے باہر کھلے میدان میں اکثر قصبے کے لڑکے شلواریں قمیصیں پہن کر کھیل جماتے تھے۔ اسد بھی ایسے موقعوں پر ضرور شامل ہوتا تھا۔ گرمیوں کی شروعات ہو چکی تھی لہٰذا قصبے کے میدان میں بھی اب کم ہی لڑکے آتے تھے۔ شوق پورا کرنے کے لئے اسد گھر کے آنگن میں چوکے چھکے لگا لیا کرتا تھا۔ اس دُھواں دھار کھیل میں شمیم، نازو، علی اور پڑوس کے ایک دو بچے بھی شامل ہو جاتے تھے۔ صحن میں دیوار ہو جانے کے باوجود دونوں گھروں کے آنگن کافی وسیع تھے۔ شمیم کے گھر والے آنگن میں تو باقاعدہ گھاس بھی موجود تھی اور گراؤنڈ کی سی شکل بن گئی تھی۔ یہ گھریلو کرکٹ عام طور سے شمیم کے گھر ہی ہوا کرتی تھی۔ اسد اچھی بیٹنگ کرلیا کرتا تھا۔ شمیم اور علی زور لگا لگا کر رہ جاتے، شمیم کے رُخسار باؤلنگ کی مشقت کی وجہ سے آگ کی طرح دہکنے لگتے مگر اسد آؤٹ نہ ہوتا۔ آخر جب وہ دیکھتا کہ شمیم اور علی روہانسے ہو رہے ہیں اور اب کسی بھی وقت نازو سمیت واک آؤٹ کر جائیں گے تو وہ جان بوجھ کر شمیم کی کسی گیند پر آؤٹ ہو جاتا اور مخالف کھلاڑیوں کو پھر سے کھیل میں واپس لے آتا۔

اُس روز بھی چچا کے گھر میں ایسی ہی دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی۔ باقاعدہ میچ ہو رہا تھا۔ اسد، نازو اور پڑوسیوں کا بچہ طوطی ایک طرف تھے، جبکہ شمیم، علی اور دوسرا بچہ پپو دوسری طرف تھے...... ایسے میچوں میں طے ہوتا تھا کہ اسد بائیں ہاتھ سے بیٹنگ کرے گا۔ اس کے باوجود اُسے آؤٹ کرنا سب کے لئے مشکل ہو جاتا تھا۔ عموماً وہ اپنی مرضی سے ہی آؤٹ ہوا کرتا تھا بہر حال اُس روز واقعی میچ پھنس گیا تھا۔ شمیم نے دوپٹہ کمر سے باندھ کر اور بالوں کو اچھی طرح جوڑے میں کس کر اتنے جوش میں بال پھینکے تھے کہ چوتھے ہی بال پر اسد صاف آؤٹ ہو گیا تھا۔ بس ایک لمحے کی چوک ہوئی تھی اُس سے...... پتہ نہیں وہ کیا دیکھنے لگ گیا تھا کہ شمیم کی پھینکی ہوئی گیند اُس کے بلے کے نیچے سے گزر گئی تھی۔ اسد نے بہتیرا شور مچایا تھا کہ یہ وٹا گیند ہے...... نو بال ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن مخالف ٹیم نے اُس کی ایک نہیں چلنے دی تھی اور اُس سے بیٹ چھین کر باقاعدہ دھکے مار مار کر چارپائی پر گرا دیا تھا...... چارپائی پر چاچی نے سرخ مرچیں سوکھنے کے لئے ڈال رکھی تھیں۔ اسد چارپائی پر گرا تو چاچی نے باورچی خانے سے دُہائی دی۔

''ہائے ساری مرچوں کا ستیاناس کر دیا۔ اتنے اتنے بڑے دُھوش ہو گئے ہیں پھر بھی نہ عقل ہے نہ تمیز...... کوئی گھروں میں بھی اس طرح تڑتھلی مچاتا ہے؟''

مرچوں پر گرنے سے اسد کے ہاتھ بری طرح رگڑے گئے تھے۔ وہ ہتھیلیاں ملتے ہوئے بولا۔ ''چچی جان! بچے کھیلیں کودیں تو گھر میں تھوڑی سی رونق رہتی ہے۔''

''ہائے ہائے، تو ساری رونق ہمارے ہی مقدر میں کیوں لکھی ہوئی ہے؟ کبھی کبھی اپنے صحن میں بھی رونق لگا لیا کرو۔ جاؤ لے جاؤ ان کو اپنے صحن میں۔''

''چچی جان! اب میں کیا عرض کروں؟ دراصل آپ کو اس کھیل کے اصولوں کا پتہ نہیں ہے۔ جب ایک بار میچ شروع ہو جائے تو پھر میدان کسی صورت بدلا نہیں جا سکتا۔''

باقی کھلاڑیوں نے بھی اسد کے مؤقف کی پُرزور حمایت کی۔ چاچی بولیں۔ ''اچھا، آج آ لینے دو بھائی صاحب کو۔ تم سب کی شکایت لگا کر ہی رہوں گی۔'' پھر وہ بڑبڑاتی ہوئی اندر کمرے میں چلی گئیں۔

ایسی دھمکیاں تو وہ لوگ روزانہ دن میں کئی بار سنتے تھے، بہر حال شکایت کبھی کبھار ہی لگتی تھی...... میچ پھر سے شروع ہو گیا تھا۔ آخری باری شروع ہوئی تو اسد کی ٹیم کو میچ

جیتنے کے لئے پورے بیس سکور درکار تھے۔ چوکے کی باؤنڈری صحن کی وہ دیوار تھی جہاں دروازہ لگا ہوا تھا۔ اب اُس دیوار کے سامنے بیٹھ کر مائی نوراں نے کپڑے دھونے شروع کر دیئے تھے لہٰذا وہ باؤنڈری بے کار ہوگئی تھی۔ اسد کو اب دوڑ کر ہی سکور بنانے تھے۔ علی نے وکٹ سے چار گز آگے آ کر ایک زوردار گیند کرائی۔ اسد نے اُسے گلی پوزیشن کی طرف کھیلا کیونکہ اُدھر کوئی فیلڈر نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر جونہی وہ سکور لینے کے لئے دوڑا، اُس نے دیکھا کہ صحن میں پڑے اُپلوں کے ڈھیر کے پیچھے سے فیلڈر برآمد ہو گیا۔ یہ پپو تھا۔ وہ ڈھیر کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ ایسی چالاکیاں شمیم کرتی ہی رہتی تھی۔ پپو صاحب نے گیند پکڑ کر اسد کو رن آؤٹ کر دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسد اور اُس کی ٹیم پندرہ رنز سے میچ ہار گئے تھے۔ بہت غدر مچا۔ دونوں ٹیموں کے کھلاڑی ضابطہ اخلاق کو ایک طرف رکھ کر سخت چیخ و پکار کرنے لگے۔ علی، اسد کی گردن سے لٹک گیا تھا۔ شمیم اُس سے بیٹ چھیننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسد اس دھوکہ دہی پر سراپا احتجاج تھا جبکہ مخالف ٹیم کی متفقہ رائے تھی کہ وہ آؤٹ ہو چکا ہے۔ شمیم کے ساتھ ہاتھا پائی کے دوران اسد ایک دم سکتے کی سی حالت میں رہ گیا۔ بیٹ اُس کے ہاتھ سے نکل گیا اور اُس کی مزاحمت ایک دم ختم ہوگئی۔ اُس کا ہاتھ جیسے ہزاروں وولٹ کے برقی تار سے چھو گیا تھا۔

اپنے گھر واپس آ کر اور کمرے میں بیٹھ کر وہ دیر تک سوچتا رہا...... ایسا کیوں ہوا تھا؟ اس سے پہلے بھی تو سینکڑوں بار اُس کے جسم کو چھوا تھا پھر آج ایسی کیا بات تھی؟ آج بھی تو شمیم کے بدن کا ایک حصہ ہی اُس کے ہاتھوں سے مس ہوا تھا۔ پھر یہ بجلی سی بدن میں کیوں کوندی تھی؟ اور یہ بجلی صرف اسد نے ہی محسوس نہیں کی تھی، اس کا اثر اسد کو شمیم کے چہرے پر بھی نظر آیا تھا۔ ایک رنگ سا شمیم کے سرخ و سپید چہرے پر لہرایا تھا۔ یہ رنگ عجیب سا تھا۔ نہ اُس کے رخساروں کی طرح سرخ تھا، نہ اُس کی آنکھوں کی طرح سیاہ، نہ اُس کی گردن کی طرح دودھیا اور نہ ہونٹوں کی طرح گلابی۔ یہ ایک مختلف ہی رنگ تھا جو اس سے پہلے کبھی شمیم کے خوبصورت چہرے پر دکھائی نہیں دیا تھا۔

...... دن گزرتے رہے۔ شمیم نے فرسٹ ایئر میں داخلہ لے لیا تھا۔ یہ ڈگری کالج اس قصبے کے اندر ہی واقع تھا۔ اسد انٹر کے امتحان میں واجبی نمبروں سے پاس ہو گیا تھا اور اُس نے بی۔اے میں داخلہ لے لیا تھا۔ وہ بس پڑھائی برائے پڑھائی کر رہا تھا۔

پڑھائی سے کہیں زیادہ دلچسپی اُسے کرکٹ میں تھی۔ ڈگری کالج میں بھی کرکٹ کی بری بھلی ٹیم موجود تھی۔ اسد اُس کا کپتان بن گیا تھا۔ نزدیکی قصبات اور دیہات کی ٹیموں سے اُن کے میچز وغیرہ ہوتے رہتے تھے۔ اسد کی شاندار بیٹنگ کی وجہ سے کئی میچز شادپور کی ٹیم نے جیتے تھے۔ کامیابی ''شوق'' کو مہمیز کرتی ہے۔ اسد کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ کھیل میں اُس کی دلچسپی بڑھ رہی تھی اور پڑھائی میں کم ہو رہی تھی۔ کھیل کود کی وجہ سے اسد کا جسم اب اور توانا اور مضبوط ہو رہا تھا۔ قد چھ فٹ کے لگ بھگ ہو چکا تھا...... سینہ کشادہ اور کلائیاں چوڑی تھیں۔ دیہاتی آب و ہوا اور خالص خوراک نے اُس کے جوان خون میں ایسی توانائی بھر دی تھی کہ جسم میں چنگاریاں سی پھوٹتی محسوس ہوتی تھیں۔ اُس کی توجہ کھیل کی طرف تھی لہٰذا یہ غیر معمولی توانائی اُس کے لئے کبھی کوئی مسئلہ نہیں رہی تھی۔ کھیل جہاں اُس کے جسم کی فالتو توانائی کو اپنے اندر جذب کرتا تھا وہاں اُسے روحانی سکون بھی دیتا تھا۔ اسد کے روزمرہ کے معمولات بڑے لگے بندھے تھے...... وہ شادپور کی سہانی صبحوں، پُرسکون دوپہروں اور رنگین شاموں کو بڑے اچھے طریقے سے استعمال کرتا تھا۔ سویرے منہ اندھیرے ہی والد صاحب اُسے جگا دیتے تھے۔ اُس وقت گلی سے گزرنے والے مویشیوں کی گھنٹیاں اسد کے کانوں میں گونجتیں اور پرندوں کی چہکار، بابے شرفو کے باغ سے لے کر قصبے کے آخری کنارے تک سنسناتی ہوئی محسوس ہوتی۔ ایک اور آواز جو ہمیشہ اسد کے کانوں میں پڑتی وہ دودھ بلونے کی آواز تھی۔ اُس کی والدہ چاٹی میں مدھانی ڈال کر ڈوری کو مخصوص انداز میں حرکت دیتیں۔ ساتھ ساتھ اُن کے ہونٹ بھی ہلتے رہتے۔ یقیناً کوئی وظیفہ ہی ہوتا تھا جو صبح سویرے اُن کے لبوں پر جاری رہتا تھا۔ نماز پڑھنے کے بعد اسد قصبے کے میدان میں چلا جاتا۔ وہاں کچھ نوجوان اور لڑکے بالے موجود ہوتے۔ وہ مل کر دوڑ لگاتے، پھر اینٹوں کی وکٹیں کھڑی کر کے کچھ دیر کرکٹ کھیلتے...... گھر واپس آ کر اسد نہاتا اور دیسی گھی کے پراٹھوں اور دیسی انڈوں کا دیسی ناشتہ کر کے چائنہ کے بارہ گراری والے سائیکل پر کالج کی راہ لیتا۔ کالج قریباً آٹھ میل دوری پر ''شیخوپورہ'' میں واقع تھا۔ سائیکل پر روزانہ یہ سولہ میل کا سفر بھی اسد کے لئے اضافی ورزش کا ذریعہ تھا۔ اگر کوئی میچ وغیرہ ہوتا تو اسد کی واپسی شام کے بعد ہوتی ورنہ وہ سہ پہر تک شادپور واپس آ جاتا۔ اس کے بعد وہ

زیادہ وقت گھر میں ہی گزارتا تھا...... جس دن شمیم سے ہاتھ پائی کرتے ہوئے اسد کے جسم میں ہزاروں وولٹ کا کرنٹ دوڑا تھا اُس دن کے بعد سے اسد نے شمیم کے روئیے میں ایک جھجک سی محسوس کی تھی۔ وہ جو قلانچیں بھرتی ہوئی ہر آدھ گھنٹے کے بعد اُن کے گھر میں گھس آتی تھی اور ناک میں دم کر دیتی تھی اب قدرے کم آنے لگی تھی۔ اُس کے روئیے میں بھی تھوڑی سی شائستگی داخل ہو گئی تھی۔

بہرطور نوک جھونک اور تو تکار تو اسی طرح جاری و ساری تھی۔ ایک دن شمیم گھر میں آئی تو اسد کی والدہ کی طبیعت ذرا خراب تھی۔ اسد نے اگلے روز میچ پر جانا تھا۔ اُس کی سفید قمیض اور پتلون غسل خانے میں ان دُھلی پڑی تھی۔ اسد کی والدہ نے شمیم سے کہا۔

''چل تو آ گئی ہے تو ایک کام کر۔ تیرے بھائی کی قمیض پتلون غسل خانے میں پڑی ہے۔ دوپہر سے میرے کان کھا رہا ہے۔ تو ذرا صابن لگا کر دُھوپ میں پھیلا دے۔

شمیم نے شرارت سے اسد کی طرف دیکھا۔ ''تائی جی! اتنا بڑا گھر ہے۔ آپ کو اکیلے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ جب سے آپا سلمٰی کی شادی ہوئی ہے سارا بوجھ آپ پر پڑ گیا ہے۔ اب تو اس گھر میں کچھ ہو جانا چاہیئے۔''

اسد نے گھور کر شمیم کو دیکھا۔ وہ منہ چڑا کر غسل خانے کی طرف چلی گئی۔ اچانک اسد کو یاد آیا کہ اُس کی گھڑی بھی پتلون کی جیب میں ہے۔ اُسے خطرہ محسوس ہوا کہ شمیم کہیں گھڑی گرا نہ دے۔ وہ گھڑی لینے غسل خانے کی طرف گیا۔ شمیم کو اُس کی آمد کا بالکل پتہ نہیں چلا۔ غسل خانے کی کھڑکی سے اُس کی نگاہ شمیم پر پڑی، وہ اسد کے پسینے میں بھیگے ہوئے میلے کچیلے کپڑوں کو سونگھ رہی تھی۔

''اوئے! یہ کیا کر رہی ہے شمیم کی بچی؟'' اسد نے اچانک زور سے کہا تو شمیم بری طرح چونک گئی۔

اُس نے گڑبڑا کر اسد کی طرف دیکھا، مگر پھر فوراً سنبھل کر کہنے لگی۔ ''توبہ توبہ، اتنی بو؟ لگتا ہے...... لگتا ہے......''

''کیا لگتا ہے؟''

جواب دینے سے پہلے وہ غسل خانے سے نکلی اور ایک دم بولی۔ ''لگتا ہے قمیض میں چوہے مرے ہوئے ہیں۔''

اسد اُس کی طرف جھپٹا مگر وہ پہلے ہی برآمدے کے قریب کھڑی تھی۔ دوڑ کر برآمدے میں پہنچ گئی اور وہاں سے صحن میں نکل آئی۔ اب اسد کی والدہ سامنے ہی موجود تھیں۔ اُن کے ہوتے ہوئے وہ اسد کی دستبرد سے بالکل محفوظ تھی۔

کچھ دیر بعد اسد نے دیکھا کہ وہ نل کے پاس بیٹھی اُس کے کپڑے دھو رہی تھی۔ گاہے گاہے وہ ناک کو اپنی چٹکی سے بند کر کے بڑا برا سا منہ بھی بناتی تھی جیسے ظاہر کر رہی ہو کہ بو سے اُس کا دماغ پھٹا جا رہا ہے۔

اگلے روز وہ میتھ کا ایک سوال پوچھنے کے لئے اسد کے پاس آئی تو اسد کمرے میں چارپائی پر لیٹا تھا۔ ''مے آئی کم ان سر؟'' وہ بڑی ادا سے بولی۔

''خبردار! باہر ہی رکو۔ ورنہ بو سے تمہارا دماغ پھٹ بھی سکتا ہے۔''

''بو...... کیسی بو؟'' وہ شاید کل کی بات بھول چکی تھی۔

''مرے ہوئے چوہوں کی بو...... جو میرے کپڑوں سے آتی ہے۔'' وہ اُس کی طرف توجہ کئے بغیر اخبار پڑھتا رہا۔

''اوہو...... تو جناب کو کل کی بات کا غصہ ہے۔ آئی ایم رئیلی سوری سر!'' وہ اندر آتے ہوئے بولی۔

اسد نے اخبار ایک طرف پھینک دیا اور دایاں بازو موڑ کر آنکھوں پر رکھ لیا۔ ''بھئی اس وقت تو مجھے معاف کرو۔ سر میں سخت درد ہو رہا ہے۔ شام کے بعد آنا۔ پھر بتا دُوں گا۔'' اُس کے سر میں واقعی درد تھا۔

''سر میں خشکی جو اتنی ہے۔ درد نہیں ہو گا تو اور کیا ہو گا؟'' وہ بے تکلفی سے اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

''اچھا چھوڑو اس خشکی کو۔ مجھے ذرا سونے دو۔''

''خشکی چھوڑنے سے نہیں جاتی، علاج کرنے سے جاتی ہے۔ ٹھہرو، میں تمہارے سر میں خالص سرسوں کا تیل لگاتی ہوں۔ کل ہی ابا جی لے کر آئے تھے۔''

اسد کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ دوڑتی ہوئی اپنے گھر گئی اور تیل کی بوتل لے آئی۔ ذرا دیر بعد وہ اُس کے سرہانے بیٹھی بڑی نرمی سے اُس کے بالوں میں تیل لگا رہی تھی۔ اُس کی چوڑیوں کی چھن چھن اسد کے کانوں میں گونجنے لگی اور اُس کی پوروں کا نازک

لمس اسد کی کھوپڑی کو ٹھنڈک دینے لگا۔ اسد کی والدہ علی کو لے کر حکیم صاحب کی طرف گئی ہوئی تھیں۔ ابا جی ابھی ڈیرے سے ہی نہیں آئے تھے۔ وہ اور شمیم گھر میں اکیلے تھے...... لیکن اسد کے لئے اس اکیلے پن میں کوئی کشش نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی سینکڑوں مرتبہ وہ دونوں اکیلے بیٹھے رہے تھے۔ شمیم اُس سے پہلے بھی اسی طرح بڑی اپنائیت سے اسد کے کام کیا کرتی تھی...... وہ مزے لیتا رہا اور وہ اُس کے سر کی مالش کرتی رہی۔

"ویسے کل میں نے مذاق مذاق میں جو بات کہی تھی وہ غلط بھی نہیں ہے۔" شمیم بولی۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تائی جی پر کام کا بڑا بوجھ ہے۔ بے چاری اُٹھتی بیٹھتی ہائے ہائے کرتی ہیں۔ بایاں گھٹنا تو کبھی کبھی جام سا ہو جاتا ہے۔"

"خیر اتنا بھی جام نہیں ہے جتنا تم کر رہی ہو۔" اسد نے کہا۔ "ویسے بھی تم اُن کا ہاتھ شاتھ بٹاتی رہتی ہو۔ اور تمہیں بٹانا چاہئے۔ بیٹیاں ہوتی کس لئے ہیں؟"

"لیکن جب میں بھی نہ ہوں گی...... پھر؟"

"پھر دیکھا جائے گا۔" اسد نے بات کی تہہ تک پہنچے بغیر کہا۔

وہ چند لمحے کے لئے خاموش سی ہوگئی۔ پھر ایک دم چہک کر بولی۔ "ہم مسلمانوں کی یہی تو خوبی ہے۔ اُس وقت سوچتے ہیں جب لاٹھی سر پر پڑتی ہے۔"

وہ باتیں کرتی جا رہی تھی اور اُس کی کومل اُنگلیاں بدستور اسد کے تیل سے چپڑے ہوئے بالوں میں گردش کر رہی تھیں۔ اسد کے سر کا درد جاتا رہا۔ اُسے نیند سی آنے لگی۔

اچانک بیرونی دروازے پر کھٹ پٹ سنائی دی۔ بالوں میں گردش کرتی ہوئی اُنگلیاں ٹھٹک سی گئیں۔ "لگتا ہے تائی جی آگئی ہیں۔"

"اوہو، آگئی ہیں تو کیا ہوا؟ تم مالش تو پوری کرو۔"

"نہیں نہیں۔ اب میں جاتی ہوں۔" وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔

اسد کی سمجھ میں اُس وقت بھی یہ بات نہیں آئی کہ رویئے کی یہ تبدیلی کچھ معنی رکھتی ہے۔ جب دروازے پر کھڑکھڑاہٹ سن کر بالوں میں گردش کرتی ہوئی اُنگلیاں رُک جاتی ہیں تو وہ چچا زاد بہن کی نہیں صرف چچا زاد کی اُنگلیاں ہوتی ہیں۔ اسد کے روکنے

کے باوجود وہ باہر نکل گئی تھی۔

انہی دنوں اسد کی ایک پھوپھو کے بیٹے کی شادی آگئی۔ برات ساتھ والے گاؤں میں جانا تھی۔ دیہی علاقوں میں شادی بیاہ اور میلے ٹھیلے کی خوشیوں کو خوب انجوائے کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سیدھی سادی اور قدرے سست رفتار دیہی زندگی میں ہلچل کے ایسے گنے چنے مواقع غنیمت ہوتے ہیں۔ عبداللہ کی شادی کی تیاری بھی کئی ہفتے پہلے شروع ہوگئی تھی۔ عبداللہ لڑکپن سے اسد کا دوست بھی تھا۔ اُسے بھی کرکٹ کا شوق تھا مگر اتنا نہیں جتنا اسد کو تھا۔ درحقیقت دیہی علاقوں میں کرکٹ سے زیادہ ہاکی، کبڈی، والی بال اور فٹ بال وغیرہ کھیلے جاتے رہے ہیں۔ نوے کی دہائی میں دیہی علاقوں میں کرکٹ نے قدرے مقبولیت حاصل کرنا شروع کی تھی۔ عبداللہ بھی پہلے والی بال ہی کھیلتا تھا مگر پھر کرکٹ میں اسد کا والہانہ شوق عبداللہ کو بھی کرکٹ کی طرف کھینچ لے گیا......

عبداللہ کا گھر شاد پور کے دوسرے سرے پر واقع تھا۔ شادی کی تیاری کے سلسلے میں اسد اور گھر کے دیگر افراد اکثر پھوپھو کے گھر آتے جاتے رہتے تھے۔

اُس دن مہندی کی رسم تھی۔ اسد اپنے کمرے میں بیٹھا اپنے بلے کی مرمت کر رہا تھا۔ بلے کو گلو وغیرہ لگا کر اور ڈوری کے ذریعے اچھی طرح باندھ کر وہ چھت پر دُھوپ میں رکھنے کے لئے لے گیا۔ چھت پر سے اچانک اُس کی نگاہ شمیم اور نازو پر پڑی۔ دونوں شادی والے گھر جانے کے لئے تیار تھیں۔ شمیم نے گلابی ویلوٹ کا بڑا پیارا سوٹ پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں ہم رنگ سینڈل تھے۔ بال بڑے ڈھیلے انداز میں باندھے گئے تھے۔ چھوٹی نازو بھی خوب سجی بنی تھی۔ دونوں کمرے میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ چیزیں اِدھر سے اُدھر پھینکی جا رہی تھیں۔ اسی دوران شمیم کی نگاہ اسد پر پڑ گئی۔ اسد نے چمکیلے کپڑے کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ اُوپر بوسکی رنگ کی واسکٹ تھی۔ اسد کو دیکھ کر شمیم نے تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ اُس کے انداز میں ایسی بے ساختگی تھی کہ اسد مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"نازو کی بچی! کہاں رکھی ہے لپ اسٹک؟" شمیم ایک بار پھر چیخ کر بولی۔

"باجی! قسم سے یہ سامنے ٹیبل پر رکھی تھی اور آپ نے خود ہی رکھی تھی۔"

ایک دم اسد کو شمیم کے چہرے پر شوخی نظر آئی۔ اُس نے قریب کھڑی ننھی منی نازو کو

اپنے قریب کر لیا اور زور سے بولی۔ ’’چل لگا لے لپ اسٹک۔‘‘

’’کیسے باجی؟‘‘

’’میرے ہونٹوں سے۔‘‘

بات نازو کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اُس نے ہنستے ہوئے اپنے ہونٹ شمیم کے ہونٹوں سے پیوست کر دیئے اور یوں اُس کی لپ اسٹک چرا لی۔ شمیم نے مسکراتی نظروں سے اسد کی طرف دیکھا اور پھر ایک دم رُخ پھیر کر اپنی اُنگلی سے نازو کے ہونٹوں کی سرخی درست کرنے لگی۔

اسد نے بلے کو ایک بار پھر چیک کیا اور اُسے درست زاویے کے ساتھ دُھوپ میں رکھنے کے بعد چھت سے نیچے آ گیا...... ابھی وہ آ کر بیٹھا ہی تھا کہ شمیم چھم سے اُن کی طرف آ گئی۔ پیچھے ہی پیچھے نازو بھی چلی آ رہی تھی۔ شمیم کچھ دیر اِدھر اُدھر بلا مقصد گھومتی رہی، اور ’’تائی جی...... تائی جی!‘‘ کی آوازیں دیتی رہی۔ اسد نے اُسے بتایا کہ وہ باتھ رُوم میں ہیں۔

کچھ دیر بعد نازو، شمیم اور علی صحن کے ایک گوشے میں بیٹھ گئے اور ایک دوسرے کو مہندی لگانے لگے۔ کون کے ذریعے اسد خود بھی بڑی اچھی مہندی لگا لیتا تھا۔ وہ اُن کے پاس چلا گیا۔ ’’یہ نالائقوں کی ٹولی کیا کر رہی ہے؟‘‘ اُس نے پوچھا۔

’’باجی مہندی لگا رہی ہے۔‘‘ علی نے کہا۔

’’چھوڑو، اسے کیا لگانی آئے گی؟ یہ تو خود مجھ سے لگواتی رہی ہے۔ لاؤ میں لگاؤں۔‘‘

اسد نے مہندی کی کون شمیم سے لے لی۔ اُس نے پانچ منٹ کے اندر نازو کے ہاتھ پر بڑے خوبصورت نقش و نگار بنا دیئے۔ پھر وہ شمیم سے بولا۔ ’’چل آ اِدھر۔ تجھے بھی لگاؤں۔‘‘

’’نن...... نہیں۔ میں نہیں لگواؤں گی۔‘‘

’’او پاگلے! مفت میں مہندی لگا رہا ہوں۔ چل لا ہاتھ ادھر۔‘‘

’’لیکن......‘‘

’’اوئے تو زیادہ چھوئی موئی مت بن...... ادھر لا ہاتھ۔‘‘ اُس نے زبردستی اُس کا ہاتھ دبوچ لیا اور بڑے انہماک سے اُسے مہندی لگانے لگا۔ اُس کا سارا دھیان مہندی

کی طرف تھا۔ شمیم کے چہرے پر آتے جاتے رنگوں کی طرف نہیں تھا۔ وہ پہلے بھی دو تین بار اُس کے ہاتھ پر مہندی لگا چکا تھا مگر آج اُسے شمیم کے ہاتھ میں عجیب سی لرزش محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے سر اُٹھا کر شمیم کی طرف دیکھا۔

’’کیا بات ہے...... سردی لگ رہی ہے تجھے؟‘‘

’’ہاں۔ مہندی ٹھنڈی ہوتی ہے نا۔‘‘ علی نے لقمہ دیا۔

’’لیکن ٹھنڈ لگنے سے ماتھے پر پسینہ تو نہیں آتا۔‘‘ نازو نے باجی کی پیشانی پر نمی کی چمک دیکھ کر کہا۔

’’کہاں آ رہا ہے پسینہ؟ خوامخواہ مجھے پزل کر رہے ہیں۔‘‘ شمیم نے جلدی سے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔

’’گویا کوئی پزل ہونے والی بات بھی ہے۔‘‘ اسد نے نقطہ اُٹھایا۔

’’ابھی تو نہیں ہے۔ لیکن تائی جی آ گئیں تو...... کیا کہیں گی۔‘‘

اسد نے ذرا دھیان سے شمیم کو دیکھا۔ ’’اوئے شمی! تو یہ آج کل کیسی باتیں کر رہی ہے؟ لگتا ہے تیرا کوئی پیچ ڈھیلا پڑ گیا ہے۔‘‘

’’شاید ایسا ہی ہے۔‘‘ اُس کا رنگ ایک دم گلابی ہو گیا تھا۔

ذرا دیر بعد دروازے پر کھٹ پٹ سنائی دی۔ یہ غسل خانے کا دروازہ تھا۔ امی جان باہر آ رہی تھیں۔ شمیم نے ایک دم اپنا ہاتھ اسد کے ہاتھ سے چھڑایا اور چوکڑی بھرتی ہوئی صحن کی طرف نکل گئی۔

’’پاگل......‘‘ اسد نے کہا اور سر ہلا کر رہ گیا۔

شادی والے گھر خوب گہما گہمی رہی۔ مٹھائی کے تھال چکراتے رہے، ڈھولک بجتی رہی اور لڑکیوں کے گیت فضا میں بکھرتے رہے۔ عبداللہ اور اسد پاس پاس ہی بیٹھے تھے۔ شمیم ایک ٹرے میں پھولوں کی پتیاں رکھے اُن کے پاس سے گزری تو عبداللہ نے کہا۔ ’’یار! یہ شمی کافی سمارٹ نکلی ہے۔ شہر میں ہوتی تو اس کا ٹھکا ہی اور ہوتا۔‘‘

’’یہاں بھی کچھ کم ٹھکا نہیں ہے۔ چچا، چچی کی لاڈلی ہے۔ ہر وقت ناک میں دم کئے رہتی ہے۔‘‘

’’تمہارا اپنا چچا چچی کا؟‘‘

"سب کا۔"

"یار اسد! مجھے لگتا ہے کہ تیری نزدیک کی نظر کمزور ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"بس کہہ دیا نا کمزور ہے۔ ٹیسٹ کراؤ گے تو فوراً پتہ چل جائے گا۔"

اتنے میں لڑکیاں ایک بار پھر گیت گانے لگی تھیں۔ شمیم اُن میں پیش پیش تھی۔ اُس نے ذرا ایک مختلف قسم کا گیت چھیڑ دیا۔

پھکی پے گئی چن تاریاں دی لو توں اجے وی نہ آیوں سجناں
رنگ سوہا میرا پیلا گیا ہو تو اجے وی نہ آیوں سجناں

گیت کے دوران کئی بار اسد اور شمیم کی نگاہیں ملیں۔ شمیم کی آنکھوں میں اسد کے لئے جو پیغام تھا وہ اسد کی سمجھ میں نہیں آیا اور آئندہ چار پانچ ماہ تک بھی وہ اس پیغام کو سمجھ نہیں پایا۔ بہرحال وہ پیغام موجود تھا۔ ایک گھنٹی تھی جو بجائی گئی تھی۔ ایک خدشہ تھا جس کو آواز کا رُوپ دیا گیا تھا۔

شادی بیاہ میں عموماً مرچ مسالے والے کھانے کھائے جاتے ہیں۔ اسد کی والدہ ہاجرہ بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں۔ شادی والے دن ہی وہ بیمار ہوگئیں۔ آئندہ دو چار روز میں اُن کی طبیعت مزید خراب ہوئی اور وہ پورے ایک ماہ کے لئے بستر سے لگ گئیں۔

پہلے تو اسد کی بڑی بہن راولپنڈی سے آگئیں اور امی کی دیکھ بھال کے ساتھ گھر کا کام کاج بھی کرتی رہیں، مگر اُن کے بچے کے امتحان شروع ہو رہے تھے۔ دو ہفتے بعد اُنہیں نہ چاہتے ہوئے بھی واپس جانا پڑا۔ اُن کی موجودگی میں شمیم گھر کے اکثر کام نمٹاتی رہی تھی۔ اُن کے جانے کے بعد زیادہ تر ذمہ داری اُسی پر آگئی۔ وہ ہر وقت تندہی سے مائی نوراں کا ہاتھ بٹاتی نظر آتی تھی۔ خاص طور سے اسد کے کام تو وہ ہمیشہ ہی بڑی چاہت اور توجہ سے کرتی تھی۔ عام حالات میں بھی اُس کا کمرہ سنوارنا، اُس کی کتابوں کو ترتیب سے رکھنا، اُس کے کپڑے استری کرنا اور اُس کے سائیکل کی جھاڑ پونچھ کر دینا شمیم کا معمول تھا۔ کبھی کبھی ہاجرہ بی بی پریشان ہو کر کہہ اُٹھتی تھیں۔

"شمی! تم تو میرے دونوں بیٹوں کو بالکل ناکارہ کر کے رکھ دو گی۔ اور یہ بڑا تو بالکل کام کا نہیں رہا ہے۔ بس کھیلنا ہے یا سونا ہے۔"

ایسے میں شمیم بڑے بزرگانہ انداز میں کہتی۔ "تائی جان! بچے ہیں، یہ ان کے کھیلنے کھانے کے دن ہیں۔ آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں؟"

تائی جان اِدھر اُدھر دیکھ کر آہستہ سے کہتیں۔ "اگر تیرے دماغ میں یہ خیال ہے کہ تو بہو بن کر اس گھر میں آجائے گی تو یہ خیال دل سے نکال دے۔ تیری ماں بھی اس پر راضی نہیں ہوگی۔ وہ تو تجھے شہر میں بیاہنا چاہتی ہے، کسی ڈاکٹر شاکٹر کے ساتھ۔"

"تائی جان! آپ بھی بس ہر وقت ایسی ہی باتیں کرتی ہیں۔" شمیم منہ بنا کر کہتی۔

شمیم اچھی طرح جانتی تھی کہ تائی کی اپنی مرضی نہیں ہے۔ وہ اسد کا رشتہ اسد کی دوسری خالہ صباحت کی طرف کرنا چاہتی تھیں۔ وہ لوگ زمیندارا کرتے تھے اور کافی خوشحال تھے۔ خالہ صباحت بھی اکثر گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنی بیٹی ممتاز کے ساتھ شاد پور آتی تھی اور مہینہ بھر رہتی تھی۔ تائی کی باتوں سے اکثر اس بات کا اظہار ہوا تھا کہ وہ ممتاز کو بہو بنانا چاہتی ہیں۔

اسد کی والدہ کی بیماری کے دنوں میں شمیم کا زیادہ تر وقت اسد کے گھر میں ہی گزرتا تھا۔ وہ سارا دن کام کاج کرتی نظر آتی، ساتھ ساتھ بیمار تائی کی دیکھ بھال بھی کرتی تھی۔ بس کبھی کبھار اُس کی امی سلطانہ اُس کا ہاتھ بٹانے کے لئے آجاتی تھیں...... کالج میں ایک ٹورنامنٹ ہو رہا تھا۔ فائنل جیتنے والے کے لئے کپ اور دس ہزار نقد انعام تھا۔ اسد کی ٹیم یہ ٹینس بال ٹورنامنٹ جیتنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ شام کو اکثر اسد دیر سے ہی گھر آتا تھا۔ اُس کے آنے سے پہلے غسل خانے میں نہانے کا پانی تیار ہوتا تھا۔ گھر میں پہننے والے کپڑے الماری میں ٹنگے ہوتے تھے۔ نہاتے ساتھ ہی شمیم کھانا اُس کے سامنے لا دھرتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ علی کو بھی کھانا دے دیتی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ اکیلے کھانا اچھا نہیں ہوتا...... ایک دو بار اسد شام کو زیادہ دیر سے آیا تو اُس نے شمیم کو مضطرب اور پریشان پایا تاہم وہ اپنی کیفیت کا کھل کر اظہار نہیں کرتی تھی۔ اسد محسوس کر رہا تھا کہ وہ کچھ بدل سی گئی تھی۔ بات بات پر لڑائی جھگڑا اور دھینگا مشتی بھی کم ہوگئی تھی۔

ایک روز عجیب اتفاق ہوا۔ اسد نسبتاً جلدی گھر آ گیا۔ ابا جان برآمدے میں نماز پڑھ رہے تھے۔ علی گھر میں نہیں تھا۔ اسد کی آمد کا کسی کو پتہ نہیں چلا۔ وہ اپنے کٹ بیگ

سمیت کمرے میں گھس گیا۔ اتفاقاً اُس روز وہ اپنی سائیکل بھی خرابی کے سبب کالج ہی چھوڑ آیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد شمیم آ وارد ہوئی۔ اسد نے کمرے کی کھڑکی میں سے جھانکا، اُس نے برآمدے سے گھر کے بیرونی دروازے تک پانچ منٹ میں پانچ چکر لگائے۔ اسد نے اندازہ لگایا کہ وہ اُسی کی راہ دیکھ رہی ہے۔ اُس کی بے چینی دیکھ کر اسد کے ابا جان بولے۔ ''تم بھی بس کملی دھی ہو۔ روزانہ اس وقت خبطی ہو جاتی ہو۔ بھئی آ جائے گا۔ کسی وقت دیر سویر ہو ہی جاتی ہے۔''

''لیکن اب تو آٹھ بجنے والے ہیں۔'' وہ روہانسی سی ہو کر بولی۔

''ایک دو بار ساڑھے آٹھ بجے آیا ہے۔''

''مگر تب تو کہہ کے جاتا تھا کہ دیر سے آؤں گا۔''

''اچھا حوصلہ رکھ۔ عشاء کی نماز پڑھ لے اتنی دیر میں آ جائے گا۔ یا گھر چلی جا۔ جب آئے گا میں تجھے آواز دے لوں گا۔''

وہ گھر نہیں گئی تھی بلکہ وہیں برآمدے میں بیٹھ کر علی کے ساتھ لڈو کھیلنے لگی تھی۔ غالباً لڈو کھیلتے ہوئے بھی اُس کا دھیان دروازے کی طرف ہی تھا کیونکہ علی بار بار اُسے غلط گوٹ چلنے پر ٹوک رہا تھا...... کمرے کے اندر سے اسد کی امی نے نحیف آواز میں پکار کر پوچھا۔ ''ابھی نہیں آیا اسد؟''

''بس آ ہی رہا ہوگا۔'' شمیم نے پکار کر کھوکھلی تسلی دی۔

''اچھا میں دیکھتا ہوں۔'' اسد کے ابا جان اُٹھتے ہوئے بولے۔ ''بیوقوف کہیں رُک گیا ہوگا عبداللہ کے پاس۔''

وہ ہولے ہولے چلتے باہر نکل گئے۔ اسد کو کمرے سے والدہ کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ ''ہزار دفعہ کہا ہے کہ دفع کر اس کھیل کو...... لوہے کے وٹے جیسی گیند ہوتی ہے۔ کہیں لگ جائے تو ہڈی توڑ کر رکھ دے۔''

شمیم ایک بار پھر اُٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگی۔ کبھی دروازے کی طرف جاتی کبھی صحن میں چکرانے لگتی۔ ''ہائے اللہ تائی جی۔ اب تو نو بجنے والے ہیں۔'' اُس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

پھر وہ غالباً وال کلاک دیکھنے کے لئے ہی کمرے کی طرف آئی تھی۔ یہاں اسد

اطمینان سے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ ابھی شمیم نے لائٹ آن نہیں کی تھی کہ اسد نے ایک دم اُس پر جھپٹا مارا اور چیخ کر اُسے ڈرا دیا۔ وہ چلاتی ہوئی باہر کو بھاگی اور برآمدے میں جا کر دم لیا...... اسد کی امی بھی اُٹھ کر برآمدے میں آ گئیں۔ اُس روز اسد نے دھوپ چھاؤں کا عجیب منظر دیکھا۔ شمیم کے چہرے پر خوشی اور غصہ یکجا ہو گئے تھے۔ غصہ یقیناً اس بات کا تھا کہ اُس نے گھر میں ہوتے ہوئے سب کو ستایا تھا اور خوشی اس بات کی تھی کہ وہ گھر میں ہی تھا۔ اسد نے نہا دھو کر کپڑے بدلے اور پھر نازو، علی وغیرہ کو لطیفے وغیرہ سنانے لگا۔ اس دوران حسب معمول شمیم کھانا لے آئی۔ اسد بولا۔

''بس خواتین و حضرات! اتنا سا جھگڑا تھا۔ یہ جوشی صاحبہ ہمارے لئے بے چین پھر رہی تھیں اور صحن میں لٹو کی طرح چکرا رہی تھیں تو اس کی وجہ صرف یہ کھانا تھا...... یہ جلد از جلد اس کٹھن ذمہ داری سے فارغ ہو کر اپنے گھر جانا چاہتی تھیں اور حسب عادت سر شام خراٹے نشر کرنا چاہتی تھیں۔''

''باجی خراٹے نشر نہیں کرتیں۔'' نازو نے فوراً تردید کی۔

''اور باجی کسی اپنے کے کام کو کٹھن بھی نہیں سمجھتیں۔'' شمیم نے مزید وضاحت کی۔ اُس نے ''اپنے'' پر تھوڑا سا زور دیا تھا۔

''اپنا...... کون اپنا......؟ میں کب سے اپنا ہو گیا؟'' اسد نے کہا۔

''کیوں تم غیر ہو؟'' وہ بولی۔

''بھئی تم سب لوگ ایک صاف ستھری فیملی سے تعلق رکھتے ہو۔ جبکہ میں ٹھہرا ایک کھلنڈرا آوارہ گرد، جس کی قمیض میں سے مرے ہوئے چوہوں کی بو آتی ہے۔''

''اچھا تو وہ بات تم ابھی تک بھولے نہیں ہو۔'' شمیم نے کہا۔

''مرتے دم تک نہیں بھول سکتا۔''

ایک دم شمیم کی آنکھوں کے کنارے سرخ ہو گئے۔ وہ بے حد سنجیدگی سے بولی۔ ''اچھا چلو معاف کر دو۔ اور اس جیسی دوسری جتنی باتیں بھی مجھ سے ہوئی ہیں معاف کر دو۔''

اُس کی سنجیدگی نے اسد کو ایک دم گڑبڑا دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا شمیم تیزی سے مڑی اور گھر واپس چلی گئی۔

رات سونے سے پہلے علی نے اسد کے پیٹ پر ٹانگ چڑھائی اور بولا۔ ''بھئی جان۔

آپ نے باجی سے کیا کہہ دیا تھا؟ وہ چھت پر جا کر دیر تک روتی رہی ہیں۔ انہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔''

''دراصل اُس کا ایک آدھ پیچ ڈھیلا ہو گیا ہے۔ بی اے کی انگریزی کتاب میں لکھا ہے کہ جب لڑکیاں ایک خاص عمر کو پہنچتی ہیں تو ان کا ایک آدھ پیچ ڈھیلا ہو جاتا ہے۔''

''تو کیا نازو کا پیچ بھی ڈھیلا ہو جائے گا؟''

''ہاں۔ اُس کا بھی ہو جائے گا۔ لیکن تم یہ بات کسی سے کرنا نہیں.....سن لیا ہے نا؟''

''ہاں سن لیا ہے۔ لیکن کیا امی اور چچی کے پیچ بھی ڈھیلے ہیں؟ وہ بھی کچھ سال پہلے لڑکیاں ہی تھیں۔''

''اُلو کی دُم! بال کی کھال مت اُتارا کر۔ بس اب سو جا چپ کر کے۔'' اسد نے غصے سے کہا۔

ناراض ہونا تو شمیم کو آتا ہی نہیں تھا۔ اگلے روز وہ اسد کو ملی تو پھر سے بھلی چنگی تھی۔ تاہم اُس کی آنکھیں گواہی دے رہی تھیں کہ علی کی اطلاع درست تھی۔ اُن خوبصورت آنکھوں میں ایک متورم سی سرخی موجود تھی۔ آج اسد کا کوئی میچ نہیں تھا شاید یہی وجہ تھی کہ اُس کا دل کالج جانے کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ شمیم نے کالج نہ جانے کی وجہ پوچھی تو وہ بات بناتے ہوئے بولا۔ ''بھئی صبح صبح اخبار میں ستاروں والا کالم پڑھا ہے۔ میرے اسٹار میں لکھا ہے کہ آج کہیں آتے جاتے میری ملاقات کسی خوبصورت چہرے سے ہو سکتی ہے۔ اور یہ ملاقات رومانس میں بدل سکتی ہے۔ لہٰذا مابدولت نے احتیاطاً گھر ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

وہ مسکرائی۔ ''کب تک رہو گے گھر میں؟ ایک روز تو ''اسٹار'' کا کہا ہوا پورا ہونا ہی ہے۔''

''اسٹار تو تمہارا بھی یہی ہے۔'' اسد نے کہا۔ ''لہٰذا میرے والا معاملہ تمہارے ساتھ بھی ہو گا۔''

وہ بولی۔ ''لڑکیوں کے سلسلے میں یہ اسٹار شناس سب جھوٹ بولتے ہیں۔ ساری گھریلو لڑکیوں کی قسمتیں بس ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔ اُنہیں لمبے سفر پر جانا پڑتا ہے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر..... ایک دن بیٹھے بٹھائے کپڑے جھاڑ کر کھڑی ہو جاتی ہیں، اور ایک نئی دنیا میں داخل ہو جاتی ہیں۔ بڑا عجیب سفر ہوتا ہے۔''

''بس..... آج کل تو تم پر فلسفے کا بھوت سوار ہے۔ اول فول بکنا شروع کر دیتی ہو۔ جہاں تک مجھ ناچیز کا خیال ہے، جس نے لمبا سفر کرنا ہو اُس کے ہاتھ پر ایک لکیر ہوتی ہے۔ تمہارے ہاتھ پر وہ لکیر ہی نہیں۔ دکھاؤ ہاتھ۔''

''رہنے دو۔'' وہ ذرا سا سمٹ گئی۔

''ارے لاؤ ہاتھ.....'' اُس نے جھلا کر شمیم کا ہاتھ تھاما۔

لکیریں دیکھنے لگا تو حیران ہوا۔ شمیم کے ہاتھ پر آج بھی وہ مہندی موجود تھی جو دو مہینے پہلے اسد نے لگائی تھی۔ مہندی کا رنگ اتنی دیر کہاں رہتا ہے؟

''ارے یہ کیا؟ یہ ڈیزائن ابھی تک ہے؟'' اسد نے کہا۔

''یہ بڑی دیر تک رہے گا۔''

''وہ کیسے؟'' اسد مزید حیران ہوا۔

''میں ہر چھ سات روز بعد اس مہندی پر مزید مہندی لگا دیتی ہوں۔ یہ ڈیزائن بہت پسند آیا ہے مجھے۔''

اسد نے معنی خیز نظروں سے علی کی طرف دیکھا جیسے خاموشی کی زبان میں اُس سے کہہ رہا ہو، تمہیں کہا تھا نا کہ لڑکیاں جب بڑی ہو جاتی ہیں تو اُن کا ایک آدھ پیچ ڈھیلا ہو جاتا ہے۔ علی نے بھی شمیم کی نگاہ بچا کر اثبات میں سر ہلایا۔

اسی دوران میں دروازہ کھلا اور عبداللہ لمبے ڈگ بھرتا اندر آ گیا۔ شمیم نے بدک کر اپنا ہاتھ اسد کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ ''سلام بھائی جان!'' اُس نے دوپٹہ درست کرتے ہوئے عبداللہ کو سلام کیا۔

عبداللہ نے جواب دیا۔ اُس کی نظر میں شوخی سی جھلک آئی تھی۔ ''ہاں بھئی کیا ہو رہا تھا؟ شاید ہاتھ شاتھ دیکھا جا رہا تھا۔'' اُس نے اسد سے مخاطب ہو کر کہا۔

شمیم ایک دم گفتگو کا رُخ بدل کر نئی آنے والی بھابھی اور اُس کی مصروفیات کی طرف لے گئی۔ عبداللہ اپنی نئی نویلی بیوی کے متعلق سوالات کے جواب دیتا رہا اور مسکراتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد باقی سب چلے گئے، صرف اسد اور عبداللہ کمرے میں رہ گئے۔ عبداللہ نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''اسد! تم مانو یا نہ مانو۔ لیکن کوئی گڑبڑ ہے ضرور۔ یہ کُڑی تجھ پر لگی گئی ہے۔''

"لگی گئی ہے...... کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے کہ یہ تجھ سے پیار شیار کرنے لگی ہے۔"

"پیار تو ہم سب ایک دُوجے سے کرتے ہیں۔ اور شروع سے کرتے ہیں۔"

"یار! یہ وہ والا پیار نہیں ہے۔ یہ ڈر کر ہاتھ پکڑانے اور ڈر کر ہاتھ چھڑانے والا پیار ہے۔ ابھی تم نے دیکھا بھی تھا۔ میں اندر آیا تو شمی کے چہرے پر کیسے لال پیلے رنگ آئے تھے۔"

"میں تیرا منہ توڑ دُوں گا عبداللہ! میں نے تجھے پہلے بھی بتایا تھا مجھے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ اور پھر یہ تو چچا کی بیٹی ہے۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"بس تو صرف کھیل کے بارے میں سوچا کر۔ شادی بھی کرکٹ کے بلے یا گیند سے کر لینا۔ اوئے پاگل خانے! چچا زاد سے کیا شادی نہیں ہو سکتی؟ اور جس سے شادی ہو سکتی ہے، اُس کو دوسری نظر سے دیکھا جا سکتا ہے اور اُس سے پیار بھی کیا جا سکتا ہے۔"

"اچھا تم اس بارے میں اپنی چونچ بند رکھو اور کوئی دوسری بات کرو۔ تمہاری نئی نئی شادی ہوئی ہے اس لئے تمہیں ہر طرف رومانس ہی رومانس نظر آتا ہے۔"

عبداللہ نے مسکرا کر ایک بھرپور انگڑائی لی اور دھیمے لہجے میں اسد کو اپنی شادی کے قصے سنانے لگا۔ عبداللہ عمر میں اسد سے تھوڑا سا بڑا تھا۔ تاہم دونوں اتنے بے تکلف تھے کہ ہر طرح کی بات کر لیتے تھے۔ شادی سے پہلے عبداللہ کا اپنی ہونے والی بیوی سے تھوڑا سا رومانس بھی چلا تھا۔ اس رومانس کے سارے نشیب و فراز عبداللہ اپنے لنگوٹیے اسد کے سامنے بیان کیا کرتا تھا۔ اب وہ شادی کے بعد کے "نشیب و فراز" بیان کر رہا تھا۔ دونوں اندرونی کمرے میں بیٹھے سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔ گاہے گاہے عبداللہ کی دبی دبی ہنسی اُبھرتی اور اسد چونک کر اُسے تادیبی نظروں سے دیکھنے لگتا۔

اُس رات اسد سونے کے لئے بستر پر لیٹا تو عبداللہ کا فقرہ کئی بار اُس کے کانوں میں گونجا۔ "یار! یہ وہ والا پیار نہیں۔ یہ ڈر کر ہاتھ پکڑانے اور ڈر کر ہاتھ چھڑانے والا پیار ہے۔" نجانے کیوں اسد کو عبداللہ کی بات میں وزن محسوس ہو رہا تھا۔ اُسے کچھ دن پہلے کا وہ واقعہ بھی یاد تھا جب وہ اسد کے سر کی مالش کر رہی تھی۔ امی جان کی آہٹ بیرونی دروازے پر سنائی دی تھی اور شمیم کی اُنگلیاں ٹھٹک کر پیچھے ہٹ گئی تھیں...... وہ دیر تک

سوچتا رہا۔ اُس کے تصور میں وہ روشن صبح بھی آئی جب اُس نے اپنے گھر کی چھت پر سے شمیم کو انگڑائی لیتے دیکھا تھا۔ جب انگڑائی لیتا ہوا بدن دو تین بار اُس کے ذہن میں آیا تو اُس نے لاحول پڑھا، سر کو جھٹک کر اپنا ذہن صاف کیا اور سو گیا۔ اگلے روز شیخو پورہ کے ایک کلب کی ٹیم سے دُھواں دھار میچ تھا۔ شام تک اسد سب کچھ بھول چکا تھا۔

امی کی طبیعت چند روز بعد سنبھل گئی لیکن شمیم کا اُن کے گھر کثرت سے آنا جانا جاری رہا۔ اس آنے جانے میں بھی ایک پیغام تھا جو دوسرے پیغاموں کی طرح اسد کی سمجھ میں نہیں آیا یا شاید اُس نے سمجھنا ہی نہیں چاہا۔ اسد گھر میں ہوتا تو وہ بہانے بہانے سے جھلک دکھاتی رہتی تھی۔ کبھی صحن سے برآمدے میں آ رہی ہے، کبھی علی کے ساتھ گتھم گتھا ہو رہی ہے، کبھی تائی کے منع کرنے کے باوجود بھینس کا دودھ دوہ رہی ہے، کبھی ننگے پاؤں ڈولتے جسم کے ساتھ سیڑھیاں اُتر رہی ہے۔ برسات شروع ہو چکی تھی۔ ایک روز خوب گھر کر بادل آئے۔ شادپور کی ترسی ہوئی زمین پہلی بوندوں کو اپنے اندر جذب کرنے کے لئے بے تاب ہو گئی۔ اسد نے چاچی کے ناک بھوں چڑھانے کے باوجود اُن کے صحن میں کرسی رکھ دی اور کرکٹ شروع ہو گئی۔

پڑوس کے دو تین بچے بھی آ گئے تھے۔ کھیل کے دوران ہی بارش بھی شروع ہو گئی۔ وہ کھیلتے رہے۔ چاچی سلطانہ اندر سے بار بار شمیم کو آوازیں دینے لگیں۔ "شمی! بارش ہو رہی ہے۔ بس کرو اب۔ اندر آ جاؤ۔"

اُس وقت تو اسد نے غور ہی نہیں کیا کہ چاچی صرف شمی ہی کو آوازیں کیوں دے رہی ہیں؟ لیکن تھوڑی دیر بعد جب وہ سب بھیگ گئے تو اسد کو پتہ چلا۔ لان کے ہلکے پھلکے کپڑوں میں شمیم کا بدن نمایاں تر ہو گیا تھا۔ وہ بھی مستی میں آئی ہوئی تھی۔ چاچی کی مسلسل آوازوں کے باوجود کھیل جاری رکھے ہوئے تھی۔ اپنی بھیگی ہوئی چنری کو وہ سر کے اوپر سے گزار کر گاہے گاہے اپنے بدن کے گرد لپیٹتی لیکن چنری مختصر تھی اور جسم اس کے حصار میں آنے والا نہیں تھا۔ سترہ سال کی عمر، گھی مکھن اور خالص خوراک کے سبب اُس کا جسم کشش کے ہر معیار پر پورا اُترنے لگا تھا۔ نجانے کیوں اسد کو لگا کہ وہ کھیلنے کے لئے نہیں بھیگ رہی، شاید بھیگنے کے لئے کھیل رہی ہے۔ بارش جب زیادہ ہو گئی تو وہ اندر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ سب لوگ بھی کھیل بند کر کے برآمدے میں چلے گئے۔ اس

دوران شمیم نے چاچی کے کھلے سے کپڑے پہن لئے تھے۔ آستینیں اُڑس کر اور بھیگے بھیگے بالوں کو جوڑے کی شکل میں باندھ کر وہ اور بھی جاذب نظر ہوگئی تھی۔ اتنے میں چچا شوکت چھتری لئے صحن میں داخل ہوئے۔ اُن کے ساتھ ایک ملازم تھا جس نے آموں کی پیٹی کندھے پر دھری ہوئی تھی۔ چچا شوکت کی عادت تھی کہ جب بھی گھر میں کوئی چیز لاتے تھے ڈھیر ساری لاتے تھے، کسی خوانچہ فروش سے ساری کی ساری چیز کا سودا کر لیتے تھے۔ مونگ پھلی آئی ہے تو اکٹھی پانچ سیر آ گئی ہے۔ گاجریں آئی ہیں تو بوری بھر کر لے آئے ہیں۔ پھل بھی اکثر وہ ریڑھی کے حساب سے ہی لاتے تھے۔ پوری ریڑھی کا سودا کیا اور اُٹھا کر لے آئے۔

پتلے رس والے چھوٹے چھوٹے آم تھے۔ پیٹی ایک طرف رکھ کر اُنہوں نے دو حصے کئے۔ ایک حصہ اسد کے گھر بھیج دیا۔ چچا کے اِردگرد بیٹھ کر وہ سب آم چوسنے اور بارش سے لطف اندوز ہونے لگے۔ ایک آم بڑا میٹھا تھا۔ اسد نے ایک چوسا لے کر نازو کو دے دیا...... نازو سے پہلے ہی چپکے سے ایک چوسا شمیم نے بھی لے لیا۔ شمیم کی یہ حرکت اسد کے سوا شاید ہی کسی نے دیکھی ہو۔ سب آموں کی چھانٹی میں مصروف تھے۔ ”واقعی بہت میٹھا ہے۔“ شمیم نے مزے سے سر ہلا کر کہا۔

وہ صبح اسد کے لئے عام سی صبح تھی۔ مگر اس میں کوئی خاص بات تھی۔ کئی دن کے بعد دُھوپ نکلی تھی۔ وہ ابھی بستر پر ہی تھا۔ اُس نے ساتھ کے کمرے میں ابا جان اور چچا جان کو دھیمے لہجے میں باتیں کرتے سنا۔ چچا جان کہہ رہے تھے۔ ”میں نے بہتر سمجھا کہ پہلے آپ سے بات کر لوں۔ آپ گھر کے بڑے ہیں۔“

ابا جان نے ڈھیلے لہجے میں کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ اگر لڑکا تمہیں اچھا لگا ہے تو پھر بات چلا کر دیکھ لو۔ آج کل اچھے رشتے ملتے کہاں ہیں؟“

”مسئلہ یہ بھی ہے بھائی جان! کہ لڑکیوں کو زیادہ دیر بٹھایا بھی نہیں جا سکتا۔ خالدہ، شمیم کی ہم عمر ہی تھی۔ اُس کا ایک بچہ ہے۔“

اسد جان گیا تھا کہ یہ شمیم کے رشتے کی بات ہو رہی ہے۔ پتہ نہیں کیا ہوا کہ اُسے اپنے جسم میں ایک لرزش سی محسوس ہوئی۔ اس لرزش کی کوئی خاص وجہ بھی اُس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ حیران تھا، نہ غمزدہ تھا۔ نہ کوئی اور ایسی کیفیت تھی۔ پھر بھی وہ لرز رہا تھا۔

ایسا کیوں تھا؟ وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ یہ کوئی انہونی تو نہیں تھی۔ شمیم کی شادی ایک نہ ایک دن تو ہونا ہی تھی۔ اچھی بات تھی کہ کسی اچھی جگہ اُس کی بات چلنے والی تھی۔

اُس روز وہ ایک سہ روزہ میچ میں شرکت کے لئے لاہور جا رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ لاہور کے کھلاڑیوں سے اُس کا سامنا ہونے والا تھا۔ وہ اس میچ کے سلسلے میں بڑا پُر جوش تھا۔ مخالف ٹیم میں ایک ایسا کھلاڑی بھی موجود تھا جسے پاکستان کی طرف سے انڈر 19 کھیلنے کا اعزاز حاصل تھا۔ اسد کے لئے یہ تصور بڑا خوش کُن تھا کہ وہ لاہور کے ایک ایسے باؤلر کا سامنا کرنے جا رہا تھا جو پاکستان کی نمائندگی کر چکا ہے۔ لاہور کے کسی گراؤنڈ پر کھیلنا ویسے بھی اسد کا دیرینہ خواب تھا۔ وہ دو چار سال پہلے جب کبھی لاہور جاتا تو ایل سی سی یا یونیورسٹی کی گراؤنڈ کا چکر ضرور لگاتا تھا۔ وہاں خوبصورت میدان میں صاف ستھری سفید وردیاں پہنے چست کھلاڑیوں کو کھیلتے دیکھتا تو اُسے اپنے ”مضافاتی“ ہونے کا احساس زیادہ شدت سے ہوتا۔ اُسے لگتا کہ صاف ستھرے گراؤنڈ پر کھیلتے ہوئے یہ کھلاڑی اُس سے دُور بہت دُور ہیں۔ شاید وہ ستارے ہیں اور وہ زمین سے اُنہیں دیکھ رہا ہے۔ لیکن آج اُسے اُسی یونیورسٹی گراؤنڈ میں اُنہی ستاروں کے ساتھ کھیلنے کا موقع مل رہا تھا۔

اُس روز وہ لاہور چلا گیا تھا۔ وہ اپنے قصبے کی ٹیم کی قیادت کر رہا تھا۔ اس میچ میں اتفاقاً اسد کی کارکردگی کچھ زیادہ اچھی نہیں رہی بہرحال اُسے اچھے کھلاڑیوں کے ساتھ کھیلنے کا تجربہ ہوا تھا اور سب سے اہم یہ کہ وہ لاہور کی گراؤنڈ پر کھیلا تھا۔ اس کھیل میں تھوڑی سی بدمزگی بھی ہوئی تھی۔ ایک تیز رفتار سکور لیتے ہوئے اسد مخالف ٹیم کے ایک کھلاڑی سے ٹکرا گیا تھا اور جواب میں اُس کھلاڑی نے اسد کو بڑی بدتمیزی سے دھکا دیا تھا۔ یہ وہی سجاد نامی کھلاڑی تھا جو انڈر 19 میں کھیل چکا تھا۔ میچ شروع ہونے سے پہلے اسد کا ارادہ تھا کہ وہ سجاد سے ملے گا، ایک پرستار کی حیثیت سے اُس کی باتیں سنے گا اور اُس سے کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ مگر سجاد کی بددماغی کے سبب اسد کے ان تمام دوستانہ جذبات پر اوس پڑ گئی تھی۔ اور وہ اُس کے بارے میں کوئی اچھا تاثر لے کر نہیں آیا تھا۔ یہ میچ اسد کی ٹیم ہار گئی تھی۔ بہرحال مقابلہ خوب ہوا تھا۔ اگر اسد کی ٹیم دو تین کیچ پکڑ لیتی تو میچ جیت بھی سکتی تھی۔ اسد نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ سب مناسب

صلاحیت رکھنے کے باوجود صرف اسی لئے میچ ہارے ہیں کہ وہ پہلی بار لاہور میں کھیلنے کی وجہ سے انڈر پریشر تھے۔

اسد اور اُس کے ساتھی ہفتے کے روز شاد پور واپس پہنچے تھے۔ اگلے روز اتوار تھا۔ اسد جلدی سو گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ کل دوپہر سے پہلے نہیں اُٹھے گا۔ مگر اُس کی امی نے کھینچ تان کر نو بجے ہی جگا دیا۔

''کیا بات ہے امی! سونے بھی دیں۔'' وہ منہ بسورتے ہوئے بولا۔

''ساری رات سوتا رہا ہے۔ چل اُٹھ، جا کر بڑی باجی کو شیخوپورہ سے لے آ۔ گھر میں مہمان آنے والے ہیں۔ وہ ذرا سلطانہ کا ہاتھ بٹا دے گی۔''

''مہمان...... کون مہمان؟''

''تو گھر میں رہے تو تجھے کچھ خبر ہو نا...... شمیم کی منگنی ہو رہی ہے شام کو...... ساہیوال میں رشتہ طے ہوا ہے اُس کا۔''

''اوہ واقعی؟'' اسد کے منہ سے نکلا۔

''نہیں مذاق کر رہی ہوں تجھ سے۔'' امی نے منہ بنا کر کہا۔

فوری طور پر اسد کو اندازہ نہیں ہوا کہ اس خبر نے اس کے دل و دماغ پر کیا اثر کیا ہے؟ بس ایک ہلکی سی کپکپی محسوس ہوئی۔ وہ کپکپی جس سے چند روز پہلے اُس کا تعارف ہوا تھا۔ چند لمحے بعد یہ کپکپی بھی معدوم ہو گئی۔ اُس رات اسد نے شمیم کو سرخ جوڑا پہنے دیکھا۔ وہ سر جھکائے مہمانوں کے درمیان بیٹھی تھی۔ اس موقع پر اکثر لڑکیاں رونے لگتی ہیں۔ اسد نے شمیم کو بھی زار و قطار روتے دیکھا۔ اُس نے شمیم کی ہونے والی ساس کو شمیم کے سر پر ہاتھ پھیرتے دیکھا۔ اُس نے مہمانوں کو خوش ہوتے اور مٹھائی کھاتے دیکھا۔ اُس نے ڈھولک پر لڑکیوں سے گداز گیت سنے...... اُس نے کچھ خاص محسوس نہیں کیا۔ بس سب کچھ روٹین کے مطابق لگ رہا تھا۔ مگر جب مہمان واپس چلے گئے...... اور آدھی رات گزر گئی...... اور بھادوں کی آخری تاریخوں کا چاند مشرق کی طرف جھکنا شروع ہوا اور اسد نے چھت پر بچھی چارپائی پر چت لیٹ کر ٹمٹماتے ستاروں کی طرف دیکھا تو اچانک...... بالکل اچانک...... اُس پر ایک لرزہ خیز انکشاف ہوا۔ اس انکشاف نے اُس کی روح کو گہرائی تک تھرا دیا...... وہ شمیم سے محبت کرتا تھا...... وہ شمیم

سے شدید ترین محبت کرتا تھا...... وہ تو اُس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔

یہ انکشاف اتنا سنسنی خیز تھا کہ لمحوں میں اسد کا پورا جسم پسینے میں نہا گیا۔ دل میں دھڑکن کی جگہ جیسے توپ کے گولے پھٹ رہے تھے۔ وہ ششدر تھا اتنی بڑی حقیقت اب تک اُس کی نظروں سے اوجھل کیوں رہی؟ اُسے اپنے احساس پر، اپنے حواس پر، خود اپنے آپ پر بھروسہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ساری رات آسمان سے برستی شبنم میں ماہی بے آب کی طرح بستر پر تڑپتا رہا۔ ہر طرف شمیم کا چہرہ تھا، ہر طرف اُس کا خیال تھا...... وہ تو اُس کی زندگی تھی اور یہ زندگی اُس سے دُور جا رہی تھی۔ ہمیشہ کے لئے اُس کے دل کو اُمنگ سے اور اُس کے جسم کو رُوح سے خالی کر کے اپنا ٹھکانہ کہیں اور بنا رہی تھی۔ یہ کیسے ہوگا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟ وہ ساری رات سوچتا رہا اور تڑپتا رہا۔

○

اگلے چند روز میں بڑی خاموشی کے ساتھ اسد کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب رونما ہو گیا۔ اُس کے ذہن میں، اُس کے خیالوں میں، اُس کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون میں صرف شمیم ہی شمیم تھی۔ اُس نے کئی بار خود کو سنبھالنے کی کوشش کی، یہ بتانے کی کوشش کی کہ اُس کی زندگی میں شمیم کو کوئی خاصی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ وہ فقط اُس کی چچا زاد بہن ہے۔ وہ اُس کا چچا زاد بھائی ہے۔ وہ پورے خاندان میں سب سے نیک نام، شرمیلا اور فرمانبردار لڑکا شمار کیا جاتا ہے۔ اگر کسی کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اپنی چچا زاد کے بارے میں کس انداز میں اور کتنی شدت سے سوچ رہا ہے تو کیا ہو؟ یہ سوچ کر ہی اُس کی پیشانی پر پسینہ آنے لگتا۔

نجانے کیوں اب اسد کو یہ احساس بھی ہو رہا تھا کہ اُس نے شمیم کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ وہ حیلے بہانوں سے اُسے اپنے جذبات سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتی رہی ہے مگر اکثر باتیں اُس کے سر کے اُوپر سے گزرتی رہی ہیں۔ چند ایک باتیں وہ سمجھا ہے مگر پھر بھی نہیں سمجھا۔ اب اُسے گزرنے دنوں کی ہر بات یاد آ رہی تھی...... اُسے اندازہ ہو رہا تھا کہ شمیم کے رشتے کی کھچڑی اب سے نہیں کافی دیر سے پک رہی تھی۔ غالباً شمیم کو بھی اندازہ تھا کہ فیصلے کا وقت آ گیا ہے۔ شاید اسی لئے وہ زیادہ بے قرار تھی اور ممکنہ طریقوں سے اسد کو آنے والے وقت سے آگاہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی...... اسد کو

اپنے والد سے ساری باتیں معلوم ہو گئی تھیں۔ درحقیقت چچی چچا کو پہلے سے اندازہ تھا کہ اسد کی والدہ اسد اور شمیم کے رشتے پر راضی نہیں ہوں گی۔ یہی وجہ تھی کہ اُنہوں نے اس بات پر زیادہ زور ہی نہیں دیا تھا۔ بس ایک بار اسد کے والد سے اشارتاً پوچھنے کے بعد اُنہوں نے شمیم کی بات ساہیوال میں پکی کر دی تھی۔ یہ لوگ شمیم کے والد کے کاروباری دوست تھے۔ ساہیوال میں اُن کا چاولوں کا شیلر تھا اور ڈیری فارم تھا۔ جس لڑکے سے شمیم کی بات پکی ہوئی تھی وہ ساہیوال شہر میں چاولوں کے سیل ڈپو پر بیٹھتا تھا۔ وہ پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ سنا تھا کہ ایف اے کر چکا ہے۔ شفیق نامی اس لڑکے کی دادی کافی بیمار تھیں۔ اُن دادی صاحبہ کی خواہش پر وہ لوگ شادی جلد سے جلد کرنا چاہتے تھے۔

منگنی کے بعد شمیم نے اسد کے گھر آنا جانا بہت کم کر دیا تھا۔ اگر کبھی آتی بھی تھی تو کم بات کرتی تھی۔ اُس کا چہرہ دیکھ کر اکثر اسد کو محسوس ہوتا کہ وہ روئی روئی ہے۔ ایک دن اسد کی موجودگی میں اسد کی والدہ نے اُس سے کہا۔ ''ہائے ہائے شمی! لگتا ہے کہ تو، تو ابھی سے پرائی ہو گئی ہے۔ نہ گل بات، نہ ہنسنا بولنا...... یہ سارے تیرے اپنے ہیں۔ کوئی غیر تو نہیں ہے یہاں۔ یہ تیرا بھائی اسد ہے، یہ تایا جی ہیں۔ تو دوپٹہ لپیٹے ایسے بیٹھی ہے جیسے بازار میں سے گزر رہی ہے۔''

''نہیں تائی جی...... ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' وہ بوکھلا کر بولی۔

''اچھا ایسی بات نہیں تو جا اسد کے ساتھ اُوپر اور کنک (گندم) کی بوری لے آ دونوں۔ آج پیسی جائے گی تو شام کو روٹی پکے گی۔ ایک مٹھی آٹا بھی نہیں ہے۔''

''تو ہمارے گھر سے لے آنا تائی۔''

''وہ تیری ماں بڑبڑ کرنے لگتی ہے۔ اب تیری بات پکی ہو گئی ہے، لگتا ہے کہ اُس نے آہستہ آہستہ ہمارا حقہ پانی ہی بند کر دینا ہے۔''

اسد جلدی سے بولا۔ ''امی! بات پکی ہونے کا ان باتوں سے کیا تعلق؟ آپ ہر بات کو گھما پھرا کر ایک ہی جگہ لے آتی ہیں۔''

''تم بڑے بھولے ہو میرے پتر! یہ دنیا بڑی تیز طرار ہے۔''

''اور دنیا سے آپ کی مراد ہمیشہ چاچی ہی ہوتی ہیں۔ حالانکہ وہ آپ کی سگی بہن بھی ہیں۔''

ماں بیٹے کے آخری جملے شمیم نے نہیں سنے تھے۔ کیونکہ وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر چلی گئی تھی۔ مائی نوراں گندم صاف کر کے اُسے دو چھوٹی بوریوں میں ڈال کر رکھ دیتی تھی۔ بوریوں کا منہ باندھ کر اسد اُنہیں بذریعہ سائیکل آٹا چکی پر لے جاتا تھا۔ بوری کا منہ باندھنے کے لئے شمیم اور اسد دونوں جھکے۔ شمیم نے بوری کے منہ کو اکٹھا کر کے بل دیا۔ اسد نے اُسے رسّی سے باندھنا شروع کیا۔ دونوں ایک دوسرے کے بالکل قریب تھے۔ وہاں اُوپری منزل کی اُس برساتی میں اور کوئی نہیں تھا۔ اسد کا دل ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دھڑکنے لگا۔ اُس کا دل چاہا وہ ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر شمیم سے کہہ دے...... شمیم! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے چھوڑ کے مت جانا......

لیکن یہ چند الفاظ کہنا اسد کو آگ اور برف کے سات سمندر پار کرنے سے زیادہ مشکل لگا۔ وہ جو کچھ عرصہ پہلے تک شمیم سے کشتیاں کر لیتا تھا اب اُسے مخاطب کرتے ہوئے بھی پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ دو منٹ میں اُس نے بھرپور کوشش کی مگر اُس کی زبان سے ایک لفظ نہیں نکل سکا۔

اپنی ناکامی پر وہ اکثر جھنجھلاہٹ کا شکار ہو جاتا تھا۔ یہ جھنجھلاہٹ کھیل میں اُسے اکثر فائدہ بھی پہنچایا کرتی تھی۔ کسی میچ کی پہلی باری میں اگر وہ کسی غلطی کے سبب جلد آؤٹ ہو جاتا تھا تو اُس کی کسر اگلی باری میں نکال لیتا تھا۔ جھنجھلاہٹ اُس کی توانائی بن کر اُس کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی تھی اور وہ باؤلر کی ہر کمزوری سے بھرپور فائدہ اُٹھاتا تھا۔ مگر یہ کرکٹ نہیں تھی، یہ زندگی تھی۔ اُس نے کسی دوسرے سے نہیں اپنے اندر کی جھجک سے شکست کھائی تھی۔ پورا پورا موقع ملنے کے باوجود وہ شمیم کے سامنے چند الفاظ نہیں بول سکا تھا......

اپنے ذہن سے ناکامی اور کم ہمتی کے اس داغ کو دھونے کا ایک موقع اُسے چند روز بعد مل گیا۔ قصبے کے اندر ایک مرگ ہو گئی تھی۔ اسد کے والد، والدہ اور چچی افسوس کے لئے گئے ہوئے تھے۔ گھر میں صرف نازو اور شمیم تھیں۔ اسد کمرے میں لیٹا تھا۔ برسات ختم ہو چکی تھی۔ طویل موسم گرما اور برسات کے بعد اب موسم میں ہلکی سی خوشگوار خنکی آ گئی تھی۔ اسد کے کمرے کی کھڑکی ایک نیم پختہ راستے کی طرف نکلتی تھی۔ اس راستے

سے آگے آہنی تاروں کی باڑ سی تھی۔ اس سے آگے کھیت تھے اور کھیتوں کے درمیان سفیدے اور بیری وغیرہ کے درخت حد نگاہ تک چلے گئے تھے۔ فارغ وقت میں اُس کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر قصبے کے گرد و نواح کو دیکھتے رہنا اسد کا محبوب مشغلہ تھا۔ لیکن آج کل تو اُسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ شاید کرکٹ بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ پاکستان اور ویسٹ انڈیز کے درمیان ون ڈے میچ ٹی وی پر آ رہا تھا مگر اسد نے ٹی وی ہی آن نہیں کیا تھا۔

اتنے میں نازو اندر آ گئی۔ ''ہائے بھائی جان! آپ نے ٹی وی بند کیا ہوا ہے۔ اِدھر تو پاکستان کا میچ لگا ہوا ہے۔''

''بس دل نہیں چاہ رہا۔'' اسد نے بیزاری سے کہا۔ ''در...... اصل سر میں سخت درد ہو رہا ہے۔'' پھر چند لمحے توقف کر کے اُس نے کہا۔ ''تمہاری باجی کہتی تھی کہ چچا سرسوں کا بڑا اچھا تیل لائے تھے۔ ایک دن اُس نے تھوڑی سی مالش بھی کی تھی، بڑا سکون آیا تھا۔ کیا کر رہی ہے باجی؟''

''اپنے کپڑوں پر کڑھائی کر رہی ہے۔'' نازو نے کہا تو اسد کے دل پر گھونسہ سا لگا۔ گہری سانس لے کر بولا۔ ''اچھا، تم ہی تھوڑی سی مالش کر دو۔''

''اچھا...... میں تیل لاتی ہوں۔'' وہ فرمانبرداری سے بولی۔

اسد کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اُمید کا جگنو سا سینے میں چمک رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ شمیم خود آ جاتی۔ ظاہر ہے اُس نے نازو سے پوچھنا تو تھا کہ وہ تیل کس کے لئے لے جا رہی ہے؟ نازو نے ساری بات بھی بتانا تھی۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ لیٹا رہا اور اپنے کان باہر سے اُبھرنے والی آہٹوں پر لگائے رکھے۔ اچانک نازو کے چھوٹے چھوٹے قدموں والی چاپ سنائی دی اور اسد کی اُمیدوں پر اوس پڑ گئی۔ وہ بڑی معصومیت سے اسد کے سرہانے بیٹھ گئی اور اُس کے بالوں میں تیل لگانے لگی۔

''باجی نے پوچھا تھا؟'' اسد نے سوال کیا۔

''ہاں جی۔ کہہ رہی تھیں آپ کے سر میں خشکی ہے اس لئے درد ہوتا ہے۔''

''اور کیا کہا تھا؟''

''کہہ رہی تھیں کہ بالوں کو علیحدہ علیحدہ کر کے بالوں کی جڑوں میں تیل لگانا اور مالش ہتھیلی

کے ساتھ نہیں کرتے اُنگلیوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور......''

''اور کیا کہا تھا......؟''

''اور کہتی تھیں کہ اپنے بھائی جان کا خیال رکھا کرو۔ اُن سے پوچھا کرو کہ اگر کوئی کام ہے تو بتائیں۔ اور......'' وہ پھر کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

''بھئی بات پوری کیا کرو......'' اسد نے اُسے ٹوکا۔

''اور وہ کہتی تھیں کہ میں جب چلی جاؤں گی تو اُن کا اور زیادہ خیال رکھنا۔'' پھر نازو نے اپنے ہاتھ اسد کے بالوں پر سے ہٹائے اور پُر سوچ لہجے میں بولی۔ ''بھائی جان! باجی تو ایسے باتیں کرتی ہیں جیسے ساہیوال جا کر اُنہیں کبھی واپس ہی نہیں آنا...... وہ اپنے گھر آیا جایا کریں گی نا؟''

اسد نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''بھئی اس بات کا تو مجھے بھی ٹھیک سے پتہ نہیں۔ جاؤ باجی سے پوچھ کر آؤ کہ وہ آیا جایا کریں گی نا؟''

وہ دوڑی ہوئی گئی اور ایک منٹ میں واپس آ گئی۔ اُس نے رپورٹ دی۔ ''باجی کہتی ہیں کہ سفر بہت لمبا ہے۔ اتنا لمبا سفر بار بار تو نہیں کیا جا سکتا۔''

''اُن سے کہو کہ اگر بندے کی اپنی مرضی ہو تو کوئی سفر لمبا نہیں ہوتا۔''

نازو پھر گئی اور ایک منٹ بعد واپس آ گئی۔ ''باجی کہتی ہیں کہ اب مرضیاں کرنے کا وقت گزر گیا ہے۔ اب تو کسی اور کی مرضی چلنا ہے۔'' پھر وہ ذرا توقف سے بولی۔

''بھائی جان! یہ ''کسی اور'' کا کیا مطلب ہے؟''

''یہ مطلب بھی تمہاری باجی ہی بتا سکتی ہے۔ پوچھنا ہے تو پوچھ آؤ۔''

نازو پھر اپنے گھر کا چکر لگا کر آئی۔ ''بھائی جان! باجی کہتی ہیں یہ ''اور'' وہ ہوتا ہے جو حقیقت میں ہوتا ہے۔ اس طرح کا ایک دوسرا ''اور'' ہوتا ہے مگر وہ صرف خوابوں میں ہوتا ہے۔ پتہ نہیں آج کل کیسی کیسی باتیں کرتی ہیں۔ دھیان کہیں اور ہوتا ہے، کام کوئی اور کر رہی ہوتی ہیں۔ ابھی جب میں اُن کے پاس گئی تو بات کرتے کرتے ایک دم اُن کی اُنگلی میں سوئی لگ گئی۔''

اسد، نازو کے ذریعے شمیم سے بات چیت کر رہا تھا۔ اُسے اُمید تھی کہ شاید اس بات چیت کے دوران وہ خود ہی چلی آئے۔ مگر وہ تو جیسے ایک دم ہی سارے جانے پہچانے

راستے بھول گئی تھی۔ اسد کے ذہن پر ایک بار پھر جھنجھلاہٹ سوار ہونے لگی۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ خود چچی کی طرف چلا جائے اور شمیم سے دو باتیں کرے۔ مگر یوں جانے میں بھی اُسے سبکی محسوس ہوئی۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ امی اور چچی وغیرہ کسی وقت بھی مرگ والے گھر سے واپس آ سکتی تھیں۔ وہ سٹپٹا گیا۔ اس سٹپٹاہٹ میں اُس نے نازو سے کہا۔ ''جاؤ! باجی سے کہو کہ میں بلا رہا ہوں۔''

نازو یہ پیغام لے کر چلی گئی۔ اور بعد میں اسد کو تھوڑا سا پچھتاوا بھی ہوا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر وہ نہ آئی تو اس میں اُس کی توہین کا پہلو نکلے گا۔ اور یہ توہین برداشت کرنا اسد کے لئے خاصا مشکل ہوگا۔ پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ نازو اکیلی ہی واپس چلی آئی۔ اُس نے کہا۔ ''بھائی جان! باجی ہانڈی پکا رہی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ہانڈی جل جائے گی۔ ابھی گوشت میں پانی ڈال کر آؤں گی۔''

اسد کا تن من سلگ اُٹھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہانڈی تو بس ایک بہانہ ہے۔ وہ کسی طرح پندرہ بیس منٹ گزارنا چاہتی ہے تاکہ امی، چچی وغیرہ آ جائیں۔ ایک عجیب سی آگ دہک اُٹھی تھی اُس کے سینے میں۔ یہ آگ اُس تپش سے ملتی جلتی تھی جو کبھی کبھی کھیل کے میدان میں بھی اُس کے سینے میں جاگتی تھی۔ مگر اُس تپش کے اخراج کا راستہ تھا۔ وہ باؤلر کی دھنائی کر کے اس تپش کو ٹھنڈک میں بدل لیتا تھا۔ مگر آج جس تپش سے شمیم نے اُسے آشنا کیا تھا وہ کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ غالباً یہ تپش اور شدید جھنجھلاہٹ ہی تھی جس نے چند روز بعد اسد کو وہ بات کہنے کا حوصلہ دے دیا جو وہ ایک دن برساتی میں کہتے کہتے رہ گیا تھا۔

اُس نے اپنے لنگوٹیے عبداللہ سے مشورہ کیا اور الف سے ے تک ہر بات اُس کے گوش گزار کر دی۔ اُس نے پہلے بھی کبھی کوئی بات عبداللہ سے نہیں چھپائی تھی۔ عبداللہ طبعاً باتونی، رنگین مزاج اور کسی حد تک زمانہ ساز لڑکا تھا۔ اُس نے شادی سے پہلے کئی عشق کئے تھے۔ وہ سات آٹھ جماعتیں ہی پڑھ سکا تھا اور اب تو شاید وہ لکھنا پڑھنا بھول ہی گیا تھا۔ اُس کی لکھائی اُس کی پڑھائی سے زیادہ گندی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے معاشقوں کے خطوط وغیرہ وہ اسد سے ہی لکھواتا رہا تھا۔ بلکہ عبداللہ کا آخری معاشقہ بھی

جو اُس کی شادی پر منتج ہوا، اسد کے قلمی تعاون کے بغیر شاید بحرانوں کا شکار رہتا..... یہ پہلی مرتبہ تھی کہ کسی رومانی معاملے میں عبداللہ اُس سے تعاون کر رہا تھا۔ عبداللہ نے اسد کو مشورہ دیتے ہوئے پنجابی کی ایک مثال دُہرائی۔ اُس نے اسد سے کہا کہ ڈُلیاں بیراں دا اجے کُج نہیں وگڑیا..... یعنی گرے ہوئے بیروں کا ابھی کچھ نہیں بگڑا..... ابھی شمیم کی صرف منگنی ہی ہوئی ہے۔ خدانخواستہ شادی تو نہیں ہوگئی۔ منگنی تو ہوتی ہی اس لئے ہے کہ لڑکی اور لڑکے والے ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھ پرکھ لیں وغیرہ وغیرہ۔

اُس نے اسد کو مشورہ دیا کہ وہ آج کل میں موقع دیکھ کر بلا جھجک شمیم سے اظہارِ محبت کر دے اور اُسے بتا دے کہ وہ اُس کے لئے کتنی اہم ہے۔

عبداللہ کے مشورے سے اسد کی حوصلہ افزائی ضرور ہوئی مگر وہ جرأت پھر بھی پیدا نہ ہو سکی جو شمیم کے منہ پر محبت کی بات کہنے کے لئے درکار تھی۔ مجبوراً اسد نے تحریر کا سہارا لیا۔ جو کچھ اُس کے دل میں تھا، اُس نے صاف صاف شمیم کو لکھ دیا۔ اُس نے خط کے آخر میں لکھا۔ ''شمیم! میں نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ کچھ بھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اور سچ یہی ہے کہ تم سے اپنی شدید ترین محبت کا پتہ مجھے اُس رات چلا جس رات تمہاری منگنی ہوئی۔ شاید کچھ چیزوں کی قدر اُس وقت جاگتی ہے جب اُن کے چھن جانے کا خطرہ پیدا ہوتا ہے..... اب میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ کیا کروں؟ پڑھائی میں دل لگتا ہے نہ کھیل میں۔ شاید تمہیں معلوم نہ ہو مجھے شیخوپورہ کے ایک اہم کلب کی طرف سے کھیلنے کی دعوت ملی تھی لیکن میں وہ تاریخ ہی بھول گیا جس تاریخ کو مجھے ٹرائل پر جانا تھا۔ اس سے تم میری ابتر ذہنی حالت کا اندازہ لگا سکتی ہو اور مستقبل میں میری حالت زار کا نقشہ بھی تمہارے سامنے آ سکتا ہے (اگر میں زندہ رہا تو)۔ شمیم یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں کسی راہ پر لانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں تو تم سے مشورہ مانگ رہا ہوں کہ میں کیا کروں؟ مجھے تو لگتا ہے کہ اگر تم مجھ سے دُور ہوگئیں تو میں اپنی زندگی سے دُور ہو جاؤں گا۔''

عبداللہ نے اسد کو یقین دلایا تھا کہ شمیم کی طرف سے خط کا جواب ضرور آئے گا۔ اسد کو بھی کافی حد تک اُمید تھی۔ مگر دونوں دوستوں کی توقعات بالکل غلط ثابت ہوئیں۔ اسد ایک ہفتے تک شب و روز انتظار کرتا رہا مگر کوئی تحریری جواب ملا اور نہ زبانی۔ اسد کے سینے میں بھڑکتی آگ فزوں تر ہوگئی۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ اُس کے

ساتھ کیا ہوا ہے؟

خط لکھنے کے بعد بھی شمیم کے ساتھ اُس کا کئی بار آمنا سامنا ہوا۔ کبھی چچا کے گھر میں کبھی اپنے گھر میں، کبھی چھت پر، کبھی راستے میں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ خط شمیم کو ملا ہی نہیں۔ حالانکہ وہ خود اُس نے باورچی خانے کے سامنے سے گزرتے ہوئے شمیم کی گود میں پھینکا تھا۔

دن رات سینے میں بھڑکنے والی آگ نے اور شدید ذہنی تناؤ نے اسد کو بیمار کر ڈالا۔ اُسے بخار ہوا جو ٹائیفائیڈ کی شکل اختیار کر گیا۔ وہ کافی کمزور ہو گیا تھا۔ اُس کی ٹیم کے ساتھی اور یار دوست تو اُس کی خبر گیری کے لئے آتے ہی رہتے تھے۔ ایک روز درمیانی عمر اور گنجے سر والے ایک صاحب ڈھونڈتے ڈھونڈتے شاد پور پہنچے اور پھر اسد کے گھر چلے آئے۔ اُنہوں نے اپنا نام قدیر بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ لاہور سے آئے ہیں۔

اُنہوں نے اسد سے کہا۔ ”میں نے تمہیں یونیورسٹی گراؤنڈ لاہور میں کولڈ ڈرنک کے ٹورنامنٹ میں کھیلتے دیکھا تھا۔ میں تمہاری بیٹنگ سے متاثر ہوا تھا۔ میں تم سے رابطہ کرنا چاہتا تھا، لیکن اُنہی دنوں ایک ضروری کام کے سلسلے میں مجھے پاکستان سے باہر جانا پڑ گیا۔ اب واپس آیا ہوں تو تم تک پہنچا ہوں۔ میں تمہیں کسی خوش فہمی میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا، نہ ہی میرے پاس تمہارے لئے کوئی بڑی آفر ہے۔ لیکن مجھے یہ یقین ضرور ہے کہ اگر تم محنت کرو اور تمہیں ٹھیک سے گائیڈ کیا جائے تو تم کافی اچھا رزلٹ دے سکتے ہو۔“

اسد نے نحیف آواز میں کہا۔ ”یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے مجھے کسی قابل سمجھا۔ لیکن میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”تم لاہور میں میرا کلب جوائن کر سکتے ہو۔ تمہاری طرح کچھ اور ہونہار لڑکے بھی میں نے بڑی محنت سے تلاش کئے ہیں۔ اُن میں سے چار پانچ ایسے ہیں جن کا تعلق لاہور سے نہیں۔ اُن میں سے ایک تم بھی ہو۔ اگر تم چاہو تو میں لاہور ہی میں تمہاری رہائش اور خوراک وغیرہ کا انتظام کر سکتا ہوں۔ اگر تمہارے کوئی عزیز لاہور میں ہیں اور تم اُن کے ہاں قیام کر سکتے ہو تو یہ بھی میرے لئے قابل قبول ہے۔ ہفتے میں ایک بار تم یہاں شاد پور بھی آ سکو گے۔ ہو سکتا ہے تمہیں کچھ مشکلات بھی پیش آئیں گی۔ مگر یہ بات میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ تمہارے اندر صلاحیت موجود ہے۔ لاہور میں اس

صلاحیت کے پھلنے پھولنے اور تمہارے آگے بڑھنے کے بھرپور مواقع ہوں گے۔“

اسد نے کہا۔ ”جناب! میں آپ کے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔ مگر میری سب سے بڑی مجبوری یہ ہے کہ میں اپنے والدین کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا خاص طور سے والدہ کو۔ کیونکہ وہ اکثر بیمار رہتی ہیں۔ پھر میرا تعلیمی سلسلہ بھی ہے۔ میں یہاں کالج میں داخل ہوں....“

”کالج کی حد تک تو میں تمہارا مسئلہ بڑے اچھے طریقے سے حل کر سکتا ہوں۔“ قدیر صاحب نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں تمہیں کسی اچھے کالج میں داخل کرا سکتا ہوں۔ جہاں تک والدین سے دُور جانے کا سوال ہے تو میرے بھائی! وقت کے ساتھ کئی سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔ یہ قانونِ فطرت ہے۔ بچہ جب بڑا ہو جاتا ہے تو پھر اُسے اپنے پروں سے پرواز کرنی پڑتی ہے اور اُسے کرنی بھی چاہئے۔“

قدیر صاحب کافی دیر تک اسد کے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اُن کی باتیں حوصلہ افزا اور ہمت بندھانے والی تھیں۔ مگر اسد کے دل میں کچھ ایسی مایوسی اُتری ہوئی تھی کہ کوئی گفتار بھی اُس کے دل کو چھو نہیں رہی تھی۔ وہ خود کو بالکل خالی محسوس کر رہا تھا۔ اس دوران اسد کے والد صاحب بھی آ گئے۔ قدیر صاحب نے اُن سے بھی گفتگو کی۔ اُنہوں نے محمد حیات کو باتوں باتوں میں سمجھایا کہ اُن کا بیٹا باصلاحیت ہے۔ اپنے بیٹے کے جس مشغلے کو وہ بیکار سمجھ رہے ہیں وہ اس میں نام پیدا کر سکتا ہے۔

جاتے جاتے قدیر صاحب اسد کو ایک لفافہ دے گئے تھے۔ اس لفافے میں قدیر صاحب کے کلب کے بارے میں معلومات پر مبنی مواد تھا۔ تصویریں وغیرہ تھیں اور مستقبل کے ارادوں کی جھلک تھی۔ وہ اپنے اس کلب کو لاہور کے بہترین کلبس میں شمار کرانا چاہتے تھے۔

قدیر صاحب کے ساتھ اسد کی بیشتر گفتگو علی نے بھی سنی تھی۔ وہ کم عمر ہونے کے باوجود بڑا ذہین تھا اور بہت جلد بات کی تہہ تک پہنچ جاتا تھا۔

دو تین روز بعد موسم کی تبدیلی کے سبب اسد کا بخار ایک بار پھر شدت اختیار کر گیا۔ وہ ساری رات درد سے کراہتا رہا۔ والد اور چچا نے فیصلہ کیا کہ ایک آدھ دن مزید دیکھیں گے۔ اگر افاقہ نہ ہوا تو اسد کو لاہور لے جائیں گے۔ اسد کی والدہ کا رو رو کر برا حال تھا۔ اُنہیں یقین تھا کہ اُن کے بیٹے کو کسی کی نظر لگ گئی ہے، یا کسی نے اُس پر تعویز

وغیرہ کر دیئے ہیں۔ وہ صبح سویرے تانگے پر بیٹھ کر شیخوپورہ کے نزدیک ''کوٹ نگر'' نامی گاؤں میں چلی گئیں تاکہ وہاں کے ایک پہنچے ہوئے بزرگ سے بیٹے کے لئے پانی دم کرا کے لا سکیں۔ علی بھی اُن کے ساتھ چلا گیا۔ والدہ کو کیا معلوم تھا کہ بیٹے کا علاج کوٹ نگر میں نہیں، بلکہ شاید لاہور میں اور لاہور سے آگے بھی نہیں، اس کا علاج تو گھر کے اندر ہی ہے۔ وہ سادہ سی لڑکی جو اپنی تمام تر محبتوں اور ساری اسراریت کے ساتھ اُس کے اندر جذب ہو چکی تھی، اُس کی رگ رگ میں حلول کر چکی تھی...... شمیم کے حوالے سے اسد پیچ ڈھیلا ہونے کی باتیں کیا کرتا تھا۔ آج اُس کا اپنا پیچ ڈھیلا ہو گیا تھا اور اس بری طرح ڈھیلا ہوا تھا کہ اُس کے کسے جانے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔

اُس روز گھر میں صرف مائی نوراں تھی۔ دوپہر سے ذرا پہلے اچانک اسد نے محسوس کیا کہ اُس کے علاوہ بھی کوئی کمرے میں موجود ہے۔ اُس نے کمبل میں سے سر نکال کر دیکھا، وہ سامنے دیوار کے ساتھ کرسی پر بیٹھی تھی۔ ہلکے زرد رنگ کے لباس میں وہ خزاں کا پھول ہی دکھائی دیتی تھی۔ اُسے دیکھ کر بھی اسد اپنی جگہ لیٹا ہی رہا۔

''اب تمہارا کیا حال ہے؟'' اُس نے پوچھا۔

''تمہارے سامنے ہے۔ لگتا ہے کہ مستقبل میں بہتری کی کوئی اُمید بھی نہیں۔''

''ایسا مت کہو۔ تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔'' پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''تمہاری لکھی ہوئی باتیں میں نے پڑھی تھیں...... لل لیکن......'' اُس کے چہرے پر ایک لمحے میں کئی رنگ گزر گئے۔

''لیکن کیا؟''

''اب ان باتوں کا وقت گزر چکا ہے اسد...... تمہیں پتہ ہے نا کہ قسمت کے فیصلے آسمانوں پر ہوتے ہیں۔ سمجھ لو کہ میری قسمت میں یہی کچھ تھا۔''

''بالکل غلط...... قسمت انسان خود بناتا ہے۔ کم ہمت لوگ قسمت اور تقدیر کو الزام دیتے ہیں۔ ابھی...... ہم بہت دُور نہیں گئے شمی...... تم چاہو تو ہم واپس آ سکتے ہیں۔ سب کچھ ہو سکتا ہے شمی......''

ایک دم اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ ''میرا اتنا سخت امتحان نہ لو اسد! یہ سچ ہے...... کہ میں بھی وہی کچھ چاہتی تھی جو تم چاہتے ہو۔ لیکن اب میں نے وہ

سب کچھ مار کر اپنے اندر دفن کر دیا ہے۔ پلیز! اگر تمہارے دل میں کچھ ہے تو وہ بھی دفن کر دو۔ اب اسی میں ہماری اور ہمارے بزرگوں کی بھلائی ہے۔ میرے ابا جان جو تمہارے چچا بھی ہیں چار آدمیوں میں بیٹھ کر زبان دے چکے ہیں۔ کیا ہم اُن کی عزت کو خاک میں ملا دیں گے؟ پلیز اسد! اب بھول جاؤ سب کچھ۔ ہم آج تک جس طرح رہے ہیں، ہمیشہ اُسی طرح رہیں گے۔ ہنسیں بولیں گے، باتیں کریں گے، ایک دوسرے کے دُکھ سکھ میں شریک ہوں گے۔ بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔''

''میں...... یہ سب کچھ نہیں جھیل سکوں گا شمیم!'' وہ کراہا۔

''بہت جلد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اسد...... میں دن رات تمہارے لئے دُعائیں کروں گی۔''

''مجھے دُعاؤں کی نہیں، تمہاری ضرورت ہے شمیم۔''

''میری ضرورت نہیں رہے گی۔ بہت جلد تم سنبھل جاؤ گے۔ اگر کوئی چھوٹا موٹا خلا ہو گا بھی تو وہ خلا پُر کرنے والی آ جائے گی۔ میں ممتاز کو بڑی اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ بڑی اچھی لڑکی ہے اسد! تمہاری بڑی اچھی جیون ساتھی بنے گی۔''

''جیون رہے گا تو کوئی جیون ساتھی ہوگی نا......'' اسد پھر کراہا۔

''مایوسی کی باتیں مت کرو...... مجھ سے وعدہ کرو اسد! کبھی مایوسی کو قریب نہیں آنے دو گے...... پلیز وعدہ کرو۔ میں نے تم سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔'' آنسو ٹپ ٹپ اُس کی خوبصورت آنکھوں سے گر رہے تھے۔

اسد خاموش رہا تو وہ پھر بولی۔ ''علی کل مجھے بتا رہا تھا کہ شہر سے کوئی آدمی تم سے ملنے آیا تھا۔ وہ تمہیں لاہور لے جانا چاہتا ہے، کسی اچھی ٹیم میں کھیلنے کی دعوت دے رہا ہے اور تم نے اُسے انکار کر دیا ہے۔''

''پتہ نہیں ابھی مجھے کس کس بات سے انکار کرنا ہے۔''

''نہیں اسد! میں تمہیں کسی مقام پر دیکھنا چاہتی ہوں۔ میری آرزو ہے تم بہت بلندی تک جاؤ۔ اتنی بلندی تک کہ میں سر اُٹھا کر دیکھوں تو یوں لگے...... جیسے آسمان کو دیکھ رہی ہوں۔ پلیز اسد! میری یہ آرزو ضرور پوری کرنا۔'' وہ جذباتی ہو رہی تھی۔

''اگر تم نہیں ہوگی تو پھر کچھ نہیں ہوگا۔ نہ آرزو ہوگی نہ آرزو پوری کرنے والا۔ میں

سچ کہتا ہوں شمی! سب کچھ تم سے ہے۔ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ مجھے تمہاری یہ فلمی ہیروئنوں والی دردناک مکالمہ بازی نہیں چاہئے۔ مجھے تم درکار ہو۔''

''میں تو خود اپنے پاس بھی نہیں ہوں، تمہارے پاس کہاں سے آؤں گی؟'' وہ بے حد مایوس لہجے میں بولی تھی۔ اُسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اُس کی اب تک کی ساری گفتگو رایگاں ہی گئی ہے۔

اچانک اسد کی نگاہ اُس کے دائیں ہاتھ پر پڑی۔ ہتھیلی پر وہی مہندی موجود تھی جو کچھ عرصہ پہلے اسد نے اُسے لگائی تھی۔ ڈیزائن پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا اور یوں لگتا تھا کہ جیسے آج ہی مہندی لگا کر ہاتھ دھویا گیا ہے۔ ایک دن شمیم نے کہا تھا یہ مہندی ہمیشہ اسی طرح دمکتی رہے گی۔ اس حنائی ہاتھ کو دیکھ کر اسد کو سینے میں خوشگوار دھڑکنوں کا احساس ہوا۔ اُسے لگا جیسے اُس کے اندر مرتا ہوا حوصلہ پھر سے زندہ ہو گیا ہے...... چند لمحے کے اندر ذہن نے خیال کے کئی تانے بانے بُن دیئے۔ شمیم اُس سے محبت کرتی تھی۔ وہ اب بھی اُسے چاہتی تھی، اُسے سوچتی تھی۔ اُس کے دل کے چور خانوں میں وہ اب بھی ایک ارمان بھرے خواب کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کے سینے میں ٹھہری ہوئی تپش اُس کے پورے بدن میں پھیلنے لگی۔ خون میں شامل ہو کر یہ تپش ہر رگ و پے میں گردش کرنے لگی۔ عبداللہ کی کہی ہوئی باتیں اُسے یاد آئیں۔ اُس نے کہا تھا، عورت میں مرد سے نو گنا زیادہ جذبات ہوتے ہیں، مگر وہ اُنہیں ظاہر نہیں ہونے دیتی۔ پیش قدمی مرد کو ہی کرنا پڑتی ہے۔ وہ دل ہی دل میں حساب جوڑنے لگا۔ نو گنا زیادہ جذبات...... اُس کے اپنے جذبات ایک گنا تھے اور طوفانی لہروں کی طرح اُس کے بدن کو توڑ پھوڑ رہے تھے...... اس کیفیت کو اگر نو سے ضرب دے دی جاتی تو بات کہاں تک پہنچتی تھی؟ وہ یہ نو گنا طوفان اپنے کومل جسم میں چھپائے خاموش بیٹھی تھی۔ کتنا بڑا جھوٹ بول رہی تھی، اسد سے اور خود اپنے آپ سے۔ جھوٹی کہیں کی۔

اُس نے اپنا سر تکیے پر رہنے دیا اور نیم وا آنکھوں سے کرسی پر بیٹھی شمیم کو دیکھا۔ اِردگرد کوئی نہیں تھا۔ کمرے کی کھڑکی سے آگے کھیتوں میں ٹریکٹر کی آواز آ رہی تھی۔ دُور جوہڑ کے کنارے عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں۔ وہ نظر نہیں آ رہی تھیں۔ مگر جب وہ لکڑی

کے ڈنڈے سے صابن آلود کپڑے پر ضرب لگاتی تھیں تو اُس کی آواز ہوا کے دوش پر دُور تک پھیلتی تھی۔

''ادھر میرے پاس آؤ......'' اسد نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''نہیں...... میں یہیں ٹھیک ہوں۔ تم نے کیا کہنا ہے؟''

''اوہو...... ادھر میرے پاس تو بیٹھو!'' وہ ذرا جھلا کر بولا۔

وہ خاموش رہی۔ اُس کی خاموشی ہی اُس کا جواب تھی۔ شدید توہین کے احساس سے اسد کے اعصاب چیخ گئے مگر وہ اپنے لہجے پر قابو رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں آج بھی وہی اسد ہوں جو اب تک تمہارے ساتھ رہا ہے۔ آج کوئی جنگلی جانور نہیں بن گیا ہوں...... یہ میرے سر پر تھوڑا سا تیل لگا دو۔'' اُس نے سرہانے رکھی تیل کی بوتل کی طرف اشارہ کیا۔

''میں نازو کو بھیجتی ہوں۔'' اُس نے لرزاں لہجے میں کہا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اُس کی زبان نے صرف ایک فقرہ کہا تھا مگر اُس کی آنکھوں نے کئی پُر اندیش فقرے کہے تھے۔ اُس کی آنکھوں نے کہا تھا...... ''اسد! میں نے تمہاری نگاہوں کی نیت بھانپ لی ہے۔ تم مجھے قریب بلاؤ گے، مجھے سر میں تیل لگانے کے لئے کہو گے، پھر میری کلائی تھامو گے، پھر پورا بازو تھامو گے...... مائی حوا نے جنت میں مرد کو بہکایا تھا، تم وہ بات اب تک نہیں بھولے ہو۔ تم اس کا بدلہ مجھے بہکا کر لینا چاہتے ہو۔ مگر میں نے صدیوں سزا بھگت کر اس کا بدلہ چکا دیا ہے۔ اب میں نہیں بہکوں گی۔ میں اپنے باپ، اپنے تایا اور اپنے بزرگوں کی عزت خاک میں نہیں ملاؤں گی۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب میں تم سے اتنی ہی دُور ہوں جتنا مشرق سے مغرب......''

''رُک جاؤ...... میری بات سنو۔'' اسد کراہ کر بولا۔ اُس کے اندر کی آگ اُس کے لہجے میں منتقل ہو رہی تھی۔

وہ ٹھٹک کر رُک گئی مگر اُس کی طرف نہیں آئی۔

''میرے پاس آ کر...... میری بات نہیں سنو گی؟'' وہ لرزتے لہجے میں بولا۔

''تم کہو...... میں سن رہی ہوں۔''

ایک دم اسد کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ وہ پھٹ پڑا۔ ''تو پھر دفع ہو جاؤ یہاں سے...... دور ہو جاؤ میری نظروں سے...... تم ایک جھوٹی اور دغا باز لڑکی ہو۔ تم جہاں جاؤ گی،

دھوکہ ہی دو گی، فریب ہی کرو گی۔ نکل جاؤ یہاں سے۔''

اُس نے ایک دم سہم کر اسد کی طرف دیکھا اور پھر منہ پر ہاتھ رکھ کر تیزی سے باہر نکل گئی...... اسد بستر پر پڑا اپنی ہی آگ میں جلتا رہا۔

شام کو نازو ملی تو اُس نے پوچھا۔ ''بھائی جان! کیا باجی سے آپ کی لڑائی ہوئی تھی؟''

''کیوں، کیا ہوا ہے؟''

''وہ بس روئے جا رہی ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے غسل خانے میں بیٹھی تھیں اور اپنے ہاتھ کی مہندی کو رگڑ رگڑ کر صاف کر رہی تھیں۔''

اسد کے دل میں ایک اور گھونسہ لگا...... اُسے پہلے بھی اندازہ تھا کہ شمیم کی چھٹی حس بڑی تیز ہے۔ کئی مواقع ایسے آئے تھے جب اُس نے اسد کے دل میں اُٹھنے والے خیالات کو بھانپا تھا اور اس کے مطابق ردِعمل ظاہر کیا تھا۔ اس کی ایک مثال یہ مہندی والی بات بھی تھی۔ آج دوپہر گفتگو کے دوران اسد کی نگاہ شمیم کے مہندی والے ہاتھ پر پڑی تھی، اور مہندی والا ہاتھ دیکھ کر اُس کے لہجے میں ایک نیا رنگ آیا تھا...... اب شمیم اُس نقش کو ہی ختم کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا وہ ذہنی طور پر اسد سے بہت دُور چلی گئی ہے۔

اسد اپنا قصور مانتا تھا۔ واقعی اُسے بڑی دیر میں ہوش آیا تھا۔ دن رات شمیم کے قریب رہتے ہوئے بھی وہ برسوں اُس توانا جذبے سے بے خبر رہا تھا جو شمیم کے حوالے سے اُس کے دل میں پایا جاتا تھا۔ مگر اس نادانی یا غلطی کی سزا اتنی کڑی تو نہیں ہونی چاہیے تھی۔

تیسرے چوتھے روز کی بات ہے، اسد کی طبیعت قدرے سنبھلنے کی خوشی میں اُس کی والدہ نے محلے بھر میں گڑ کے چاول بانٹے۔ چچی چچا اور بچے سب اسد کے گھر میں موجود تھے۔ شمیم بھی تھی۔ تاہم اُس کی شکل دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ مجبوراً یہاں موجود ہے۔ سب باتیں کر رہے تھے۔ نازو نے کہا۔ ''بڑے مزے کا میچ تھا آج تو...... بھائی جان! آپ نے دیکھا؟'' اسد نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''بھئی آج سورج کدھر سے نکلا ہے کہ اسد نے کرکٹ میچ نہیں دیکھا؟'' چچا شوکت نے کہا۔ سب ہنسنے لگے۔

شمیم بھی مسکرا رہی تھی۔ وہ دو تین روز پہلے کے واقعے سے بالکل لاپرواہ نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

علی نے کہا۔ ''میانداد نے تو کمال کر دیا۔''

''ہاں...... میانداد کا کھیل بڑا اچھا تھا۔'' چچا نے تائید کی۔

''کس کا کیلا کچا تھا؟'' چچی نے کان کے پیچھے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو سب ہنس دیئے۔

''کیلا کچا نہیں تھا، کھیل اچھا تھا۔ کیلے کھائے ہوئے تو آٹھ گھنٹے ہو گئے، کچے پکے سب ہضم ہو گئے ہوں گے۔'' اسد کی والدہ نے چبا کر کہا۔ مقصد یہ بتانا بھی تھا کہ اُنہوں نے اکیلے اکیلے کیلے کھائے ہیں۔

چچا بولے۔ ''میانداد نے جو آخری پانچ گیندیں کھیلیں، انہوں نے کھیل کا پانسہ پلٹ دیا۔''

''رہی سہی کسر عمران خان نے مارشل کو اوپر تلے دو چوکے لگا کر پوری کر دی۔ ہمارے تو تالیاں بجا بجا کر ہاتھ سرخ ہو گئے۔'' علی نے کہا۔ ''یہ دیکھیں، میرے ہاتھ ابھی تک سرخ ہیں۔''

''اور میرے بھی۔'' نازو نے کہا۔

''میرے تو نہیں ہوئے۔'' شمیم نے نازو کو دونوں ہاتھ دکھائے...... لیکن اصل میں یہ ہاتھ اُس نے اسد کو دکھائے تھے۔

دونوں ہاتھ بالکل صاف تھے۔ اُس مہندی کا کہیں نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا جو کئی ماہ سے شمیم کے ہاتھوں پر موجود تھی۔ ایک اور گھونسہ اسد کے دل پر لگا۔

اسد کے والد محمد حیات کہہ رہے تھے۔ ''چھوڑو یار شوکت! کرکٹ شرکٹ کی بات میرے سامنے مت کیا کرو۔ یہ بھی کوئی کھیل ہے...... بس نخرہ ہی نخرہ ہے۔ کھیل تو ہوتا ہے کبڈی، کشتی، رسہ کشی...... یہ کیا ہوا پتلونیں قمیصیں پہن کر آ گئے اور سارا دن کملوں کی طرح دُھوپ میں کھڑے رہے۔''

ابا جان کی آواز اور دیگر ساری آوازیں جیسے دُور کہیں بہت دُور سے اسد کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ سب کے درمیان بیٹھا ہوا بھی جیسے اُن سے کہیں بہت دُور چلا گیا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے بس شمیم کے ہاتھوں کی صاف شفاف ہتھیلیاں تھیں اور ذہن میں سرخ آندھی سی چل رہی تھی۔

○○○

"امی جان! میں لاہور جانا چاہتا ہوں۔" اسد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ اُس کے ہاتھ میں وہی لفافہ تھا جو چند روز پہلے قدیر صاحب اُسے دے گئے تھے۔

امی خالی خالی نظروں سے اسد کو دیکھتی رہیں، پھر بولیں۔ "مجھے علی نے رات کو ہی سب کچھ بتا دیا تھا۔ مجھے پتہ ہے پچھلے مہینے جو وہ موٹا سا گنجا لاہور سے آیا تھا، وہی تجھے اُلٹی پٹی پڑھا گیا ہے۔ اسدی! کان کھول کر سن لے! میں تجھے لاہور نہیں جانے دُوں گی۔"

"امی! آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ مجھے ایک موقع مل رہا ہے۔"

"دفع کرو ان موقعوں کو...... اللہ نے سب کچھ دے رکھا ہے۔ کس بات کی کمی ہے ہمیں؟ نہیں چاہئیں ہم کو یہ موقعے شوقعے...... اور تجھے پتہ ہے تیرے ابا ویسے بھی کتنا خلاف ہیں اس کام کے...... وہ کسی طور تجھے جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔"

"آپ...... اُن سے بات کریں۔"

"میری شامت نہیں آئی ہوئی۔ جو اُن کے منہ میں آئے گا کہہ دیں گے...... اور تم بھی ذرا سوچو، گھر میں بیاہ رچا ہوا ہے، دن طے ہو گئے ہیں۔ دو تین ہفتے میں برات آنے والی ہے اور تم کو لاہور کی پڑی ہوئی ہے۔ تمہارے چچا کیا سوچیں گے؟ دوسرے لوگ کیا سوچیں گے؟ اور سب سے زیادہ باتیں تو وہ سلطانہ بنائے گی۔ اُسے تو بات کا بتنگڑ بنانے کا موقع چاہئے۔ ابھی تو کانوں سے کم سنائی دیتا ہے ورنہ خبر نہیں کیا قیامتیں ڈھاتی۔"

"لیکن امی......!"

"دیکھ پتر! میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ اپنے ابا سے میری اور اپنی بے عزتی نہ کرانا۔ اُنہوں نے کسی صورت اجازت نہیں دینی ہے، اور نہ میں نے دینی ہے۔"

اگلے دو تین دن اسد نے سخت کوفت میں گزارے۔ اُسے یوں لگتا تھا کہ اس فضا

میں اُس کا دم گھٹ رہا ہے۔ وہ یہاں سے دُور نکل جانا چاہتا تھا۔ کسی ایسی جگہ جہاں شمیم سے وابستہ کوئی چیز، کوئی چہرہ اُسے نظر نہ آئے اور نہ کوئی آواز کانوں میں پڑے...... ایک آگ سی ہمہ وقت اُس کے سینے میں بھڑکتی رہتی تھی...... اسی اثنا میں ابا جان کے کانوں میں یہ بات پڑ گئی کہ اسد کھیلنے کے لئے لاہور جانا چاہتا ہے۔ اُس شام اُن کے گھر میں بس قیامت ہی آ گئی تھی۔ ابا جان اتنے زور سے گرجے برسے کہ در و دیوار ہل گئے۔ غصے کے عالم میں اُنہوں نے جوان بیٹے کو شانوں سے پکڑ کر خوب جھنجھوڑا...... بس اُن کا ہاتھ اُٹھنے میں تھوڑی سی کسر ہی رہ گئی تھی۔

اُس روز اسد خوب رویا تھا۔ اُس نے وہ لفافہ پھاڑ کر پھینک دیا جو قدیر صاحب اُسے دے کر گئے تھے۔ اُس نے اپنا "کٹ بیگ" بھی اُٹھا کر گھر کے سٹور میں پھینک دیا۔ اُس نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ اب کبھی گیند بلے کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ جو کام اُس کے باپ کو اتنا ناپسند تھا وہ اُسے بھی پسند نہیں ہونا چاہئے تھا...... اُس دن اُسے یوں محسوس ہوا جیسے شمیم اور کرکٹ ایک ساتھ ہی اُس سے رُوٹھ گئے ہیں۔ ہمیشہ کے لئے دُور چلے گئے ہیں...... کتنے ہی روز وہ بالکل گم صم رہا۔ موقع ملتے ہی کمرے میں گھس جاتا اور دروازہ بند کر کے آتشیں آنسو بہاتا۔ اپنے والد کا اُس کے دل میں بڑا احترام تھا۔ وہ دل کی گہرائی سے اُن کی عزت کرتا تھا اور اسی طرح چچا جان کی بھی...... دھیرے دھیرے بات اُس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اُسے اپنے سینے پر برداشت کا بھاری پتھر رکھنا تھا اور وہ سب کچھ سہنا تھا جو آئندہ چند روز میں پیش آنے والا تھا...... شمیم کو کسی اور کی ہوتے دیکھنا بڑا ہی کٹھن مرحلہ تھا۔ مگر اُسے اس مرحلے سے گزرنا تھا۔ بے شک یہ آگ کا سمندر تھا مگر اسے پار کئے بغیر چارہ نہیں تھا۔

شمیم اپنی نئی زندگی شروع کرنے سے پہلے ہی اُس سے بہت دُور جا چکی تھی۔ وہ بہت کم اُس کے سامنے آتی تھی اور اگر آتی بھی تھی تو اجنبی سی لگتی تھی جیسے کوئی بھولا بسرا نغمہ، جیسے کتاب میں رکھا ہوا خشک پھول، جیسے ویرانے میں چٹکی ہوئی چاندنی، جیسے کسی دُور کے مسافر کی آخری جھلک...... اسد پہلے ہی غم سے چور تھا۔ ستم بالائے ستم، والد اور چچا نے اُس پر بھاری ذمہ داریاں ڈال دی تھیں۔ اُسے امی، چچی، شمیم اور ایک دوسری کزن کو شادی کی شاپنگ کرانے لاہور لے جانا تھا۔ شادی کارڈز بھی اُسی نے چھپوانے

تھے۔ شادی کے بیشتر انتظامات اسد ہی کے ذمے تھے۔

چچا کے گھر ڈھولک رکھ دی گئی تھی۔ شام ہوتے ہی گلی محلے کی لڑکیاں اور بچیاں چچا کے گھر میں جمع ہو جاتیں۔ جو ایک دو اپنے گھر قصبے میں موجود تھے اُن کی خواتین بھی چلی آتیں۔ رات نو دس بجے تک محفل جمی رہتی۔ شادی بیاہ کے گیت ڈھولک سے ہم آہنگ ہو کر فضا میں بکھرتے اور درمیانی وقفوں میں لڑکیوں کے الہڑ قہقہے گونجتے۔ ایک دن اسد کی خالہ صباحت کی بیٹی ممتاز بھی ڈھولک بجانے کے لئے آئی۔ وہ ایک قریبی گاؤں ''اٹھراں'' میں رہتی تھی۔ اچھی شکل کی تھی۔ امی اُس کے صدقے واری جا رہی تھیں۔ لیکن اسد کو اُس میں مطلق دلچسپی نہیں تھی۔ امی نے ممتاز کو اپنے پاس بٹھا لیا اور اسد کے سامنے بچپن کی باتیں اور یادیں دُہرانے لگیں۔

''تمہیں یاد ہے اسد! جب تمہاری پھوپھو نرگس کی شادی ہوئی تھی، تم نے ممتاز کو مہندی والے تھال میں گرا دیا تھا۔''

اسد کو فوراً پھوپھو نرگس کی شادی یاد آ گئی اور اُس شادی کے ساتھ ہی یاد آ گیا کہ شادی کے روز وہ شمیم کو اپنے سائیکل پر بٹھا کر پھوپھو نرگس کے گھر لے کر گیا تھا۔

اسد کی امی نے کہا۔ ''اور تمہیں یاد ہے اسد! کوٹ نگر کے میلے پر ممتاز گم ہو گئی تھی۔ تم اور عبداللہ دو گھنٹے اسے ڈھونڈتے رہے تھے؟''

اسد کو فوراً کوٹ نگر کا وہ میلہ یاد آ گیا اور اس کے ساتھ ہی یاد آیا کہ وہ کسی بات پر شمیم سے ناراض ہو گیا تھا اور اُس نے زبردستی اُس کے منہ میں جلیبیاں ٹھونس ٹھونس کر اُسے منایا تھا۔

امی نے کہا۔ ''اور اسد! تمہیں پچھلی سے پچھلی بقر عید تو نہیں بھولی ہوگی جب تم نے بکرے کے کٹے ہوئے سر کو سینگوں سے پکڑ کر ممتاز کو ڈرایا تھا اور یہ مائی نوراں کے اوپر جا گری تھی۔''

اور اسد کو فوراً یاد آ گیا کہ اُس نے ایسا شمیم کے کہنے پر ہی کیا تھا۔ کیونکہ شمیم اور ممتاز میں شرط لگی ہوئی تھی کہ وہ بکرے سے نہیں ڈریں گی۔ اس موقع پر شمیم کی کھلکھلاتی ہوئی ہنسی اسد کے کانوں میں گونج گئی۔ اسد کو یوں لگتا تھا کہ جیسے ہر طرف شمیم ہی شمیم ہے۔ نہ اُس کے سوا کچھ دکھتا تھا نہ سنائی دیتا تھا۔ امی تو بس یونہی وقت ضائع کر رہی تھیں۔

جس وقت اسد کی امی ممتاز کو اسد کے قریب بٹھا کر پرانی یادیں تازہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں، اُس وقت چچا کے گھر میں ڈھولک زور و شور سے بج رہی تھی۔ اچانک لڑکیوں نے وہ گانا چھیڑ دیا۔

پھکی پے گئی چن تاریاں دی لوتوں اجے وی نہ آیوں سجناں
رنگ سوہا میرا پیلا گیا ہوتوں اجے وی نہ آیوں سجناں

اسد کے سینے میں جلتی ہوئی نیلی آگ کے شعلے کچھ اور بلند ہو گئے۔ یہی گانا کچھ عرصہ پہلے عبداللہ کی شادی پر شمیم نے گایا تھا۔ گانا گاتے ہوئے شمیم نے جن نگاہوں سے بار بار اسد کو دیکھا تھا وہ آج بھی اُس کے ذہن میں محفوظ تھیں۔ اب اُن نگاہوں کے معنی بڑی وضاحت سے اسد کی سمجھ میں آ رہے تھے...... کاش یہ معنی اُسی وقت اُس کی سمجھ میں آئے ہوتے۔ اُس سے یہ ڈھولک، یہ آوازیں برداشت نہیں ہوئیں...... وہ امی سے، ممتاز سے اور اُن کی آوازوں سے پیچھا چھڑا کر گھر سے باہر نکل آیا۔ ٹھنڈے اندھیرے میں کھیتوں کے کنارے اور کھیتوں کے اندر پگڈنڈیوں پر وہ تیز تیز چلتا رہا۔ وہ بے مقصد چل رہا تھا مگر اس طرح چلنا اُسے کچھ سکون دے رہا تھا...... پھر وہ بھاگنے لگا۔ بے مقصد اور بے سمت...... شاید وہ اپنے آپ سے اور اپنے حالات سے بھاگ رہا تھا...... مگر اپنے آپ سے کون بھاگ سکتا ہے؟ ڈھولک اور گیتوں کی آواز آنا بند ہو گئی تھی مگر اُس کے اندر جو ڈھولک بج رہی تھی اس سے وہ اپنے کان کیسے بند کر سکتا تھا؟ ایک طویل چکر کاٹ کر وہ گھر واپس لوٹ آیا۔ بالکل جیسے کوئی کھلاڑی سکور لینے کے لئے بھاگے، مگر بھاگنے کی اور منزل تک پہنچنے کی مہلت نہ ہو، مجبور ہو کر واپس اپنی کریز میں پہنچ جائے۔

دو روز بعد وہ شمیم سمیت سب گھر والوں کو شادی کی شاپنگ کرانے لاہور لے گیا۔ صبح سے شام تک وہ وقت اسد نے جس طرح کاٹا کچھ اُسے ہی معلوم تھا۔ شمیم جو اُس کی بچپن کی ساتھی تھی جو بارہ تیرہ سال تک اُس کی ہمراز دوست کی حیثیت سے رہی تھی، اب ایک دم اتنی بیگانی ہو گئی تھی کہ اُس سے مخاطب تک نہیں ہوتی تھی۔ اُس کی طرف دیکھتی تک نہیں تھی۔

دو چار روز بعد ہی شادی کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ چچا شوکت کے گھر یہ پہلی شادی تھی

لٰہذا وہ ہر ارمان پورا کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ تمام رسمیں یعنی مایوں، تیل، مہندی وغیرہ ادا کئے جانے کا پروگرام تھا۔ ایک طرف اسد تھا جو چاہتا تھا کہ یہ کام جلد سے جلد اختتام پذیر ہو جائے، دوسری طرف شمیم کے گھر والے تھے جو نادانستہ اُس کے عذاب کو طول دے رہے تھے۔ نازو چھوٹی عمر کی تھی اس کے باوجود اسد کو اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی حد تک اسد کے غم و اندوہ سے آگاہ ہے۔ وہ بے چاری اپنی عقل سمجھ کے مطابق ہر وقت اسد کی دل جوئی میں لگی رہتی تھی۔ کسی وقت اسد جھلا جاتا تھا اور کہتا تھا کہ جاؤ مجھے تنہا چھوڑ دو۔ اُس معصوم کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر جاتے تھے۔ ایک روز ایسے ہی اسد نے اُسے جھڑکا تو اُس کی شکل رونے والی ہوگئی۔ وہ جو رسالہ اسد کے پڑھنے کے لئے لائی تھی وہ اسد نے لے لیا اور اُسے پاس بیٹھنے کو کہا۔ وہ سہمی سہمی سی بیٹھ گئی۔

اسد نے پوچھا۔ ”یہ تم ہر وقت چڑیل کی طرح میرے سر پر کیوں سوار رہتی ہو؟“

”آ...... آپ میرے بھائی جان ہیں۔ ویسے بھی باجی نے کہا ہوا ہے کہ میں اب آپ کا خیال رکھا کروں۔“

”تمہاری باجی نے میرے بارے میں کبھی کچھ اور نہیں کہا؟“

”ہاں...... نہیں......“ وہ گڑبڑا گئی۔

”یہ کیا بات ہوئی؟ ہاں میں جواب دو یا نہ میں...... میں نے تم سے کہا تھا نا کہ اچھے بچے کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔“

وہ کچھ دیر اپنے پاؤں کی طرف دیکھتی رہی، پھر بولی۔ ”مگر آپ نے یہ بھی تو کہا تھا کہ کسی سے وعدہ کریں تو پھر پورا کرنا چاہئے۔“

”ہاں یہ بات تو ہے۔“ وہ چپ سا ہو گیا۔

چند لمحے بعد وہ بولی۔ ”اچھا، میں آپ کو بتا دیتی ہوں۔ مگر آپ کسی اور کو نہیں بتائیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“

”باجی اکثر آپ کے بارے میں پوچھتی رہتی ہیں۔ مگر اُنہوں نے تاکید کی تھی کہ میں کسی کو یا آپ کو بتاؤں گی نہیں......“ پھر وہ ذرا توقف سے بولی۔ ”بھائی جان! کیا باجی سے آپ کی لڑائی ہوئی ہے؟ آپ ایک دوسرے سے بولتے نہیں، نہ ہی اکٹھے بیٹھتے ہیں۔ میں کل بڑا زور لگاتی رہی ہوں مگر باجی آپ کے گھر بھی نہیں آتیں۔“

”نہیں، لڑائی تو نہیں۔ بس ایسے ہی ذرا کم ملنا ہوتا ہے۔ ویسے بھی اُس کی شادی ہو رہی ہے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو...... یہ بتاؤ وہ میرے بارے میں کیا پوچھتی ہے؟“

”کچھ خاص نہیں۔ بس چھوٹی چھوٹی باتیں۔ تمہارے بھائی جان کیا کر رہے ہیں؟ کھیلنے گئے ہیں کہ نہیں؟ کھانا کھایا ہے کہ نہیں؟ ٹی وی لگاتے ہیں کہ نہیں؟ میں بڑا کہتی ہوں کہ آپ خود کیوں نہیں پوچھ لیتیں، ایک دم اُداس ہو جاتی ہیں۔ کل کچن میں بیٹھی رو رہی تھیں۔ اُن کی سہیلی باجی عارفہ نے پوچھا کیوں رو رہی ہو؟ کہنے لگیں، میں تم سے دُور جا رہی ہوں۔ باجی عارفہ نے کہا، ہم سب جانتے ہیں، رو کسی اور کے لئے رہی ہو، نام ہمارا لگا رہی ہو۔“

ننھی نازو کی باتوں نے اسد کے سینے میں بھڑکتی آگ پر تیل کے چھینٹے ہی ڈالے تھے۔ اس دوران میں چچا جان اندر آ گئے۔ اُنہوں نے اسد سے کہا۔ ”یار! تم یہاں بیٹھے ہو، اُدھر سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ آج سارے کارڈ لکھ لو، کل اتوار ہے، جہاں جہاں پہنچانے ہیں، پہنچا آؤ۔“ طوعاً و کرہاً وہ چچا کے ساتھ اُن کے گھر چلا گیا۔ شکر تھا کہ ڈھولک نہیں بج رہی تھی ورنہ اُس کا دماغ پھٹنے لگتا۔

کارڈ لکھنے کے بعد وہ چچا کے گھر سے یوں بھاگا جیسے کوئی اُس کے پیچھے لگا ہو۔ حالانکہ یہی وہ آنگن تھا جو اُسے اپنے آنگن سے بڑھ کر پیارا تھا۔

اگلا سارا دن بھی شادی کے انتظامات میں ہی گزرا۔ مٹھائی بنانے والے سے بات چیت ہوئی۔ پکوائی کرنے والے سے دیگوں کے مسالے وغیرہ لکھوائے گئے، شام کو اسد اور چچا قصبے کے بازار میں گئے، شامیانوں اور کراکری وغیرہ کے بارے میں بات کی۔ اگلے روز تیل کی رسم تھی۔ اس کے لئے بھی ضروری سامان بازار سے خرید لیا گیا۔ اس ساری خون رُلانے والی مصروفیت کے دوران بھی نجانے کیوں اسد کے دل میں یہ اُمید بار بار ایک جگنو کی طرح چمکتی رہی کہ شاید اپنی شادی سے پہلے ایک بار...... آخری بار شمیم اُس سے ملے۔ پتہ نہیں کیوں اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ ایسا ہو۔ وہ ایک بار شمیم کو شادی سے پہلے دیکھنا چاہتا تھا۔ اُسے سامنے بٹھا کر اُس کی صورت یوں آنکھوں میں بھر لینا چاہتا تھا کہ برسوں وہ اُس کے ذہن پر نقش رہے۔

راتوں میں ڈھولک بجتی رہی، قہقہے گونجتے رہے اور وہ ماہئ بے آب کی طرح اپنے

بستر پر تڑپتا رہا۔ پھر مہندی کی رات آ گئی۔ ''مہندی اور میکے کے گھر سے جدائی'' کے
گیت گائے گئے۔ اپنے تاریک کمرے میں لیٹا اسد یہ گیت سنتا رہا اور اُس کی آنکھوں
سے آتشیں سیال بہتا رہا۔ مصیبت تو یہ تھی کہ وہ کسی تاریک گوشے میں سمٹ کر زیادہ دیر
آنسو بھی نہیں بہا سکتا تھا۔ اُس پر ذمہ داریاں تھیں۔ کبھی ابا جان بلانے آ جاتے تھے،
کبھی چچا یا چچی کی آواز پڑ جاتی تھی۔ اب پھر اُسے بلایا گیا تھا کہ ساہیوال سے چند
مہمان آئے تھے۔ اسد شادی والے گھر میں داخل ہوا۔ اُس نے زرد رو شمیم کو زرد
جوڑے میں ملبوس دیکھا۔ وہ عورتوں کے جھرمٹ میں سر جھکائے بیٹھی تھی، اُس سے
ہزاروں میل دُور...... وہ کیوں اتنی جلدی اتنی دُور چلی گئی تھی؟ اسد کے دل میں برسوں
سے بیٹھے ہوئے چور جذبے نے اُس کے ساتھ اتنا بڑا دھوکہ کیوں کیا تھا...... شمیم اس
زرنگار کرسی پر بیٹھی تھی جو آج صبح ہی اسد اُس کے لئے شیخوپورہ سے لے کر آیا تھا۔ گڑیا
سی لگ رہی تھی وہ۔ اسد کے دل میں آیا کہ جہاں اتنے ستم سہے ہیں، وہاں وہ ایک ستم
اور ضرور سہے گا۔ وہ شمیم کو دُلہن بنے ہوئے دیکھے گا۔

اگلے روز دوپہر کو برات آنا تھی۔ وہ ساری رات اور اگلا دن بھی انتظامات کرتے
ہوئے گزر گیا۔ اسد کا جسم تھکن اور دل غم سے نڈھال تھا۔ اُس نے فلموں اور ڈراموں
میں کئی مرتبہ دیکھا تھا کہ ہیرو اپنی محبوبہ کی شادی پر دل فگار پھرتا ہے اور ہنسی کے پیچھے
اپنے آنسو چھپا کر تقریب میں حصہ لیتا ہے۔ لیکن اب وہ دیکھ رہا تھا کہ حقیقت میں یہ
کام کتنا مشکل ہوتا ہے۔

برات تین بجے کے لگ بھگ پہنچی۔ آتش بازی اور دھماکوں سے قرب و جوار لرز
اُٹھے۔ باجوں کا شور، دیگوں کی کھنکناہٹ، براتیوں کے قہقہے، گاڑیوں کے ہارن اور اس
سارے شور میں بہت آگے کسی کمرے میں عورتوں اور بچوں کے ہجوم میں بیٹھی ہوئی
شمیم...... وہ اُسے سوچتا رہا اور اپنے اندر ہی اندر مسمار ہوتا رہا۔

اُس نے شمیم کے دُلہا کو دیکھا، وہ گورا چٹا نوجوان تھا۔ قد کاٹھ اچھا تھا، جسم تھوڑا سا
چربیلا تھا۔ اُس کی ٹھوڑی پر ٹیپ سے چھوٹی سی پٹی چپکی ہوئی تھی۔ ایک رُخسار پر ہلکا سا
نیل بھی تھا۔ معلوم ہوا کہ اپنی مہندی کے روز وہ سیڑھیوں سے پھسل گیا تھا...... مشروبات
سے مہمانوں کی تواضع کی گئی۔ اس کے بعد رسم نکاح ہوئی، نکاح کے بعد کھانا، کھانے

کے بعد رسومات شیشہ دکھائی...... جوتا چھپائی، واگ پھڑائی اور پتہ نہیں کیا کچھ۔ زنانے
میں عورتوں اور بچوں کا اژدھام تھا اور قہقہے پر قہقہہ گونج رہا تھا۔ اسد ایک گوشے میں سمٹا
کھڑا تھا۔ وہ ایک بار...... دُلہن بنی شمیم کی صورت دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر شاید یہ بھی اُس کی
قسمت میں نہیں تھا۔ شمیم ہجوم میں یوں چھپی ہوئی تھی کہ اوجھل ہو کر رہ گئی تھی۔ اسد نے
ایک دو بار آگے جانے کی کوشش کی مگر شمیم کے سسرال کی موٹی تازی عورتوں کے حصار
نے اُس کی ایک نہیں چلنے دی۔

وہ گھبرا کر اس محفل رنگ و طرب سے نکل آیا۔ شامیانوں کے نیچے پہنچا تو وہاں بھانڈ
ہنس رہے تھے اور دوسروں کو ہنسا رہے تھے۔ یوں لگا کہ ہر طرف اسد ہی کا مذاق اُڑایا جا
رہا ہے۔ اسی کے پاگل پن پر ہنسا جا رہا ہے۔ وہ ان قہقہوں سے کہیں چھپ جانا چاہتا تھا
مگر چچا نے اُسے آواز دی۔

''اسد! بس کے ڈرائیور اور کنڈیکٹر کو کھانا پہنچا دیا ہے؟''

''جی چچا......'' اُس نے گلوگیر آواز میں کہا۔

''بس اب تیاری کرو۔ اُن سے کہو کہ بس ذرا نزدیک لے آئیں۔ تم عبداللہ اور نذیر
کے ساتھ مل کر سامان وغیرہ بس پر لدواؤ۔''

''جی چچا......''

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''جی ہاں چچا! بالکل ٹھیک ہوں۔'' اُس نے کہا۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ چچا سے
لپٹ جائے اور اتنا روئے کہ آنکھیں بھی آنسوؤں کے ساتھ بہہ جائیں۔

چچا نے اُس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتا ہوں تم پرسوں سے مسلسل کام کر
رہے ہو۔ بہت تھک چکے ہو۔ بس بیٹا! اب تھوڑی سی تکلیف باقی رہ گئی ہے۔''

چچا برتن دھونے والوں کی طرف چلے گئے۔ وہ سوچنے لگا، ہاں بس تھوڑی سی تکلیف
باقی رہ گئی ہے۔ بس پھانسی گھاٹ تک ایک بے بس انسان کا تھوڑا سا سفر ہے...... بجھنے
سے پہلے چراغ کی تھوڑی سی تڑپ ہے......

وہ عبداللہ اور نذیر وغیرہ کے ساتھ مل کر اٹیچی کیس، بستر اور اسی طرح کی دوسری
اشیا، بس میں رکھنے لگا۔ اس دوران میں ابا جان کی آواز آئی۔ وہ پکار کر کہہ رہے تھے۔

"آ جاؤ بھئی لڑکو! کھانا کھالو تم بھی۔"

خاندان کے وہ لڑکے اور دیگر افراد جو برات کو کھلانے پلانے میں لگے ہوئے تھے ابھی تک بھوکے تھے۔ آخر میں اُن کے لئے کھانا لگایا گیا تھا۔ عبداللہ، اسد کو کھینچ تان کر کھانے تک لے گیا۔ اُس سے ایک لقمہ تک نہیں لیا جا رہا تھا مگر دوسروں کو دکھانے کے لئے کچھ نہ کچھ کھانا بھی ضروری تھا۔ بس اب اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ یہ سب کچھ جلدی سے ختم ہو جائے۔ مگر رسمیں تھیں کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔ دودھ پلائی پر جھگڑا چل رہا تھا۔ گھر کے اندر سے بار بار لڑکیوں کے قہقہے سنائی دیتے تھے اور ساتھ ہی ہوٹنگ کے انداز میں ہوہو کی آوازیں آتی تھیں۔

آخر وقتِ رخصت آ ہی گیا...... براتیوں میں ہلچل نظر آئی۔ بس کی سواریاں بس کی طرف اور کاروں والے کاروں کی طرف بڑھے۔ اسد نے گھر کے صحن میں کھڑے ہو کر دیکھا۔ شمیم ایک ایک سہیلی سے گلے مل رہی تھی۔ پھر وہ نازو، چچی اور امی وغیرہ سے ملی۔ وہ مسلسل رو رہی تھی۔ اُس کی شکل نظر نہیں آ رہی تھی لیکن اُس کا ہچکولے کھاتا سرخ لباس اُس کی ہچکیوں کی نشاندہی کر رہا تھا۔ آج وہ مرکزِ نگاہ تھی۔ ابھی اسد کی قسمت مین ایک اور دُکھ بھی لکھا تھا...... شمیم کو ڈولی یعنی گل پوش کار کی طرف لے جانے کا مرحلہ آیا تو ابا جان نے اُسے کہا۔ "اسد! چلو شمیم کو گاڑی میں بٹھاؤ۔"

اُس نے بڑی بے بسی سے ابا جان کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ اس قدر مصروف تھے کہ بیٹے کی بے بس نگاہوں کی بے چارگی نہ دیکھ سکے۔ "آگے بڑھو بیٹا!" اُنہوں نے اسد کا کندھا تھپکا۔ امی نے بھی اشارے سے اُسے دُلہن کی طرف بلایا۔ اُس کے قدم منوں بھاری ہو گئے تھے۔ وہ کہیں بھاگ جانا چاہتا تھا۔ مگر اُس کے پاؤں میں وزنی زنجیریں تھیں۔ وہ ان زنجیروں کو گھسیٹتا ہوا شمیم کی طرف بڑھا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ شمیم کے قریب پہنچا۔ چچی نے شمیم کو تھوڑا سا دھکیل کر اسد کے ساتھ لگا دیا۔ وہ خوشبو میں لپٹی ہوئی گٹھڑی سی تھی...... اُس کے سرخ کامدار جوڑے کا سخت لمس اسد نے اپنے بازو اور سینے پر محسوس کیا، وہ کانپ رہی تھی اور ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے اسد کا دل چاہا کہ اُسے اتنی زور کا تھپڑ رسید کرے کہ وہ اُچھل کر دُور جا گرے۔ مگر اگلے لمحے اُسے اُس پر ترس آیا۔ اُس نے اپنا بازو اُس کے کندھے کے اُوپر سے گزار کر اُسے

اپنے ساتھ لگایا اور آہستہ آہستہ چلاتا ہوا گل پوش گاڑی کی طرف بڑھا۔ اُس کے اردگرد سسکیوں کی سرسراہٹ تھی۔ آنچلوں کے گوشوں سے آنکھیں پونچھی جا رہی تھیں۔ ایک لڑکی بابل کا گھر چھوڑ کر دُور دیس جا رہی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر براتی جو دُلہا کا کوئی قریبی تھا بڑے جوش کے عالم میں دُلہا دُلہن پر سکے نچھاور کر رہا تھا۔ قصبے کے بچے بالے ان سکوں پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔

بینڈ والوں نے دُھن بجانا شروع کر دی تھی۔

بابل کی دُعائیں لیتی جا، جا تجھ کو سکھی سنسار ملے
میکے کی کبھی نہ یاد آئے سسرال میں اتنا پیار ملے۔

اور وہ سسرال چلی گئی......

شاد پور اُداس اور ویران رہ گیا۔ گلیاں سونی ہو گئیں، آسمان پر ستاروں کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ اُس رات ایک تاریک گوشے میں پہنچتے ہی اسد کے ضبط کے بند ٹوٹ گئے۔ وہ جو تقریباً 72 گھنٹے سے مسلسل کام میں جتا ہوا تھا، تنہائی اور فراغت ملتے ہی یوں پھوٹ پھوٹ کر رویا کہ جل تھل ہو گیا۔

○

اگلے روز ولیمہ تھا۔ اُن لوگوں کو صبح نو بجے کے قریب شاد پور سے براستہ لاہور ساہیوال کے لئے روانہ ہونا تھا۔ مگر ابھی نو نہیں بجے تھے کہ ساہیوال سے شمیم کے سسرالیوں کا فون آ گیا۔ اس فون کے ذریعے ایک ناخوشگوار خبر ملی۔ پتہ چلا کہ دُلہا کو ساہیوال کے راستے میں ہی شدید بخار ہو گیا تھا۔ گھر پہنچنے کے ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی اُس کی طبیعت مزید بگڑ گئی اور نیم بے ہوشی طاری ہو گئی۔ اُسے فوراً ہسپتال پہنچانا پڑا، لہٰذا ولیمہ فی الحال ملتوی کر دیا گیا ہے۔

اس خبر نے سب کو پریشان کر دیا۔ چچی اور چچا جان فوراً ساہیوال جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ ابا جان بھی ساتھ جانا چاہتے تھے مگر چچا نے اُنہیں منع کر دیا۔ سہ پہر کے وقت ساہیوال سے اسد کے ایک ننھیالی رشتے دار کا فون آیا۔ اُس نے شمیم کے دُلہا شفیق کی بیماری کی تصدیق کی۔ تاہم بتایا کہ راستے میں شفیق بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ بلکہ گھر پہنچنے تک بالکل ٹھیک تھا۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، گھر پہنچنے کے بعد ہوا ہے۔

معاملہ کچھ اُلجھا ہوا سا لگتا تھا۔ شفیق جس وقت شمیم کو بیاہنے آیا اُس وقت بھی اُس کے چہرے پر چوٹوں کے نشان موجود تھے۔ شاید چہرے کے علاوہ بھی کہیں چوٹیں آئی ہوں۔

اگلے روز دوپہر سے پہلے چچا کا نوکر ارشاد جو چچا کے ساتھ ہی ساہیوال گیا تھا واپس آ گیا۔ وہ کچھ خاموش خاموش تھا۔ اُس نے بتایا کہ شفیق احمد ابھی تک ہسپتال میں ہے۔ ارشاد علی کی باتوں سے انکشاف ہوا کہ شمیم کے دُلہا کو کوئی دورہ وغیرہ پڑا تھا۔ وہ ابھی تک ہسپتال کے انتہائی نگہداشت وارڈ میں ہے۔

شفیق کی بیماری کے حوالے سے شمیم کے سسرالیوں نے پراسرار خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ دو تین دن بعد چچا چچی بھی قصبے میں واپس آ گئے۔ وہ بھی اس سلسلے میں بہت مختصر بات ہی کر رہے تھے۔ بہرحال اس طرح کی بات ایک بار نکل جائے تو پھر چھپتی نہیں ہے۔ جلد ہی سب کو معلوم ہو گیا کہ شمیم کے دُلہا کو اس سے پہلے بھی دماغی دورے پڑتے رہے ہیں۔ اُس کی بیماری کو چچا چچی اور دیگر لوگوں سے چھپایا گیا تھا۔ اپنی برات سے ایک روز پہلے بھی شفیق اسی دورے کے سبب گرا تھا اور بے ہوش ہوا تھا۔ بعدازاں جب وہ لوگ اگلے روز دُلہن کو لے کر واپس ساہیوال پہنچے تو پہنچتے ساتھ ہی شفیق کو پھر دورہ پڑا۔ اس دفعہ یہ کافی شدید تھا۔ وہ بے ہوش ہو کر ہسپتال پہنچ گیا۔

چچا چچی نے شمیم کو اپنے ساتھ لانا چاہا تھا مگر اُس کے سسر کی دلی خواہش تھی کہ شمیم اپنے بیمار شوہر کے پاس رہے۔ خود شمیم نے بھی یہی کہا تھا کہ اس کا جانا مناسب نہیں۔

اگلے چند روز میں اس حوالے سے اور کئی باتیں ان لوگوں کو معلوم ہوئیں۔ پتہ چلا کہ شفیق کو سایہ وغیرہ ہے۔ وہ دو تین سالوں سے ایب نارمل روّیے کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اُس کے گھر والے پہلے تو اُسے عاملوں اور پیروں فقیروں کو دکھاتے رہے، پھر ڈاکٹری علاج کی طرف آ گئے۔ اس دوران میں شفیق نشہ بھی کرنے لگا تھا۔ ڈاکٹروں نے پہلے تو بہت کوشش کر کے اُس کا نشہ چھڑوایا، پھر اُس کے دماغی دوروں کا علاج شروع ہوا۔ ایک ماہر نے رائے دی کہ بچے کی شادی کر دی جائے۔ اس ماہر کے مشوروں کا آخری نتیجہ یہ نکلا تھا کہ دماغی مریض شفیق احمد ولد شفیع محمد کی برات شاد پور پہنچی تھی اور اسد کے سینے سے دل نکال کر لے گئی تھی۔

اس دھوکہ دہی پر چچی نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔ چچا بھی سخت آزردہ خاطر تھے۔

مگر بیٹی دی ہوئی تھی، کر کیا سکتے تھے؟ شمیم کے ساس سسر مسلسل تسلیاں دے رہے تھے کہ ان کے بیٹے کو سر درد اور غشی کی عام سی تکلیف ہے، بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ یہ بات بھی ماننے کو تیار نہیں تھے کہ شفیق کو یہ تکلیف پہلے سے تھی۔

شمیم کئی دن گزرنے کے باوجود اپنے سسرال میں ہی تھی۔ چچی چچا دو بار جا کر اُس سے مل چکے تھے۔ ایک بار نازو بھی ساتھ گئی تھی۔ شفیق بدستور ہسپتال میں تھا۔ کچھ افراد کی موجودگی میں وہ پُرسکون رہتا تھا مگر عجیب بات تھی کہ کچھ افراد کی موجودگی میں وہ ایک دم چیخنا چلانا شروع کر دیتا تھا۔ ان میں اُس کی نوبیاہتا بیوی شمیم بھی تھی۔ لہٰذا شمیم ایک دو بار سے زیادہ اُس سے نہیں ملی تھی۔ وہ گھر میں ہی رہتی تھی۔

اسد کے دل و دماغ کی حالت اُن دنوں عجیب تھی۔ شمیم کے بغیر اُسے اپنی زندگی ایک ایسے فریم کی طرح محسوس ہوتی تھی جس میں سے کوئی تصویر نکال کر لے گیا ہو۔ ہنستا بستا قصبہ شاد پور ایک دم لق و دق صحرا بن گیا تھا۔ شمیم کو گئے مہینہ ہونے کو آیا تھا مگر اُس کی آواز، اُس کے قہقہے ابھی تک اسد کو آس پاس گونجتے محسوس ہوتے تھے۔ صحن میں آم کا پیڑ اُداس تھا، اُس کی چھاؤں اُداس تھی...... اور کیا کیا اُداس نہیں تھا، کھیت، گلیاں، رہٹ، ڈیرے سب اُداس...... صبح کو پرندے اُداس اور مویشیوں کی گھنٹیوں کی آواز اُداس...... دوپہروں کو پیڑوں کے سائے اُداس اور کھیتوں کی پگڈنڈیاں اُداس...... شام کو سرخ کناروں والے بادل اُداس اور دھیرے دھیرے پھیلتا اندھیرا اُداس...... رات کو چاند، تارے، شبنم اور چکور کی آواز سب اُداس...... یہ کیسی اُداسی تھی جو شاد پور کی ہر جاندار اور بے جان چیز میں سرایت کر گئی تھی؟

وہ چھت پر چلا جاتا اور اُس خالی خالی آنگن کو دیکھتا جہاں شمیم ہر وقت چوکڑیاں بھرتی نظر آتی تھی۔ وہ ہواؤں میں اُس کی خوشبو محسوس کرتا اور اُس کی باتوں کی بازگشت سنتا تھا۔ دروازے پر آہٹ ہوتی تو اُسے یوں لگتا کہ شمیم آئی ہے۔ قصبے کی خاک اُڑاتی گلیوں سے گزرتے ہوئے اُسے کئی بار شبہ ہوا کہ اُس کے آگے آگے جانے والی لڑکی شمیم ہے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ وہ اس آس کے سہارے سارا سارا دن کھیتوں مین پھرتا رہا کہ جب شام کو وہ گھر واپس جائے گا تو نازو بھاگ کر آئے گی اور اُسے بتائے گی کہ باجی آئی ہیں۔ اُداس شاموں میں وہ چھوٹی نہر کے کنارے گھاس پر جا لیٹتا اور اُس سرخی

مائل پانی کی طرف دیکھتا رہتا جو شمال سے جنوب کی طرف بہتا تھا۔ جنوب جس طرف لاہور تھا...... اور ساہیوال تھا...... اور اُس کی زندگی تھی۔ اُس کے دل میں آتا وہ اپنے اندر کی ساری وحشت، اذیت اور محرومی ایک کاغذ پر لکھ کر اُسے کاغذ ہی کی ایک ناؤ میں رکھے اور جنوب کی طرف بہتے پانیوں کے حوالے کر دے۔ پھر یہ خط بے وفا شمیم تک پہنچے۔ وہ اُسے پڑھے اور جانے کہ اسد پر کیا بیت رہی ہے۔

کسی وقت وہ بڑے درد کے عالم میں سوچتا، کیا یہاں سے جانے کے بعد کبھی شمیم نے بھی اُسے یاد کیا ہوگا؟ اُس نے بھی کبھی شاد پور کی گلیوں میں رینگتی ہوئی زرد اُداس دُھوپ کے بارے میں سوچا ہوگا؟ اور اس درد بھری ہوا کے بارے میں سوچا ہوگا جو اس موسم میں شام کے بعد شمال سے جنوب کی طرف چلتی تھی...... ایک دن شام کو وہ گھر آیا تو چچی اپنے داماد کی صحت یابی کے لئے سورۃ یٰسین پڑھوا رہی تھیں۔ محلے کی اور کچھ رشتے دار خواتین سفید چادروں پر بیٹھی پڑھائی میں مصروف تھیں۔ امی کے مجبور کرنے پر اسد بھی چچا کے گھر چلا گیا اور سورۃ پڑھنے لگا۔ پڑھتے پڑھتے اُس نے اپنے دل میں جھانکا اور ایک دم کانپ گیا۔ وہ کس قدر منافقت کا مظاہرہ کر رہا تھا...... وہ بظاہر چچی کے داماد کی صحت یابی کے لئے ایک عمل کر رہا تھا مگر اُس کے سینے میں یہ خواہش دبی ہوئی تھی کہ وہ شخص مر جائے جس سے شمیم منسوب ہوئی ہے۔ اسد کو محسوس ہوا کہ پچھلے کئی ہفتوں سے وہ چپکے چپکے یہ خواہش کرتا رہا ہے کہ ساہیوال کے کسی ہسپتال میں لیٹا ہوا اُس کا رقیب کبھی صحت یاب نہ ہو۔ اپنے دل کی کیفیت جان کر وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا کہ اب اُس کے نزدیک وہ عمل بیکار تھا جو وہ کر رہا تھا......

اگلے روز دوپہر کے وقت خبر آئی کہ ہسپتال میں شفیق کی حالت ٹھیک نہیں......

شام چھ بجے پتہ چلا کہ وہ انتقال کر گیا ہے......!

○

شفیق کی آخری رسومات میں شرکت کے لئے وہ سب ساہیوال گئے تھے۔ قُل کے بعد وہ شمیم کو لے کر واپس آ گئے۔ شمیم اس سانحے پر سوگوار تو تھی مگر غم و اندوہ کی کوئی شدید کیفیت اُس پر طاری نہیں تھی۔ وجہ یہی تھی کہ اپنے شوہر سے میل ملاقات کا اُسے موقع ہی نہیں ملا تھا۔ وہ ہسپتال میں اُس کی تیمارداری بھی نہیں کر سکی تھی کیونکہ وہ اُسے دیکھتے

ہی چیخنا چلانا شروع کر دیتا تھا۔ اسد نے شمیم کو دیکھا تھا۔ وہ بالکل ویسی ہی تھی جیسے پہلے تھی۔ بس پہلے سے تھوڑی سی کمزور ہو گئی تھی۔

مہینہ ڈیڑھ مہینہ سوگواری سی کیفیت میں گزر گیا۔ پھر دھیرے دھیرے حالات معمول پر آنے لگے۔ شادی کے موقع پر لڑکی کے سسرال میں اس قسم کا سانحہ پیش آ جائے تو عموماً لڑکی کو بدقسمت اور منحوس قرار دینے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مگر شمیم کے حوالے سے ایسی کوئی بات کسی کی زبان پر آئی اور نہ کسی نے دل میں محسوس کی۔ حقیقت سب پر عیاں تھی۔ لڑکا پہلے سے شدید بیمار تھا۔ اُس کے والدین نے شمیم کے والدین کو اندھیرے میں رکھ کر اپنے بچے کے مرض کا چارہ ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ اپنی اولاد کی بہتری کا سوچتے ہوئے یہ خیال نہیں کیا تھا کہ وہ کسی دوسرے کی اولاد کو شدید نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اولاد کے حوالے سے یہ مطلب پرستی تو انسان میں ہمیشہ سے رہی ہے۔ نجانے کیوں اسد کے ذہن میں کچھ عرصہ پہلے کا ایک واقعہ آ گیا۔ وہ لاہور میں تھا اور اپنی پسندیدہ ترین جگہ پر یعنی یونیورسٹی اولڈ کیمپس کی گراؤنڈ پر...... وہاں وہ جنگلے کے ساتھ کھڑا ایک میچ شروع ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ سکول ٹائم تھا۔ ایک گاڑی بڑی تیز رفتاری سے آئی اور اُس نے سکول کے ایک بچے کو سڑک پار کرتے ہوئے کچل دیا۔ بچہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ بعد ازاں پتہ چلا کہ بچے کو کچلنے والی کار کے اندر بھی سکول کا ایک بچہ ہی تھا جسے اُس کا باپ بروقت سکول پہنچانا چاہتا تھا۔ یعنی اُس نے اپنے بچے کو وقت پر سکول پہنچانے کے لئے کسی اور کے بچے کو بے وقت موت سے دوچار کر دیا۔

شمیم کی عدت پوری ہونے سے پہلے ہی اُس کے لئے ایک رشتہ آ گیا تھا۔ یہ لوگ بھی اسد اور شمیم کے خاندان میں سے تھے۔ لڑکا بنک ملازم تھا۔ شکل و صورت بھی ٹھیک تھی۔ یہ لوگ کوئٹہ میں مقیم تھے۔ چچی چچا نے ابتداء میں ہی اس رشتے کو ناپسند کر دیا...... ایک تو شمیم اتنی جلدی کسی نئی جذباتی ہلچل کا شکار ہونا نہیں چاہتی تھی، دوسرے چچی چچا بھی شمیم کو اتنی دور اور اتنے ہجوم میں بھیجنے کے حق میں نہیں تھے۔ ہجوم سے مراد یہ کہ لڑکے کی چار بن بیاہی بہنیں اور چار بھائی تھے۔

یہ رشتہ جس تیزی سے مسترد ہوا تھا اس میں اسد کے لئے اُمید کی ایک ہلکی سی کرن موجود تھی۔ خاص طور سے یہ اطلاع اُس کے لئے اُمید کا عکس تھی کہ شمیم نے امی کو دو

ٹوک لہجے میں کہا تھا کہ وہ اُس کے بارے میں کسی سے کوئی بات نہ کریں۔ وقت مرہم ہوتا ہے۔ یہ مرہم بھی بڑی تیزی سے شمیم کے زخم کو مندمل کر رہا تھا۔ سردیوں کے دن تھے۔ سردیوں کے آغاز میں اسد کی والدہ اکثر بیمار ہو جایا کرتی تھیں۔ اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ ایک روز اسد کالج سے گھر آیا تو اُس نے شمیم کو تندہی سے گھر کے کام کاج کرتے دیکھا۔ اُس نے آستینیں اُڑسی ہوئی تھیں۔ اُس کی گوری گوری نہایت خوبصورت بانہیں کہنیوں سے اُوپر تک عریاں تھیں۔

''السلام علیکم۔'' شمیم کی سنجیدہ آواز اُس کے کانوں میں پڑی تو وہ چونک گیا۔

''وعلیکم السلام۔'' اُس نے کہا اور کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اُن دونوں میں بہت کم بات ہوتی تھی۔ اور جب ہوتی تھی دوحرفی ہوتی تھی۔ نہا کر اسد نے کپڑے بدلے اور کمرے میں واپس آ گیا۔ کھانا سامنے میز پر دھرا تھا۔ اُس کی پسندیدہ چیز تھی، آلو قیمہ اور تنور کی روٹی۔ سالن کی رنگت دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ شمیم نے پکایا ہے۔ وہ کھانے بیٹھا تو وہ پانی لے کر آ گئی۔ اسد کا خیال تھا کہ وہ چلی جائے گی۔ مگر وہ کھڑی رہی۔ پھر ایک گہری سانس لے کر دروازے کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔ یہ وہی کرسی تھی جس پر بیٹھ کر شمیم نے ایک روز اُسے یادگار توہین سے دوچار کیا تھا۔ وہ اُسے اپنے قریب بلاتا رہا تھا اور وہ چلی گئی تھی۔

کچھ دیر کمرے میں گہری خاموشی رہی۔ بس اسد کے نوالہ چبانے کی مدہم آواز کمرے میں گونجتی رہی۔ علی چچا کے گھر گیا ہوا تھا۔ امی دوائی کے زیر اثر سرِشام ہی سو گئی تھیں۔ شمیم نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

''اسد! تم کرکٹ کھیلنے کیوں نہیں جاتے؟''

''میں نے بہت کچھ چھوڑ دیا ہے۔ ان میں کرکٹ بھی شامل ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم نے ابھی تک مجھے معاف نہیں کیا ہے۔''

''نہیں کر سکتا۔''

''کیوں؟''

''تم نے نہ مٹنے والا غم دیا ہے۔ بڑی بے رحمی اور سفاکی سے مجھے دھتکارا ہے۔''

''میں مر کر بھی ایسا نہیں کر سکتی۔ سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''لیکن تم نے کیا ہے۔ تم نے ایک بار...... صرف ایک بار بھی میرے حق میں آواز نہ اُٹھائی۔ بڑی خاموشی سے پھولوں والی گاڑی میں بیٹھ گئیں تم۔''

چند لمحے گمبھیر خاموشی طاری رہی، پھر شمیم نے کہا۔ ''تم سب جانتے ہو اسد...... اُس وقت میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔''

''یاد ہے شمیم! اسی کرسی پر بیٹھ کر تم نے میرے منہ پر جوتا مارا تھا۔ میں منت کرتا رہا تھا لیکن تم اُٹھ کر چلی گئی تھیں۔''

''اب ان باتوں سے کیا فائدہ اسد؟ اب کچھ باقی نہیں بچا...... میں تو......''

''میری بات کا جواب دو!'' اسد نے تیزی سے اُس کی بات کاٹی۔ ''تم نے اسی جگہ بیٹھ کر میری بے بسی کا مذاق اُڑایا تھا نا...... اُٹھ کر چلی گئی تھیں نا؟''

شمیم نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری، کچھ دیر فرش کو گھورتی رہی، پھر بولی۔ ''اُس وقت کچھ بھی میرے بس میں نہیں تھا اسد۔''

ایک دم اسد کے دل و دماغ کو ایک نئے خیال نے جھنجھوڑا۔ ایک بات جیسے خود بخود ہی اُس کی زبان پر آ گئی۔ ''اب تو سب کچھ تمہارے بس میں ہے نا؟''

یہ الفاظ ایک چھناکے کی طرح کمرے میں گونجے۔ اس چھناکے کی مہیب گونج اسد نے شمیم کے چہرے سے لے کر اپنے دل کی گہرائی تک ہر جگہ محسوس کی۔

شمیم کی لرزاں پلکیں اُٹھ کر پھر جھک گئیں۔ وہ کسی کنوئیں کی گہرائی سے آتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''یہ اب بھی میرے بس میں نہیں ہے۔'' دو آنسو اُس کی پلکوں سے جدا ہو کر اُس کی آغوش میں گرے اور وہ تیزی سے اُٹھ کر باہر چلی گئی۔

اگلے دو تین روز اسد نے بڑے کرب کے عالم میں گزارے۔ سارے زخم پھر سے چھل گئے تھے اور خون اُگل رہے تھے۔ اپنی توہین کا احساس یوں اُس کے دل و دماغ پر چھایا تھا کہ ایک اسموک سکرین بن کر رہ گیا تھا۔ اس سکرین کے آر پار اُسے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ خنک اندھیرے میں رات کو دیر تک چھت پر ٹہلتا رہا۔ چھت سے اُسے وہ کمرہ نظر آتا تھا جہاں شمیم بیٹھ کر پڑھتی تھی۔ جب اُس کی شادی ہوئی وہ ایف اے کا امتحان دینے والی تھی۔ اب اُس نے پھر سے ایف اے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ کھڑکی کے پردے عموماً کھسکے رہتے تھے۔ اس کھڑکی میں سے شمیم کا روشن سراپا اسد کو نظر

آتا تو اُس کے سینے میں دہکتے ہوئے انگارے کچھ اور بھی اذیت دینے لگتے۔ وہ اب پہلے سے بھی کچھ زیادہ پُرکشش نظر آنے لگی تھی۔ سنجیدگی اور ملال نے اُس کے خدوخال کو عجیب سی حلاوت بخش دی تھی۔ اپنے بالوں کو پونی ٹیل سے باندھ کر وہ ٹیبل لیمپ کے سامنے جھک جاتی اور کتاب میں محو ہو جاتی۔ ایسے میں اُس کے بالوں کی درازلٹیں اُس کے چہرے پر جھولتیں۔ اُس کے چہرے اور بدن کا جو حصہ لیمپ کی تیز روشنی کی زد میں آتا، ہیرے کی طرح جگمگاتا محسوس ہوتا۔

شاید وہ چھت پر اسد کی چہل قدمی کے بارے میں جان گئی تھی۔ دو دن بعد وہ تھوڑا سا رُخ پھیر کر بیٹھنے لگی۔ اب اسد اُس کا پورا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا، فقط اُس کے رُخسار کی اُبھری ہوئی ہڈی، اُس کا کان اور اُس کی گردن کا تھوڑا سا حصہ اسد کی نگاہ میں رہتا تھا۔ لیکن ایسی بات تھی تو وہ کھڑکی کا پردہ مرمت کر کے کھڑکی کو ''نظر پروف'' بنا سکتی تھی۔ مگر وہ ایسا بھی نہیں کر رہی تھی۔ یعنی ''صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں''...... ایسے میں عبداللہ کی بات اُس کی سماعت میں بازگشت بن کر گونجنے لگی۔ وہ کہتا تھا، لڑکی کے دل میں کچھ بھی ہو زبان پر ''نہ'' ہی رہتی ہے۔ عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ اُس کی ہر ''نہ'' میں دس ہاں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ کامیاب وہی ہوتا ہے جو آگے بڑھ کر ''دس ہاں'' کا نظارہ کر لیتا ہے۔

ایک رات وہ برساتی میں لیٹا ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ ہلکی ہوا چل رہی تھی اور ساتھ میں پھوار سی پڑ رہی تھی۔ یکایک اسد کو اپنے کانوں میں ایک سرسراہٹ سی محسوس ہوئی، جیسے کوئی اُس کے کان میں سرگوشی کرنا چاہتا ہو...... پھر سچ مچ سرگوشی اُس کے کانوں میں گونجی۔ کوئی اُس سے مخاطب تھا، لیکن اِردگرد کوئی نہیں تھا... ایک دم خوف کی ایک لہر اسد کے رگ وپے میں پھیل گئی۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا مگر الفاظ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ ایسی سرگوشی اسد کے کانوں میں گونجی تھی۔ پہلے بھی کئی مرتبہ ایسا ہو چکا تھا۔ ایک غیر مرئی آواز اُسے سنائی دیتی تھی۔ کبھی الفاظ سمجھ میں نہیں آتے تھے اور کبھی آ جاتے تھے...... شروع میں تو اسد نے اُسے یکسر اپنا وہم خیال کیا تھا۔ لیکن تین چار بار کے تجربے کے بعد اُسے یقین آنے لگا تھا...... میں تمہارا ہمدرد ہوں...... میں تمہارا خیر خواہ ہوں...... میں تمہیں صحیح مشورہ دُوں گا...... یہ ''آواز'' اس قسم کے فقرے ادا

کرتی تھی۔

اسد توہم پرست نہیں تھا، نہ ہی جاہل تھا۔ تعویذ گنڈوں اور جھاڑ پھونک جیسے کاموں پر بھی اُسے زیادہ یقین نہیں تھا۔ وہ زندگی کا حقیقی اور ٹھوس رُخ دیکھنے کا عادی تھا...... لیکن ہوا میں سرسراتی ہوئی یہ سرگوشی اُس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

جب کبھی چار چھ ماہ بعد یہ سرگوشی سنائی دیتی تھی، اسد کئی دن تک سخت ڈسٹرب رہتا تھا۔ اس بارے میں گہرائی سے سوچتا رہتا تھا۔ اُس نے اپنے دوست نذیر احمد سے سنا تھا کہ ''شیزوفرینیا'' ایک نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے۔ اس میں بندے کو اکثر ایسی آہٹیں یا آوازیں سنائی دیتی ہیں جو حقیقت میں موجود نہیں ہوتیں۔ اگر کسی نفسیاتی ماہر سے مشورہ کیا جائے تو وہ اس کیفیت کو کنٹرول کر سکتا ہے۔ اسد سوچتا تھا کہ شاید وہ بھی کسی ایسی ہی کیفیت کا شکار ہے۔ اُس نے نذیر احمد کو تو کچھ نہیں بتایا تھا لیکن اپنے لنگوٹیے عبداللہ سے ایک دو بار اپنی اس پریشانی کا ذکر کیا تھا...... اُس رات بھی یہ ناقابلِ فہم سرگوشی سننے کے بعد اسد کافی دیر تک ڈسٹرب رہا۔ سرگوشی کے آخری الفاظ اُس نے کافی وضاحت سے سنے تھے۔ وہ الفاظ اس طرح تھے۔ ''اپنے ارادوں پر مضبوط رہو۔ اپنا سر اُونچا رکھو۔ اپنے ارادوں پر مضبوط رہو۔ اپنا سر اُونچا رکھو۔'' یہ الفاظ کئی مرتبہ دُہرائے گئے تھے۔

یہ جو کچھ تھا ILLUSION نہیں تھا، ٹھوس حقیقت تھا۔ تاہم ان الفاظ کا سیاق و سباق اسد کی سمجھ سے بالا تھا۔ وہ اس واقعے کے بعد حسبِ معمول تین چار روز تک سخت ڈسٹرب رہا۔ تاہم پھر بتدریج معمول پر آ گیا اور ایک بار پھر شمیم کا دُکھ کالے دُھوئیں کی طرح اُس کے سینے میں بھرنے لگا۔

ایک رات چھت پر ٹہلتے ٹہلتے سب کچھ اسد کے بس سے باہر ہو گیا۔ اُس نے سوچا وہ کیوں اس طرح مجنوں بن کر دُور دُور سے شمیم کا دیدار کر رہا ہے؟ آخر وہ اُس کی چچا زاد ہے، وہ ایک ہی گھر میں پلے بڑھے ہیں۔ اُس سے ملنے اور کھل کر بات کرنے میں کیا چیز مانع ہو سکتی ہے؟ وہ اپنی چھت سے چچا کی چھت پر چلا گیا۔ وہاں سے شیڈ پر اُترا اور پھر ایک ایئر کولر کے اُوپر پاؤں دھرتا ہوا صحن میں آ گیا۔ اُس نے چچا کے گھر کے بیرونی دروازے کی کنڈی کھول دی تاکہ اگر کوئی اُسے گھر میں دیکھ ہی لے تو یہی سمجھے کہ وہ دروازے کے راستے ہی اندر آیا ہے۔

چند ہی لمحے بعد وہ شمیم کے سامنے اُس کے کمرے میں کھڑا تھا۔ گھر کے باقی افراد سو رہے تھے۔ صرف چچی کے کھانسنے کی آواز آ رہی تھی۔ مگر وہ چونکہ اُونچا سنتی تھیں لہٰذا اُن کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

''اسد! تم اس وقت یہاں؟'' شمیم نے سر پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے کہا۔

وہ بغیر کسی تمہید کے بولا۔ ''میں آج تم سے ایک فیصلہ کن بات کرنے آیا ہوں۔''

''مم...... میں سمجھی نہیں؟''

''تم سب کچھ سمجھتی ہو لیکن انجان بنتی ہو۔'' پھر اُس نے توقف کر کے ذرا نرم لہجے میں کہا ''شمیم! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ کچھ دیر سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ پھر بولی۔ ''اسد! خدا کے لئے مجھے میری نظروں سے نہ گراؤ...... میں اب تمہارے لائق نہیں ہوں۔ تمہیں اچھی سے اچھی بیوی مل سکتی ہے۔ میرا خیال اب چھوڑ دو......''

''میں نہیں چھوڑ سکتا، اور نہ میں چھوڑوں گا۔ میں لمبی چوڑی بات بھی نہیں کروں گا۔ دو حرفی بات تو یہ ہے کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں پہلے ہی بہت تباہ ہو چکا ہوں۔ تمہارے انکار کی صورت میں میری جو مزید تباہی ہو گی اس کی ذمہ داری صرف اور صرف تم پر ہو گی۔''

''اسد! مجھ پر رحم کرو۔ میں اس امتحان سے نہیں گزر سکوں گی۔ میں بہت ٹوٹ پھوٹ گئی ہوں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔''

''تم صاف کیوں نہیں کہہ دیتی ہو کہ زہر کھا کر یا ریل کے نیچے آ کر مر جاؤ۔''

''نہ اسد...... ایسا مت کہو۔ تمہیں پتہ نہیں میرے دل میں تمہارا کیا مقام ہے۔''

''مجھے تمہارے مکالمے نہیں چاہئیں شمیم! تمہارا اقرار چاہئے یا انکار۔''

اس ٹھٹھری ہوئی رات میں اُس کمرے کے اندر اسد اور شمیم کے درمیان ایک طویل اور گمبھیر بحث ہوئی۔ بہرحال یہ بحث بے نتیجہ نہیں تھی۔ بالآخر شمیم نے اسد کے پیہم اصرار کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ اُس نے کہا۔

''میں...... اتنا بڑا فیصلہ اکیلی کیسے کر سکتی ہوں اسد......؟''

''تم فیصلہ مت کرو...... مت کرو تم فیصلہ...... بس تم اپنی رضا مندی ظاہر کر دو۔ باقی

گھر والوں کو آمادہ کرنا میرا کام ہے۔''

''لیکن اسد!''

''پھر وہی لیکن......'' وہ غرانے والے انداز میں بولا۔ ''اب چھوڑ دو جان اس لیکن کی۔ میں نے کہا ہے نا میں سنبھال لوں گا سب کچھ۔''

''مجھے سب سے زیادہ ڈر تائی جان کا ہے۔ سب سے پہلے تم اُن سے بات کرو۔''

''ٹھیک ہے۔ میں ایک دو دن میں اُن سے بات کر لیتا ہوں۔''

اچانک دوسرے کمرے میں کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ شاید شمیم کی والدہ اندھیرے میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ چند لمحے بعد اُن کی خمار آلود آواز آئی۔ ''شمیم پتر...... شمیم!''

شمیم نے ٹھٹک کر کہا۔ ''آئی امی!'' پھر وہ اسد سے مخاطب ہوئی۔ ''پلیز اب تم جاؤ۔ کوئی اور نہ جاگ جائے۔''

''اچھا خدا حافظ......'' اسد نے کہا۔

''خدا حافظ......'' شمیم بولی۔

اسد واپس چلا گیا۔

اگلے دو روز اُس نے پہلے سے بھی زیادہ کرب میں گزارے۔ ایک مرحلہ تو طے ہو گیا تھا...... ایک طویل بحث کے بعد بالآخر شمیم نے اُس کی بات مان لی تھی۔ مگر شادی سے پہلے اسد کی جو توہین ہوئی تھی، وہ کسی پل اسد کو بھولتی نہیں تھی۔ وہ جب بھی کمرے کے گوشے میں رکھی ہوئی اُس کرسی کو دیکھتا تھا جس پر سے اُٹھ کر شمیم چلی گئی تھی، اُسے یوں لگتا تھا جیسے وہ کرسی اور اس کمرے میں رکھی ہوئی ہر چیز اس کا منہ چڑا رہی ہے۔

یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ شمیم کو اپنانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ زیادہ رُکاوٹ امی کی طرف سے ہی تھی۔ مگر اُسے یقین تھا کہ جب وہ دوٹوک بات کرے گا تو امی کو اُس کی بات مانتے ہی بنے گی۔ ممکن تھا کہ اب ابا جان بھی تھوڑے بہت معترض ہوتے۔ کیونکہ شمیم کنواری ہونے کے باوجود کنواری نہیں کہلا سکتی تھی۔ مگر اسد کو معلوم تھا کہ امی راضی ہو جائیں گی تو ابا جان بھی راضی ہو جائیں گے۔ لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ شمیم اور اسد کے درمیان توہین کا ایک لمحہ آن کھڑا ہوا تھا۔ معلوم نہیں کہ اسے توہین کہنا بھی چاہئے یا نہیں، مگر اسد کے نزدیک وہ توہین کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اگر ایک بات اسد

کے منہ سے نکل ہی گئی تھی تو شمیم اُس کی عزت رکھ لیتی۔ لیکن وہ کرسی پر ڈٹی بیٹھی رہی تھی۔ اور پھر چلی گئی تھی۔ مہینوں گزر گئے تھے مگر شمیم کے انکار کا وہ منظر ٹوٹے ہوئے شیشے کی طرح اسد کی آنکھوں میں چبھا ہوا تھا۔ اُس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اگر اُس نے توہین کے اس احساس سمیت شمیم سے شادی کر لی تو کبھی اُس کو خوشی نہیں دے سکے گا۔ اُس کی محبت میں منافقت اور مطلب پرستی کا کھوٹ ہوگا۔ اس صورت حال سے بچنے کا بس ایک ہی طریقہ تھا۔ وہ توہین کے اس احساس کو اپنے ذہن سے کھرچ دیتا...... اُسے جڑوں سے نکال کر پھینک دیتا۔ لیکن یہ کیسے ہوسکتا تھا؟ یہ اسی طرح ہوسکتا تھا کہ شمیم نے اُس کے دل پر انکار کا جو گہرا زخم لگایا تھا وہ اُس پر اقرار کا مرہم رکھتی...... یہ بہت ضروری تھا...... یہ بہت ضروری تھا۔

یہ اکتوبر نومبر کے دن تھے۔ سردی کا آغاز ہو چکا تھا۔ دیہاتی علاقوں میں تو سردی ویسے بھی جلدی زور پکڑ لیتی ہے۔ لحاف نکل آئے تھے۔ امی تو مٹی کی انگیٹھی بھی سلگانے لگی تھیں...... قصبے کے بازار میں ایک دُکان پر گاجر اور دال کا حلوہ بڑا اچھا بنتا تھا۔ عبداللہ اور اسد شام کے بعد ٹہلنے نکلتے تو اُس دُکان پر ضرور جاتے۔ راستے میں دنیا جہان کی باتیں بھی ہوتی رہتیں۔ اسد نے اپنے اور شمیم کے حوالے سے عبداللہ کو تازہ ترین صورتحال سے باخبر رکھا ہوا تھا۔ ہر بات کھول کر وہ عبداللہ سے بیان کر دیا کرتا تھا۔ عبداللہ نے اس امر پر مثبت ردِعمل کا اظہار کیا تھا کہ اسد نے شمیم سے کھل کر کہہ دیا ہے کہ وہ اُس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ تاہم عبداللہ کا خیال تھا کہ اُس کی امی اس فیصلے کی مزاحمت کریں گی۔

اسد بولا۔ ”کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ شمیم کی شادی اس وجہ سے ساہیوال میں ہوگئی تھی کہ امی میرے ساتھ شمیم کے رشتے کی مخالف تھیں؟“

عبداللہ بولا۔ ”میرے خیال کو چھوڑو۔ مگر عام طور پر یہی بات کہی جاتی ہے۔ میری والدہ کا بھی یہی خیال ہے کہ تمہارے چچا چچی نے مایوسی کے عالم میں شمیم کی بات ساہیوال میں طے کر دی تھی۔ اُنہیں معلوم تھا کہ تمہاری والدہ نے تمہارے اور شمیم کے رشتے کی بیل منڈھے نہیں چڑھنے دینی۔

”اس بات میں صرف دس پندرہ فیصد سے زیادہ سچائی نہیں ہے۔“ اسد نے کہا۔

”حقیقت وہی ہے جو تمہیں بھی معلوم ہے۔ یہ صرف میری سرد مہری تھی جس کی وجہ سے بات آگے نہ بڑھ سکی۔ اگر میں ایک بار بھی جھوٹے منہ کے ساتھ چچا چچی سے کہہ دیتا کہ میں شمیم کو دُلہن بنانا چاہتا ہوں تو اُن کی مجال نہیں تھی کہ وہ شمیم کی بات کہیں اور کرتے۔ کیونکہ اُنہیں بھی معلوم تھا کہ اگر میں چاہوں گا تو پھر امی بھی رُکاوٹ نہیں ڈال سکیں گی۔ باقی...... ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ تم خود دیکھ لینا میں شمیم کو اپنانا چاہ رہا ہوں۔ امی بڑی خوشی سے ایک دو ہفتے کے اندر راضی ہو جائیں گی۔“

”ہاں یہ بات تو ہے۔ وہ بچپن سے تمہاری ہر ضد مانتی آئی ہیں۔“

”مسئلہ وہی ہے یار! جو میں نے تمہیں بتایا ہے۔ شادی تو ہونی ہی ہونی ہے۔ لیکن شادی سے پہلے اُسے اس بات کا ثبوت ضرور فراہم کرنا ہوگا کہ وہ واقعی مجھ سے محبت کرتی ہے، اور اس محبت میں اتنی طاقت ہے کہ وہ میری ایک مشکل بات مان سکتی ہے۔“

”یعنی نامناسب فرمائش......؟“ عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نامناسب فرمائش...... کیا مطلب؟“

”یہ لفظ ایک مرتبہ راحت نے کہا تھا۔ شادی سے پہلے کی بات ہے۔ وہ واقعہ میں نے تمہیں سنایا تھا۔ شاید بھول گئے ہو۔“

”سناؤ تو شاید پھر یاد آجائے۔“

”یار وہی جب میرا اور راحت کا نیا نیا پیچا پڑا تھا۔ وہ اپنی ماں اور میری موجودہ ساس صاحبہ کے ساتھ رہنے کے لئے ہمارے گھر آئی ہوئی تھی۔ ان دنوں وہ لوگ مالی پور رہتے تھے۔ ایک رات چھت پر میں نے اُسے ہاتھ لگایا تھا تو وہ پھٹ پڑی تھی اور مجھے باقاعدہ تھپڑ مار دیا تھا۔“

”ہاں ہاں یاد آ گیا۔“ اسد نے کہا۔ ”پھر وہ تمہیں منانے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ تم نے کہا تھا کہ جب تک رات کو مجھ سے ملنے چھت پر نہیں آؤ گی، صلح نہیں ہوگی......“

”جی ہاں۔ اور وہ پورا ایک مہینہ اڑی رہی تھی۔ لیکن واپس مالی پور جانے سے ایک رات پہلے اُس نے ہار مان لی تھی اور چھت پر ملنے آئی تھی۔“ وہ واقعہ یاد کرتے ہوئے عبداللہ کے چہرے پر فاتحانہ چمک لہرا گئی۔ سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ ”سچ کہتا ہوں اسدی! اگر وہ اڑی رہتی نا...... تو شاید یہ قصہ ہی ختم ہو گیا ہوتا۔ اس عورت ذات سے

بس ایک بار شکست مان لو نا...... پھر شکست پر شکست ہوتی چلی جاتی ہے۔'' وہ کچھ دیر خاموش رہا، پھر زیر لب مسکراتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''نامناسب فرمائش۔''

اسد نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تو پھر تمہارا کیا خیال ہے؟ شمیم کی محبت کو تھوڑا سا پرکھنا تو چاہئے نا......''

''بالکل پرکھنا چاہئے۔'' عبداللہ نے گاجر کے حلوے کا ایک بھرپور چمچ انڈے کے ٹکڑے سمیت منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ پھر حلوہ نگل کر بولا۔ ''اُس کو بلاؤ...... اور دیکھنا وہ آئے گی بھی...... وہ جانتی ہے کہ تمہارے ساتھ اس سے پہلے کتنی زیادتی کر چکی ہے۔''

...... بڑی عید کی آمد آمد تھی۔ تیاریاں ہو رہی تھیں۔ قصبے کے بازار میں دُکانیں بھری پڑی تھیں اور خریداروں کا ہجوم نظر آتا تھا۔ اکثر گھروں میں بکرے، چھترے اور دُنبے وغیرہ کی موجودگی نظر آنے لگی تھی۔ شام سے پہلے قصبے کے لڑکے بالے قربانی کے جانور لے کر میدان میں جمع ہو جاتے۔ قربانی کے جانور گھاس پر منہ مارتے، ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے، ٹکریں کھیلتے۔ جبکہ لڑکے کرکٹ اور فٹ بال، گلی ڈنڈا وغیرہ سے دل بہلاتے۔ عید سے زیادہ عید کی آمد اسد کو اچھی لگا کرتی تھی۔ وہ سوچتا تھا شاید سب کے ساتھ ہی ایسا ہوتا ہے...... شمیم کے ساتھ اب اسد کی ہلکی پھلکی بات چیت شروع ہو گئی تھی کسی وقت تھوڑی دیر کے لئے وہ اسد کے گھر بھی آ جاتی تھی۔ اُس کی آمد اسد کی امی کو اس لئے بھی قابل قبول تھی کہ وہ جب بھی آتی تو گھر کے ڈھیروں کام نمٹا جاتی تھی۔ اُن دنوں اسد کی بڑی باجی آمنہ بھی بچوں کے ساتھ رہنے کے لئے آئی ہوئی تھیں۔ گھر میں خوب گہما گہمی تھی۔ خصوصاً جب سے دونوں گھروں میں بکرے آ گئے تھے، زیادہ ہی ہلا گلا رہتا تھا۔ علی اور باجی کے بچے مل کر ہر طرف بکروں کو دوڑاتے پھرتے تھے۔ ایک بکرا مارنے والا بھی تھا۔ جب علی اُسے نازو اور دیگر بچوں کی طرف دوڑاتا تو اُن کی چیخیں نکل جاتیں۔ ایک روز ایسے ہی وہ بکرا شمیم کے پیچھے دوڑا تو وہ چیختی ہوئی کمرے کی طرف دوڑی اور اندر گھس کر کنڈی لگالی۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اسد بھی چارپائی پر لحاف لئے پڑا ہے۔

اچانک اُس کی نگاہ اسد پر پڑی تو وہ بری طرح گڑبڑا گئی۔ ''اوہ سوری! مجھے پتہ نہیں تھا کہ تم یہاں ہو۔ یہ علی کا بچہ ناک میں دم کر رہا ہے۔ بکرا میرے پیچھے دوڑا رہا ہے۔''

اُس نے کنڈی کھولنے کی کوشش کی مگر بکرا آس پاس ہی تھا۔ اُس کے پاؤں کی جھانجریں دروازے کے بالکل قریب شور مچا رہی تھیں۔ ''علی! میں کہتی ہوں اسے دُور لے جاؤ۔ نہیں تو تایا کو شکایت لگاؤں گی۔'' وہ رُوہانسی ہو کر بولی۔

علی پکار کر بولا۔ ''لگتا ہے باجی! بکرے کو آپ سے محبت ہو گئی ہے۔ وہ پیچھے ہی نہیں ہٹ رہا۔''

''علی کے بچے باز آ جاؤ۔'' پھر وہ تائی کو آوازیں دینے لگی۔

اسد کی امی نے اُس کی فریاد سن لی اور ڈانٹ ڈپٹ کر اُسے بکرا دُور لے جانے پر مجبور کر دیا۔ بہرحال شمیم اب بھی احتیاطاً دروازہ نہیں کھول رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اُس نے دروازہ تو کھول دیا مگر باہر نہیں نکلی۔ اب وہ قدرے پُرسکون تھی۔ اسد کے کمرے میں بکھری ہوئی چیزوں کو ترتیب سے رکھنے لگی۔ یہ سب کچھ جیسے وہ عادتاً ہی کرنے لگتی تھی۔

اسد کی نگاہ اچانک اُس کے بائیں ہاتھ پر پڑی۔

''یہ کیا ہے؟'' اُس نے شمیم سے پوچھا۔

''عید کی مہندی۔''

''مگر دوسرے ہاتھ پر کیوں نہیں؟''

''دوسرے ہاتھ پر نہیں لگائی۔'' وہ عجیب لہجے میں بولی۔

''کیوں؟''

''بس نہیں لگائی۔'' اُس نے ادا سے کہا۔

اُس کی خوبصورت خاموشی بات کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ یہ خاموشی کہہ رہی تھی کہ اس ہاتھ پر جب لگاؤں گی وہی مہندی لگاؤں گی جو ایک مرتبہ کھرچ کھرچ کر اُتاری تھی۔ اچانک اسد نے کہا۔

''رات کو اُوپر تھوڑی دیر کے لئے برساتی میں آ سکتی ہو؟''

''کیوں؟''

''تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

''تت...... تو ابھی کر لو۔''

''نہیں...... یہاں نہیں۔''

شمیم نے ذرا چونک کر اسد کی طرف دیکھا، پھر اُس کی پلکیں جھک گئیں۔ ''یہ ٹھیک نہیں اسد! کسی کو پتہ چل گیا تو......''

''تم میری اتنی سی بات بھی نہیں مان سکتی ہو؟'' اُس کا بدن جلنے لگا۔

''اچھا...... میں کل کسی وقت...... یہاں تمہارے کمرے میں ہی آ جاؤں گی۔ لیکن بات کیا ہے؟''

''یہاں نہیں بھئی! تمہیں پتہ ہے باجی آئی ہوئی ہیں۔ ہر وقت ہلا گلا رہتا ہے...... میں کل نو بجے سے ساڑھے دس بجے تک اُوپر برساتی میں تمہارا انتظار کروں گا۔''

''پلیز اسد! مجھے ایسے امتحان میں نہ ڈالو۔ رات کو فلک شیر بھائی بھی گھر میں ہوتے ہیں۔ کسی کو پتہ چل گیا تو......'' فلک شیر اسد کے بہنوئی کا نام تھا۔

شمیم کا گریز اُسے سیخ پا کر رہا تھا۔ وہ بگڑ کر بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم میری اتنی سی بات بھی نہیں مان سکتی ہو۔''

''نہیں، ایسی بات نہیں ہے اسد...... مگر......''

''پلیز شمی! کیا میں اس قابل نہیں ہوں کہ تم میری یہ چھوٹی سی خواہش پوری کر دو؟''

اتنے میں برآمدے کے اندر باجی کے بچوں کا شور سنائی دینے لگا۔ وہ جلدی سے بولی۔ ''اچھا...... میں چلتی ہوں۔''

''میں انتظار کروں گا۔''

''اچھا......'' اُس نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

جب دونوں باجیوں میں سے کوئی رہنے کے لئے آتی تھی تو اکثر اسد برساتی میں بھی سو جایا کرتا تھا۔ اُس روز بھی وہ شام کے بعد دو تین کتابیں لے کر اُوپر برساتی میں چلا گیا۔ رات دھیرے دھیرے گہری ہوتی چلی گئی۔ گھڑی کی سوئی سرکتی ہوئی نو کے ہندسے پر پہنچی اور اسد کے انتظار کا اصل مرحلہ شروع ہوا۔ اُس کے کان ہر گھڑی شمیم کی چاپ پر لگے تھے۔ وہ با آسانی اپنے گھر کی چھت پر پہنچ سکتی تھی۔ دونوں گھروں کی چھتیں ملی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی چھت سے با آسانی اسد کی چھت پر اور پھر برساتی میں آ سکتی تھی۔ ساڑھے نو بجے کے قریب اسد نے برساتی سے نکل کر چچا کے صحن میں جھانکا۔ وہ اپنے کمرے میں ہی تھی اور ٹیبل لیمپ کے قریب بیٹھی پڑھ رہی تھی...... اسد نے

اندازہ لگایا کہ وہ والدہ کے سونے کا انتظار کر رہی ہے۔ اُس کا جتنا بدن روشنی میں تھا، ہیرے کی طرح دمک رہا تھا۔

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ واپس برساتی میں آ گیا اور انتظار کی کٹھن گھڑیاں گننے لگا۔ آج سردی معمول سے زیادہ تھی۔ شام سے مطلع ابر آلود تھا۔ اب کسی وقت ہلکی ہلکی بوندا باندی ہونے لگتی تھی۔ اس بوندا باندی کی نسبت سے اسد کو چند ماہ پہلے کی دُھواں دھار بارش یاد آ گئی۔ اُس بارش میں اُن سب نے مل کر گھر کے صحن میں کرکٹ کھیلی تھی اور آم چوسے تھے۔ اُس بارش کے کچھ یادگار مناظر ابھی تک اسد کے ذہن میں نقش تھے۔ شمیم کا کڑی کمان سا بدن، اُس کے بھیگے بال، اُس کے شفاف رخساروں پر بارش کے قطروں کا سفر...... ایک عجیب سی سنسنی اُس کے رگ و پے میں پھیلنے لگی۔ انتظار کی گھڑیاں کچھ اور بھی گراں ہو گئیں۔ وہ اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ دس بجے کے قریب وہ بے قرار ہو کر پھر چھت پر آ گیا۔ شمیم کے کمرے کی بتی گل ہو چکی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اب فیصلے کا لمحہ قریب آ گیا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جب شمیم دبے پاؤں چلتی چھت پر پہنچے تو اُسے اسد چھت پر کھڑا نظر آئے۔ وہ شمیم کی آمد کے وقت برساتی کے اندر ہونا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شمیم پر اُس کی بے پناہ بے قراری ظاہر ہو۔

......ساڑھے دس بجے...... پھر گیارہ بجے...... پھر بارہ بج گئے...... شمیم کو نہیں آنا تھا وہ نہیں آئی۔

○

اگلے روز جج کی چھٹی تھی۔ اسد کو کالج نہیں جانا تھا۔ اگر چھٹی نہ بھی ہوتی تو وہ شاید نہ جا سکتا۔ رات بھر جاگنے کے سبب اُس کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔ اُسے یوں لگتا تھا کہ بخار ہو رہا ہے۔ صبح نو بجے کے قریب اُس نے برساتی سے نیچے اپنے صحن میں جھانکا تو وہاں شمیم نظر آئی۔ وہ اُس کی باجی کے ساتھ مل کر گھر کی صفائی کر رہی تھی۔ اُن لوگوں کا دستور تھا کہ تہوار وغیرہ کے موقع پر سارے گھر کی کھڑکیاں، دروازے، جالیاں وغیرہ دھوتے تھے۔ خوب اچھی طرح صفائی کی جاتی تھی۔ اس صوصی صفائی میں شمیم بھی شریک نظر آ رہی تھی۔ ایک دم دونوں کی نگاہیں ملیں۔ شمیم نے ٹھٹک کر نظریں جھکا لیں۔ اسد کی آنکھوں میں جیسے خون اُتر آیا۔ اُس کا دل چاہا کہ شمیم اُس کے سامنے ہو اور وہ اُسے پکڑ

کر جھنجھوڑ ڈالے۔

وہ دوپہر تک کوشش کرتا رہا کہ اُسے شمیم سے بات کرنے کا موقع مل جائے۔ اتفاقاً آج چچا بھی گھر میں ہی تھے۔ وہ بڑے مزے سے دُھوپ میں چارپائی ڈالے بیٹھے تھے اور حج کی چھٹی کا لطف اُٹھا رہے تھے۔

سہ پہر تین بجے کے لگ بھگ وہ اپنی بھینس اور دونوں بکروں کے چارے کا انتظام کرنے کے لئے کھیتوں کی طرف گئے تو اسد کو بات کرنے کا موقع مل گیا۔ شمیم اُس وقت باورچی خانے میں بیٹھی کل کے لئے لہسن چھیل رہی تھی۔

''میں ساری رات تمہارا انتظار کرتا رہا ہوں۔''

''بارش ہو رہی تھی۔ اور امی بھی جاگ رہی تھیں۔''

''مجھے پتہ تھا تم نے یہی بہانہ بنانا ہے۔'' وہ زہریلے لہجے میں بولا۔

''سچ مانو! امی آدھی رات تک جاگتی رہیں۔''

''وہ ساری رات کھانستی رہتی ہیں تو کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ وہ ساری رات جاگتی ہیں؟''

''لیکن بارش بھی تو تھی۔''

''اچھا بحث چھوڑو......'' وہ تڑخ کر بولا۔ ''میں آج رات پھر انتظار کروں گا...... دیکھتا ہوں کہ یہ صرف زبانی کلامی محبت ہے یا تمہارے دل میں بھی میرے لئے کوئی بات ہے۔''

''مم...... میں وعدہ نہیں کرتی۔ لیکن کوشش کروں گی۔''

''اگر نہیں آؤ گی تو پھر کبھی نہ آنا۔'' اندرونی آگ کی حدت میں پگھل کر جیسے الفاظ خود بخود اُس کے ہونٹوں سے ٹپک گئے۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا گیا۔

وہ عید سے پہلے کی رات تھی۔ قصبے کے گھروں اور گلیوں میں چہل پہل تھی۔ صبح کے لئے میٹھے پکوان پک رہے تھے۔ روح کیوڑے، الائچی وغیرہ کی خوشبو اسد کے گھر میں بھی پھیلی ہوئی تھی۔ تھوڑے ہی گھر ایسے ہوں گے جہاں سے قربانی کے جانوروں کے بولنے کی آوازیں نہیں آتی ہوں گی۔

شمیم کی دو تین پڑوسی سہیلیاں بھی اسد کے گھر میں جمع تھیں۔ نازو، علی، باجی، باجی کے بچے، صحن میں خوب اژدھام مچا ہوا تھا۔ چوڑیاں پہنائی جا رہی تھیں، مہندی لگائی جا

رہی تھی۔ قربانی کے جانور صحن میں مینگنیاں کرتے پھر رہے تھے۔ علی کی لاپرواہی کے سبب جانوروں کا چارا پورے برآمدے میں بکھرا ہوا تھا۔ امی علی پر چیخ رہی تھیں، چچی نازو سے لتے لے رہی تھیں۔ ہر عید پر یہی کچھ ہوتا تھا...... اور اسد اس کو انجوائے کرتا تھا۔ لیکن اس عید پر اس کے علاوہ بھی کچھ ہو رہا تھا۔ اور اسد کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ جلتی ہوئی لکڑیوں کے درمیان باندھ کر پھینک دیا گیا ہو۔

اُسے رات کا انتظار تھا...... اور نو بجے کا انتظار تھا...... اور شمیم کے آنے کا انتظار تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے کے لگ بھگ ابا جان نے سب کو ڈانٹ ڈپٹ کر گھروں میں بھیج دیا تا کہ سویرے جلدی اُٹھا جا سکے...... اور عید گاہ کا رُخ کیا جا سکے۔ چارپائیوں پر لیٹتے لیٹتے اور بتیاں بجھتے بجھتے ساڑھے نو بج ہی گئے...... ساڑھے نو بجے سے اسد کا اصل انتظار شروع ہوا۔ وہ برساتی کے اندر بے قراری سے بستر پر کروٹیں بدلنے لگا۔ دونوں صحنوں میں اور مشترکہ چھت پر مکمل اندھیرا تھا۔ یخ بستہ اندھیرے میں بس بکروں، چھتروں اور دُنبوں کے بولنے کی آوازیں ہی آتی تھیں...... وہ صبح ذبح ہونے والے تھے مگر مطمئن تھے۔ وہ زندہ تھا مگر یوں لگتا تھا کہ ذبح ہونے والا ہے۔ اگر شمیم آج رات بھی نہ آتی تو بات ذبح ہونے والی ہی تھی۔

دس بجے کے بعد شمیم کے کمرے کی لائٹ بھی آف ہو گئی۔ اسد کا دل نئے انداز سے دھڑکنے لگا۔ اُس کے کان چھوٹی سے چھوٹی آہٹ کو نوٹ کر رہے تھے۔ عبداللہ کی باتیں، اُس کے سنائے ہوئے قصے اُس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ خاص طور سے وہ والا واقعہ جب راحت، مالی پور جانے سے ایک رات پہلے عبداللہ سے ملنے کے لئے چھت پر آئی تھی۔ اُس رات اس طویل انتظار کا مداوا ہو گیا تھا جو عبداللہ نے کیا تھا۔ اُس نے راحت کو اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا۔ اُس کے جذبے کی شدت نے راحت کو ششدر اور بے ترتیب کر ڈالا تھا۔ وہ خاموشی سے عبداللہ کی بے تابی کا سامنا کرتی رہی تھی۔ کیونکہ وہ اُسے ناراض کر کے مالی پور جانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ سوچنے لگا کیا آج شمیم بھی اُسے تھوڑی سی رعایت دینے پر آمادہ ہو جائے گی؟ وہ اُسے بانہوں میں بھرنا چاہتا تھا۔ اُسے اپنے ہونٹوں سے چومنا اور سہلانا چاہتا تھا۔ وہ اُسے تھوڑا سا بکھیر دینا چاہتا تھا...... اور بس۔ اور وہ جانتا تھا کہ اگر وہ آ گئی تو پھر یہ سب کچھ ہو گا۔

انتظار کی گھڑیاں آگے کو سرکتی رہیں۔ بے حد وزنی اور سست رو گھڑیاں تھیں......سوا دس بجے کے قریب اسد بے قرار ہو کر چھت پر آ گیا اور اندھیرے میں شمیم کے کمرے کے بند دروازے کو گھورنے لگا۔ ہر طرف سناٹا اور سکوت تھا۔ وہ سردی میں بے حرکت کھڑا رہا اور چچا کے صحن میں دیکھتا رہا...... پتہ نہیں کتنا وقت گزر گیا۔ پھر ایک دم جیسے اُس کی حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئیں۔ شمیم کے کمرے کے دروازے میں تھوڑی سی حرکت ہوئی تھی۔ وہ دیوار کے سائے میں ہو گیا تا کہ شمیم کو اُس کا ہیولا بھی نظر نہ آ سکے۔ وہ شمیم ہی تھی۔ شاید وہ ننگے پاؤں تھی۔ پنجوں کے بل چلتی ہوئی وہ سیڑھیوں تک پہنچی۔ اسد کا دل جیسے اُس کی کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا تھا۔

ڈیوڑھی کے بلب کی مدھم روشنی میں اُس کے فیروزی کپڑوں کی جھلک نظر آنے لگی۔ وہ دھیرے دھیرے نصف سیڑھیوں تک آئی۔ ایک آدھ بار اُس نے سر جھکا کر نیچے بھی دیکھا۔ نصف سیڑھیوں پر پہنچ کر وہ رُک گئی۔ اس کے ساتھ ہی اسد کو اپنا دل بھی رُکتا ہوا محسوس ہوا۔ یوں لگا جیسے وہ شدید کشمکش میں ہے۔ وہ قریباً نصف منٹ تک وہیں سیڑھیوں پر رُکی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ واپس پلٹی۔ اسد کا دل چاہا کہ وہ لپک کر جائے اور مدھم آواز دے کر اُسے روک لے۔ اگر وہ ایسا کرتا تو شاید وہ رُک بھی جاتی۔ لیکن ایسا رُکنا کیا رُکنا تھا؟ اسد جبڑے بھینچے اپنی جگہ کھڑا رہا۔ وہ سیڑھیاں اُتری اور واپس اپنے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا......

اسد کے جسم کو اس وقت کہیں سے کاٹا جاتا تو شاید لہو کا ایک قطرہ بھی برآمد نہ ہوتا۔ وہ پتھر کا بت بنا اپنی جگہ بالکل ساکت کھڑا رہ گیا۔ شمیم کو خاموشی سے سیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر خون میں جو ایک جوشیلی لہر پیدا ہوئی تھی، وہ ایک برفیلی لہر بن گئی تھی اور اس نے پورے جسم کو برفاب بنا دیا تھا۔ سرد ہوا شمالاً جنوباً چل رہی تھی۔ وہ اس ہوا سے، اس تاریکی سے اور اس رات سے بے خبر وہاں دیوار کے سائے تلے کھڑا رہا۔ دسویں رات کا چاند اُس کی حسرت کو بے بسی سے دیکھتا رہا اور ستارے آنکھیں جھپکتے رہے۔ بہت دیر بعد اُس کے برفاب جسم میں غیض وغضب کی آگ جاگنا شروع ہوئی۔ اُس کا دل چاہا کہ وہ دندناتا ہوا شمیم کے کمرے میں گھس جائے اور وہ سب کچھ کر گزرے جو کر کے اُس کے سینے کی آگ ٹھنڈی ہو سکتی ہو۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ ایسا کرنا ہی نہیں

چاہتا تھا...... وہ آگ میں جلتا ہوا برساتی میں آ گیا۔ اچانک اُسے محسوس ہوا کہ آتشیں آنسو اُس کے رخساروں پر بہہ رہے ہیں۔

صبح عید تھی...... اور صبح اُسے تیز بخار تھا۔ اتنا تیز کہ وہ سب کے ساتھ عیدگاہ بھی نہیں جا سکا تھا۔ رات اُسے ٹھنڈ لگ گئی تھی۔ وہ نیچے اپنے کمرے میں لحاف لئے پڑا رہا۔ ابا جان، امی جان، چچا چچی سب باری باری اُس کی خیریت دریافت کر چکے تھے۔ مگر ابھی تک نہیں آئی تھی تو وہ شمیم تھی۔ وہ اس وقت آئی جب سب باہر صحن میں تھے اور بکرے ذبح کئے جا رہے تھے۔ وہ دروازہ کھول کر دھیرے سے اندر داخل ہوئی۔

"اب طبیعت کیسی ہے؟" اُس نے کہا۔

وہ منہ تک لحاف لئے پڑا رہا۔ بالکل خاموش رہا۔

اُسے چوڑیوں کی کھنک سنائی دی۔ ایک ہاتھ ہولے سے اُس کے لحاف میں سرکا اور اُس کے پاؤں پر آ گیا۔ ہتھیلی کا نرم ٹھنڈا لمس اُس نے اپنے بائیں پاؤں پر محسوس کیا۔

"کافی تیز بخار ہے۔" وہ بولی۔

اسد پھر بھی خاموش رہا۔ ہاتھ بدستور اُس کے پاؤں پر تھا بلکہ اب ہاتھ نے پاؤں پر ہلکی سی گرفت قائم کر لی تھی...... چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ عجیب لہجے میں بولی۔

"اسد پلیز! معاف کر دو۔ میں جانتی ہوں، میں تمہیں دُکھ دے رہی ہوں۔ لیکن جو کچھ تم کہہ رہے ہو یہ میرے بس میں نہیں ہے۔ میں ایسا کر ہی نہیں سکتی ہوں۔" ایک دم اُس کی آواز روہانسی ہو گئی۔ "میری بات سمجھنے کی کوشش کرو اسد! مم...... میں...... پیار کرتی ہوں تم سے...... اور تم نہیں جانتے کہ کتنا کرتی ہوں۔ خدا کے لئے میرے پیار کا ایسا امتحان نہ لو...... ہماری شادی ہو جائے، پھر تم جو کہو گے میں مانوں گی...... تمہاری ہر بات کو حکم سمجھوں گی۔ میں وعدہ کرتی ہوں تم سے...... تمہاری ہر ناراضگی کو دُور کر دُوں گی۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہاری توہین ہوئی ہے تو میری توہین کر لینا۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ بُرا نہیں مانوں گی...... لیکن...... لیکن اسد! ابھی مجھے کسی ایسی بات پر مجبور نہ کرو۔ میں اپنی نظروں میں گر گئی تو پھر کہیں کی نہیں رہوں گی۔" اُس کا ہاتھ بدستور اسد کے پاؤں پر تھا۔

اسد بالکل خاموش لیٹا رہا۔ وہ اُس کے پاؤں کو ذرا سا جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔ "تم بولتے کیوں نہیں ہو...... میں جانتی ہوں اسد! تم نے خوامخواہ اپنے دل میں گرہ ڈال لی

ہے۔ ورنہ تم بھی سمجھتے ہو کہ جو میں کہہ رہی ہوں وہ درست ہے۔ ہماری تربیت ایک ہی گھر میں ہوئی ہے۔ تمہارے اور میرے والدین نے ہمیں نیکی اور سچائی کا جو سبق پڑھایا ہے وہ بھی ایک ہی ہے۔ پھر...... تم اور طرح سے کیسے سوچ سکتے ہو؟''

اسد نے اپنے دائیں پاؤں سے شمیم کی کلائی کو بے دردی سے دھکیلا اور اپنے بائیں پاؤں پر سے اُس کی گرفت ختم کر دی۔ اپنے دہکتے ہوئے بخار زدہ چہرے پر سے اُس نے لحاف ہٹایا اور غرا کر بولا۔

''پہلے یہ میری خواہش تھی۔ اب یہ میری ضد ہے۔ اگر میری بات نہیں مانو گی تو پھر میرے اور تمہارے درمیان سب کچھ ختم ہو جائے گا...... سب کچھ۔''

اس کے ساتھ ہی اُس نے لحاف مضبوطی سے چہرے پر لے لیا۔

''اسد...... میری بات سنو!'' وہ ملتجی آواز میں بولی۔

''میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا۔ اب جاؤ یہاں سے۔'' وہ اتنی زور سے بولا کہ آواز باہر تک جانے کا امکان پیدا ہو گیا۔ شمیم جلدی سے اُٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔

عید آئی اور گزر بھی گئی۔ اسد اس خوبصورت تہوار سے ایسے ہی بیگانہ رہا جیسے کوئی نابینا شخص کسی تصویری نمائش میں سے گزر جائے۔ اُسے کچھ اچھا ہی نہیں لگ رہا تھا۔ اپنا آپ بھی نہیں۔ اُس کے حلق میں مسلسل ایک پھندا سا لگا ہوا تھا۔ ایسا پھندا اکثر بچپن میں اُس کے گلے میں لگتا تھا جب وہ امی سے کسی چیز کے لئے ضد کرتا تھا اور اس کی ضد پوری نہیں ہوتی تھی۔ وہ رو رو کر ہلکان ہو جاتا تھا اور گلے میں جیسے غم و غصے کا گولا سا پھنس جاتا تھا۔ آج کل بھی اُس کی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ بچپن میں اُس کی یہ کیفیت تادیر نہیں رہا کرتی تھی، کیونکہ ماں اُس کی ضد مان لیتی تھی۔ مگر اب جس سے پالا پڑا تھا وہ اتنی جلدی ماننے والی نہیں تھی۔ وہ اُسے خون کے آنسو رُلا رہی تھی۔

عید والے واقعے کے بعد سے وہ بہت کم نظر آئی تھی۔ اور جب بھی آئی تھی گم صم دکھائی دی تھی۔ نازو کی زبانی اسد کو پتہ چلا تھا کہ شمیم کے ایف اے کے امتحان قریب ہیں اور وہ کتابوں میں غرق ہے۔ اسد بھی اپنے طور پر خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر ہر کوشش اُسے ناکام ہوتی نظر آتی تھی۔ ایک دن وہ ٹی وی لگا کر بیٹھا ہوا تھا اور خالی نظروں سے اُس کی سکرین کو دیکھ رہا تھا کہ ابا جان بھی اُس کے قریب صوفے پر آ بیٹھے۔

''یہ کس کا میچ لگا ہوا ہے؟'' اُنہوں نے ٹی وی دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ مقامی کھلاڑی آپس میں کھیل رہے ہیں ابا جان! ٹرافی کے میچ ہیں۔'' اسد نے غیر دلچسپ لہجے میں جواب دیا۔

''اچھا یہ تین ڈنڈے کس لئے گاڑے ہوتے ہیں انہوں نے؟''

''ان کو وکٹیں کہتے ہیں ابا جان! اگر گیند ان وکٹوں کو لگ جائے تو کھلاڑی آؤٹ ہو جاتا ہے۔ یعنی اُس کی باری ختم ہو جاتی ہے۔''

''لیکن یہ ڈنڈے تو دو جگہ لگے ہوتے ہیں۔''

''دو کھلاڑی ایک ساتھ باری لیتے ہیں ابا جی! گیند کو بلے سے مارنے کے بعد وہ ان وکٹوں کے درمیان بھاگتے ہیں۔ وہ جتنے چکر لگاتے ہیں، اتنے سکور بن جاتے ہیں۔''

''لیکن یہ جو کہتے ہیں کہ چوکا ہو گیا...... یہ کیا ہوتا ہے؟''

''گراؤنڈ کے چاروں طرف جو سفید رسہ ہے، اگر گیند کھلاڑی کے بلے کو لگ کر اس رسے سے پار ہو جائے تو کھلاڑی کو چار سکور ملتے ہیں، اسے چوکا کہتے ہیں۔''

ابا جان نے دلچسپی سے سر ہلایا۔ آج کل وہ کبھی کبھی کرکٹ دیکھنے کے لئے ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتے تھے۔ کرکٹ میں جو اُنہیں تھوڑی بہت دلچسپی پیدا ہوئی تھی تو اس کا سہرا علی کے سر تھا۔ وہ کھینچ تان کر اُنہیں ٹی وی کے سامنے بٹھا دیتا تھا اور پھر دلچسپی لینے پر مجبور کر دیتا تھا۔ یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ اس کھیل میں ایک خاص قسم کی کشش ہے جو بہت جلد بندے کو گرفت میں لے لیتی ہے۔ حیات محمد پر بھی اس کشش نے تھوڑا بہت اثر کرنا شروع کر دیا تھا۔

ایک روز شام کو اسد اپنے لنگوٹیے عبداللہ کے ساتھ مٹر گشت کر کے واپس آیا تو اپنے گھر کے دروازے کے پاس ہی اُس کی ملاقات چچی سلطانہ سے ہو گئی۔ اُنہوں نے اُسے روکا اور اپنے ساتھ گھر میں لے گئیں۔ کمرے میں لے جا کر کہنے لگیں۔ ''اسد! تم ہی اس پاگل کو کچھ سمجھاؤ۔ خوامخواہ پڑھائی کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ ہم نے کوئی نوکری تو نہیں کروانی ہے اس سے...... ہم تو چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد اس کا گھر بس جائے...... کل مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میری شادی وغیرہ کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیں۔ میں نے اس بارے میں کچھ نہیں سننا ہے۔ اب تم ہی سوچو اسد! یہ کوئی کہنے والی باتیں ہیں؟ جو

کچھ ہمارے ساتھ ہوا ہے اس کے بعد تو لڑکی کو کوئی پوچھتا نہیں۔ مگر اللہ کا کرم ہے ہمیں اس طرح کا کوئی صدمہ نہیں دیکھنا پڑا ہے۔ تمہیں پتہ ہی ہے کہ ابھی اس کی عدت بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ کوئٹہ کے بنک ملازم لڑکے کا رشتہ آ گیا تھا۔ اب چند دن پہلے میری ایک پرانی سہیلی نے مجھ سے بات کی ہے۔ بڑے اچھے لوگ ہیں۔ خاندانی زمین ہے، اچھا خاصا کاروبار ہے۔ لڑکے کا نکاح ہوا تھا مگر رخصتی سے پہلے ہی بات ختم ہو گئی تھی..... اگر مجھے شمیم کی طرف سے تسلی ہو تو میں سہیلی سے بات کروں...... مگر یہ تو پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتی۔ بس پڑھائی پڑھائی کی رٹ لگائی ہوئی ہے۔"

"آپ نے مجھے کس لئے بلایا ہے چاچی؟"

"شمیم تیری بات بہت مانتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم سمجھاؤ گے تو سمجھ جائے گی۔ اسے کہو کہ پڑھنے کا کیڑا دماغ سے نکال دے۔"

"چاچی! میں اس گھر میں اتنا معتبر کب سے ہو گیا کہ کوئی میری بات مانے؟ اگر میں ایسا ہی معتبر ہوتا تو مجھے شمیم کی منگنی کا پتہ اُس وقت نہ چلتا جب گھر میں مہمان پہنچنے والے تھے۔ باقی آپ کو یہ بھی غلط فہمی ہے کہ وہ میری بات مانتی ہے۔ میری بات یہاں کوئی نہیں مانتا۔"

"پُتر! تم نے تو دل میں پتہ نہیں کن کن باتوں کا غصہ بٹھایا ہوا ہے۔"

"ہاں جی...... میں بہت غصے والا ہوں۔ اس کے علاوہ بھی ساری دنیا جہان کی برائیاں میرے اندر موجود ہیں۔ آپ سب لوگ مجھے بس میرے حال پر چھوڑ دیں۔ مجھے پتہ ہے آپ لوگ سب کچھ جانتے تھے اس کے باوجود انجان بنے ہوئے تھے۔ آپ اب بھی انجان بنے ہوئے ہیں۔"

چچی کی آنکھوں میں حیرانی دکھائی دی تھی۔ اسد پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل آیا تھا۔ دروازے کے پاس ہی شمیم کھڑی تھی۔ اُس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اسد کو دیکھا۔ یقیناً اُس نے سب کچھ سن لیا تھا۔ شاید وہ صحن میں ہوتی تو بھی سب کچھ سن لیتی۔ چچی چونکہ اُونچا سنتی تھیں لہٰذا اُن کے ساتھ رازداری سے تو کوئی بات کی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ اور یہ باتیں تو اسد رازداری سے کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اُس کی خواہش تھی کہ اگر شمیم گھر میں موجود ہے تو وہ یہ سب کچھ سن لے۔"

شمیم کے پاس سے تیزی سے گزرتا ہوا وہ اپنے گھر چلا آیا۔

وہ اپنے ہر عمل سے شمیم پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اس سے بہت ناراض ہے اور وہ اس کوشش میں بہت حد تک کامیاب تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اُس نے چچی سے جس انداز میں بات کی تھی، آج تک نہیں کی تھی۔ یقیناً شمیم کے ساتھ ساتھ چچی بھی از حد حیران ہوئی ہوں گی۔ جو کچھ اسد نے کہا تھا اس کا ردِ عمل دو دن بعد ہی ظاہر ہو گیا۔ چھوٹی نازو اُس کے پاس آئی۔ کہنے لگی۔

"بھائی جان! آپ کی لکھائی بڑی اچھی ہے۔ میرے خیال میں آپ بتا سکتے ہیں کہ باجی کو کس طرح کی ہینڈ رائٹنگ میں لکھنا چاہئے۔"

"کیا مطلب؟"

"دراصل آج کل باجی اپنی ہینڈ رائٹنگ بہتر کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ پہلے وہ سیدھا لکھتی تھیں، اب انہوں نے تھوڑا سا ترچھا لکھنا شروع کر دیا ہے۔ یہ دیکھیں، یہ اُن کی رائٹنگ کے چھ سات نمونے ہیں، آپ انہیں دیکھ کر بتائیے کہ ان میں سے کون سا اچھا ہے؟"

نازو نے کاپی کا ایک صفحہ اسد کے سامنے کر دیا۔ اس پر انگریزی میں چھ سات دفعہ ایک ہی فقرہ لکھا گیا تھا۔ ہر فقرے میں ہینڈ رائٹنگ قدرے مختلف تھی۔ فقرہ یہ تھا......

"پلیز...... معاف کر دو۔"

ایک لمحے میں اسد جان گیا کہ ہینڈ رائٹنگ وغیرہ سب ڈرامہ ہے۔ شمیم نے اس طرح اسد کو منانے کی کوشش کی ہے۔ اُس کے سینے میں انبساط کی ایک ہلکی سی لہر اُٹھی۔ اُسے لگا کہ شمیم کا لوہا پگھل رہا ہے۔ اُس نے نازو سے پوچھا۔ "یہ تمہاری باجی نے کہا تھا کہ ہینڈ رائٹنگ مجھے دکھاؤ؟"

"کیوں...... اس میں کوئی غصے والی بات ہے؟" نازو ڈر کر بولی۔

"نہیں بھئی۔ میں نے یونہی پوچھا ہے۔ کیا باجی نے کہا تھا؟"

"انہوں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ میں آپ کو رائٹنگ دکھاؤں۔ بس یہ کہتی تھیں کہ آپ کی لکھائی بڑی اچھی ہے۔ آپ کوئی اچھا مشورہ دے سکتے ہیں۔"

اسد کا اندازہ درست تھا۔ یہ تحریر شمیم کی خواہش پر ہی اُس تک پہنچی تھی...... "پلیز

معاف کر دو......'' کسی ایسے بچے کی طرح جسے خوشخط نہ لکھنے پر سزا دی گئی ہو اُس نے یہ فقرہ چھ سات مرتبہ لکھا تھا۔ اسد کے دل میں ایک دم اُس کے لئے نرم گوشہ پیدا ہوا۔ اُس کا دل چاہا کہ وہ شمیم سے ایسی بیگانگی کا برتاؤ نہ کرے......شاید وہ کچھ اور بھی مثبت سوچتا۔ لیکن ایک بار پھر وہی توہین کا ناقابل فراموش لمحہ اُس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ کمرے کے گوشے میں پڑی ہوئی ایک خالی کرسی اُس کا منہ چڑانے لگی۔

اُس نے جیب سے قلم نکال کر ترچھے حروف میں یہ الفاظ لکھے۔ ''Waiting for you'' اور نازو سے بولا۔ ''میرے خیال میں یہ سٹائل زیادہ اچھا ہے۔''

نازو چہک کر بولی۔ ''باجی نے یہ جو تیسری لائن لکھی ہے یہ بالکل اسی طرح تو ہے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ اُس سے کہو ایسے ہی لکھے۔''

نازو چلی گئی۔ اسد کو ڈوبتے ہوئے جیسے تنکے کا سہارا مل گیا تھا۔ ایک بار پھر اُس کا انتظار شروع ہو گیا۔ وہی برساتی تھی، وہی کھڑکی، ویسی ہی سرد راتیں......کھیتوں میں دُور کہیں ٹریکٹر چلنے کی آواز، کھیتوں میں کام کرتے مزدوروں کی دُور افتادہ آوازیں...... اُمید کے جگنوؤں کی طرح ٹمٹماتے ستارے اور نا اُمیدی کی سرد لہر کی طرح سرسراتا اندھیرا......پتہ نہیں کہ مر کر بھی انسان کے اندر آس مرتی کیوں نہیں؟ کیوں وہ نئے نئے بہروپ بھر کر مسلسل دل میں جاگزیں رہتی ہے۔ اسد نے کئی پہاڑ جیسی راتیں شمیم کے انتظار میں جاگتے گزار دیں۔ وہ غم میں جلتی ہوئی پیاسی آنکھوں کے ساتھ چچا کے صحن کو گھورتا رہتا......

ایک دن اتھاہ مایوسی کے عالم میں اُس نے سوچا کہ اپنی بے پناہ بے قراری اور تڑپ سے کسی طرح شمیم کو آگاہ کرے۔ اُس کے قریب ہی ٹیپ ریکارڈر رکھا تھا۔ اُس نے اپنی آواز ریکارڈ کرنے کے لئے ایک کیسٹ کو پلٹے کیا۔ رات کا وقت تھا اور وہ برساتی میں تھا۔ ایسا کوئی خدشہ نہیں تھا کہ کوئی اُس کی آواز سن لے گا۔ اُس نے کہنا شروع کیا۔

''تمہیں خبر نہیں میرے دن رات کتنی بے چینی سے گزر رہے ہیں......میرا ہر پل تمہارے لئے انتظار کی سولی پر کٹتا ہے......بس میرا کمرا ہے اور تمہارا انتظار ہے۔ یہ انتظار میرے خون میں، میرے جسم اور میری رُوح میں اندر تک اُترتا چلا جا رہا ہے۔ میں کچھ زیادہ نہیں کہوں گا، کیونکہ زیادہ کہنے کا حوصلہ نہیں رہا۔ بس اتنا کہتا ہوں کہ گزری

راتوں کی طرح آج رات بھی میں تمہارا انتظار کروں گا۔ یوں تو یہ انتظار ساری رات کا ہو گا لیکن نو بجے سے ساڑھے دس بجے تک اس انتظار کی شدت انتہا کو چھوتی رہے گی۔''

کیسٹ میں آواز ریکارڈ کرنے کے بعد وہ دیر تک سوچتا رہا کہ اُسے شمیم تک کیسے پہنچایا جائے؟ وہ کسی بھی حوالے سے اب شمیم کے سامنے ہلکا پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اب کسی ایسی حرکت کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا جس سے شمیم کو یہ شبہ ہوتا کہ وہ اندر سے ٹوٹ رہا ہے۔ ساری رات سوچنے کے بعد اور اپنی ریکارڈ شدہ آواز دو تین بار سننے کے بعد اُس نے یہی محسوس کیا کہ اگر وہ کیسٹ بھیجے گا تو ایک طرح سے اپنی جزوی ہار تسلیم کرے گا......اُس نے کئی دوسرے ارادوں کی طرح کیسٹ بھیجنے کا ارادہ بھی ختم کر دیا۔

انتظار کا سفر جاری رہا۔ یاس بھرے دن لاچار راتوں کے پیچھے بھاگتے رہے۔ وہ ان لاچار راتوں میں ویران آنکھوں سے چچا کے صحن کو دیکھتا رہتا۔ اُس دریچے کو دیکھتا رہتا جس کی دوسری جانب شمیم ٹیبل لیمپ کی روشنی میں پڑھتی تھی اور اُس کے جسم کا روشن حصہ ہیرے کی طرح دمکتا تھا۔ لیکن اب تو وہ ہیرے کی طرح دمکتا ہوا جسم صرف تصور میں ہی دیکھ سکتا تھا۔ بہت دن پہلے اُس دریچے کے بے ترتیب پردے باترتیب ہو گئے تھے۔ اب ان میں ایسی کوئی درز نہیں پائی جاتی تھی جو اسد کی نگاہ کو راستہ دے سکے...... اگر ایسی کوئی درز نہیں تھی، ایسا کوئی امکان نہیں تھا تو پھر......پھر وہ تحریر کیا معنی رکھتی تھی؟ وہ معافی نامہ کیسا تھا؟ کیا وہ مشروط معافی تھی؟ کیا معذرت کے وہ حروف اس شرط کے ساتھ تھے کہ اسد اپنے مطالبے سے دستبردار ہو جائے گا......نہیں، اسد کو تو غیر مشروط معذرت درکار تھی۔

چند بے ثمر راتوں کے بعد اُس کا ٹوٹا ہوا دل ایک بار پھر ٹوٹ گیا۔ اور اس مرتبہ اتنی شدت سے ٹوٹا کہ بس ریزہ ریزہ ہی ہو گیا۔ اُس کے دل میں آئی کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر کہیں چلا جائے۔ کہیں بہت دُور جہاں شمیم کی آواز اُس کے کانوں میں پڑے نہ اُس کا تصور ذہن پر دستک دے۔ اُس کا دل ہر شے سے اُچاٹ ہو گیا۔ حتیٰ کہ وہ اپنے آپ سے بھی بیزاری محسوس کرنے لگا۔ اُس کی شیو بڑھ گئی تھی، آنکھیں بے خوابی کے سبب سرخ انگارہ رہتی تھیں۔ ایک دن عبداللہ آیا تو اُسے کھینچ تان کر گھر سے باہر لے گیا۔ اسد جانتا تھا کہ عبداللہ کی آمد اُس کی امی جان کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ اُنہوں نے ہی

عبداللہ سے کہا ہو گا کہ وہ آئے اور اُسے کہیں گھمانے پھرانے لے جائے۔ شام کا وقت تھا، وہ اپنی پسندیدہ جگہ یعنی چھوٹی نہر کے کنارے گھاس کے قطعے پر بیٹھ گئے۔ وہ اکثر یہاں بیٹھ کر باتیں کرتے تھے اور چھوٹے ٹرانسسٹر ریڈیو پر گانے وغیرہ سنتے تھے۔ آج بھی ریڈیو عبداللہ کے پاس تھا۔ فرمائشی نغموں کا پروگرام آ رہا تھا۔ جب تیسری مرتبہ اسد کے منع کرنے کے باوجود عبداللہ نے بے خیالی میں ریڈیو آن کیا تو اسد بھنا کر بولا۔

''میں اس ریڈیو کو فرمائشی گانوں سمیت اُٹھا کر نہر میں پھینک دُوں گا۔ اور ہو سکتا ہے کہ خود بھی کود جاؤں۔''

''اچھا یار بند کر دیتا ہوں۔ اتنا ناراض کیوں ہوتا ہے؟'' عبداللہ نے ریڈیو بند کر دیا، پھر کھسیانے انداز میں بولا۔ ''اور وہ جو برساتی میں لیٹ کر آدھی رات تک بھولے بسرے انڈین گانے سنتا ہے اور ریڈیو سینے پر رکھے رکھے سو جاتا ہے...... وہ کس حساب میں ہے؟''

''چھوڑ دیا ہے سب کچھ۔'' وہ بدستور بھنائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''وہ برساتی بھی چھوڑ دی ہے، وہ گھر بھی چھوڑ رہا ہوں۔ اور ہو سکتا ہے کہ دنیا ہی چھوڑ جاؤں۔''

عبداللہ نے دو سگریٹ سلگائے ایک اپنے ہونٹوں سے لگائے رکھا، دوسرا اسد کی طرف بڑھایا۔ اسد سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن اب کبھی کبھار عبداللہ کے کہنے پر چند کش لگا لیتا تھا۔ اسد نے ہچکچاتے ہوئے سگریٹ لے لیا تو عبداللہ گھاس پر کہنی ٹکا کر اور ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر نیم دراز سا ہو گیا اور اسد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ویسے سچ پوچھو تو تمہاری یہ بات مجھے بھی تھوڑی سی مناسب ہی لگی ہے۔''

''کون سی بات؟''

''یہی شاد پور سے جانے کی بات...... سیانے کہتے ہیں کہ یہ عشق کے داؤ پیچ بڑے نرالے ہوتے ہیں۔ بندے کی عقل خبط ہو کر رہ جاتی ہے۔ بندہ گھن چکر بن جاتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ معشوق کے پاس رہ کر بندے کو اتنا فائدہ نہیں ہوتا جتنا اُس سے دُور رہ کر ہوتا ہے۔ دُوری میں بھی ایک خاص قسم کا جادو ہوتا ہے۔ جو باتیں پیار کرنے والوں کو پاس رہ کر سمجھ میں نہیں آ رہی ہوتیں وہ دُوری پڑ جانے پر فر فر سمجھ میں آنے لگتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے شاد پور سے چلے جانے سے شمیم کی اُلٹی مت بھی

سیدھی ہو جائے۔ لیکن یار! تم اس طرح نہ جاؤ جس طرح جانا چاہتے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کسی اور طریقے سے جاؤ۔''

''کیا مطلب ہے...... سر نیچے اور ٹانگیں اُوپر کر لوں؟''

''یہ دیکھ! یہ کیا ہے......'' عبداللہ نے جیب سے ایک مُڑا تڑا لفافہ نکالا اور اسد کے سامنے رکھ دیا۔ یہ وہی کاغذات تھے جو لاہور سے آنے والے قدیر صاحب اسد کو دے گئے تھے۔ اس میں قدیر صاحب کے کلب کے بارے میں معلومات اور اُس کی کارکردگی کی تفصیل وغیرہ تھی۔ کچھ عرصہ پہلے اسد نے یہ لفافہ کاغذات سمیت پھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ آج یہ عبداللہ کے ہاتھ میں نظر آ رہا تھا۔

''تم نے یہ لفافہ کہاں سے لیا؟'' اُس نے عبداللہ سے پوچھا۔

''اندازہ لگاؤ...... کہاں سے لیا ہو گا؟''

''پہیلیاں مت بجھواؤ یار!'' وہ تڑخ کر بولا۔

''یہ مجھے علی نے دیا تھا۔ اُسے بڑا شوق ہے کہ اُس کے بھائی جان ایک بڑے کھلاڑی بنیں۔ اور کسی روز وہ اُنہیں بھی ٹی وی پر میچ کھیلتے دیکھے۔''

''اُس بچے کی بات چھوڑو۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

عبداللہ نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا اور پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ''تم جانتے ہو کہ مجھ میں کرکٹ کا جو تھوڑا بہت شوق ہے وہ تمہاری وجہ سے ہی ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ ہمارے اس قصبے میں جو زیادہ تر لڑکے کرکٹ کھیلتے ہیں اُن کو اُکسانے میں تمہارا ہی ہاتھ ہے۔ کرکٹ کی مجھے کچھ زیادہ سمجھ بوجھ تو نہیں مگر جتنی بھی ہے اس کی روشنی میں یہ بات میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تم اچھے کھلاڑی بن سکتے ہو۔ اور اگر یار! تم بن سکتے ہو تو پھر کیوں کوشش نہیں کرتے ہو؟ تمہارے ساتھ ساتھ ہمارے بھی کچھ دلدر دُور ہو جائیں گے...... ہم بھی شاد پور سے نکل کر دنیا کا کوئی رنگ ڈھنگ دیکھ لیں گے۔''

''بس یہی کہنا چاہتے ہو؟''

''نہیں یار! بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ابھی تو شروع ہی ہوا ہوں۔'' عبداللہ نے کہا۔

بے آواز بہتے پانی کے کنارے گھاس کے اس قطعے پر بیٹھ کر اُن کے درمیان دیر تک بات ہوتی رہی۔ اسد تذبذب میں تھا۔ یہ بات تو وہ طے کر چکا تھا کہ اب اُسے شاد پور

میں نہیں رہنا۔ مگر کرکٹ سے ناطہ جوڑنا ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ وہ نہیں کر پا رہا تھا۔ کبھی اُس کا دل چاہتا کہ گیند بلے کو ہاتھ نہ لگانے کے عہد پر قائم رہے، کبھی دل چاہتا کہ وہ مغرور و بے حس شمیم کو کچھ کر کے دکھائے۔ وہ دو اطراف میں کھنچ رہا تھا۔ کبھی ایک طرف کھچاؤ زیادہ ہو جاتا تھا، کبھی دوسری طرف۔

یہی وہ لمحے تھے جب اچانک اُس کی نگاہ ایک کاغذ پر پڑی۔ اس کاغذ میں اُن اچھے اور نمایاں کھلاڑیوں کی فہرست تھی جو قدیر صاحب کے کلب کی طرف سے کھیل رہے تھے۔ اس فہرست میں درج ایک نام نے اسد کو چونکا دیا۔ یہ نام سجاد تھا۔ وہی سجاد جس کے ساتھ چند ماہ پہلے اسد نے ایک میچ میں شرکت کی تھی، ایک تیز سکور لینے کی کوشش میں اسد اُس سجاد نامی کھلاڑی سے ٹکرا گیا تھا اور سجاد نے اُس کے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔ اسد کا دل بری طرح گھائل ہوا تھا۔ اور وہ کتنے ہی دن اس زخم کی ٹیسیں محسوس کرتا رہا تھا...... آج کلب کے کھلاڑیوں کی فہرست میں سجاد کا نام دیکھ کر ایک دم اُس کشمکش کا فیصلہ ہو گیا جو کتنی ہی دیر سے اسد کے ذہن میں جاری تھی۔ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ لاہور جائے گا اور قدیر صاحب کے کلب کی طرف سے کھیلے گا۔

سب سے مشکل مرحلہ ابا جان سے اجازت لینے کا تھا۔ وہ دو تین دن ابا جان کے خوشگوار موڈ کا انتظار کرتا رہا۔ ایک دن بڑا ہی آئیڈیل موقع ہاتھ آیا۔ ون ڈے سیریز کا آخری میچ ٹی وی سے براہِ راست دکھایا جا رہا تھا۔ نازو، علی اور چچا شوکت کے علاوہ اسد کے ابا جان بھی ٹی وی سیٹ کے سامنے موجود تھے۔ وہ گاہے گاہے علی سے مختلف سوالات بھی پوچھ رہے تھے۔ مثلاً اب کتنے سکور ہو گئے ہیں؟ کتنے سکور اور ہوں گے تو پہلی ٹیم میچ جیت جائے گی...... یہ نو بال کیا ہوتا ہے؟ چھکا کیسے لگتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سوال اس دلچسپی کے غماز تھے جو ابا جان کو کرکٹ جیسے ''نہایت ناپسندیدہ'' کھیل میں پیدا ہو چکی تھی۔ یہ صورت حال دیکھ کر اسد کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی ہوئی۔ میچ کے دوران جب کچھ دیر کے لئے بجلی بند ہوئی اور چچا جان اُٹھ کر باہر گئے تو اسد نے والد سے وہ سب کچھ کہہ دیا جو کہنا چاہتا تھا۔

شروع میں تو یہی لگا کہ اُس کی اپیل خارج ہو جائے گی اور ابا جان اپنے فیصلے پر ڈٹے رہیں گے۔ لیکن دس پندرہ فقروں کے تبادلے کے بعد اُن کے رویئے میں تھوڑی

سی نرمی پیدا ہوئی۔ اسی دوران چچا جان بھی واپس آ گئے۔ اُنہوں نے بھی درپیش مسئلے پر اپنی رائے کا وزن اسد کے پلڑے میں ڈال دیا۔ اسد کے ابا جان نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''اچھا...... مجھے اس بارے میں ذرا سوچنے دو۔''

یہ فقرہ ایک طرح سے کامیابی کی نوید تھا۔ جب محمد حیات نے کسی بارے میں مثبت رائے دینا ہوتی تھی وہ اکثر یہی کہا کرتے تھے، اچھا مجھے اس بارے میں ذرا سوچنے دو.... ٹھیک چار روز بعد اسد اپنی جنم بھومی شاد پور سے لاہور کے لئے روانہ ہو رہا تھا......!

○○○

لاہور میں سب کچھ بہت جلدی ہو گیا اور پروگرام کے عین مطابق ہوا۔ قدیر صاحب سے ملاقات ہوتے ہی اسد کی رہائش کا انتظام بھی ہو گیا۔ کلب کی بی ٹیم کا کپتان اشفاق بڑا سوشل اور ہر دلعزیز لڑکا تھا۔ وہ بائیں ہاتھ سے لیگ سپن باؤلنگ کرتا تھا۔ قد کاٹھ کے لحاظ سے تو وہ عام تھا مگر اپنے کھیل کے لحاظ سے عام نہیں تھا۔ وہ قائداعظم ٹرافی کے میچ کھیل چکا تھا۔ ایک بینک کی ٹیم میں اُس کی شمولیت کے قوی امکانات موجود تھے۔ اشفاق اقبال ٹاؤن میں رہتا تھا۔ اُس کے دونوں بڑے بھائی اپنی بیویوں کے ساتھ کینیڈا جا چکے تھے۔ دس مرلے کی کوٹھی میں اشفاق اور اُس کے والدین کے سوا اور کوئی نہیں رہتا تھا۔ قدیر صاحب نے اشفاق سے کہہ کر اسد کو گھر کا ایک کمرہ دلا دیا۔ کمرے میں اٹیچ باتھ کے علاوہ چھوٹے سے برآمدے کی سہولت بھی تھی۔

گھر اور اِردگرد کا ماحول خوبصورت تھا۔ ایک طرح سے اشفاق کا گھر چھوٹی اور بڑی کوٹھیوں کے سنگم پر واقع تھا۔ اشفاق کے دس مرلے والے گھر سے آگے کوٹھیوں کی جو دو قطاریں شروع ہوتی تھیں، وہ دو اور تین کنال میں تھیں۔ اقبال ٹاؤن ایک شاندار آبادی تھی، لیکن ہر ''شاندار'' میں مزید شاندار ہونے کی گنجائش ہوتی ہے۔ جس طرح جہاز میں بھی اکانومی اور فرسٹ کلاس کی درجہ بندی ہوتی ہے، اسی طرح اس شاندار آبادی میں بھی مزید شاندار آبادیاں موجود تھیں۔

جس گراؤنڈ میں قدیر صاحب کے کلب ''اے ون'' کا نیٹ لگتا تھا وہاں پانچ چھ مزید کلبوں کے نیٹ بھی لگتے تھے۔ بڑی وسیع و عریض گراؤنڈ تھی اور بڑی بارونق بھی۔ گھر سے گراؤنڈ کا فاصلہ بمشکل دو کلومیٹر ہو گا۔ اسد یہ فاصلہ پیدل ہی طے کر کے گراؤنڈ میں پہنچ جاتا تھا۔ قدیر صاحب نے اسد کو لباس کے علاوہ کھیل کے سامان کی پیشکش بھی کی تھی۔ مگر اسد نے شکریئے کے ساتھ انکار کر دیا تھا۔ شادپور سے آتے ہوئے وہ اتنے

روپے لے آیا تھا کہ وہ کپڑے، جوتے اور کھیل کا ضروری سامان اپنی جیب سے خرید سکے۔ ''اے ون کلب'' کی پریکٹس صبح و شام ہوتی تھی۔ شام کی پریکٹس میں اکثر قدیر صاحب بنفس نفیس موجود ہوتے تھے۔ وہ ایک ایک کھلاڑی پر توجہ دیتے، اُسے اپنے پاس بلاتے اور اُس کی خوبیوں اور خامیوں پر تبصرہ کرنے کے علاوہ اُسے گراں قدر مشورے دیتے۔ چند ہی دنوں میں بی ٹیم کے کپتان اشفاق کے ساتھ اسد کی گہری دوستی ہو گئی۔ وہ اشفاق کے گھر میں خود کو فیملی کے ایک فرد ہی کی طرح محسوس کرنے لگا۔ گراؤنڈ میں بھی کئی کھلاڑی جلد ہی اُس کے ساتھ بے تکلف ہو گئے۔ تاہم چند ایسے بھی تھے جو ابھی تک اُس سے فاصلہ رکھے ہوئے تھے۔ ان میں اے ٹیم کے تین چار کھلاڑی تھے۔ وہ پریکٹس کے دوران بہت لئے دیئے رہتے تھے۔ اے ٹیم کے سجاد کے ساتھ ابھی تک اسد کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اُسے پتہ چلا تھا کہ وہ کسی ٹورنامنٹ میں شرکت کے لئے کوئٹہ گیا ہوا ہے۔ لاہور میں آ کر اسد کھیل میں اتنا مگن ہوا تھا کہ اُسے اردگرد کا کچھ ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ اُس نے اپنے آس پاس اچھے کھلاڑی دیکھے تھے اور اُنہیں دیکھ کر اُس کے اندر مسابقت کا شدید جذبہ پیدا ہوا تھا اور یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہ ان کھلاڑیوں میں اپنا منفرد مقام بنائے۔

جس گھر میں وہ اشفاق کے ساتھ رہتا تھا اُس گھر کے پہلو میں دو کنال کی ایک شاندار محل نما کوٹھی تھی۔ اس کوٹھی کی وسیع و عریض بالکونی میں اکثر ایک خوبصورت لڑکی نظر آتی تھی۔ عمر اٹھارہ اُنیس سال رہی ہو گی۔ اُس کا رنگ دُودھیا اور آنکھیں گہری سیاہ تھیں۔ وہ بڑے خوبصورت رنگوں کے کپڑے پہنتی تھی یا شاید یہ بات تھی کہ ہر رنگ اُس کے جسم پر آ کر سج جاتا تھا۔ بالکونی میں اُس کی آمد عام طور پر صبح نو بجے کے بعد ہوتی تھی۔ اُس وقت اسد چونکہ کھیل سے فارغ ہو کر واپس آ چکا ہوتا تھا اور اُسے کوئی مزید کام بھی نہیں ہوتا تھا لہٰذا اکثر اُس کا اور لڑکی کا آمنا سامنا ہو جاتا تھا۔ وہ لڑکی کو اکثر اپنے کمرے کے سامنے واقع برآمدے کی طرف دیکھتے ہوئے ہی پاتا تھا۔ شروع میں تو اُس نے خیال کیا کہ شاید اس لڑکی اور اشفاق کے درمیان کوئی چکر ہے۔ مگر جلد ہی اُس کا اندازہ غلط ثابت ہو گیا۔ اُسے اشفاق کی مصروفیات میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی جس سے اس شبہے کی تصدیق ہوتی کہ وہ لڑکی میں دلچسپی لیتا ہے۔ پھر اسد نے غور کیا تو

اُسے یہ شبہ سرے سے ہی غلط نظر آیا۔ اشفاق درمیانے قد کا مخنی سا نوجوان تھا جبکہ لڑکی خاصی قد آور اور متناسب جسم کی مالک تھی۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ لڑکیاں اپنے قد کے برابر یا قد سے چھوٹے لڑکوں میں کم ہی دلچسپی لیتی ہیں اور یہی حال لڑکوں کا ہے۔ ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے کیونکہ عشق اندھا ہوتا ہے۔ لیکن بہر حال اتنا بھی اندھا نہیں ہوتا۔

لڑکی کی تین بہنیں بھی تھیں۔ یہ سب اُس سے چھوٹی تھیں۔ یہ سب جب بالکونی میں اکٹھی ہوتی تھیں تو اچھا خاصا ہنگامہ ہو جاتا۔ اسد تو فارغ ہی ہوتا تھا، اپنے کمرے کے ادھ کھلے دروازے یا کھڑکی میں سے اُن کی مستیاں دیکھتا رہتا۔ بڑی بہن اُن میں سب سے زیادہ خوبصورت تھی اور زیادہ شوخ بھی تھی۔ اُس کی ادائیں کسی بھی راہ چلتے پر بجلی گرا سکتی تھیں اور شاید وہ بجلی گرانے کے لئے ہی سب کچھ کرتی تھی۔

ایک دن چاروں بہنوں نے بالکونی میں ہی کرکٹ کھیلنی شروع کر دی۔ بالکونی کتنی بھی وسیع سہی مگر ایسی بھی نہیں تھی کہ گراؤنڈ کا کام دے سکتی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پلاسٹک کی بال بار بار اُس برآمدے میں آ کر گرنے لگی جو اسد کے کمرے کے سامنے واقع تھا۔

ہر پانچ منٹ بعد آواز آتی۔ ''بھائی جان بال......'' اسد باہر نکل کر بال واپس بالکونی میں پھینکتا، لڑکیوں کا تھینک یو وصول کرتا اور آ کر پھر سے کمرے میں کتاب کھول کر بیٹھ جاتا۔ آخر یوں ہوا کہ وہ مستقل برآمدے میں ہی کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔

ایک لڑکی نے اُوپر بالکونی سے آواز دے کر کہا۔ ''سوری! ہم آپ کو تکلیف دے رہے ہیں۔''

''نہیں، اب تو کوئی تکلیف نہیں۔ اب تو میں برآمدے میں ہی آ گیا ہوں۔ اب آپ شوق سے گیند پھینکیں۔''

لڑکیاں کھلکھلا کر ہنسیں اور پھر کورس کی شکل میں تھینک یو کی گونجدار آواز آئی۔ برآمدے میں آ کر اسد نے عملاً ایک فیلڈر کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ لڑکیاں شرما بھی رہی تھیں اور ہنس بھی رہی تھیں...... اسی دوران میں کھیل کھیل میں جھگڑا ہو گیا...... باجی بیٹنگ فرما رہی تھی۔ باجی سے چھوٹی باؤلنگ کر رہی تھی۔ چھوٹی نے ایک تیز بال کرائی تو باجی نے اُسے ہاتھ سے روک لیا۔ شور مچ گیا۔ ''آؤٹ...... آؤٹ......''

''نہیں...... یہ آؤٹ نہیں ہے۔'' باجی نے بھی چیخ کر کہا۔

ایک منٹ تو تو میں میں ہوتی رہی، پھر مقدمہ اسد کے سامنے پیش ہو گیا۔ باجی نے اُوپر بالکونی سے اسد کو مخاطب کیا اور کہا۔ ''دیکھیں جی، آپ ہی بتائیں۔ بال میرے ہاتھ کو لگی ہے۔ کیا یہ آؤٹ ہے؟''

''لگی نہیں ہے جی...... آپ نے پکڑی ہے۔'' باؤلر زور سے چیخی۔

''اچھا چلو پکڑی ہی سہی، لیکن یہ آؤٹ تو نہیں ہے۔''

سب سے چھوٹی بولی۔ ''آپ بتائیں بھائی جان! کیا یہ آؤٹ نہیں؟''

اسد نے مسکرا کر ذرا توقف کیا اور بولا۔ ''ہے تو یہ آؤٹ۔''

ایک دم ''آؤٹ آؤٹ'' کا فلک شگاف شور اُٹھا۔ باجی نے چیخ کر کہا۔ ''مگر وہ بڑی تیز بال تھی، میں نے جان بوجھ کر ہاتھ سے روکی تھی۔ ورنہ میری کنپٹی پر لگتی۔''

''کچھ بھی ہے مگر یہ آؤٹ ہے۔ اب تو بھائی جان نے بھی کہہ دیا ہے۔'' منجھلی نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ باجی سے بلا چھین لیا گیا۔ اسی تکرار میں اسد کو ''باجی'' کا نام بھی معلوم ہوا۔ اُسے باجی فریحہ کہا گیا تھا۔

اشفاق کی سپورٹس کے سامان کی دُکان تھی۔ بہت بڑی دُکان نہیں تھی لیکن اُس نے جیسے کوزے میں دریا بند کر رکھا تھا۔ کرکٹ سمیت تقریباً ہر کھیل کا سامان یہاں دستیاب تھا، اس کے علاوہ کھیلوں کے سامان مثلاً ہاکی، بیٹ، ریکٹ وغیرہ کی مرمت بھی کی جاتی تھی۔ کلب کے تمام لڑکے اشفاق کی دُکان ہی سے ضروریات خریدتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی اشفاق کا حلقہ احباب کافی وسیع تھا لہٰذا گاہکوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔

وہ صبح پریکٹس کے فوراً بعد ناشتہ کرتا تھا اور دُکان پر چلا جاتا تھا۔ اسد آ کر کچھ دیر ستاتا تھا، پھر آہستہ آہستہ اُٹھتا تھا، شیو کرتا تھا، نہاتا تھا اور ساڑھے نو بجے کے قریب ناشتہ کرتا تھا۔ چند ہفتوں میں ہی اشفاق کی والدہ جنہیں سب چھوٹے بڑے خالہ جی کہتے تھے اسد کو اپنے بچوں کی طرح چاہنے لگی تھیں۔ اشفاق کے والد فالج کے پرانے مریض تھے اور مشکل سے چل پھر سکتے تھے۔ وہ بھی اسد کے لئے ایک محبت کرنے والے بزرگ ثابت ہوئے تھے...... اگلے روز صبح اسد گراؤنڈ سے واپس آیا تو اُسے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ کل اُس نے پڑوس کی بالکونی میں ہونے والے میچ میں جو ایک غیر جانبدارانہ فیصلہ دیا

تھا، اس کا کیا نتیجہ نکلنے والا ہے۔ وہ باتھ رُوم میں گیا، ٹوتھ پیسٹ نکالنے کے لئے ٹیوب کو دبایا تو پیسٹ نے باہر آنے سے انکار کر دیا۔ اُس نے تھوڑی سی کوشش کی، پھر ذرا زور سے دبایا تو ٹیوب ایک طرف سے کریک ہوگئی اور پیسٹ بہہ نکلی۔ اُس نے جیسے تیسے پیسٹ برش پر لگائی اور برش دانتوں پر جما کر اُسے پہلا رگڑا دیا۔ یہ پہلا رگڑا ہی برش کا آخری رگڑا ثابت ہوا اور برش دو ٹکڑے ہو گیا۔ وہ اب تک ان ''حادثات'' کو ایک اتفاق ہی سمجھ رہا تھا۔ لیکن جب اُس نے شیونگ کریم نکالنے کے لئے دوسری ٹیوب اُٹھائی اور اُسے بھی بند پایا تو اُس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ سمجھ گیا کہ اُس کے ساتھ شرارت...... بلکہ شرارتیں کی گئی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اُس کا دھیان فوراً محل نما کوٹھی میں رہنے والی چاروں بہنوں کی طرف چلا گیا۔ یقیناً یہ اُنہی میں سے کسی کا کام تھا اور غالب گمان یہ تھا کہ سب سے بڑی کا کام تھا۔ کیونکہ وہ سب سے زیادہ شوخ تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور بات بھی ثابت ہوتی تھی اور وہ یہ کہ ان لڑکیوں کا اشفاق کے گھر آنا جانا تھا۔ کل کسی وقت جب وہ گھر میں نہیں تھا، اُن میں سے کوئی آئی تھی اور ٹیوبز کے منہ ایلفی وغیرہ سے بند کر کے چلی گئی تھی۔

یہی سوچتا ہوا وہ باہر برآمدے میں آیا۔ یہاں گھریلو ملازم ماجھو نے اُس کا تولیہ دھو کر الگنی پر پھیلا رکھا تھا۔ اُس نے تولیہ الگنی سے کھینچ کر واپس باتھ رُوم میں جانا چاہا تو تولیے نے اُس کے ساتھ آنے سے انکار کر دیا۔ روانی میں اسد نے تولیے کو ایک دو جھٹکے دیئے اور تب اُس پر انکشاف ہوا کہ یہ تولیہ بھی سلوشن کی بدولت الگنی سے چپکا ہوا ہے۔

اچانک بالکونی کی طرف سے لڑکیوں کا ایک دبا دبا سا قہقہہ سنائی دیا۔ اسد نے چونک کر بالکونی کی طرف دیکھا، دو ہیولے تیزی سے ایک پردے کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔ وہ سٹپٹاتا ہوا واپس کمرے میں آ گیا۔

اُس روز اسد نے خالہ جی کے پاؤں دباتے ہوئے اُن سے پڑوس کی لڑکیوں کے بارے میں پوچھا۔ خالہ جی نے جو کچھ بتایا، اُس کا خلاصہ یہ تھا۔ یہ کل پانچ بہنیں تھیں۔ ایک بہن فوت ہو چکی ہے، بھائی کوئی نہیں ہے، والد کار ڈیلر ہیں اور جیل روڈ پر اُن کا بہت بڑا شوروم ہے۔ اچھے لوگ ہیں۔ بہت امیر ہونے کے باوجود بعض امیروں والا تکبر ان میں نہیں ہے۔ دو کنال کی کوٹھی میں رہتے ہیں لیکن اپنے دس مرلے والے پڑوسیوں

کے گھر بے تکلفی سے آتے جاتے ہیں اور ہر دُکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ خالہ جی نے خاص طور سے فریحہ کی والدہ کی تعریف کی اور بتایا کہ وہ بڑی ہمدرد خاتون ہے۔

لڑکیوں نے اگلے روز بھی بالکونی میں میچ کھیلا مگر اسد نے اپنے کمرے کا دروازہ بند رکھا اور کتاب پڑھتا رہا۔ حسب توقع جلد ہی بال برآمدے میں آ گری اور بالکونی پر سے ''بھائی جان بال...... بھائی جان بال'' کی تکرار شروع ہو گئی۔ اسد باہر نہ نکلنے کا تہیہ کئے ہوئے تھا، لہٰذا وہ نہیں نکلا۔ چھوٹی لڑکی ہر بار خود ہی دروازہ کھول کر آتی رہی اور بال لے جاتی رہی۔

تین چار دن اسی طرح گزر گئے۔ پھر ایک دن دوپہر کے وقت اسد کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اُس نے دروازہ کھولا تو چاروں لڑکیاں ایک قطار میں سامنے کھڑی تھیں۔ فریحہ سب سے آگے تھی، چاروں کے چہروں پر معذرت نظر آ رہی تھی۔

آج پہلا موقع تھا کہ اسد نے فریحہ کو اس قدر قریب سے دیکھا تھا۔ وہ اُس کے اندازے سے زیادہ خوبصورت تھی۔ ترشے ہوئے بال، بنی ہوئی بھنویں، نکھری نکھری رنگت، اُس کی ہلکی بادامی آنکھیں جھیل کی طرح گہری تھیں۔

''جی فرمایئے......'' اسد نے متانت سے کہا۔

''ہم دراصل آپ سے معافی مانگنے آئے ہیں۔ اُس روز ہم نے آپ کو بہت ستایا اور آپ کا نقصان بھی کیا۔'' فریحہ سب کی ترجمانی کرتے ہوئے بولی۔

اسد نے کہا۔ ''گستاخی معاف، یہ ''ہم'' کا لفظ تو آپ خوامخواہ استعمال کر رہی ہیں۔ ورنہ میرا خیال یہی ہے کہ آپ نے اکیلے ہی...... یہ سب کچھ کیا تھا۔ کیونکہ میں نے آپ کے خلاف فیصلہ دے کر آپ کو شرمندہ کیا تھا۔''

''بائی گاڈ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں۔''

''پھر اس کا مطلب ہے کہ آپ نے بدنیتی اور ہوشیاری سے ان معصوموں کو شریک جرم کیا ہے۔ اس طرح تو یہ معاملہ اور بھی سنگین ہو جاتا ہے۔''

''اسد صاحب! آپ صرف مفروضے قائم کر رہے ہیں...... بہرحال آپ چھوڑیں ان ساری باتوں کو۔ جب ہم چل کر آپ کے پاس آ گئے ہیں اور آپ سے معذرت چاہ رہے ہیں تو پھر اس بات پر مٹی ڈالئے۔ ہم اس بات پر بھی آپ کے مشکور ہیں کہ آپ

نے خالہ جان سے ہماری شرارت کا تذکرہ نہیں کیا۔"

"اچھا چلیں آپ کے بقول ہم مٹی ڈال دیتے ہیں اس بات پر...... اب فرمایئے آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"ہم یہ چاہتی ہیں کہ آپ کل سے اُس دن کی طرح برآمدے میں تشریف فرما ہوا کریں اور ہمارا میچ دیکھا کریں۔" منجھلی نے کہا۔ اُس کا نام شاہین تھا۔

اسد نے کہا۔ "آپ سیدھی طرح یہ کیوں نہیں کہتیں کہ آپ کو بار بار گیند اُٹھا کر دینے کے لئے ایک رضا کار کی ضرورت ہے۔"

"توبہ اللہ...... کتنے شکی ہیں آپ۔" فریحہ نے کہا۔ "بائی گاڈ ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں کھیلتے ہوئے دیکھیں۔ سنا ہے کہ اشفاق بھائی کی طرح آپ بھی بڑی اچھی کرکٹ کھیلتے ہیں۔ جب آپ ہمیں کرکٹ کھیلتے ہوئے دیکھیں گے اور ہماری غلطیاں نکالیں گے تو ہمیں بڑا اچھا لگے گا۔ اس قسم کی سچویشن میں بڑا چارم ہوتا ہے۔"

"اچھا، آپ کہتی ہیں تو میں مان لیتا ہوں۔" اسد نے کہا۔

اگلے روز پھر وہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسد برآمدے میں بیٹھ گیا اور اُوپر بالکونی میں میچ ہونے لگا۔

گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اسد اپنے نئے شب و روز میں جذب ہوتا چلا جا رہا تھا۔ شہر کی تیز رفتار زندگی اُسے تنہا بیٹھنے اور سوچنے کا بہت کم موقع دیتی تھی۔ نئے نئے دوست بن رہے تھے، نئے نئے مشغلے مل رہے تھے۔ پھر کھیل کی ہنگامہ خیزی تھی۔ روزانہ کم و بیش چھ گھنٹے وہ کرکٹ کے حوالے سے ہی گزارتا تھا۔ اگر کسی وقت کوئی میچ ہوتا تو پھر یہ شرح اور بڑھ جاتی۔ لیکن اس سارے شور شرابے کے دوران میں کہیں کہیں ایسے وقفے ضرور آتے تھے جب وہ اپنے اردگرد سے بہت دُور چلا جاتا تھا...... اُس کے کانوں میں کھیتوں میں چلنے والے ٹریکٹر کی آواز گونجتی تھی، نہر کا مٹی رنگا سرخ پانی سرسراتا ہوا اُس کی سماعت میں بہتا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے دُور تک سرسوں اور کپاس کے پھول کھل جاتے تھے...... اُسے شاد پور کی یاد آتی تھی اور ساتھ ہی شمیم کی یاد بھی۔ وہ سوچتا شمیم اس وقت کیا کر رہی ہوگی؟ اُس نے کس رنگ کے کپڑے پہنے ہوں گے؟ کیا

وہ بھی اُس کے بارے میں سوچتی ہوگی؟ کیا اُسے اسد کی کمی محسوس ہوتی ہوگی؟ جب وہ بیاہ کر ساہیوال چلی گئی تھی تو اسد کو بھرا پرا شاد پور ایک لق و دق ویرانہ لگا تھا۔ کیا شمیم کے لئے بھی شاد پور کی رونقیں کچھ کم ہوئی تھیں؟ کبھی اُس کا دل کہتا، وہ روتی ہوگی، پچھتاتی ہوگی، سوچتی ہوگی کہ کیوں وہ اُس کی بات نہ مان سکی۔ کیوں اُسے ناراض کر کے شاد پور سے بھیج دیا؟ کبھی اُس کا دل کہتا، نہیں ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ یہ تو خام خیالی ہے۔ وہ اپنے حال میں مگن ہوگی، اپنی کتابوں میں غرق...... یہ تو خس کم جہاں پاک والا معاملہ ہوگا۔

وہ جب یاد آتی تھی، اتنی شدت سے آتی تھی کہ اسد کو اپنی رگیں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ پاؤں کے ناخنوں سے سر کے بالوں تک ایک آگ اُس کے اندر بھڑک اُٹھتی تھی۔ ایسے میں اگر وہ کھیل کے میدان میں ہوتا تھا تو بے حد جارحانہ موڈ میں آ جاتا تھا...... خاص طور سے اگر بیٹنگ کر رہا ہوتا تھا تو باؤلر کے لئے اُسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ ایک روز ایک کلب میچ میں اُس نے اتنی جارحانہ بیٹنگ کی کہ قدیر صاحب بھی بے ساختہ شاباش دینے پر مجبور ہو گئے۔ اسد کے شوق کو جو ایک اور چیز ہوا دے رہی تھی وہ کلب میں سجاد کی موجودگی تھی۔ سجاد ایک لمبا تڑنگا اور اکھڑ مزاج نوجوان تھا۔ پیشانی پر کسی پرانی چوٹ کا نشان تھا۔ وہ اُن کھلاڑیوں میں سے تھا جو نئے کھلاڑیوں کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں کرتے بلکہ اُن کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ نئے آنے والوں کو اس طرح ڈس ہارٹ کریں کہ وہ جلد از جلد کلب کو خیرباد کہہ دیں۔

سجاد اور اُس کے ایک دو دوستوں نے پہلی فرصت میں ہی اسد کو "پینڈو" کا خطاب دے دیا تھا۔ وہ اُس کی ہر حرکت کو تنقید کا نشانہ بنانے کی کوشش کرتے۔ اسد بالوں کو تیل لگاتا تو وہ اُن کو کھٹکتا، وہ لسی پیتا تو وہ اُن کو بری لگتی، اُس کے لباس کو تو وہ تنقید کا نشانہ بناتے ہی رہتے تھے۔ اسد ان ساری باتوں کا جواب کھیل کے میدان میں دیتا تھا۔ اُس کا کھیل دن بدن نکھر رہا تھا۔ اور یہ کھیل ہی اُس کے مخالفین کو ایک حد کے اندر رہنے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ اُسے مذاق کا نشانہ تو بناتے تھے مگر سجاد کے سوا کوئی بھی حد سے تجاوز نہیں کرتا تھا۔

شام کے بعد اکثر اشفاق کے دو چار دوست گھر کی بیٹھک میں جمع ہو جاتے تھے۔ دنیا جہان کی باتیں ہوتی تھیں۔ کرکٹ کے قومی کھلاڑیوں کے بیانات پر تبصرے ہوتے

تھے۔ نئی فلموں اور ڈراموں کا ذکر ہوتا۔ تازہ ترین معاشقوں کی بازگشت سنائی دیتی۔

جب کوئی لڑکا آنکھوں میں خوشی کی چمک لئے میٹھے میٹھے انداز میں اپنی رومانی کامیابیوں و کامرانیوں کے قصے سناتا تو بے ساختہ اسد کے دل پر چوٹ سی لگتی۔ شمیم کا چہرہ اُس کی نگاہوں میں گھوم جاتا اور اس کے ساتھ ہی وہ برساتی بھی جس کے اندر نہ جانے کتنی بے کل راتیں اسد نے شمیم کے انتظار میں گزاری تھیں۔ اُس کے گلے میں ایک نمکین پھندا سا لگ جاتا۔ جب وہ کسی لڑکے سے اُس کی رومانی فتح کے گرما گرم واقعات سنتا، اُس کا بدن ایک خشک جنگل کی شکل اختیار کر جاتا اور اس جنگل میں دیکھتے ہی دیکھتے شعلے بھڑک اُٹھتے۔ اُس کا دل چاہتا وہ ساری مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر واپس شادپور پہنچے اور شمیم کو اُس کی بے وفائی کا مزہ چکھادے۔ اُس کے ساتھ ایسا کچھ کرے کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔

مگر بہت جلد وہ خود ہی اپنے اس خیال کو رد کر دیتا۔ وہ سوچتا کہ شمیم کو اس طرح حاصل کیا تو کیا تیر مارا؟ بات تو تب ہے جب وہ اُس کے پیار کی طاقت کو تسلیم کر لے اور خود چل کر اُس کے پاس پہنچے...... انہی دنوں ایک کلب کے ساتھ ہونے والے میچ میں اسد نے زبردست کارکردگی دکھائی۔ اُس کی ٹیم کو پانچ اوورں میں میچ جیتنے کے لئے آٹھ رنز فی اوور کی اوسط سے چالیس رنز کی ضرورت تھی اور آخری دو کھلاڑی کریز پر تھے۔ اسد نہ صرف یہ کہ تیز رفتاری سے سکور بناتا رہا بلکہ وہ آخری نمبر پر آنے والے بیٹسمین کو بڑی ہوشیاری سے باؤلنگ کا سامنا کرنے سے بچاتا بھی رہا۔ ابھی میچ کی آخری گیند باقی تھی کہ اسد نے آن سائیڈ پر ایک زوردار چوکا لگا کر اپنی ٹیم کو میچ جیتوا دیا۔ بہرحال اُسے ایک حسرت بھی رہی، اُس کا ذاتی سکور بیالیس تھا جبکہ اُس کی اپنی ہی ٹیم کے کھلاڑی سجاد کا سکور چوالیس تھا۔ وہ ایک بار پھر صرف دو رنز کے فرق سے سجاد کے برابر نہیں پہنچ سکا تھا۔ وہ مانتا تھا کہ سجاد اُس سے بہتر کھلاڑی تھا۔ مگر یہ حرفِ آخر تو نہیں تھا۔ سجاد کو لاہور کے بہترین کھلاڑیوں میں کھیلتے ہوئے چھ سال ہو گئے تھے، جبکہ اسد اب تک شادپور کی ٹوٹی پھوٹی وکٹ پر ٹوٹے پھوٹے ساز و سامان کے ساتھ اُلٹی سیدھی باؤلنگ کا سامنا کرتا رہا تھا۔ اُسے لاہور آ کر اندازہ ہوا تھا کہ کھیل کسے کہتے ہیں اور قدیر صاحب جیسے رہنما کی رہنمائی میں اپنے کھیل میں نکھار کیسے پیدا کیا جاتا ہے۔

اُسے قوی اُمید تھی کہ جلد ہی وہ اپنی ٹیم کے بہترین بیٹسمین سجاد کا ہم پلہ ہو جائے گا۔

مذکورہ میچ میں بہترین winning کارکردگی دکھانے پر اسد کی چھوٹی سی تصویر اخبار کے کھیلوں والے صفحے پر شائع ہوئی۔ نجانے کیوں یہ تصویر دیکھ کر اسد کے دل میں اُمنگ جاگی کہ یہ تصویر شمیم کی نظروں سے بھی گزرے۔ تصویر شمیم کی نظروں سے تو معلوم نہیں گزری یا نہیں مگر فریحہ اور اُس کے گھر والوں کی نظروں سے ضرور گزری۔ اُنہوں نے خالہ جی اور خالو جان (اشفاق کے والدین) کو بھی بتایا۔ سب خوش ہوئے۔

اگلے روز اچانک شادپور سے چچا شوکت کا فون آ گیا۔ یہ تیسرا فون تھا جو پچھلے دو ہفتوں میں اُنہوں نے کیا تھا۔ چچا جان نے فون پر ہی اسد کے خوب کان کھینچے۔ اُنہوں نے کہا۔ ''خبیث! پورے چار مہینے ہو گئے ہیں تجھے۔ یوں لگتا ہے کہ لاہور نہیں گیا ملک سے باہر چلا گیا ہے تو...... غلط بیانی کی بھی حد ہوتی ہے۔ ہر بار یہی کہتے ہوا اس اتوار پر آؤں گا۔''

''مم...... میں وعدہ کرتا ہوں۔''

''کوئی وعدہ نہیں......'' چچا گرجے۔ ''شام پانچ بجے سے پہلے تمہیں شادپور ہونا چاہئے۔ ورنہ میں اسی وقت گاڑی پر سوار ہو جاؤں گا لاہور آنے کے لئے۔''

''لیکن چچا جان......''

''مجھ سے بات مت کرو......'' اُنہوں نے پیار آمیز غصے سے ڈانٹا۔ ''آپا جان (اسد کی والدہ) کا رو رو کر برا حال ہو رہا ہے۔ بس فوراً سے پہلے پہنچو۔'' اُنہوں نے فون بند کر دیا۔

چار و ناچار اسد کو جانا پڑا۔ جب وہ پختہ سڑک سے شادپور جانے والے کچے پکے راستے پر مڑا تو اُس کے سینے میں ایک میٹھا میٹھا سا درد لہریں لے رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ چار مہینے بعد شمیم کو دیکھنا کیسا لگے گا۔ اُس کی خوبصورت آنکھوں میں شکووں شکایتوں کی عبارت پڑھنا کیسا تجربہ ہو گا؟ کیا وہ اُس سے بات کرے گی...... کیا وہ اپنے اٹل فیصلے کو بدلنے پر آمادہ ہو جائے گی؟...... عبداللہ کہتا تھا کہ دُوری میں جادو ہوتا ہے۔ کیا یہ جادو شمیم کی بے رُخی پر بھی چلے گا؟

مگر شادپور پہنچ کر اُس کی ساری اُمیدوں پر اوس پڑ گئی۔ شمیم تو شادپور میں تھی ہی

نہیں۔ ایک ہفتہ ہوا وہ خالہ صباحت کے گھر گئی ہوئی تھی۔ خالہ کے ہاں بچے کی پیدائش ہونے والی تھی۔ خالہ سے شمیم کو بہت پیار تھا۔ وہ اُن کے گھر کی دیکھ بھال اور کام کاج کے لئے چلی گئی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اسد کو ہر اُس فرد سے رقابت محسوس ہوتی تھی جو شمیم کو پیارا لگتا تھا۔ اب بیٹھے بٹھائے اُسے بے چاری مسکین صورت خالہ صباحت پر تاؤ آنے لگا تھا۔

امی جان، ابا جان، عبداللہ اور دوسرے عزیزوں سے ملنا اُسے اچھا لگا مگر دو دن بعد ہی اُس کا دل شاد پور سے اُچاٹ ہو گیا۔ اُسے لگا جیسے شمیم کے بغیر شاد پور میں رہنا ایسے ہی ہے جیسے جسم پر کسی ایسی جگہ خارش کی جائے جہاں خارش ہو ہی نہ رہی ہو۔ تیسرے دن لاہور کی ایک اہم گراؤنڈ میں اُس کا میچ بھی تھا۔ وہ دوسرے روز رات کو ہی لاہور واپس آ گیا۔

O

رات نو بجے کا وقت تھا۔ اشفاق کے دوست آئے ہوئے تھے۔ اُس کے اکثر دوست کرکٹر ہی ہوتے تھے۔ مگر یہ دونوں لڑکے ڈیل ڈول سے کھلاڑی نظر نہیں آتے تھے۔ وہ برآمدے میں کھڑے ہو کر اشفاق سے دبی دبی سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اشفاق پہلے تو انکار میں سر ہلاتا رہا، پھر نیم رضامند نظر آنے لگا۔

اشفاق کے دوستوں میں سے ایک لمبا لڑکا گیا اور اپنی گاڑی کے اندر سے کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی شے لے آیا۔ یہ وی سی آر تھا۔ اشفاق نے بڑی خاموشی کے ساتھ اسد کے کمرے سے ٹی وی سیٹ اُٹھایا اور اُسے ڈرائنگ رُوم میں لے گیا۔

''یہ کیا کر رہے ہو بھائیو؟'' اسد نے کہا۔

''فلم دیکھنی ہے۔''

''تو میرے کمرے میں ہی دیکھ لیتے۔''

''نہیں وہاں خطرہ رہے گا۔ ابو کسی بھی وقت اندر جھانک سکتے ہیں۔''

''یار! کوئی پہلی بار تو فلم نہیں دیکھ رہے۔''

''تم بھی نرے پینڈو ہی ہو۔'' اشفاق نے سرگوشی کی۔ ''کھوتے! یہ ذرا اور طرح کی فلم ہے۔''

اسد ٹپٹا کر رہ گیا۔ ''ذرا اور طرح کی فلم'' کے بارے میں اسد نے سنا تو کئی بار تھا لیکن اس تجربے سے بچا ہوا تھا۔

اُس روز نادان دوستوں کی مہربانی سے یہ تجربہ بھی ہو گیا۔ ہالی وڈ، انڈیا اور پاکستان کی رنگیلی بھڑکیلی فلمیں تو وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا مگر یہ تو ہر حد سے گزری ہوئی تھی۔ فلم کیا تھی، بے شرمی کو تصویر کیا گیا تھا...... اُس نے آدھی فلم دیکھ کر اُٹھنا چاہا مگر اشفاق اور اُس کے دوستوں نے ''پینڈو'' کا طعنہ دے کر روک لیا۔

سارا دن اُس کا ذہن پراگندہ رہا۔ کھیل میں بھی دل نہیں لگا۔ صبح کی نیٹ پریکٹس کے بعد 25 اوورز کا ایک میچ بھی تھا۔ یہ میچ بھی اسد نے منتشر ذہن سے کھیلا۔ ذہن میں بار بار ایک ہی طرح کے مناظر گھوم رہے تھے۔ شام کی پریکٹس میں اشفاق شریک نہیں تھا کیونکہ اُسے دُکان پر کام تھا۔ اشفاق کی غیر موجودگی میں نیٹ سجاد چلاتا تھا۔ جب نیٹ سجاد چلا رہا ہوتا تھا تو اسد اکثر سخت ٹینشن میں رہتا تھا۔ اسد اپنی باری لینے کے بعد ایک نوآموز کھلاڑی کو چھوٹے اسٹارٹ سے باؤلنگ کرا رہا تھا جب اچانک اُس کے ذہن میں بجلی سی کوندی.... رات کو وہ لوگ فلم کی کیسٹ وی سی آر کے اندر ہی چھوڑ کر سو گئے تھے۔ صبح سویرے نیٹ پر آتے ہوئے کیسٹ نکالنے کا خیال اسد کو آیا تھا اور نہ اشفاق کو۔

اوہ خدایا! اگر کسی نے وی سی آر آن کر کے دیکھ لیا تو کیا ہو گا؟ خالہ جان تو اکثر ٹی وی لگا لیا کرتی تھیں......

اسد نے نیٹ پریکٹس وہیں چھوڑی اور بھاگم بھاگ گھر پہنچا۔ سب سے پہلے اُس نے خالو جان کے تاثرات دیکھے۔ وہ آرام کرسی پر نیم دراز تھے اور نارمل ہی نظر آ رہے تھے۔ خالہ جان بھی عام سے تاثرات کے ساتھ دکھائی دیں۔ مگر جب اُس نے وی سی آر پر نگاہ دوڑائی تو اُس کا کپڑا ہٹا ہوا تھا اور لگتا تھا کہ اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ ہوئی ہے۔

خالہ جان نے کہا۔ ''بیٹا اسد! آج جلدی آ گئے؟''

''بس یونہی...... کھیل جلدی ختم ہو گیا تھا۔'' پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''خالہ جان! وہاں ڈرائنگ رُوم میں کوئی گیا تو نہیں تھا؟''

''نہیں بیٹا...... تمہیں تو پتہ ہے، ڈرائنگ رُوم ہر وقت بند ہی رہتا ہے۔'' مگر پھر فوراً

وہ چونکیں اور بولیں۔ ''ہاں، ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے فریحہ آئی تھی۔ وہ کتاب ڈھونڈ رہی تھی جو پرسوں تم نے اُس سے پڑھنے کے لئے لی تھی۔'' اسد کا دل دھک سے رہ گیا۔

''تو پھر لے گئی کتاب؟'' اسد نے پوچھا۔

''مجھے تو معلوم نہیں۔ میں عصر کی نماز پڑھنے چھت پر چلی گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ کافی دیر ڈھونڈتی رہی وہ۔''

اسد کے جسم پر لرزش طاری ہوگئی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ فریحہ کتاب ڈھونڈ نہیں رہی تھی، غالباً پڑھ رہی تھی۔ اور کتاب بھی ایسی جو بچے کو بھی چند منٹ میں بالغ بنا سکتی ہے۔ اب پتہ نہیں اُس نے کیا پڑھا تھا؟ کتنا پڑھا تھا؟ اور اس کے بعد اشفاق اور اسد کے بارے میں کیا تاثر لیا تھا؟

اب تک اسد نے فریحہ کا جو تجزیہ کیا تھا اس کے مطابق وہ بے شک ایک ماڈرن اور شوخ لڑکی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُس کے اندر ایک معصوم بچپنا بھی تھا۔ اُس بچپنے کے زیر اثر وہ شرارتیں کرتی تھی اور اودھم مچاتی تھی۔ وہ اپنے شعلہ فشاں حسن اور اُس کی تباہ کاریوں سے تقریباً غافل ہی تھی۔ وہ دوپٹہ گلے میں ڈال کر بے باکی سے اشفاق اور اسد کے سامنے آ جاتی تھی اور بے تکان بولتی تھی۔ بہنوں کے ساتھ جب وہ بالکونی یا چھت پر کھیلتی نظر آتی تھی تو دوپٹہ اُس کی کمر سے بندھا ہوتا تھا۔ اُس نے چند ماہ پہلے آئی سی ایس کا امتحان دیا تھا اور اپنے کالج میں تیسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ وہ بلا کی ذہین اور خوش گفتار بھی تھی۔ مگر ان تمام اوصاف کے باوجود اپنے حسن و شباب سے غفلت کا رویہ اپنی جگہ تھا۔

اسد کو یوں لگا جیسے آج اشفاق نے اور اُس نے اپنی لاپرواہی سے فریحہ کی بے تکلف معصومیت کا تیاپانچہ کر دیا ہے...... اگلے دو تین دنوں میں اسد کا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ بالکونی میں کھیل کود تو دُور کی بات ہے اسد کو فریحہ کی جھلک تک نظر نہیں آئی۔ وہ بالکونی میں فریحہ کو آتے جاتے دیکھنے کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ کمرے میں گھومتے ہوئے اُس کی نگاہ اپنے آپ بالکونی کی طرف اُٹھتی رہتی تھی...... پھر ایک دن اُس نے فریحہ کو بالکونی میں دیکھا۔ اُس کا دوپٹہ سر پر تھا اور انداز میں نمایاں جھجک تھی۔ اسد کے ساتھ اُس کی نگاہ صرف ایک سیکنڈ کے لئے ملی، پھر وہ جلدی سے اندر چلی گئی۔

کئی دن اسی طرح گزر گئے۔ پھر ایک روز وہ خالہ جان کا بلڈ پریشر چیک کرنے کے لئے آئی تھی۔ اُن کے گھر میں بلڈ پریشر چیک کرنے کا آلہ یعنی بی پی آپریٹر موجود تھا۔ وہ گھر میں آئی تو برآمدے میں اسد کو اُس سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔

اسد نے کہا۔ ''فریحہ! آپ کے پاس ناول ''آئی لینڈ'' ہے؟''

''جی نہیں......'' وہ ذرا بے رُخی سے بولی۔

''کوئی اور اچھی کتاب؟''

''میں جسے اچھی کتاب کہوں گی وہ پتہ نہیں آپ کو کیسی لگے گی؟ کیونکہ آپ کا ذوق شریف کافی مختلف ہے۔'' وہ چبھتے لہجے میں بولی۔

اسد نے کہا۔ ''آپ کافی ناراض لگتی ہیں۔ لیکن اگر اُس روز آپ نے ڈرائنگ رُوم میں کچھ دیکھا تھا تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ بلکہ اشفاق بھی زبردستی گھسیٹا گیا تھا۔ بس اُس کے دو دوستوں نے...... خیر چھوڑیئے اس بات کو۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم میں پھر صلح ہو جائے؟''

''صلح ہو سکتی ہے۔ مگر اس کے لئے آپ کو برے دوستوں کی کمپنی چھوڑ کر اچھے دوستوں کی کمپنی اختیار کرنی ہوگی۔'' اُس نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ اپنے فقرے میں اُس نے ''اچھے دوستوں'' پر خاص انداز سے زور دیا تھا۔

اسد کو ہرگز اُمید نہیں تھی کہ یہ معاملہ اتنی جلدی سدھر جائے گا۔

وہ پھر بالکونی میں اپنی بہنوں کے ساتھ نظر آنے لگی۔ اشفاق کے گھر میں بھی آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ نجانے کیوں اسد کو محسوس ہو رہا تھا کہ فریحہ اُس میں دلچسپی لے رہی ہے۔ شروع میں تو اُس نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ اُس کا وہم ہے۔ کہاں وہ پڑھی لکھی اور بہت دولت مند گھرانے کی لڑکی، کہاں وہ گاؤں سے اُٹھ کر آنے والا عام سا لڑکا...... وہ کوئی بہت زیادہ حسین اور پُرکشش بھی نہیں تھا، نہ ہی کوئی اور ایسی بات تھی۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ وہ اچھا کھلاڑی تھا اور اشفاق کے برعکس اُس کی وضع قطع بھی کھلاڑیوں والی تھی۔ اسد کا قد چھ فٹ سے بھی تھوڑا سا نکل گیا تھا۔ دیہاتی آب و ہوا اور خاص خوراک نے اُس کی صحت میں نکھار پیدا کیا تھا...... اُس کی کلائیاں مضبوط، سینہ کشادہ اور رنگت میں ایک توانا سرخی تھی۔ درحقیقت وہ بے حد سرخ و سپید تھا۔ مگر کرکٹ

کے کھیل میں چونکہ کئی کئی گھنٹے دُھوپ میں کھڑا رہنا پڑتا تھا لہٰذا رنگ تھوڑا سا گندمی ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود اُس کی رنگت کو خوبصورت کہا جا سکتا تھا۔

اپنے اندر فریحہ کی دلچسپی کو محسوس کر کے شروع میں تو اسد کو اُلجھن سی محسوس ہوئی.... اُس کا مطمعِ نظر صرف اور صرف شمیم تھی۔ اُس کی یادیں ہمہ وقت اسد کے آس پاس رہتی تھیں...... مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل...... کبھی کبھی ''دُوری'' جذبات کی شدت کو کم بھی کرنے لگتی ہے۔ چار پانچ مہینے کی ''دُوری'' کاٹ کر جب کچھ دن پہلے اسد شادپور گیا تھا اُس کے جذبات میں بے حد شدت تھی۔ وہ جلد سے جلد شمیم کو دیکھنا چاہ رہا تھا، اُس کی بے قراریوں کا مشاہدہ کرنا چاہ رہا تھا۔ مگر شادپور پہنچ کر اُسے پتہ چلا تھا کہ وہ تو شادپور میں ہے ہی نہیں، بلکہ خالہ صباحت کی تیمارداریوں میں مصروف ہے۔ ایک دم اُس کے سلگتے جذبات پر اوس پڑ گئی تھی اور اس اوس کے اثرات ابھی تک موجود تھے۔

اب وہ دھیرے دھیرے فریحہ کو اپنے قریب محسوس کر رہا تھا۔ فریحہ کے حسن میں بہت سے رنگ تھے اور تپش تھی۔ وہ اسد کو سرما کی بھڑکتی آگ کی طرح لگی۔ اس آگ کی حرارت بندے کو جلاتی بھی ہے مگر وہ اس سے دُور بھی جانا نہیں چاہتا۔ اُن دنوں اسد نے خود کو عجیب سی اُلجھن میں محسوس کیا۔ اُسے پتہ چلا کہ انسان دو حصوں میں تقسیم کیسے ہوتا ہے؟ قدیر صاحب کھیل پر لیکچر دیتے ہوئے اکثر ''ڈبل مائنڈڈ'' کا لفظ استعمال کیا کرتے تھے۔ وہ کھلاڑیوں کو سمجھایا کرتے تھے کہ جب ایک بیٹسمین باؤنسر گیند کو زوردار طریقے سے ہُک کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ نیچے جھک کر گیند سے بچنا بھی چاہتا ہے تو وہ ڈبل مائنڈڈ ہو جاتا ہے۔ وہ ڈبل مائنڈڈ ہونا یعنی ذہن کا تقسیم ہو جانا کھلاڑی کے لئے بے حد نقصان دہ ثابت ہوتا ہے...... اسد بھی آج کل خود کو ڈبل مائنڈڈ محسوس کر رہا تھا۔ وہ فریحہ سے دُور رہنا چاہتا تھا مگر اُس کی لگاوٹ، اُس کی پُرکشش باتیں، اُس کی ماڈرن آنکھوں سے چھلکتی ہوئی ''غیر ماڈرن'' شرم، یہ سب کچھ اسد کے دل پر غیر محسوس طریق سے اثر کرتا تھا۔

پھر ایک روز ایک عجیب واقعہ ہو گیا۔ خالہ جان کچھ بیمار تھیں۔ فریحہ اپنی امی کے ساتھ اُن کی خبر گیری کے لئے آئی۔ اُس کی امی بھی ایک پڑھی لکھی نفیس خاتون تھیں۔ وہ

لیکچرار رہ چکی تھیں۔ غالباً اچھی کتابیں پڑھنے کا شوق فریحہ میں اپنی ممی کی طرف سے ہی آیا تھا۔ جس وقت فریحہ کی ممی خالہ جان کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھیں، فریحہ ٹہلتی ہوئی اسد کے کمرے کی طرف آ گئی۔ وہ ٹیپ ریکارڈر پر میوزک سن رہا تھا اور ساتھ ساتھ اپنے سپورٹس شوز پالش کر رہا تھا۔ خوشبو کا ایک لطیف جھونکا اسد کے نتھنوں سے ٹکرایا، اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا، فریحہ اُس کے سر پر کھڑی تھی۔ اُس کے خوبصورتی سے تراشے ہوئے بال اُس کے رخساروں پر جھول رہے تھے۔ وہ عنابی رنگ کی شلوار قمیض میں ملبوس تھی۔

''ہیلو...... کیسے ہیں آپ؟'' اُس کی مترنم آواز اُبھری۔

''آئی ایم فائن...... آپ کیسی ہیں؟''

''ایک دم بور ہو رہی ہوں۔ نئی نئی کلاسیں شروع ہوئی ہیں۔ نئی جگہ، نئے کلاس فیلو، بورنگ سے مضمون......''

''نئی چیزیں آپ کو بور کرتی ہیں؟''

''نہیں...... ساری تو نہیں۔'' وہ ادا سے مسکرائی۔ ''آپ بھی تو نئے ہیں۔''

''آپ کو نیا لگ رہا ہوں۔ ورنہ اتنا نیا بھی نہیں ہوں۔''

''اچھا...... کتنے پرانے ہیں آپ؟''

''تقریباً اکیس سال۔''

''نہیں، ٹھیک ٹھیک بتائیں۔ اتنے سال، اتنے مہینے بلکہ تاریخ پیدائش بتائیں۔''

اسد نے تاریخ پیدائش بتائی تو وہ چہک اُٹھی۔ ''ارے آپ بھی میری طرح عقرب ہیں۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے عقرب دو۔''

آخری الفاظ جیسے بے اختیار ہی اُس کی زبان سے نکل گئے تھے۔ زبان کی اس پھسلن نے شرم کا ایک لہریہ سا اُس کے چہرے پر بکھیر دیا۔

''مجھے ان برجوں وغیرہ پر اور ستاروں کے احوال پر کچھ زیادہ یقین نہیں ہے۔''

''یہ بھی عقرب ہی کی نشانی ہے اسد صاحب! عقرب افراد کسی بات پر آسانی سے یقین نہیں کرتے...... ویسے جناب! یہ لوگ ہوتے مزیدار ہیں۔'' اُس نے ایک لمحہ توقف کیا، پھر بولی۔ ''اچھا چھوڑیں ان باتوں کو...... یہ آپ نے مہدی حسن کی کیسٹ لگا رکھی ہے غالباً۔''

''ہاں...... یہ مہدی صاحب کی کولیکشن ہے۔ میں سکول کے زمانے سے فین ہوں ان کا۔''

''مہدی صاحب کی کوئی اور کیسٹ ہوگی آپ کے پاس؟''

''آپ نے سننی ہے تو یہی لے جائیں۔''

''نہیں...... کوئی غزلیں وغیرہ۔''

''ہاں غزلیں بھی ہیں لیکن ذرا ڈھونڈنی پڑیں گی۔ میں ابھی ملازم کے ہاتھ بھجوا دیتی ہوں۔''

''بہت شکریہ...... میں شام تک لوٹا دوں گی۔''

''بھئی اتنا بھی پُر تکلف ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ سن لیں دو چار دن۔ ایسی کوئی جلدی نہیں۔'' فریحہ چلی گئی...... سہ پہر کے وقت اسد نے کیسٹ بھجوا دی۔

تیسرے روز کی بات ہے۔ اشفاق شاپ پر جا چکا تھا۔ خالہ جان گھریلو ملازم ماجھو کے ساتھ قریبی کلینک میں گئی ہوئی تھیں۔ خالو جان چھت پر دُھوپ سینک رہے تھے۔ فون کی گھنٹی بجی۔ اسد نے کامن روم میں جا کر فون اُٹھایا۔ دوسری طرف کی آواز سن کر وہ بری طرح چونک گیا۔ یہ فریحہ کی آواز تھی۔

''ہیلو آپ...... کہاں سے بات کر رہی ہیں آپ؟''

''آپ کے بالکل قریب سے...... یعنی اپنے گھر سے۔''

''تو پھر محکمہ ٹیلیفون کو بیچ میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟ اپنے گھر کی کوئی بھی کھڑکی کھول کر ہم میں سے کسی کو مخاطب کر لیا ہوتا۔''

''یہ فون بھی تو ایک کھڑکی جیسا ہی ہوتا ہے۔'' وہ اجنبی سی آواز میں بولی۔

''مگر اس کھڑکی میں پردہ لگا ہوتا ہے۔ اور بولنے والے کی شکل نظر نہیں آتی۔''

''کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو پردے کے پیچھے سے ہی ٹھیک رہتی ہیں۔'' فریحہ کی آواز کے ارتعاش نے اسد کو چونکا سا دیا۔

''کیا بات ہے فریحہ...... آپ ٹھیک تو ہیں؟ میرا مطلب ہے آپ کی طبیعت......؟''

''میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ لیکن آپ کی طبیعت کچھ نامناسب لگتی ہے۔''

فریحہ کی باتیں اسد کو اُلجھا رہی تھیں۔ اُس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ ''میں

آپ کی بات سمجھ نہیں پا رہا۔''

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔ بس فریحہ کی ریشم کی طرح سرسراتی ہوئی سانس سنائی دیتی رہی۔ پھر اُس کی رُکی رُکی آواز آئی۔

''اسد! آپ جو کہہ رہے ہیں وہ نہیں ہو سکتا۔''

وہ مزید اُلجھ گیا۔ ''میں کیا کہہ رہا ہوں آپ سے؟''

غالباً دوسری طرف وہ مسکرائی تھی۔ ''بس زیادہ انجان نہ بنیئے... آپ کو سب معلوم ہے۔''

''کیا معلوم ہے؟''

''وہی جو آپ نے کہا ہے۔''

''یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کیا کہا ہے؟''

''بس، ہم اچھے دوست ہیں اور کچھ نہیں...... اچھا خدا حافظ''

''فریحہ...... میری بات تو سنو۔''

''خدا حافظ......'' اُس کے لہجے میں ہلکی سی شرارت بھی تھی۔

''فریحہ...... فون بند مت کرنا۔''

''خدا حافظ......'' اور اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اسد کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا...... یہ فون پر فریحہ کس طرح کی گفتگو کر گئی تھی؟ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر بیل ہوئی۔ اسد نے جا کر دروازہ کھولا۔ سامنے فریحہ کی سب سے چھوٹی بہن نادیہ جاگنگ سوٹ پہنے کھڑی تھی۔

''یہ آپ کی کیسٹ بھائی جان!'' اُس نے کہا اور مہدی حسن کی غزلوں کی کیسٹ اسد کو تھما کر واپس چلی گئی۔

اسد خالی خالی نظروں سے کیسٹ کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک اُس کے دماغ میں پھلجھڑی سی چھوٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ تیزی سے کمرے میں آیا۔ اُس نے کیسٹ کو ٹیپ ریکارڈر میں ڈال کر تھوڑا سا ''ری وائنڈ'' کیا اور پھر پلے کر دیا۔ اُس کے جسم میں سردی کی لہر دوڑنے لگی۔ اُس کی اپنی ہی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''تمہیں خبر نہیں میرے دن رات کتنی بے چینی سے گزر رہے ہیں۔ میرا ہر پل تمہارے لئے انتظار کی سولی پہ [illegible] ہے...... بس میرا کمرہ ہے اور تمہارا انتظار ہے۔ یہ انتظار میرے جسم میں،

میرے خون اور میری رُوح میں اندر تک اُترتا چلا جا رہا ہے۔ میں کچھ زیادہ نہیں کہوں گا۔ کیونکہ زیادہ کہنے کا حوصلہ نہیں رہا۔ بس اتنا کہتا ہوں کہ گزری راتوں کی طرح آج رات بھی میں تمہارا انتظار کروں گا۔ یوں تو یہ انتظار ساری رات کا ہوگا لیکن نو بجے سے ساڑھے دس بجے تک اس انتظار کی شدت انتہا کو چھوتی رہے گی......"

اسد نے ٹیپ ریکارڈ بند کیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا...... اُس نے یہ آواز کئی ماہ پہلے شمیم کے لئے ریکارڈ کی تھی۔ لیکن اُسے بھیجی نہیں تھی۔ اپنے ان ریکارڈ شدہ جملوں میں اُس نے احتیاطاً کہیں بھی شمیم کا نام نہیں لیا تھا۔ کل یا پرسوں یہی آواز فریحہ نے سنی اور اُسے خود سے منسوب کر لیا تھا۔ یہ ساری حالات کی کرشمہ کاری تھی اور اس کرشمہ کاری نے اسد کو ششدر کر دیا تھا۔

یہ ایک ایسا اظہارِ محبت تھا جو اسد ہرگز کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اور اگر وہ کرنا چاہتا بھی تو شاید کر نہ سکتا۔ لیکن یہ ہو گیا تھا اور اتنی شدت سے ہوا تھا کہ الاماں...... یعنی سیدھے سیدھے اُس نے لڑکی کو اپنے کمرے میں بلا لیا تھا۔ اسد کے دل کی کیفیت عجیب سی ہو گئی۔ ایک بار تو اُس کے دل میں آئی کہ وہ فون اُٹھا کر فریحہ کا نمبر ڈائل کرے اور اُسے بتا دے کہ حقیقت کیا ہے۔ مگر پھر وہ یہ بھی نہ کر سکا۔

اسد کا خیال تھا کہ غالباً اب کئی دن تک فریحہ کی صورت دکھائی نہیں دے گی۔ اور اگر فریحہ نظر آئے گی بھی تو ممکن ہے کہ اُس سے ٹھیک سے بات بھی نہ کرے۔ لیکن اُس کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ فریحہ اگلے روز اُسے بالکونی میں نظر آئی۔ اُس کے بال بڑے سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ وہ بید کی کرسی پر آگے پیچھے جھول رہی تھی اور کوئی انگلش میگزین پڑھ رہی تھی۔ اُس نے اسد کو اپنی طرف دیکھتے پایا تو بڑی ادا سے میگزین چہرے کے سامنے کر لیا، تاہم کچھ ہی دیر بعد وہ ریلنگ کے سہارے آن کھڑی ہوئی اور نیچے کھیلتے بچوں سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ اس دوران میں کئی مرتبہ اسد کے ساتھ اُس کی نگاہیں بھی ملیں۔ ہر بار اُس کی شربتی آنکھوں میں شرمگیں جھلک نظر آئی۔

فریحہ کے یہ انداز اسد کے دل کو انوکھے انداز میں دھڑکانے لگے تھے۔ وہ غیر محسوس طور پر لیکن بتدریج اسد کے حواس پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ اُسی روز شام کو وہ خالو جان کی خبر گیری کے لئے اُن کے گھر بھی آئی، تاہم اسد سے اُس کا آمنا سامنا نہیں ہوا۔ اُنہی

دنوں انگلینڈ کی ٹیم کھیلنے کے لئے پاکستان آئی اور ہر طرف کرکٹ کی گہما گہمی ہو گئی۔ تین ایک روزہ میچوں کی سیریز کا ایک میچ لاہور میں بھی ہو رہا تھا۔ قدیر صاحب نے پورے کلب کو یہ میچ سٹیڈیم میں دکھانے کا اہتمام کیا تھا۔ مگر میچ سے صرف ایک دن پہلے اسد کو معلوم ہوا کہ وہ میچ دیکھنے کے لئے اپنی ٹیم کے ساتھ نہیں جا سکے گا۔ عام لوگوں کی طرح فریحہ کے والد افضال صدیقی کو بھی کرکٹ میں دلچسپی تھی۔ اُنہیں اپنے کسی بیوروکریٹ دوست سے وی آئی پی انکلوژر کے چند پاس ملے تھے۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ میچ دیکھنے جانا چاہتے تھے مگر عین موقع پر اُنہیں کام کے سلسلے میں اسلام آباد جانا پڑ گیا تھا۔ اُنہوں نے اشفاق کی ذمہ داری لگائی کہ وہ اپنی کار کے ذریعے اُن کی وائف اور بیٹیوں کو میچ دکھا لائے...... اشفاق نے اسد کو بھی ساتھ تیار کر لیا۔ اگلے روز وہ اشفاق کی 86ء ماڈل کرولا کار پر میچ دیکھنے کے لئے سٹیڈیم گئے۔ فریحہ کی منجھلی بہن شاہین اپنے امتحانات کی وجہ سے آ نہیں سکی تھی۔ گیٹ پر بدنظمی کی صورت حال تھی۔ رش کافی تھا۔ ایک دھکم پیل شروع ہو گئی۔ فریحہ کی امی یعنی آنٹی ہاجرہ نے اپنی دونوں چھوٹی بیٹیوں کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے۔ فریحہ ذرا پیچھے تھی۔ اُسے دھکا لگا تو اُس نے جلدی سے اسد کا ہاتھ تھام لیا۔ اُس کے ہاتھ کے لمس نے اُن پریشان لمحوں میں بھی اسد کو چونکا دیا۔ عجیب سا گداز اور اپنا پن تھا اُس لمس میں۔ دھکم پیل کی ایک لہر سی آئی اور فریحہ، اسد کے ساتھ آن لگی۔ اُس کے عقب میں اُس کی چھوٹی بہن نادیہ تھی۔ نادیہ کے پیچھے آنٹی ہاجرہ تھی۔ فریحہ ایک ہی لمحے میں اتنا نزدیک آ گئی تھی کہ وہ اُس کے ریشمی بدن کا ہر نشیب و فراز محسوس کر رہا تھا۔ چند لمحے بعد دھکم پیل کی کیفیت کم ہو گئی۔ مگر فریحہ نے اسد کا ہاتھ بدستور تھامے رکھا...... وہ اب گیٹ سے گزر کر قدرے کھلی جگہ پر آ گئے تھے۔ اسد کا خیال تھا کہ اب فریحہ اس کا ہاتھ چھوڑ دے گی۔ مگر وہ مسلسل تھامے رہی۔ ہاتھ کی گرفت غیر شعوری نہیں تھی اور اُس میں عجیب طرح کی گرمجوشی تھی۔

وہ میچ دیکھنے کے باوجود اسد نے نہیں دیکھا۔ اُس کے سارے خیالات کا رُخ تو فریحہ کی طرف رہا۔ اُن دونوں کی آنکھیں بار بار چار ہو رہی تھیں اور ہر بار اسد کو اُن شربتی آنکھوں میں ایک معنی خیز لگاوٹ نظر آئی تھی۔ جب وہ اس لگاوٹ کو اُس کیسٹ کے پس منظر میں دیکھتا تھا جو غلطی سے فریحہ کی طرف چلی گئی تھی تو اسد کے جسم میں

چیونٹیاں سی رینگنے لگتی تھیں۔ کیسٹ سننے کے بعد فریحہ نے فون پر جو بات چیت کی تھی اُس میں اُس نے اسد سے کہا تھا کہ اُن کے تعلق کو بس ''دوستی'' تک ہی رہنا چاہئے۔ لیکن اب اُس کی آنکھوں میں جو رنگ نظر آ رہا تھا وہ دوستی سے آگے کی چیز تھا...... اُس روز تو اشفاق نے بھی اُس سے کہہ دیا۔

''یار اسد! تم تو مجھے چھپے رستم لگ رہے ہو۔ دال میں کچھ کالا کالا نظر آ رہا ہے مجھے۔''

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے یار! کہاں وہ کروڑ پتی باپ کی پڑھی لکھی بیٹی، کہاں ہم آوارہ گرد ھلنڈرے......''

''اور پینڈو۔'' اشفاق نے اُس کا فقرہ مکمل کیا تو دونوں کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

اسد نے اشفاق کو ابھی تک وہ مہدی حسن کے کیسٹ والی بات نہیں بتائی تھی۔

اگلے روز اسد نیٹ پریکٹس کے بعد گھر واپس آیا تو فریحہ کی پوری کوٹھی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ چونک گیا۔ اُس کے دل نے گواہی دی کہ وہ لوگ گھر میں نہیں ہیں، شاید کہیں چلے گئے ہیں۔ تاہم چند منٹ بعد جب سب سے چھوٹی نادیہ نے بالکونی سے بلند آواز میں ''بھائی جان......'' پکارا تو اسد کا اندازہ غلط ثابت ہو گیا۔

''کیا بات ہے؟'' اسد نے برآمدے میں آ کر پوچھا۔

''ممی آپ کا ہی انتظار کر رہی تھیں۔ ہماری بجلی خراب ہے۔ خالہ جان نے کہا تھا کہ آپ بجلی ٹھیک کر لیتے ہیں۔''

''ہوا کیا ہے؟''

''آپ خود آ کر دیکھئے نا۔'' بالکونی سے فریحہ کی آواز آئی تو اُسے جانا ہی پڑا۔

وہ پہلے بھی دو تین بار فریحہ کے گھر جا چکا تھا۔ یہ کوٹھی باہر سے جتنی بڑی تھی اندر سے اُتنی ہی خوبصورت بھی تھی۔ اس وقت سب کچھ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ فریحہ کی والدہ نے بتایا کہ غالباً مین سوئچ سے کوئی فیوز اُڑ گیا ہے۔ فریحہ ایک ٹارچ لے آئی۔ اسد نے فیوز چیک کئے، وہ بجلی کے کام کی تھوڑی بہت سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ جلد ہی اُس نے نقص پکڑ لیا۔ اُس نے تار کا چھوٹا سا ٹکڑا مانگا۔ شاہین تار لینے چلی گئی۔ نیم تاریکی میں بس فریحہ ہی اُس کے قریب کھڑی رہ گئی۔ اُس کے بدن سے اُٹھنے والی دھیمی مہک اسد کے حواس پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ بے دھیانی میں اُس کی اُنگلی گرم تار سے چھو گئی...... اُسے

جھٹکا لگا اور تار اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

''اُوئی اللہ......'' فریحہ کے ہونٹوں سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ ''کیا کرتے ہیں......؟'' وہ احتجاجی لہجے میں بولی۔

''کبھی اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔''

''اچھا...... آپ مہربانی کر کے پیچھے ہٹ جایئے۔ میں شرفو سے کہتی ہوں وہ مکینک کو بلا لاتا ہے۔'' وہ اپنائیت آمیز ناراضگی سے بولی۔

''مس صاحبہ! بجلی ٹھیک کرنے والے کو مکینک نہیں، مستری کہتے ہیں۔ اور وہ یہ چھوٹا سا تار لگانے کے آپ سے ڈیڑھ دو سو روپے جھاڑ لے گا۔''

ایک دم جیسے فریحہ کے ہونٹوں سے پھسل گیا۔ ''آپ کی جان سے تو کچھ بھی قیمتی نہیں ہے۔''

''اوہو......'' اسد نے ہونٹ سکوڑ کر تعجب کا اظہار کیا۔ ''تو ہم اتنے اہم ہو گئے۔''

''آپ مستقبل کے ایک اچھے کھلاڑی ہیں اس لئے قیمتی ہیں۔'' اُس نے بات بدلی۔

اتنے میں شاہین تار لے آئی۔ اسد تار جوڑنے لگا۔ فریحہ کی جیسے جان پر بنی ہوئی تھی۔ وہ بار بار اسد کو احتیاط کرنے کا مشورہ دے رہی تھی۔ نجانے کیوں اُس کی پریشانی اسد کو لطف دے رہی تھی۔ وہ جان بوجھ کر کام کو طول دے رہا تھا۔ آخر اُس نے نقص دُور کر دیا۔ اُس نے مین سوئچ آن کیا اور کوٹھی روشن ہو گئی۔

''ونڈرفل...... آپ تو بڑے کام کے آدمی ہیں۔'' وہ شوخی سے بولی۔

''اچھا اب چیک کریں سوئچ کو۔'' اسد نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر مین سوئچ پر رکھا۔

فریحہ نے مین سوئچ آف کیا، کوٹھی ایک بار پھر گھٹا ٹوپ تاریکی میں ڈوب گئی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ فریحہ اُس کے قریب موجود تھی اور اُس کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ سرگوشی میں بولی۔

''آپ بہت قیمتی ہیں۔'' اُس نے یہ فقرہ انگریزی میں کہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسد کی کھوپڑی میں جیسے برق سی کوند گئی۔ دو نرم گرم ہونٹ اُس کے رُخسار سے چھوئے تھے اور پیچھے ہٹ گئے تھے...... وہ چلی گئی تھی۔

اسد سکتے کی حالت میں کھڑا تھا۔ پھر اُسے خیال آیا کہ وہ مین سوئچ آن کئے بغیر ہی

چلی گئی ہے۔ اُس نے مین سوئچ آن کیا اور آنٹی ہاجرہ کا شکریہ وصول کرتا ہوا باہر آ گیا۔

○

جو کچھ یہاں ہو رہا تھا وہ ہرگز اس کا خواہاں نہیں تھا۔ مگر فریحہ اتنی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی کہ اُس کی ہر مزاحمت بیکار ہوگئی تھی۔ کچھ بھی تھا، وہ ایک نوجوان تھا۔ اُس کی رگوں میں آتشیں لہو دوڑتا تھا۔ اپنے سرکش جذبوں کو تادیر لگام دینا اُس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ اگر شیمم کی یادیں اُس کے تعاقب میں نہ ہوتیں تو شاید وہ کب کا فریحہ کی طرف مائل ہو چکا ہوتا...... مگر اب وہ مزاحمت کر رہا تھا۔ اُس کا دل و دماغ مکمل طور پر دو حصوں میں بٹ چکا تھا۔ وہی ڈبل مائنڈڈ کھلاڑی والی کیفیت...... اُسے ایک تیز رفتار باؤنسر کا سامنا تھا۔ کبھی وہ جھکنا چاہتا تھا کبھی گیند کو ہٹ کرنا چاہتا تھا اور اسی کوشش میں معلق ہو کر رہ گیا تھا۔ مگر پھر ایک روز تذبذب کی اس شدید کیفیت کا خاتمہ ہو گیا......

ہفتے کی شام تھی۔ ایک میچ جیتنے کی خوشی میں ساری ٹیم اشفاق کے گھر بیٹھک میں جمع تھی۔ اسد بھی خوش تھا۔ لیکن ہمیشہ کی طرح آج بھی اُس کی خوشی میں مایوسی کی ملاوٹ تھی۔ سخت کوشش کے باوجود وہ آج بھی سجاد سے زیادہ سکور نہیں کر پایا تھا۔ سجاد کا سکور ایک سو دو رہا تھا جبکہ اسد ساٹھ پر آؤٹ ہو گیا تھا۔ اشفاق کی بیٹھک میں پارٹی کے دوران اسد نے محسوس کیا کہ سجاد بار بار برآمدے کا چکر لگاتا ہے اور اُس کی نگاہ فریحہ کی بالکونی کی طرف اُٹھ جاتی ہے۔

اسد کا ماتھا ٹھنکا۔ اُسے معلوم تھا کہ دیگر کھلاڑیوں کی طرح سجاد بھی اشفاق کے گھر آتا جاتا رہتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ فریحہ کو دیکھنے کے لئے بار بار برآمدے کی طرف جا رہا ہو؟ جلد ہی اسد کے اس اندیشے کی تصدیق ایک حفیظ نامی لڑکے کی زبانی ہو گئی۔ وہ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بولا۔ ''کیا بات ہے سجاد بھائی! تمہاری لال پری نظر نہیں آ رہی آج؟''

دوسرا لڑکا قہقہا بولا۔ ''اُس کو پتہ ہی نہیں ہوگا کہ گلفام صاحب آئے ہیں۔ ورنہ جھلک تو ضرور دکھاتی۔''

''گلفام صاحب آئے بھی تو کافی دنوں بعد ہیں نا۔ ہوسکتا ہے ناراض ہوگئی ہو۔'' تیسرا لڑکا بولا۔

حفیظ بولا۔ ''اوئے ہمارے شہزادے سے ناراض ہو کر کسی نے اپنی زندگی حرام کرنی ہے؟ لال پری اگر گلفام سے ناراض ہوگی تو پھر جورو کس کی بنے گی؟''

اشفاق بولا۔ ''یار! بالکل جاہل ہو تم لوگ...... گلفام کا جوڑ لال پری کے ساتھ نہیں، سبز پری کے ساتھ تھا...... اور دوسری بات یہ ہے باگڑ بلو! کہ یہ میرا گھر ہے اور یہ میرا پڑوس ہے۔ ہمسائے ماں پیو جائے ہوتے ہیں لہٰذا اپنی چونچیں ذرا بند ہی رکھو۔''

اس محفل میں ہونے والی گفتگو میں اسد پر یہ انکشاف ہوا کہ سجاد بھی فریحہ میں دلچسپی لیتا رہا ہے۔ بے شک یہ دلچسپی دُور دُور سے تھی مگر اسد کا دعوئی تھا کہ اگر وہ اس ''پراجیکٹ'' پر تھوڑی سی توجہ دے تو یہ رئیس زادی چھپاک سے اُس کی گود میں گر سکتی ہے۔ اس انکشاف کے بعد واقعی اس کشمکش کا فیصلہ ہو گیا جو کئی روز سے اسد کے دل و دماغ میں جاری تھی۔ اسد نے فریحہ کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔

دوسرے دن اتفاقاً ہی ایک بار پھر فریحہ کا فون آ گیا۔ بیل ہونے پر اُس نے ریسیور اُٹھایا، دوسری طرف خاموشی چھائی رہی۔ مگر سانسوں کی آواز آ رہی تھی۔ باہر سڑک پر جو موٹر سائیکل سٹارٹ تھی اُس کی آواز بھی فون لائن پر آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ دوسری طرف فریحہ ہی ہے۔

اسد نے دو تین بار ''ہیلو'' کہا مگر جواب نہیں آیا۔ ''کیا بولنے کو دل نہیں چاہ رہا؟'' اُس نے پوچھا۔ خاموشی برقرار رہی۔ اسد نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو وہی شاعرانہ بات ہوگئی کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں، صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔'' سلسلہ منقطع ہو گیا۔ دو چار منٹ بعد پھر بیل ہوئی۔ اسد نے ریسیور اُٹھا کر پوچھا۔

''ہیلو...... کون؟''

''ہیلو......'' دوسری طرف سے فریحہ کی مترنم آواز اُبھری۔ ''کیسے ہیں آپ؟''

''بہت خراب...... آپ نے گھن چکر بنا دیا ہے۔ ہر وقت آپ کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔''

''بالکل جھوٹ...... میرے بارے میں سوچتے ہیں تو چھ چھ گھنٹے کرکٹ کیسے کھیلتے ہیں؟''

''کون کافر کھیلتا ہے...... میری کرکٹ کا احوال تو کچھ قدیر صاحب سے پوچھو۔ اُن کے سر پر بال نہیں ورنہ نوچ نوچ کر گنجے ہو جاتے۔ اُن کا خیال ہے کہ مجھے کسی نے

تعویذ گھول کر پلا دیئے ہیں جو مجھے گیند نظر ہی نہیں آتی۔ پچھلے تین میچوں میں دو بار صفر پر آؤٹ ہوا ہوں۔''

''پھر تو بھئی آپ سے بالکل بات نہیں کرنی چاہیئے۔''

''ہوسکتا ہے کہ ایسا کرنے سے اور بھی ستیاناس ہو جائے۔''

''تو پھر کیا کروں میں...... آپ کی کارکردگی بہتر بنانے کے لئے؟''

''یہ تو وہی بات ہوئی کہ ڈاکٹر مریض سے پوچھے، بتایئے! آپ کو کون سی دوا دُوں؟''

''یعنی میں ڈاکٹر ہوں؟''

''بھئی آج کل تو یہی لگ رہا ہے۔''

''لگنے کی بات اور ہوتی ہے۔ حقیقت میں ہونا اور بات ہے۔ ہوسکتا ہے کہ جسے آپ ڈاکٹر کہہ رہے ہیں، وہ خود بھی چارہ گر کی تلاش میں ہو۔''

اُس روز گھر میں خالو جان کے سوا کوئی نہیں تھا...... دونوں میں قریباً ایک گھنٹہ رومانی گفتگو ہوئی...... اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ اشفاق کے شاپ جانے کے بعد اکثر خالہ جان بھی ڈاکٹر کو دکھانے کلینک چلی جاتیں۔ اسٹرائیک کی وجہ سے فریحہ کے کالج میں چھٹیاں تھیں۔ دوسری طرف اسد بھی پکی چھٹی کر چکا تھا۔ اُس کا اوڑھنا بچھونا اب کرکٹ ہی تھا۔ بس آدھے دل کے ساتھ پرائیویٹلی بی اے کی تیاری کر رہا تھا۔ نو دس بجے کے بعد وہ ایک دوسرے کو فون کرنے کے لئے بالکل آزاد ہوتے تھے۔ اُن کی گفتگو دھیرے دھیرے بے تکلف ہوتی چلی گئی۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ فریحہ اس معاملے میں سنجیدہ ہوتی جا رہی تھی...... ایک روز اُس نے اسد کو اطلاع دیتے ہوئے کہا۔

''جناب! شاہین کو ہماری طویل کالوں کا علم ہو چکا ہے اور اُس کے ذریعے ممی کو بھی...... ممی کل دیر تک مجھے اپنے پاس بٹھا کر اُونچ نیچ سمجھاتی رہی ہیں۔ میں نے بھی اُنہیں بہت کچھ بتا دیا ہے۔ اُنہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے اندازہ ہو کہ وہ ہمارے اس تعلق کو ناپسند کرتی ہیں۔ وہ آپ کے بارے میں بھی پوچھ رہی تھیں۔ جو باتیں مجھے معلوم تھیں وہ میں نے بتائی ہیں۔''

''پھر کیا اندازہ لگایا آپ نے؟''

''آپ اندازہ لگائیں۔ کیونکہ آپ لوگ ماہر ہوتے ہیں۔ ابھی باؤلر نے گیند پھینکی

بھی نہیں ہوتی اور اُس کی اُونچ نیچ کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ یہ بھی جان لیتے ہیں کہ کس شارٹ پر سنگل سکور ہوسکتا ہے، کس پر ڈبل؟''

''لیکن یہ کھیل نہیں ہے جناب! یہ تو بڑی سنجیدہ بات ہے۔''

''واقعی؟'' وہ خوش ہو کر بولی۔

''اور نہیں تو کیا......''

''آپ بڑے تیز رفتار ہیں۔ مگر زیادہ تیز رفتاری میں کبھی کبھی آؤٹ بھی ہو جاتے ہیں۔''

''ایسے رسک تو لینے ہی پڑتے ہیں جیتنے کے لئے۔''

''رسک لینے والے مجھے اچھے لگتے ہیں۔''

''سچ مچ؟'' اسد نے پوچھا۔ فریحہ نے اثبات میں جواب دیا تو اسد نے پھر کہا۔

''مگر آپ نے تو کبھی ایک چھوٹا سا رسک بھی نہیں لیا۔''

''کیا مطلب؟''

''کیسٹ والی بات بھول گئی؟'' وہ شرارت سے بولا۔

''یو آر وری ناٹی اسد!''

''بالکل غلط۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا...... بلکہ یہ بات تو آپ میرے کمرے میں آنے کے بعد بھی نہیں کہہ سکیں گی۔''

''میں فون بند کر رہی ہوں۔'' وہ مصنوعی غصے سے بولی۔

''ارے یہ غضب نہ کریں۔ میں مان لیتا ہوں کہ آپ کو اپنا نہیں بلکہ دوسروں کا رسک لینا پسند ہے۔''

...... اُن دنوں اسد کے کھیل میں ٹھہراؤ سا آ گیا۔ اُس کے ذہن میں ہمہ وقت فریحہ کا سلگتا ہوا ریشمی بدن سرسراتا رہتا تھا۔ اُس کی سرگوشیاں، اُس کی محبت آمیز نظریں...... ان دنوں وہ کافی سنجیدگی سے فریحہ کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ شمیم اُس کے ذہن میں موجود تو تھی لیکن فاصلے پر چلی گئی تھی۔ اُس کا تصور اپنی تمام تر تڑپ اور کسک کے ساتھ ایک دُھندلے پردے میں چھپ گیا تھا...... کسی وقت وہ سوچتا اگر نوبت واقعی فریحہ سے شادی تک پہنچ گئی تو کیا ہوگا؟ کیا وہ اس سے شادی کر لے گا؟ اس کا کوئی واضح جواب تو اسد کے ذہن میں نہیں تھا۔ مگر آج کل ایک تصور بار بار اُس کے سینے میں خوشگوار

دھڑکنیں جگاتا تھا۔ وہ سوچتا کہ اُس کے گھر میں ڈھولک بج رہی ہے، سارے شاد پور میں چرچا ہے کہ اسد لاہور شہر سے ایک خوبصورت امیرزادی کو بیاہ کر لا رہا ہے۔ شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں، شمیم اس طرح ایک نیم تاریک کمرے میں گم صم بیٹھی ہے جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے اسد بیٹھا تھا اور اُس نے شمیم کی مہندی کے گیت سنے تھے۔

فریحہ، اسد کے لئے روز بروز اہم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ ان دنوں اسد کے دو ٹارگٹ تھے۔ ایک تو فریحہ کے حوالے سے سجاد کو ہرانا، دوسرے کرکٹ میں بیٹنگ کے حوالے سے سجاد کو ہرانا۔ ایک ٹارگٹ تو اُس نے حاصل کر لیا تھا، یعنی فریحہ اُس کی طرف مائل ہو گئی تھی۔ مگر دوسرا ٹارگٹ ہنوز اسد سے دُور تھا۔ بیٹنگ میں اُس کی مجموعی کارکردگی سجاد سے نہ صرف کم تھی بلکہ وہ ایک مرتبہ بھی سجاد سے زیادہ سکور نہیں کر سکا تھا۔ شاید اس کی کوئی نفسیاتی وجہ بھی تھی۔ وہ جب سجاد کے سکور کے قریب پہنچتا تھا کسی نہ کسی وجہ سے آؤٹ ہو جاتا تھا۔ ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ اننگ ختم ہو گئی اور وہ سجاد سے زیادہ سکور نہ کر سکا۔

فریحہ کے حوالے سے اسد کی برتری کی خبر اشفاق اور اسد کے ہمراز دوستوں کو معلوم ہو چکی تھی۔ سجاد اس برتری پر سٹپٹا گیا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ کر کچھ نہیں سکتا۔ اُس نے اپنا اُبال کھیل میں نکالنا شروع کر دیا۔ وہ مختلف حیلوں بہانوں سے اسد کو تنگ کرتا رہتا تھا۔ ایک دو میچوں میں اُس نے اسد کو جان بوجھ کر رن آؤٹ کرایا۔ پھر ایک بار ایسا بھی ہوا کہ اشفاق کے زخمی ہونے کی وجہ سے سجاد کپتانی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اُس نے جب یہ دیکھا کہ اسد اچھی بیٹنگ کرتے ہوئے اننگ کا ٹاپ سکورر بننے والا ہے تو اُس نے اننگ ڈکلیئر کر دی۔ اسد تھوڑی بہت باؤلنگ بھی کرا لیتا تھا۔ اُس نے اہم میچوں میں وکٹیں بھی حاصل کی تھیں۔ نیٹ پریکٹس کے دوران میں اسد جب بھی سجاد کو گیند پھینکتا وہ بڑھ چڑھ کر اُس پر شارٹ کھیلتا اور دبے لہجے میں ساتھیوں سے کہتا کہ اس نے پینڈو کو دھنک کر رکھ دیا ہے۔

ایک دن فون پر اسد کی بات فریحہ سے ہو رہی تھی۔ تین روز بعد فروری کی 24 تاریخ تھی۔ یہ فریحہ کی سالگرہ کی تاریخ تھی۔ اسد نے فریحہ کے لئے ایک خوبصورت سا تحفہ خریدا تھا۔ یہ چاندی کا ایک رِنگ تھا۔ اس میں ڈائمنڈ کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے اور نہایت باریک الفاظ میں فریحہ بھی لکھا گیا تھا۔ اسد چاہتا تھا کہ وہ خود فریحہ کو یہ Ring دے۔ اسی بہانے فریحہ اُس کے کمرے میں بھی آ سکتی تھی۔ اُس نے فون پر فریحہ سے

درخواست کی کہ وہ اس کے کمرے میں آئے۔ اُس نے فریحہ کو بتایا کہ جمعہ کی شب اشفاق کہیں جا رہا ہے، وہ گھر میں اکیلا ہو گا، لہٰذا فریحہ کو مطلق دشواری نہیں ہو گی۔

فریحہ نے کہا۔ ”نہیں بابا...... آپ نے جو کہنا ہے فون پر ہی کہہ لیں۔“

”پلیز فریحہ! اتنی سی بات بھی نہیں مان سکتی ہیں آپ؟“

”لیکن اسد! ابو آج کل جلدی آ جاتے ہیں۔“

”میں جانتا ہوں۔ لیکن وہ آج کل نو بجے تک سو بھی تو جاتے ہیں۔ آپ کسی بہانے آ سکتی ہیں۔ باہر کا دروازہ آپ کو کھلا ملے گا۔“

”نہیں اسد! یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو کیا ہو گا؟“

”تو آپ میرے لئے اتنی سی ہمت بھی نہیں کر سکتی ہیں؟“ وہ دل گرفتہ لہجے میں بولا۔

”اچھا، ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اس بارے میں سوچوں گی۔“

”سوچنا نہیں، آنا ہے۔ میں آج ساری رات ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر آپ کی راہ دیکھوں گا۔“

”آپ بڑے پینڈو ہیں... میرا مطلب ہے بڑے ضدی ہیں۔“ وہ شرارت سے بولی۔

”بڑے افسوس کی بات ہے... آپ نے پینڈو اور ضدی کو ایک ہی درجہ دے دیا ہے۔“

”توبہ توبہ...... ایک سکہ بند پینڈو کے سامنے میں ایسی گستاخی کر سکتی ہوں جناب؟“

”اچھا چھوڑیں، پھر آ رہی ہیں نا آپ؟“

اُس نے گہری سانس لی۔ ”اچھا...... وعدہ نہیں کرتی، لیکن کوشش کروں گی۔“

اسد کے دماغ میں پھلجھڑی سی چھوٹ گئی۔ وعدہ نہیں کرتی، کوشش کروں گی...... یہ الفاظ کبھی کسی اور نے بھی کہے تھے۔ کس نے کہے تھے؟ اُس کے پردۂ تصور پر شمیم کی صورت یوں اُبھر کر غائب ہوئی جیسے ٹی وی پر چینل بدلتے ہوئے کوئی چہرہ ایک لمحے کے لئے جھلک دکھا کر غائب ہو جاتا ہے...... کیا وقت اپنے آپ کو دُہرا رہا ہے؟ اُس کے ذہن سے سوال اُبھرا۔

شاید وقت واقعی خود کو دُہرا رہا تھا...... یہ شاد پور نہیں تھا، لاہور تھا۔ یہ اُس کے گھر کی برساتی نہیں تھی، اشفاق کے گھر کا کمرہ تھا...... لیکن رات وہی تھی اور اپنے محبوب کا انتظار وہی تھا۔ وہ گھڑی کی ٹک ٹک سن رہا تھا اور اُس کے کان فریحہ کے قدموں کی

چاپ پر لگے تھے۔ اُس نے بیرونی دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ رات نو بجے کے بعد فریحہ ایک دو بار اپنی کوٹھی کی نیم تاریک بالکونی میں نظر آئی، تاہم اُس کی آمد کے آثار نہیں تھے...... وہ ساری رات اسد نے کانٹوں کے بستر پر کروٹیں بدلتے گزار دی...... صبح گراؤنڈ پر بھی وہ بے حدست اور بجھا بجھا سا نظر آتا تھا۔ اُس کو ایک دو موقعوں پر قدیر صاحب سے ہلکی سی ڈانٹ بھی پڑی۔ اُنہوں نے اسد کو وارننگ دی کہ ٹرافی کے میچ شروع ہونے والے ہیں لہٰذا وہ اپنے کھیل پر توجہ دے۔

اُس روز دوپہر کو فون پر فریحہ سے مختصر بات ہوئی۔ وہ بولی۔ ''اسد! میں جانتی ہوں آپ انتظار کرتے رہے ہوں گے۔ لیکن میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں آ نہیں سکوں گی...... دراصل میں......''

اسد نے فون بند کر دیا اور کمرے میں آ کر پڑ گیا۔ اُس کا جسم جیسے بخار میں پھنک رہا تھا...... اُس نے اچھی خاصی ناراضگی دکھائی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ شاید آج رات فریحہ اپنی زیادتی کا ازالہ کر دے۔ وہ نہ چاہنے کے باوجود اُس کا انتظار کر رہا تھا...... وہ آدھی رات تک جاگتا رہا، پھر درد کے بے پناہ بوجھ تلے دب کر سو گیا...... صبح وہ گراؤنڈ پر بھی نہ جا سکا...... آج ایک حریف کلب کی ٹیم سے بڑا کانٹے دار میچ بھی تھا۔ یہ میچ اسد کی پسندیدہ گراؤنڈ یعنی اولڈ کیمپس کی گراؤنڈ پر ہو رہا تھا۔ کبھی وہ اس گراؤنڈ کے جنگلے کے ساتھ لگ کر بڑی حسرت سے سفید پوش کھلاڑیوں کو کھیلتے دیکھتا تھا، آج وہ اُن میں شامل تھا۔ وہ نو بجے کے قریب گراؤنڈ میں پہنچا۔ کچھ تو فریحہ کے رویئے کا رنج تھا، کچھ اوپر سے قدیر صاحب نے بھی ٹھیک ٹھاک ڈانٹ پلائی۔ اسد کے اندر وہی جھلاہٹ اور تپش پیدا ہو گئی جو اکثر اُس کے کھیل میں ایک خاص قسم کا سپارک پیدا کر دیتی تھی......

اُس روز کا میچ واقعی یادگار ثابت ہوا۔ یہ میچ تین طرح سے یادگار تھا۔ ایک تو ''اے ون کلب'' نے اپنے سب سے پرانے حریف شام نگر جمخانہ کو یونیورسٹی گراؤنڈ میں شکست دی۔ دوسرے اسد نے اس میچ میں ونگ کارکردگی دکھائی اور ایک سو آٹھ سکور کیئے۔ تیسری اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ آج اسد نے وہ نفسیاتی بیریئر توڑ دیا جس نے اسد کو ایک عرصے سے پریشان کر رکھا تھا۔ اُس نے سجاد سے زیادہ سکور کیا...... اور یہ کامیابی اُسے اپنی باقی ساری کامیابیوں سے اہم لگی۔

ایک بار پھر اُس کے کلب کی کامیابی کی خبر اخبار میں چھپی اور اسد کی تصویر بھی آئی۔ صبح سویرے فریحہ نے بالکونی میں آ کر اخبار لہرایا اور اسد کو سنانے کے لئے زور سے بولی۔ ''دیکھو شاہین! ذرا پہچانو، یہ کس کی تصویر ہے؟''

تصویر دیکھ کر شاہین نے بالکونی سے ہی ہانک لگائی۔ ''اسد بھائی...... دیکھیں آپ کی تصویر آئی ہے۔''

''ہاں...... دیکھی ہے میں نے۔'' اسد نے خشک لہجے میں جواب دیا اور کمرے میں چلا گیا۔

نو دس بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی۔ اسد کی توقع کے عین مطابق وہ فریحہ تھی۔ اُس کی آواز سنتے ہی اسد نے فون بند کر دیا۔

چند سیکنڈ بعد گھنٹی پھر بج اُٹھی۔ اس مرتبہ بھی فریحہ ہی تھی۔ وہ بولی۔ ''عجیب آدمی ہیں آپ...... فون بھی ٹھیک سے اٹینڈ نہیں کرتے۔''

''پینڈو ہوں نا...... شہری بنتے بنتے دیر لگے گی۔''

''پینڈو تو آپ واقعی ہیں۔ کم از کم تصویر میں تو لگ رہے ہیں۔ بندۂ خدا کوئی نئی تصویر بھیج دیتے۔''

''یہی بتانے کے لئے فون کیا تھا آپ نے؟''

''اررررر...... نہیں، میں تو آپ سے کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔''

''یوں کہئے نا کہ لیکچر دینا چاہ رہی ہیں، ایک نادان بچے کو برے بھلے کی تمیز سمجھانا چاہ رہی ہیں، اُونچ نیچ بتانا چاہ رہی ہیں۔''

''آپ تو ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ناراض لگتے ہیں۔''

''ہوں بھی تو آپ کو کیا؟''

''مجھے سب کچھ ہے جی...... بتایئے آپ کو کیسے منایا جائے؟ وہ کیا مشہور سا گانا ہے نیرہ نور کا، رُوٹھے رُوٹھے سیاں مناؤں کیسے؟''

''بہتر ہے کہ آپ وقت ضائع نہ کریں۔''

''اچھا آپ چاہتے کیا ہیں؟'' وہ روہانسی سی ہو کر بولی۔

''میں چاہتا ہوں کہ آپ اس پینڈو کو معاف کر دیں۔''

"میں جانتی ہوں آپ کا منہ کیوں بنا ہوا ہے......لیکن...... میرا مطلب ہے...... مم...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا...... آ...... آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ...... اپنی امی سے بات کریں یا پھر......"

"یہ امی ایک دم بیچ میں کیسے کود پڑیں؟" اُس نے جل کر کہا اور فون بند کر دیا۔

چند سیکنڈ بعد گھنٹی پھر بج اُٹھی۔ اُس نے ریسیور اُٹھایا۔ دوسری طرف سے فریحہ کی بوجھل بوجھل آواز آئی۔ "اچھا اسد! آپ اپنا موڈ ٹھیک کریں...... میں کوشش کروں گی۔ لیکن ابھی نہیں۔ آپ کو پتہ ہی ہے آج کل میرے بڑے انکل بچوں سمیت رہنے آئے ہوئے ہیں۔ وہ دو چار دن میں چلے جائیں گے تو پھر۔"

"وعدہ......؟"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی، پھر "ہوں" کی دلنشیں آواز اُبھری۔

اسد کے سینے میں جیسے ایک دم خوشی کے لاتعداد شادیانے بج اُٹھے۔ فریحہ کی من موہنی صورت اُس کی آنکھوں کے سامنے گھومی۔ اُس کی دلکش رنگت، خوبصورت ترشے ہوئے بال اور اُس کے جسم سے اُٹھتی ہوئی بھینی بھینی خوشبو...... اُسے لگا جیسے اُس کی اصل منزل فریحہ افضال ہی تھی۔

ان دنوں کرکٹ میں اُس کی کارکردگی بہتر ہوگئی تھی۔ اُس نے اُوپر تلے تین بار سجاد سے زیادہ سکور کیا تھا اور اُس پر اپنی برتری ثابت کر دی تھی۔ قدیر صاحب بھی اُس سے خوش تھے۔ وہ ایک طرح سے کلب میں اُن کا فیورٹ شاگرد بن گیا تھا۔

چار پانچ دن بعد فریحہ کے گھر میں آئے ہوئے مہمان رخصت ہو گئے۔ مگر وہ پھر بھی ٹال مٹول کرتی رہی۔ تاہم پھر ایک دن اُسے وعدہ کرنا ہی پڑا۔ اشفاق اور اُس کی والدہ کو اپنے ایک عزیز کی خیریت دریافت کرنے راولپنڈی جانا پڑا۔ گھر میں اشفاق کے ابو کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اُن کا کمرہ اسد کے کمرے سے کافی دُور تھا۔

اسد نے سرِ شام ہی فریحہ کا انتظار شروع کر دیا تھا۔ اُس نے ہلکی آواز میں مہدی حسن کا نغمہ لگا رکھا تھا...... عشق سچا ہے تو پھر وعدہ نبھانا ہوگا...... تم کو آنا ہوگا، تم کو آنا ہوگا......

نو بجے...... پھر دس بج گئے۔ ایک اور "انتظار کی رات" سر پر کھڑی تھی۔ اُس کے کان اُن قدموں کی چاپ پر لگے تھے جو اس ویران کمرے کو انتظار کے بے مہر چنگل

سے نکال کر وصل کا پیغام دے سکتے تھے۔ اُس نے انتظار کے موضوع پر لاتعداد شعر پڑھے تھے، کہانیاں پڑھی تھیں مگر انتظار کا اصل ذائقہ اُسے کچھ عرصہ پہلے شمیم نے چکھایا تھا۔ اور یہ تجربہ اتنا تلخ تھا کہ وہ دوبارہ اس سے گزرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر دُعا کو اثر کے ساتھ اور خواب کو تعبیر کے ساتھ اکثر بیر رہا ہے۔ حالات کی نیرنگی نے اور اس کے اندر کے شدید موسموں نے اُسے پھر سے انتظار کے جھلسے ہوئے صحرا میں پھینک دیا تھا۔ وہ آج اُس بیکراں شب کے گمبھیر اندھیرے میں پھر کسی چمکیلے ہیولے کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نقرئی پیکر اور چاند چہرے کی راہ دیکھ رہا تھا جو اُس کی محرومیوں کا مداوا ہو سکتا تھا۔

گھڑی کی سوئیاں آپس میں گلے ملنے کے لئے دھیرے دھیرے بارہ کے ہندسے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ اچانک اسد کے پورے جسم میں جلترنگ سے بج اُٹھے۔ اُسے مین گیٹ کی طرف سے مدھم آہٹ سنائی دی تھی۔ اُس نے کھڑکی سے آنکھیں گھمائیں۔ صحن کی لائٹ اُس نے بجھا رکھی تھی لہٰذا کچھ دکھائی نہیں دیا...... ہاں یہ احساس بہت واضح تھا کہ کوئی گیٹ سے گزر کر صحن میں آ گیا ہے۔ وہ اپنی دھڑکنوں کو سنبھالتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ چاپ دروازے کے بالکل پاس سنائی دی۔ اسد کی تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی تھیں۔ پھر دروازہ دھیرے سے کھلا...... ہلکے سرخ لباس کی جھلک دکھائی دی۔ پھر اسد کو فریحہ کی صورت نظر آئی...... وہ کسی ہرنی کی طرح سہمی ہوئی تھی...... وہ اندر آئی تو اسد نے آگے بڑھ کر جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔

"تھینک یو فریحہ...... تھینک یو......!" اسد کے ہونٹوں سے لرزتی آواز نکلی۔

فریحہ کے چہرے پر ایک شرگیں رنگ لہرا گیا۔ وہ پلکیں جھکائے کھڑی تھی۔ وہ اسد کو ایک ایسے لوز بال کی طرح نظر آئی جو بیٹسمین کو دعوت دیتا ہے کہ وہ آگے بڑھ کر پُرجوش سٹروک کھیلے اور اُسے باؤنڈری سے باہر پھینک دے۔ لیکن یہ پہلا موقع تھا، اسد، فریحہ کے ساتھ کوئی ایسا برتاؤ کرنا نہیں چاہتا تھا جو اُسے مزید خوفزدہ کر دے...... جذبات اُس کے اندر یورش کر رہے تھے، جسم کی دیواروں سے سر ٹکرا رہے تھے۔ اُس نے آہستگی سے فریحہ کے کندھوں پر ہاتھ رکھا، پھر اُسے گلے سے لگا لیا...... وہ تھوڑا سا کسمسائی، پھر اُس نے اسد کے لرزتے ہوئے بازوؤں میں اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔

وہ آتشیں لمحے تھے، اُن کی حدت اسد کے جسم و جان میں پھیل گئی۔ اُس کی بیتابیوں

نے فریحہ کو بکھیر دیا...... اُسے بے ترتیب کر ڈالا۔ اسد کے جنم جنم کے پیاسے ہونٹ فریحہ کے اَن چھوئے حسن سے سیراب ہونے لگے۔ وہ مزاحمت کر رہی تھی لیکن یہ ایسی مزاحمت تھی جس میں مفاہمت بھی شامل ہوتی ہے۔ وہ اُس سے دُور جانا چاہتی تھی لیکن قریب بھی رہنا چاہتی تھی۔ کئی لمحے اسی طرح گزر گئے۔ پھر وہ بیڈ پر بیٹھ گئے۔ فریحہ کا چہرہ شرم اور حدت سے تمتما رہا تھا۔ ایک لرزش سی اسد کے جسم میں بھی موجود تھی۔ اُس نے بڑے سنسنی خیز میچ کھیلے تھے، نازک ترین لمحوں میں بھی بیٹنگ کی تھی مگر ایسی لرزش کا پہلے اُسے تجربہ نہیں ہوا تھا۔

"اب خوش ہیں......؟" فریحہ نے اسد سے بمشکل آنکھیں چار کر کے شرم آلود لہجے میں پوچھا۔

"بہت زیادہ......"

"اب میں جاؤں......؟"

"کسی کی خوشی نہیں دیکھ سکتی ہو؟"

"کسی کو خوش تو دیکھ سکتی ہوں مگر کسی کو بہت زیادہ ناراض نہیں دیکھ سکتی، خاص طور سے اپنے امی ابو کو۔"

اسد نے اُس کے ہاتھ تھام لئے اور مخمور نگاہوں سے اُس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ اچانک باہر صحن میں کہیں آہٹ ہوئی۔ فریحہ بدکی ہوئی ہرنی کی طرح اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا......اب میں چلتی ہوں۔"

"پلیز......!"

"میں پھر آؤں گی۔"

"وعدہ......؟"

"ہوں......" اُس کا ہوں کہنے کا انداز بہت دلکش تھا۔

اُس کی "ہوں" پر اسد کو ایک بار پھر پیار آ گیا۔ اُس نے اپنے ہونٹوں کی مدد سے اس پیار کا عملی اظہار کیا۔ فریحہ گل رنگ چہرہ لئے واپس چلی گئی۔

وہ چلی گئی مگر اسد کو ایک دہکتے ہوئے الاؤ کے قریب چھوڑ گئی۔ یہ سوچ کا الاؤ تھا...... اُن لمحوں کی سوچ جو اسد کو دیوانہ کر گئے تھے۔ فریحہ کی مدہوش کر دینے والی قربت، اُس

کی خوشبو، اُس کا گداز، اُس کا "ہوں" کہنے کا دلفریب انداز......سب کچھ مل کر اسد کے ہوش اُڑا رہے تھے......

اگلا سارا دن اُس نے ایک عجیب نشے کی کیفیت میں گزارا...... رہ رہ کر اُس کی نگاہ بالکونی کی طرف اُٹھتی رہی مگر آج کھیلنے والے وہاں نہیں آئے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کھیلنا چاہتے ہوں لیکن اُن کی لیڈر کا ہی موڈ نہ ہو۔ ایک ہوشربا رتجگے نے اُسے نڈھال کر رکھا ہو...... کہا جاتا ہے کہ کسی اچھی چیز کو ایک مرتبہ پانے کے بعد اُسے دوبارہ پانے کی خواہش دوگنا اور سہ گنا ہو جاتی ہے۔ اسد کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ وہ پھر فریحہ کا قرب چاہتا تھا۔ ایک ریشمی رات کی تنہائی میں وہ پھر اپنے کمرے سے باہر قدموں کی نازک چاپ سننا چاہتا تھا...... ایک بار پھر اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے ہونٹوں کو اُس کے ریشمی لمس سے ہم کلام کرنا چاہتا تھا۔

دو تین روز تو فریحہ نے صورت ہی نہیں دکھائی۔ پھر بالکونی یا چھت پر اُس کی جھلک نظر آنے لگی۔ اُن کا فون بھی خراب تھا لہٰذا فون پر بھی رابطہ نہیں ہوسکتا تھا۔ اسد بڑی شدت سے فون کے ٹھیک ہونے کا انتظار کر رہا تھا...... مجموعی طور پر اُس کے یہ دن بڑے خوشگوار رہے۔ کھیل میں بھی اُس کا دل جم گیا تھا۔ اُس نے ایک بڑا کانٹے دار میچ ایک بنک کی ٹیم کے ساتھ کھیلا تھا۔ اس میچ میں اسد نے ایک بار پھر اچھی کارکردگی دکھائی۔ اُن کا کلب یہ اہم میچ جیت گیا۔ تاہم اس جیت سے بھی بڑی خوشی اسد کے لئے یہ تھی کہ اُس نے ایک بار پھر سجاد سے زیادہ سکور کیا۔ اسد نے دوسرے نمبر پر بیٹنگ کرتے ہوئے 88 رنز بنائے اور یہ سکور سجاد کے سکور سے 20 رنز زیادہ تھا۔ اس میچ میں سجاد نے ایک بہت نمایاں خباثت بھی دکھائی۔ اُس نے جان بوجھ کر اسد کو رن آؤٹ کرایا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو ممکن تھا اسد سنچری بنا ڈالتا۔

یوں تو اسد اس سے پہلے بھی کھیل میں سجاد کی خفتہ عداوت کا شکار رہتا تھا۔ مگر اس مرتبہ تو سجاد کی "دشمنی" اتنی نمایاں تھی کہ قدیر صاحب بھی چیخ پڑے۔ لنچ سے تھوڑی دیر پہلے جب سجاد آؤٹ ہو کر پویلین میں آیا تو قدیر صاحب اُسے اور اسد کو ایک علیحدہ کمرے میں لے گئے۔ اُنہوں نے واضح الفاظ میں کہا۔

"دیکھو بوائز! تم دونوں کی آپس کی کھینچا تانی سے ٹیم کو سخت نقصان ہو رہا ہے۔ میں

اندھا نہیں ہوں۔ میں بھی سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ تم مجھے ایکشن لینے پر مجبور کر رہے ہو۔''

سجاد ماتھے پر بل ڈال کر بولا۔ ''میں جانتا ہوں جناب! آپ کا اشارہ میری طرف ہی ہے۔ شاید آپ کا خیال ہے کہ میں نے جان بوجھ کر......''

''وضاحتوں کی ضرورت نہیں۔'' قدیر صاحب نے غرا کر سجاد کی بات کاٹی۔ ''میں کسی ایک کی نہیں، تم دونوں کی بات کر رہا ہوں...... جہاں تک اس رن آؤٹ کی بات ہے، اس میں سراسر تمہاری زیادتی ہے سجاد...... کسی اندھے کو بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ تم نے اسد کو غلط کال دی تھی......''

''کال میں نے ہی دی تھی۔ مگر ''ڈبل'' کا پروگرام اس کا تھا۔ اسے بڑا شوق چڑھا ہوا تھا آف سپنر کو کھیلنے کا۔ اس نے اشارے میں مجھ سے کہا تھا کہ اس مرتبہ دو سکور لینے ہیں، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔''

اسد نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو سجاد! جو ہو گیا سو ہو گیا۔ لیکن تم خوامخواہ غلط بیانی نہ کرو۔ میں نے تم سے آف سپنر کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔''

''کہہ کر مکرنے میں تم سے کوئی نہیں جیت سکتا۔ یہ تمہاری پرانی خصلت ہے۔'' سجاد جل کر بولا۔

''دیکھو سجاد! تم اپنی زبان سنبھال کر بات کرو۔'' اسد نے بھی تلخ لہجے میں کہا۔

قدیر صاحب نے دونوں کو ڈانٹا۔ اُنہوں نے کہا کہ دونوں اپنے کانوں کی کھڑکیاں کھول کر سن لیں، اُن کے کلب میں یہ سب کچھ نہیں چلے گا۔ اگر وہ باز نہیں آئے تو پھر دونوں کی چھٹی کرنا ہو گی۔''

سجاد سرخ چہرہ لئے کمرے سے باہر آیا تھا۔ اسد جانتا تھا کہ آج کی ڈانٹ نے سجاد کی جلتی پر تیل کا کام کیا ہے۔ وہ پہلے ہی اس بات پر بے حد برہم تھا کہ اشفاق کے ہمسائے میں رہنے والی خوبرو لڑکی فریحہ، اسد میں دلچسپی لے رہی ہے۔ کسی وقت تو اسد کو یوں لگتا تھا کہ وہ لڑائی جھگڑے کے لئے کوئی بہانہ تلاش کر رہا ہے۔ اُس روز شام کو ٹیم ہی کے ایک لڑکے ندیم نے اسد کو بتایا کہ سجاد تمہارے خلاف بڑے تلخ لہجے میں بول رہا تھا۔ اُس نے یہاں تک کہا ہے کہ وہ کسی دن اسد کی ٹانگیں چیر کر پھینک دے گا۔

یہ باتیں سن کر اسد بس زیرلب مسکراتا رہا۔ وہ خوفزدہ ہونے والا نہیں تھا۔ نہ ہی وہ

ضبط و تحمل کھوتا تھا۔ وہ جانتا تھا یہ سب گیدڑ بھبکیاں ہیں۔ سجاد اُس پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے سو بار سوچے گا۔ جسمانی لحاظ سے بھی اسد ہرگز سجاد سے کمزور نہیں تھا۔ اُس کا قد سجاد سے کچھ زیادہ ہی اچھا تھا۔ دیہاتی آب و ہوا اور خوراک نے اُس کے جسم کو بڑی شاندار اُٹھان دی تھی۔ سینہ کشادہ، کمر پتلی، رانیں اور کندھے مضبوط۔ وہ سر تا پا آہنی سانچے میں ڈھلا ہوا ایک توانا کھلاڑی نظر آتا تھا...... سجاد کے ساتھ اُس کی کشمکش کئی بار برداشت کی حدوں کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی مگر ایک بار بھی اسد کے ذہن میں اُس سے لڑنے جھگڑنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ وہ سجاد کی بیہودگی کا جواب کھیل کے میدان میں دینا چاہتا تھا اور بڑے اچھے طریقے سے دے بھی رہا تھا۔

اگلے روز بارش کی وجہ سے نیٹ پریکٹس کی مکمل چھٹی ہو گئی۔ اسد نے یہ موقع غنیمت جانا اور اپنے طور پر فریحہ کا ٹیلیفون ٹھیک کرانے کی کوشش کی۔ وہ لائن مین سے ملا اور اُس کی خوشامد وغیرہ کر کے فریحہ کا فون ٹھیک کرا دیا...... اپنی اس ''کارکردگی'' کا صلہ اُسے اگلے روز ملا جب فریحہ کے ساتھ فون پر اُس کی بات ہوئی۔

''آپ تو اُس روز کے بعد سے ایسے غائب ہوئی ہیں جیسے ایک مشہور جانور کے سر سے سینگ غائب ہو جاتے ہیں۔''

''آپ اپنا نام لیتے ہوئے کترا کیوں رہے ہیں؟'' وہ بھی ذرا شوخی سے بولی۔

''ہاں...... آپ شاید ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ ایک ایسی شے کا انتظار کرنا جو سرے سے موجود ہی نہ ہو گدھا پن ہی تو ہے۔''

''کون سی چیز؟''

''محبت...... یا یوں کہہ لیں کہ محبت کرنے والی ہستی۔''

''اب آپ کو اور کیا ثبوت چاہئے؟''

''تو گویا آپ نے کوئی ثبوت دیا ہے؟''

''اُس روز اتنا خطرہ مول لے کر آپ کے پاس آئی، کیا وہ ثبوت نہیں تھا؟''

''میں مذاق کر رہا ہوں فریحہ!'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ آپ نے میری خاطر کتنی دلیری دکھائی تھی...... مگر...... میں اس دل کا کیا کروں؟ اسے کسی طور چین ہی نہیں ہے۔ آپ کی طرف سے کوئی وعدہ بھی نہیں پھر بھی ہر وقت آپ کا انتظار رہتا

ہے...... پلیز فریحہ! میرا کچھ کرو۔ ورنہ میں کسی کام کا نہیں رہوں گا۔"

"کیا کروں؟" وہ مصنوعی غصے سے بولی۔

"مم... میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ آج موقع بھی اچھا ہے۔ اشفاق اور خالہ آج رات گھر میں نہیں ہوں گے۔ خالو کا آپ کو پتہ ہی ہے، وہ جلدی سو جاتے ہیں۔"

وہ تذبذب سے بولی۔ "اسد! میں کسی مشکل میں نہ پڑ جاؤں۔"

"مشکل کا تو کہیں نام و نشان ہی نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آپ آنا ہی نہ چاہتی ہوں۔" آخری الفاظ کہتے کہتے اُس کے لہجے میں ہلکی سی مایوسی اُتر آئی۔

"اچھا...... میں آپ کو سہ پہر کے وقت بتاؤں گی۔"

سہ پہر کو مقررہ وقت پر فریحہ کا فون آیا۔ کچھ ہچکچاہٹ کے بعد اُس نے آنے کا اقرار کر لیا......

ایک سیاہ ریشمی رات کی کچھ اِور حسین گھڑیاں اسد کی قسمت میں لکھی تھیں... اُس کے جاں گسل انتظار کا نتیجہ دروازے کے قریب اُبھرنے والی نازک چاپ کی صورت نکلا۔ دروازہ وا ہوا اور وہ سمٹی سمٹائی اندر آ گئی.... اسد نے اُسے بے تابی سے بانہوں میں بھر لیا۔

"اسد! کیا کرتے ہیں...... دروازہ کھلا ہے۔" وہ منمنائی۔

اسد نے دروازہ بند کیا اور وہ دونوں پھر ایک دوجے کی بانہوں میں کھو گئے...... اسد نے ان لمحوں کے لئے طویل انتظار کیا تھا۔ وہ اس انتظار کی ساری کوفت کا مداوا جیسے ایک ہی بار کر لینا چاہتا تھا۔ اُس کی وارفتگی فریحہ کو بھی منتشر کر رہی تھی۔ دونوں دیر تک ایک دوسرے میں گم رہے...... ایک دوسرے کو تلاش کرتے رہے...... پندرہ بیس منٹ جیسے پندرہ بیس سیکنڈ میں گزر گئے۔ پھر فریحہ اسد کی بانہوں کے حصار سے نکلتے ہوئے بولی۔

"اچھا، اب ذرا آپ شرافت کے دائرے میں آئیں...... مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

اسد نے اُس کے مسکراتے ہوئے ہونٹوں کو ایک بار پھر آہستگی سے چوما۔

"اچھا...... خدا حافظ۔" وہ سرخ ہوتے ہوئے بولی۔

"پرسوں آؤ گی نا؟" اسد نے پوچھا۔

"میں نے کہا ہے نا، وعدہ نہیں کر سکتی...... کوشش کروں گی۔"

OOO

اسد اور فریحہ کی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اشفاق کو پتہ چل چکا تھا مگر دوستی کے ناطے وہ خاموش تھا۔ اکثر رات گیارہ بجے کے بعد موقع دیکھ کر فریحہ اپنی وسیع کوٹھی کی بالکونی میں آتی۔ وہاں سے نیچے اشفاق کے صحن میں جھانکتی، میدان صاف دیکھ کر وہ آہستگی سے نیچے اُتر آتی۔ اشفاق کے گھر کا گیٹ اور اسد کے کمرے کا دروازہ اُسے کھلا ملتا۔ وہ اندر چلی آتی۔

دونوں ایک دوسرے میں گم ہو جاتے۔ اُن کی گرم سانسیں ایک دوجے کے کانوں میں سرگوشیاں کرتیں۔ بے تاب ہونٹ من چاہے لمس سے ہم کلام ہوتے۔ بہرحال وہ ایک حد کے اندر ہی رہتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ فریحہ پورا ایک گھنٹہ اسد کے ساتھ رہی لیکن وہ انتہا کو چھو کر بھی انتہا کو چھوتے نہیں تھے...... کسی وقت وہ باتیں کرنے لگتے، کسی وقت شکوے شکایتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ فریحہ کی خواہش تھی کہ اسد جلد از جلد اپنے والدین کو اُن کے گھر بھیجے اور وہ فریحہ کا رشتہ مانگ لیں۔ اسد ہر بار یہی کہتا تھا کہ وہ اتوار کو گاؤں جائے گا مگر وہ جاتا نہیں تھا۔ بس کوئی نہ کوئی رکاوٹ سامنے آ جاتی تھی یا پھر شاید یہ رُکاوٹیں لاشعوری طور پر اسد کی ہی پیدا کی ہوئی تھیں۔ اُسے یوں لگتا تھا جیسے فریحہ کے لئے اُس کے دل میں پہلی سی تڑپ باقی نہیں رہی۔ یوں تو فریحہ کا قرب اُسے اب بھی بے حد مرغوب تھا مگر وہ جو ایک دیوانی سی کیفیت تھی وہ بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی۔

تین چار ہفتے مزید اسی طرح گزر گئے۔ پہلے تو فریحہ قریباً ہر رات آنے لگی تھی مگر اب دو تین روز اور کبھی اس سے بھی زیادہ کا وقفہ پڑنے لگا۔ شاید فریحہ نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ اسد کے انتظار میں اب وہ پہلے کی سی شدت اور بے قراری نہیں ہے۔ ایسا کیوں تھا؟ ...... ایسا کیوں تھا؟ اسد بارہا خود سے یہ سوال پوچھتا۔

وہ ایک ابر آلود رات تھی۔ رہ رہ کر بجلی چمکتی تھی اور بادل گرجتے تھے۔ کسی وقت کھڑکیوں کے شیشوں پہ بارش کی زوردار بوچھاڑیں پڑنے لگتی تھیں۔ اسد اپنے کمرے میں لیٹا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس طوفانی موسم کے بعد کم از کم چار پانچ روز تک کرکٹ کی کوئی سرگرمی نہیں ہو سکے گی۔ ایسے موسم میں فریحہ کے آنے کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔ لہٰذا اسد نے بیرونی گیٹ بند کر دیا تھا اور کمرے کا دروازہ بھی بند تھا۔ وہ بستر پر نیم دراز تھا اور بارش کا ترنم سن رہا تھا...... اچانک...... بالکل اچانک وہ ہوا جس کی اسد کو ہرگز توقع نہیں تھی...... ایک دم اُس کے جسم میں سنسناہٹ کی لہر دوڑ گئی اور ہاتھ پاؤں پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں...... یہ اُس کا وہم نہیں تھا...... وہم کبھی اتنا واضح اور نمایاں نہیں ہوتا...... آج پھر اُس کے کانوں میں وہی آواز گونجی تھی...... وہی سرسراتی ہوئی سرگوشی جو اُس کی رگِ جاں میں اُتر جاتی تھی۔ اپنائیت سے بھرپور وہی بارُعب آواز اُس سے کہہ رہی تھی......

’’کس چکر میں ہو دوست...... لوٹ آؤ...... واپس لوٹ آؤ......!‘‘

اسد نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا جیسے اس آواز کو اپنی سماعت سے باہر دھکیلنا چاہتا ہو یا پھر اسے وہم سمجھ کر یکسر نظر انداز کرنے کا خواہاں ہو۔ مگر آواز معدوم نہیں ہوئی، کچھ اور واضح ہوگئی۔ ’’یہ لڑکی...... تمہارے قابل کہاں ہے دوست...... جو اپنے پیدا کرنے والوں کو دھوکہ دے رہی ہے...... وہ کل تمہیں بھی دھوکہ دے سکتی ہے...... وہ بالکل تمہارے لائق نہیں...... لوٹ آؤ دوست۔‘‘

اسد کا جسم پسینے میں نہا رہا تھا۔ آج یہ آواز اتنی واضح تھی کہ وہ دہشت زدہ ہونے لگا تھا۔ اُس کی عمر کا بیشتر حصہ دیہات میں گزرا تھا۔ دیہات میں توہمات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود اسد ایک روشن خیال اور حقیقت پسند شخص تھا۔ ایسی باتوں پر وہ آسانی سے یقین نہیں کرتا تھا جن کا کوئی ٹھوس جواز موجود نہیں ہوتا...... اگر وہ اپنے کسی دوست یا جاننے والے سے اس قسم کا واقعہ سنتا جو اُس کے اپنے ساتھ وقوع پذیر ہو رہا تھا تو شاید وہ اُس کی ہنسی اُڑانے لگتا۔ مگر اب وہ ہنس نہیں سکتا تھا۔ اپنے آپ پر کون ہنس سکتا ہے؟ وہی ہنس سکتا ہے جس کا ذہنی توازن درست نہ ہو۔ اور اُس کا ذہنی توازن درست تھا۔ وہ بقائمی ہوش و حواس ایک ایسی صدا سن رہا تھا جس کا ماخذ اُسے اپنے

اِردگرد نظر نہیں آ رہا تھا...... بادل زور سے گرجے۔ شیشوں پر پانی کی بوچھاڑ پڑی...... دل میں اُتر جانے والی آواز پھر اُس کی سماعت میں داخل ہوئی۔

’’تم اپنے راستے کی طرف توجہ دو میرے دوست! تمہاری منزل بہت آگے ہے۔ اور بہت بلندی پر بھی...... راستے کی اُلجھنوں میں اُلجھ جاؤ گے تو پھر تیز نہیں چل سکو گے...... تمہارے مدِمقابل تم سے آگے نکل جائیں گے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ وہ تم سے آگے نکل جائیں؟ کوئی ایسا شخص تم سے آگے نکل جائے جو دن رات تمہیں نیچا دکھانے کی فکر میں ہے اور جس کا ذہن تمہارے خلاف نفرت کے انگاروں سے بھرا ہوا ہے۔ کیا تم ایسا چاہو گے......؟‘‘

آخری الفاظ تک پہنچتے پہنچتے آواز مدھم ہوگئی۔ اچانک ایک آہٹ نے اسد کو بری طرح چونکا دیا۔ اس آہٹ نے اس ایک لمحے میں آواز کا طلسم چکنا چور کر دیا...... اسد کو لگا کہ وہ غیر مرئی آواز ایک دم اُس سے بہت دُور چلی گئی ہے۔ اُس نے اُٹھ کر دروازے کی طرف قدم بڑھائے اور باہر سے اُبھرنے والی آہٹ پر بھرپور توجہ دی۔ اس آہٹ کا ماخذ بیرونی گیٹ تھا۔ کوئی گیٹ پر ہولے ہولے دستک دے رہا تھا۔ ایک سیکنڈ میں اسد جان گیا کہ یہ فریحہ ہوگی۔ اُس نے کمرے کا دروازہ احتیاط سے کھولا اور باہر برآمدے میں آ گیا۔ بارش ہلکی ہوگئی تھی۔ اُس نے گیٹ تک کا فاصلہ دبے قدموں طے کیا اور گیٹ کھول دیا۔ سامنے فریحہ ہی تھی۔ وہ اُس کے ساتھ جلدی سے کمرے میں آ گئی۔ بارش گو ہلکی تھی پھر بھی اس نے فریحہ کو سرتاپا بھگو ڈالا تھا۔ اُس کے بال، رُخساروں اور گردن سے چپکے ہوئے تھے۔ سلک کا براؤن سوٹ جسم ہی کا حصہ دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ بھیگے ہوئے شعلے جیسی تھی۔ اسد نے ایسی حالت میں اُسے دو تین ماہ پہلے دیکھا ہوتا تو شاید دیوانہ ہو جاتا۔ لیکن اب دیوانگی والی کوئی بات نہیں تھی۔ فریحہ کا جسم اب اُس کے لئے جانا پہچانا تھا۔ وہ اُس کی بھول بھلیوں سے اسی طرح آگاہ تھا جس طرح اپنی ہتھیلی کے نشیب و فراز سے۔

’’تم بڑے وہ ہو......‘‘ فریحہ اُسے خفا نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ’’میں پانچ منٹ سے دروازے پر کھڑی ہوں۔ میں نے فون پر کہا بھی تھا کہ آؤں گی۔‘‘

’’مگر میں سمجھا کہ شاید بارش کی وجہ سے نہ آؤ...... بارش بھی تو کافی تیز تھی۔‘‘ وہ

دونوں اب ایک دوسرے کو ''تم'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

فریحہ نے گہری سانس لے کر اپنے کرتے کا دامن نچوڑا اور بولی۔ ''تم بدل گئے ہو اسد...... اب تمہیں میرے لئے دروازہ کھولنا بھی گوارا نہیں...... ایک وہ دن تھے جب ساری ساری رات دروازے کی طرف دیکھتے رہتے تھے۔''

''یہ سب تمہارا وہم ہے جان!'' اسد نے اُسے خود سے لپٹاتے ہوئے کہا۔

''آج میں یہی جاننے کے لئے آئی ہوں کہ یہ وہم ہے یا حقیقت؟'' وہ اسد کے کندھے سے لگی لگی بولی۔

''کیا مطلب؟'' اسد نے اُسے پیچھے ہٹا کر اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔

وہ دیوار سے پشت لگا کر بولی۔ ''تم اپنی امی سے بات کرنے گاؤں کیوں نہیں جاتے ہو؟''

''بھئی تمہیں بتایا بھی تھا کہ ٹورنامنٹ کے میچ ہو رہے ہیں۔ ان میچوں کے بیچ میرا لاہور سے جانا ممکن نہیں۔''

''مگر ٹورنامنٹ تو اب شروع ہوا ہے۔ تم تو پچھلے تین مہینے سے وعدے کرتے چلے آ رہے ہو...... اور جہاں تک ٹورنامنٹ کی بات ہے تم اس سے پہلے بھی ٹورنامنٹ کے دوران ہی شاد پور گئے تھے۔ شاد پور کون سا لنڈی کوتل میں ہے؟ یہ ساتھ ہی تو شیخوپورہ ہے۔ تم آدھ دن میں جا کر واپس بھی آ سکتے ہو۔''

''تم...... میری نیت پر شک کر رہی ہو؟''

''تو پھر اور کیا کروں اسد......؟'' وہ ذرا تلخی سے بولی۔ ''تمہاری ہر بات مانی ہے میں نے...... میں نے صرف ایک بات کہی ہے اور تم نے وہ بھی نہیں مانی...... اب ہر روز بچے کی طرح مجھے بہلاتے رہتے ہو۔ اس طرح تو لوگ بچے کو بھی نہیں بہلاتے...... تم نے...... کیا سمجھا ہوا ہے مجھے، کیا میں اتنی کوڑھ مغز ہوں...... اگر تم گھر والوں سے بات کرنا نہیں چاہتے تو مجھے صاف بتا دو۔ میں دوبارہ تم سے ذکر تک نہیں کروں گی۔ اتنی گری پڑی نہیں ہوں میں۔''

''دیکھو فریحہ! خوامخواہ بات کو طول مت دو۔ میں نے کہا ہے نا کہ بس تھوڑا سا انتظار......''

''مت استعمال کرو یہ لفظ...... انتظار...... انتظار......'' وہ تیزی سے اسد کی بات کاٹ کر بولی۔ ''زہر لگنے لگا ہے یہ لفظ مجھے تمہارے منہ سے...... ایسے لگتا ہے جیسے مجھے گالی دے رہے ہو۔''

فریحہ کا لہجہ تلخ تر ہو رہا تھا۔ اور یہ صرف ایک جھلک تھی۔ اسد کو محسوس ہو رہا تھا کہ تلخی کا ایک بڑا الاؤ اس لہجے کے عقب میں بھڑک رہا ہے۔ وہ چند لمحے تک فریحہ کی آنکھوں میں جھانکتا رہا، پھر ایک طویل سانس لے کر سرد لہجے میں بولا۔

''دیکھو فریحہ! اگر تم مجھ سے اُکتا گئی ہو تو مجھے صاف بتا دو.... ہم اتنی دُور نہیں گئے کہ راستے جدا نہ کر سکیں۔ شاید تم اس تعلق کو ایک کھیل سمجھتی رہی ہو۔ لیکن اگر یہ کھیل بھی تھا تو اس کھیل میں تمہارا کچھ بگڑا نہیں ہے۔ نہ ہی تم مجھ پر کسی طرح کا الزام دھر سکتی ہو۔''

''تم صاف کیوں نہیں کہتے کہ اب مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہو!...... تمہارا دل بھر گیا ہے مجھ سے......''

''ایسی کوئی بات نہیں۔ لیکن جس طرح کا رویہ تم اپنا رہی ہو ایسا ہو بھی سکتا ہے۔''

''تم جھوٹ بولتے ہو...... ایسا ہو چکا ہے...... تم مجھے بیوقوف بنا رہے ہو اور میں مزید بننا نہیں چاہتی...... میں جا رہی ہوں...... سمجھ لینا...... سمجھ لینا مر گئی ہے فریحہ......''

وہ مُڑی اور تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔

دس پندرہ منٹ گزر گئے۔ پھر اسد نے ایک دو مرتبہ اُس سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی...... اُس نے آواز سن کر فون بند کر دیا۔ پھر اسد نے بھی اُس سے مکمل بے رُخی اختیار کر لی۔ تم چھوٹے ہم روٹھے والا معاملہ نظر آ رہا تھا۔ دو تین ہفتے کے وقفے کے بعد فریحہ نے ایک بار پھر بالکونی میں نظر آنا شروع کر دیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ شاید وہ اپنے رویئے میں نرمی پیدا کر رہی ہے۔ مگر اب اسد اُسے مکمل طور پر نظر انداز کر رہا تھا۔ اُس کی تمام تر توجہ اپنے کھیل پر تھی۔ قائد اعظم ٹرافی کے میچ شروع ہونے والے تھے۔ وہ اس ٹورنامنٹ میں بھرپور کارکردگی دکھانا چاہتا تھا۔ اُسے اُمید تھی کہ اگر وہ ان میچوں میں کارکردگی دکھا سکا تو کسی اچھے بنک میں ملازمت کا راستہ کھل جائے گا۔ اگر یہ ملازمت مل جاتی تو آگے بڑھنا اُس کے لئے مزید آسان ہو جاتا۔

ان دنوں اسد میں ایک اور تبدیلی آئی تھی۔ یہ تبدیلی خود اسد کے لئے بھی خاصی

حیران کن تھی۔ وہ ایک بیٹسمین تھا اور اپنی ٹیم کا نمایاں ترین بیٹسمین تھا۔ مگر نجانے کیا بات تھی کہ اُس کی دلچسپی اب باؤلنگ میں بڑھ رہی تھی...... پتہ نہیں یہ اُس کی طبیعت کا لا اُبالی پن تھا یا کیا تھا؟ وہ کسی ایک رُخ پر اپنی توجہ زیادہ دیر مرکوز نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ نئے نئے میدان فتح کرنا چاہتا تھا، نئی نئی بلندیوں پر کمندیں پھینکنا چاہتا تھا۔ ایک آتش تھی جو اُس کے اندر بھڑکتی تھی اور اُسے بے قرار کر دیتی تھی...... کسی وقت وہ تنہائی میں بیٹھ کر اپنا تجزیہ کرتا، کرکٹ کے میدان میں اپنے سب سے بڑے حریف سجاد کی کرخت صورت اُس کی نگاہوں میں آ جاتی۔ اُسے محسوس ہوتا شاید وہ سجاد کو نیچا دکھانے کے لئے ہی شاد پور سے لاہور آیا تھا۔ وہ اے ون کلب کا بہترین اور مغرور ترین بیٹسمین تھا۔ اُس نے اسد کے ساتھ ہتک آمیز رویہ اپنایا تھا اور اُسے بیٹنگ کے میدان میں مات دینے کی بات اسد کے دماغ میں ٹھن گئی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ برس کی کوشش کے بعد اسد نے یہ کام کر دکھایا تھا۔ یعنی ایک میدان فتح کر لیا تھا۔ اب اُس کی نظر خود بخود دوسرے میدان پر جم گئی۔ اور یہ دوسرا میدان باؤلنگ کا تھا۔ سجاد ٹیم کا ایک اچھا باؤلر بھی تھا۔ اُس نے اپنی باؤلنگ کی بدولت ٹیم کو اہم میچ جیتوائے تھے۔ اکثر وہ اپنی نپی تلی باؤلنگ سے اسد کو بھی سخت پریشان کیا کرتا تھا۔ اُس کی گیندوں نے دو تین بار اسد کو شدید چوٹیں بھی لگائی تھیں...... جس روز دانستہ رن آؤٹ کرانے کی بات پر قدیر صاحب نے سجاد کو ڈانٹا تھا، اس سے صرف دو روز بعد نیٹ پریکٹس کے دوران سجاد کی ایک تیز اُٹھتی ہوئی گیند اسد کے سر میں لگی تھی اور اُسے پانچ ٹانکے لگوانے پڑے تھے۔ بظاہر تو یہ واقعہ اتفاق ہی تھا مگر اسد جانتا تھا کہ یہ کس طرح کا "اتفاق" ہے۔ سجاد نے اُس روز کی بے عزتی کا انتقام اسد کو زخمی کر کے لیا تھا...... اس قسم کی چھوٹی موٹی کارروائیاں سجاد اکثر کرتا ہی رہتا تھا۔ اسد اپنا تجزیہ کرتا تھا تو اُسے محسوس ہوتا تھا کہ اگر وہ بتدریج باؤلنگ کی طرف جا رہا ہے تو شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ سجاد کی طرح آل راؤنڈ کارکردگی دکھانا چاہتا ہے۔ ایک میدان میں شکست دینے کے بعد اب اُسے دوسرے میدان میں للکارنا چاہتا ہے۔

یہ دوسرا میدان اسد کے لئے بڑا دلچسپ ثابت ہو رہا تھا اور حیران کن نتائج بھی دے رہا تھا...... اسد کو باؤلنگ مین خاصی کامیابی ملنے لگی تھی۔ اُس نے دنیا کے نامور کرکٹ سٹارز کے واقعات پڑھے تھے۔ ان میں سے کئی کھلاڑی ایسے تھے جو کرکٹ کے

میدان میں کچھ اور بننے کے لئے آئے تھے مگر بن کچھ اور گئے تھے۔ باؤلر کی حیثیت سے ٹیم میں داخل ہونے والا سٹار بیٹسمین کا رُوپ دھار گیا تھا۔ زبردست وکٹ کیپر بعد ازاں زبردست بلے باز ثابت ہوا تھا اور بلے باز دیکھتے ہی دیکھتے کامیاب باؤلر کے سانچے میں ڈھل گیا تھا۔ اسد کو محسوس ہو رہا تھا کہ شاید اُس کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہونے والا ہے۔ اسد کا قد کاٹھ، جسمانی ساخت اور مزاج سبھی کچھ ایک بہترین باؤلر کے لئے موزوں تھا۔

پہلے پہل تو قدیر صاحب نے باؤلنگ میں اسد کی دلچسپی کو زیادہ پسند نہیں کیا۔ لیکن جب ایک روز وہ یونیورسٹی گراؤنڈ میں کلب کی اے ٹیم کا ایک میچ دیکھنے کے لئے آئے تو اسد کی باؤلنگ دیکھ کر چونک سے گئے۔ وہ آدھ پون گھنٹے کے لئے گراؤنڈ میں آئے تھے لیکن اسد کی باؤلنگ دیکھ کر وہیں جم گئے۔ وہ قریباً دو گھنٹے وہیں رہے۔ اُنہوں نے اسد کے پانچ چھ اوور دیکھے اور دبے لفظوں میں تعریف بھی کی۔ اس میچ میں اسد نے صرف تین رنز فی اوور دیئے تھے اور ایک اہم وکٹ بھی لی تھی۔ مخالف ٹیم میں تین فرسٹ کلاس کرکٹر تھے اور وہ سب اُس سے دبے دبے نظر آئے تھے۔

اگلے روز تو چھٹی تھی، اُس سے اگلے روز جب اسد نیٹ پریکٹس کے لئے گیا تو وہاں قدیر صاحب اور کلب کے مینجر عرفان صاحب بھی موجود تھے۔ قدیر صاحب نے اسد کی باؤلنگ کی تعریف کی مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ وہ اپنی زیادہ توجہ بیٹنگ کی طرف ہی رکھے۔ قائد اعظم ٹرافی کے میچ بالکل نزدیک تھے اور اسد کی حیثیت ٹیم کے کلیدی بیٹسمین کی تھی...... اسد نے نیٹ میں باؤلنگ شروع کی۔ اب وہ دس بارہ قدم کی بجائے پورے بائیس قدم کے سٹارٹ سے بال پھینکتا تھا اور خاصی سپیڈ نکالتا تھا۔ خاص طور سے جب سجاد اُس کے سامنے ہوتا تھا، اُس کی باؤلنگ میں خاص قسم کا سپارک نظر آنے لگتا تھا۔ وہی سپارک جس نے بیٹنگ میں اُسے پرموٹ کیا تھا...... اُس روز قدیر اور عرفان صاحب دھیان سے اسد کا باؤلنگ سٹائل دیکھ رہے تھے۔ اسد کی وہ گیند جو ڈل یا آف سٹمپ پر پڑنے کے بعد تیزی سے باہر کو نکلتی تھی، اُن دونوں کی خصوصی توجہ کا مرکز تھی۔ یہ گیند پھینکتے ہوئے اسد تھوڑا سا جھک جاتا تھا جس کے سبب اُسے اپنے فالو تھرو میں مشکل پیش آتی تھی۔ قدیر صاحب نے اس نقص کی نشاندہی کی اور اُسے بتایا کہ وہ یہ

خاص گیند ڈلیور کرتے ہوئے اپنے جسم کو کس پوزیشن میں رکھے۔ اُنہوں نے دو تین سٹار باؤلروں کا حوالہ بھی دیا اور اسد سے کہا کہ وہ اُن کے وڈیوز دیکھے۔

کھیل کے ان ہیجان خیز دنوں میں وہ سب کچھ بھولا ہوا تھا۔ لیکن انہی دنوں ایک چھوٹا سا حادثہ پیش آ گیا۔ اے ون کے کھلاڑی آپس میں ہی ایک میچ کھیل رہے تھے۔ اسد کی ایک تیز گیند جو اتفاقاً نو بال بھی تھی ایک مخالف کھلاڑی کے کندھے پر لگ گئی۔ کھیل میں ایسے واقعات ہو جاتے ہیں۔ مگر مضروب کھلاڑی چونکہ سجاد کا قریب ترین دوست بھی تھا اس لئے اُس نے اپنی چوٹ پر شدید ترین ردِعمل ظاہر کیا۔ اس سے پہلے کہ اسد اُس سے معذرت کر سکتا، وہ بیٹ لے کر اسد کی طرف لپکا اور اُس پر حملہ کرنا چاہا۔ دو تین کھلاڑی درمیان میں آ گئے۔ پھر بھی افضل نامی اُس کھلاڑی نے زوردار ٹانگ اسد کے سینے پر رسید کر دی۔ اب اسد کا دماغ بھی گھوم گیا۔ اُس نے افضل کو مُکا رسید کر دیا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ اسی دوران سجاد بھی پویلین سے دوڑتا ہوا آیا۔ اُس کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ تھا۔ خوش قسمتی سے قدیر صاحب بھی اُس وقت گراؤنڈ پر ہی موجود تھے۔ اس سے پہلے کہ سجاد، اسد تک پہنچتا اور لڑائی مزید سنگین ہو جاتی قدیر صاحب وکٹوں کے درمیان پہنچ گئے۔ اُنہوں نے اسد کو مضروب کھلاڑی افضل سے علیحدہ کیا۔ اس وقت تک اسد اپنے مدمقابل کو دو چار تسلی بخش ضربات لگا چکا تھا۔ اُس کے دانت ہل گئے تھے اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ قدیر صاحب نے کمال تدبر سے بپھرے ہوئے سجاد کو بھی سنبھال لیا اور اُسے ڈانٹ کر وکٹوں سے دُور ہٹا دیا۔

اس جھگڑے کا نتیجہ گو صلح صفائی کی صورت میں نکلا۔ مگر ایسی صلح صفائیوں سے دلوں کی کدورتیں کہاں صاف ہوتی ہیں؟ قدیر صاحب نے تمام کھلاڑیوں کو بٹھا کر ایک طویل لیکچر پلایا۔ اُنہوں نے خاص طور سے افضل نامی کھلاڑی کو تنبیہ کی اور اُس سے کہا کہ اگر آئندہ اُس نے اس طرح کا رویہ اپنایا تو وہ صفائی کا موقع دیئے بغیر اُسے فارغ کر دیں گے۔

اس دھینگا مُشتی کے نتیجے میں اسد کی کلائی پر بھی ضرب آئی تھی۔ کلب کے ڈاکٹر نے کلائی کا معائنہ کیا اور اسد کو ہدایت کی کہ وہ کم از کم دو ہفتے کے لئے کھیل میں حصہ نہ لے۔

جب انسان کسی سبب اچانک اپنے روز مرہ کے معمولات سے فارغ ہو جائے تو اُسے مختلف معاملات پر اطمینان سے غور و فکر کرنے کا وافر وقت مل جاتا ہے۔ اسد کو بھی

اپنی چوٹ کے سبب کھیل کی گہما گہمی سے فرصت ملی تو اُس کی سوچ کے خوابیدہ گھوڑے حرکت میں آ گئے اور مختلف اطراف میں دوڑنے لگے۔ فریحہ کی طرف سے اُس کی توجہ یکسر ہٹ چکی تھی۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ فریحہ بھی اُس پر مطلق توجہ نہیں دے رہی۔ ایک رات وہ اپنے کمرے میں بیٹھا فریحہ کے مزاج اور رویئے کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ غور کرتے کرتے اُس کے ذہن میں پھلجھڑی سی چھوٹ گئی۔ شمیم کا خیال یوں اُس کے ذہن میں آیا جیسے کسی ڈیم کے عقب میں پانی کا خوفناک دباؤ حد سے بڑھ جائے اور جھیل اچانک گیٹ وے توڑ کر بہہ نکلے۔ شمیم اُس کے ذہن میں آئی تو پھر آتی چلی گئی۔ ذہن کے نہاں خانوں میں چھپی ہوئی اُس کی یادیں جوق در جوق نکلیں اور دل و دماغ میں اودھم مچانے لگیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسد نے محسوس کیا کہ وہ فریحہ اور شمیم کا موازنہ کر رہا ہے۔ فریحہ اور شمیم میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ فریحہ نے خود کو اسد کے لئے فراہم کر دیا تھا۔ مگر شمیم نے خود کو دُور رکھ کر اسد کو تڑپایا تھا۔ اسد نے فریحہ جیسی ماڈرن اور خوبرو لڑکی کو اپنے قریب لانے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ بے شک اس کامیابی نے بھی اسد کو کچھ دُکھ دیئے تھے مگر اس نے اسد کے اندر ایک نئی توانائی بھی پیدا کی تھی۔ اس کامیابی نے اسد کو احساس دلایا تھا کہ وہ کوئی ایسا گیا گزرا نہیں تھا کہ شمیم اُسے یوں رد کرتی...... ایسی کون سی ناقابل قبول شرط رکھ دی تھی اُس نے شمیم کے سامنے؟ ایک چھوٹی سی خواہش ہی تو تھی۔ وہ اُسے اپنے پاس بلانا چاہتا تھا۔ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اُس کی محبت کی طاقت شمیم کے قدموں کو حرکت میں لا سکتی ہے یا نہیں...؟ مگر وہ انا کا پہاڑ بن گئی تھی...... جو ٹوٹ سکا تھا، نہ ہل سکا تھا نہ اپنی جگہ سے سرک سکا تھا۔

اپنی ناکامیوں اور شمیم کی کامیابیوں کے تمام مناظر یکے بعد دیگرے ایک فلم کی طرح اسد کی نگاہوں کے سامنے سے گزرتے رہے اور اُس کے حلق میں نمکین پانی جمع ہوتا رہا۔ اُس کے بدن کے جنگل میں ایک آگ سی بھڑکتی رہی۔ اگر فریحہ جیسی ماڈرن اور امیر گھرانے کی لڑکی اسد کی محبت کا دم بھر سکتی تھی اور کچے دھاگے سے بندھ کر اس کے پاس آ سکتی تھی تو شمیم کو کون سے سرخاب کے پر لگے تھے۔ اُس کی خودسری کو اسد کی بے پایاں محبت کیوں تسخیر نہیں کر سکی تھی؟ اُس نے شمیم کے ساتھ اتنی محبت کی تھی جتنی کوئی کسی کے ساتھ کر سکتا ہے...اور اس محبت کا صلہ شکست، تحقیر اور جدائی کے سوا اُسے کچھ نہیں ملا

تھا۔

وہ جاگتا رہا اور رات بھر سوچتا رہا۔ یہاں تک کہ سپیدہ سحر نمودار ہو گیا۔ جس طرح رات کا اندھیرا دن کے اُجالے میں تبدیل ہوتا ہے، جس طرح آسمان پر چاند کی جگہ سورج لے لیتا ہے، جس طرح شب کا سکوت پرندوں کی چہکار میں بدلتا ہے، اسی طرح اُس رات کی سحر بھی اسد کے دل و دماغ میں ایک نئے خیال کو وجود دے گئی۔ ایک پرانے موسم نے نئی کروٹ لی اور اسد کے آسمانِ ہستی پر چھا گیا۔

وہ جو ڈھائی تین ماہ سے مسلسل شاد پور جانے کے پروگرام بنا اور بگاڑ رہا تھا، یکدم ایک فیصلے پر پہنچ گیا...... اُس نے سوچ لیا کہ وہ شاد پور جائے گا۔

○

یہ ستمبر کے دن تھے۔ طویل گرمی اور حبس زدہ برسات کے بعد خوشگوار موسم کی ابتدا ہو چکی تھی۔ کرکٹ کے حوالے سے یہ بہار کے آغاز کا موسم تھا۔ کھیل کے میدان صاف ہو رہے تھے، گھاس تراشی جا رہی تھی، مختلف ٹورنامنٹس کی تاریخوں کے اعلان ہو رہے تھے۔ چھوٹے بڑے کرکٹ کلب اپنی نیٹ پریکٹس میں باقاعدگی لا رہے تھے۔ انگلینڈ کی ٹیم بھی پاکستان آ رہی تھی۔ مختصر یہ کہ ایک مصروف اور پُر جوش کرکٹ سیزن کی ابتدا ہونے والی تھی۔

یہ صورت حال تھی جب آٹھ دس روز کی چھٹی گزارنے کے لئے اسد لاہور سے شاد پور روانہ ہوا۔ اُس نے شاد پور اطلاع دے دی تھی۔ گھر والے اُس کی آمد کا سن کر خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ گھر والوں میں یقیناً چچا کے گھر والے بھی شامل تھے۔ اگر کسی کا شامل ہونا مشکوک تھا تو وہ شمیم ہی ہو سکتی تھی۔ اسد کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان دنوں شمیم اُس کے بارے میں کس انداز کے ساتھ کیا سوچ رہی ہے؟ وہ اب تک اُس کے لئے ایک پہیلی ہی تھی۔ شمیم کے بارے میں عمومی باتیں اسد کو وقتاً فوقتاً معلوم ہوتی رہتی تھیں۔ وہ بڑی دل جمعی سے پڑھائی کر رہی تھی...... اس کے علاوہ وہ چھوٹی نازو اور علی کے لئے ٹیوٹر کے فرائض بھی خوش اسلوبی سے انجام دے رہی تھی۔ ایک ماہ پہلے اسد کا لنگوٹیا عبداللہ لاہور آیا تھا تو اُس سے اسد کو کئی درونِ خانہ باتیں بھی معلوم ہوئی تھیں۔ عبداللہ نے بتایا تھا کہ چچی سلطانہ شمیم پر شادی کے لئے چپکے چپکے بہت زور

دیتی رہی ہے۔ مگر اب تھک ہار کر بیٹھ گئی ہے۔ وہ اپنی ایک قریبی سہیلی کے بیٹے کے لئے شمیم کی بات چلانا چاہ رہی تھی۔ اُس لڑکے کا پہلے نکاح ہوا تھا مگر رخصتی عمل میں نہیں آ سکی تھی۔ یہ لڑکا ہر لحاظ سے شمیم کے لئے موزوں تصور کیا جا سکتا تھا۔ مگر شمیم نے رو دھو کر والدہ کو اس کارروائی سے روک دیا۔

شمیم کی صورت دیکھے ہوئے اسد کو کئی ماہ گزر چکے تھے۔ قریباً پانچ ماہ پہلے وہ آخری بار شاد پور گیا تھا۔ اُس وقت شمیم شاد پور میں نہیں تھی۔ وہ خالہ صباحت کے پاس اُن کے گاؤں اٹھراں گئی ہوئی تھی۔

جب وہ لاہور سے شیخوپورہ کے لئے روانہ ہوا تو تمام راستے اُس کے ذہن میں شمیم ہی سمائی رہی۔ یوں لگتا تھا کہ پچھلے ڈیڑھ برس میں وہ ایک لمحے کے لئے بھی اُس کے ذہن سے اوجھل نہیں ہوئی۔ صرف اتنا ہوا ہے کہ اس کی موجودگی فریحہ کی چکا چوند کے پیچھے اوجھل رہی ہے جیسے دُھوپ میں ماہ و انجم اوجھل رہتے ہیں۔ وہ سوچتا رہا، شمیم اب کیسی لگتی ہو گی؟ وہ اُس سے کس طرح نگاہیں ملائے گی؟ کیا بات کرے گی...... کرے گی بھی یا نہیں؟ کیا اُس کے رویئے میں کوئی لچک پیدا ہوئی ہو گی یا وہ پہلے سے بھی زیادہ سخت ہو چکا ہو گا......؟ عبداللہ کہتا تھا کہ محبت کرنے والوں کے لئے کبھی کبھار دُوری بڑی اکسیر ثابت ہوتی ہے۔ جو باتیں قریب رہ کر اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہوتیں وہ دُور رہ کر آ جاتی ہیں۔ کیا دُور رہ کر شمیم کی سمجھ میں بھی کچھ آیا ہو گا؟ پھر سوچتے سوچتے یونہی ایک سوہانِ رُوح خیال اُس کے ذہن میں آتا اور اُس کا دل دھک سے رہ جاتا۔ شمیم سے دُور رہ کر وہ فریحہ کی طرف مائل ہو گیا تھا، کہیں اُس سے دُور رہ کر وہ بھی کسی اور رُخ پر نہ سوچنے لگی ہو...... پھر اُس کا ذہن خود ہی اپنے اس خیال کی تردید کر دیتا۔ ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔

اُس نے گھر والوں کو یہ تو بتایا تھا کہ وہ آ رہا ہے۔ مگر یہ نہیں بتایا تھا کہ کس دن اور کب آ رہا ہے؟ وہ سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ وہ شام سے تھوڑی دیر پہلے شاد پور پہنچ گیا۔ تانگے سے اُتر کر اُس نے بیگ کندھے سے لٹکایا اور کھیتوں کے کنارے کنارے چلتا اُس میدان میں پہنچ گیا جو اُس کے لئے کھیل کا پہلا ٹریننگ کیمپ تھا۔ آج بھی قصبے کے لڑکے بالے اس میدان میں جمع تھے۔ مغربی آسمان پر وہی شفق کی سرخی تھی، ٹاہلی اور

شیشم کے درختوں سے وہی مست کر دینے والی ہوا سرگوشیاں کر رہی تھی۔ آگے پیچھے بھاگتے کھلنڈروں کی وہی چیخ و پکار تھی...... ایک طرف گلی ڈنڈا ہو رہا تھا، ایک طرف والی بال کھیلا جا رہا تھا۔ درمیان میں کرکٹ تھی۔ درجنوں لڑکے بڑے شوق سے دوستانہ میچ کھیل رہے تھے۔ ایک لڑکے کی نگاہ اسد پر پڑی۔ اُس نے آنکھیں سکوڑ کر دیکھا اور پھر چیخ کر دوسرے لڑکوں کو متوجہ کیا۔ وہ سب کے سب کھیل چھوڑ چھاڑ کر اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ اُن میں اسد کے ہم عمر ساتھی بھی تھے۔ وہ اُن کے قریب پہنچا۔ اُن سب نے اُسے گھیر لیا۔ وہ اُسے بانہوں میں بھینچ بھینچ کر ملے۔ چھوٹے لڑکوں نے اُس سے مصافحہ کیا۔ انہی لڑکوں میں علی بھی شامل تھا۔ وہ بڑے بھائی کی آمد پر اور اُس کے استقبال پر خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اسد اپنے قصبے کے ہم جولیوں کے درمیان کسی ہیرو کی طرح کھڑا تھا۔

انور چودھری نامی لڑکے نے کہا۔ ''اسدی! تم تو ٹھیک ٹھاک کھلاڑی بن گئے ہو یار! میں پچھلے سے پچھلے جمعے لاہور گیا تھا۔ وہاں میں چوبرجی والی گراؤنڈ میں میچ دیکھنے رُک گیا۔ وہاں تم بھی کھیل رہے تھے۔ تمہارے نے تو ٹور ہی اور تھے۔''

شیدے نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ ''ہم اخباروں میں تیری تصویریں بھی دیکھتے رہتے ہیں۔ آلے دوالے سارے مشہور ہو گیا ہے کہ شاد پور کا مُنڈا لاہور میں کرکٹ کھیلتا ہے اور بڑی بڑی ٹیموں سے اُس کے میچ ہوتے ہیں۔''

''نہیں یار...... میں تو ابھی سیکھ رہا ہوں۔'' اسد نے انکساری سے کہا۔ ''کھلاڑی بننا تو ابھی بہت آگے کی بات ہے۔''

''کچھ بھی ہے، تم نے ہمارا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔'' عبداللہ نے پیچھے سے آ کر اُسے چھا مار لیا اور زور لگا کر اُوپر اُٹھا لیا۔

اسد بھی گرمجوشی کے ساتھ عبداللہ سے ملا۔ اپنے لنگوٹیے سے مل کر اسد کی آنکھوں سے بے ساختہ خوشی پھوٹنے لگی تھی۔ لاہور میں رہ کر اور اچھے درجے کی کرکٹ کھیل کر بھی اسد میں کسی طرح کی نخوت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنے پرانے دوستوں کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا۔ قصبے کی ٹیم کے سب سے سینئر کھلاڑی مستری الیاس نے اپنی شلوار کو کس کر باندھتے ہوئے کہا۔ ''یاؤ اسد! مجھے انور چودھری نے بتایا ہے کہ تم اب

باؤلنگ بھی بڑی زبردست کرنے لگے ہو۔ پچھلے سے پچھلے جمعے جب لاہور میں اس نے تمہارا میچ دیکھا تھا تو تم باؤلنگ ہی کروا رہے تھے۔''

اسد نے کہا۔ ''ہاں...... دراصل ایک روز کے میچوں میں بندے کو بیٹنگ، باؤلنگ، فیلڈنگ سب کچھ ہی آنا چاہئے۔''

ان باتوں کے دوران ہی اور کئی افراد بھی میدان میں آ گئے۔ اسد کی آمد کی خبر سارے علاقے میں پھیل گئی تھی۔

یاروں دوستوں سے بمشکل رخصت ہو کر وہ گھر پہنچا۔ گھر میں سب جمع تھے۔ اڑوس پڑوس کی چند عورتیں بھی آئی ہوئی تھیں...... ماں سخت شکوہ کناں نظر آتی تھی۔ ماں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر اسد کو گلے سے لگایا اور بولی۔ ''اسدی! تو، تو لگتا ہے ولایت چلا گیا ہے۔ یہ ساتھ ہی تو لاہور ہے اور تو کئی کئی مہینے شکل ہی نہیں دکھاتا۔''

اسد ماں کے گلے سے لگا ہوا تھا اور ہجوم میں اُس کی آنکھیں شمیم کو تلاش کر رہی تھیں۔ پھر وہ اُسے نظر آ گئی۔ وہ دیکھتا رہ گیا۔ وہ ستون کے ساتھ کھڑی تصویر نظر آ رہی تھی۔ ایک دم اسد کو احساس ہوا کہ وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت اور دلکش ہو گئی ہے۔ ایک عجیب سا حزن آمیز نکھار تھا اُس کے چہرے پر۔ بالوں کی لٹیں ڈھلک کر اُس کے چہرے پر آ گئی تھیں۔ ایک لمحے کے لئے دونوں کی آنکھیں ملیں۔ ایک بجلی سی تڑپ کر بادلوں کے پیچھے اوجھل ہو گئی۔

O

قصبے کی سوندھی سوندھی خوشبو نے اور اس خوشبو میں بسی ہوئی محبت کی یادوں نے ایک بار پھر اسد کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ وہی در و دیوار تھے، وہی موسم، وہی ماحول...... دو ہی دن میں جیسے سب کچھ اسد کے لئے پلٹ آیا تھا۔ اگر کچھ نہیں پلٹا تھا تو وہ شمیم تھی۔ اُس کی بے تکلف ہنسی تھی، اُس کی خوشبو دار باتیں تھیں، اسد اور علی کے ساتھ اُس کی دھینگا مُشتی تھی، یہ سب کچھ شاید ان در و دیوار سے رُوٹھ چکا تھا۔ ایسی بات نہیں تھی کہ وہ اسد کو یکسر نظر انداز کر رہی تھی، مگر اُس کے رویّے میں ایک طرح کا نیا سا تکلف پیدا ہو چکا تھا۔ وہ اسد کے گھر آتی تھی، اُس سے ضروری باتیں بھی کرتی تھی، اسد کی موجودگی میں ہی کئی بار وہ ہنسی بھی تھی...... مگر یہ سب کچھ اسد کو بے حد مصنوعی محسوس ہوا تھا۔ اس

کے برعکس اسد کو وہ لمحے سچے اور اپنے اپنے سے لگتے تھے جب وہ خاموش ہوتی تھی اور اسد کی طرف نہ دیکھتے ہوئے بھی اُسے دیکھتی تھی۔ یہ لمحے بظاہر اجنبی لگتے تھے مگر حقیقت میں یہی اپنے اور سچے لمحے تھے۔ ان لمحوں کے کھچاؤ اور ان کی کج روی میں ہی ان کا حسن تھا۔

یہ تیسرے دن کی بات ہے۔ اسد اُسی برساتی میں بیٹھا تھا جہاں اُس نے شمیم کے انتظار کی اذیت ناک ترین راتیں گزاری تھیں۔ غم کے اُس دور کا لمحہ لمحہ اُس کے ذہن پر نقش تھا۔ وہ کھڑکی سے نیچے اپنے گھر کے صحن میں دیکھ رہا تھا۔ اچانک نازو اندر چلی آئی۔ جب وہ لاہور میں تھا اور فریحہ کے چکر میں اُلجھا ہوا تھا، نازو کے دو تین پیارے پیارے خط بھی اُسے ملے تھے۔ ان خطوں میں معصوم ذہن کی معصوم باتیں ہوتی تھیں۔ ہوم ورک کی باتیں، چھٹیوں کی باتیں، سہیلیوں کی اور گڈے گڑیا کے بیاہ کی باتیں۔ ہر خط کے آخر میں وہ یہ سوال ضرور پوچھتی تھی۔ ''بھائی جان! آپ لاہور میں کہاں پھنس کر رہ گئے ہیں؟ شادپور کیوں نہیں آتے؟''

آج بھی یہی معصوم سوال اُس کی زبان پر آ گیا۔ ''بھائی جان! آپ بڑے وہ ہیں۔ لاہور جاتے ہیں تو ہمیں بھول ہی جاتے ہیں۔ پتہ نہیں کہاں پھنس جاتے ہیں؟''

وہ اُسے کیسے بتاتا کہ وہ واقعی پھنس گیا تھا۔ اُس نے پیار سے نازو کو چپت لگائی اور بولا۔ ''دُور رہ کر بھی ہر وقت تم لوگوں کا خیال ہی رہتا ہے۔''

''کس کس کا خیال رہتا ہے؟'' وہ رسان سے بولی۔

''امی ابو کا، چچا چچی کا، تمہارا اور علی کا...... سب کا۔''

''آپ نے باجی کا نام نہیں لیا۔'' الفاظ جیسے خود بخود اُس کے ہونٹوں سے پھسل گئے۔

''ہاں...... اُس کا بھی۔''

وہ اُسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آخر آپ دونوں کو کیا ہوا ہے؟ آپ دونوں کی لڑائی کب ختم ہو گی؟ میں ہر وقت یہی سوچتی رہتی ہوں۔''

''ہمارے درمیان کوئی لڑائی نہیں ہے۔''

''لڑائی ہے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ باجی بہت بدل گئی ہیں۔ پہلے وہ کتنا خوش رہا کرتی تھیں، خود ہنستی تھیں اور دوسروں کو بھی ہنساتی تھیں۔ مگر اب وہ چپ شاہ کا

روزہ رکھے رہتی ہیں۔ کسی وقت ہنستی بولتی بھی ہیں تو لگتا ہے کہ اپنے آپ سے زبردستی کر رہی ہیں۔''

''یہ تمہاری باجی کا ذاتی مسئلہ ہو گا۔ تم اُنہی سے پوچھو۔''

رات کو برساتی میں موسم بڑا خوشگوار ہو گیا۔ ہلکی بارش کے بعد ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ اسد کا دل چاہا کہ چھت پر چہل قدمی کر کے پرانی یاد تازہ کرے۔ وہ چھت پر گھومنے لگا۔ وہ ''چہل قدمی'' کی یاد تازہ کرنا چاہتا تھا۔ مگر ایک اور یاد خود بخود تازہ ہو گئی۔ اور کچھ اس انداز سے تازہ ہوئی کہ اسد کو تڑپا ہی گئی۔ چھت پر چہل قدمی کرتے ہوئے اُسے چچا کا صحن نظر آیا اور چچا کی بیٹی نظر آئی۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ ہوا کی آمد و رفت کے لئے تھوڑی سی کھڑکی کھلی رہنے دی گئی تھی۔ مگر ہوا تو دروازے کی طرف سے بھی آ رہی تھی۔ شاید کھڑکی کھلی رکھنے کی وجہ بھی کچھ اور تھی۔ ''صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں'' والا معاملہ تھا۔ کچھ دیر بعد کمرے کی لائٹ بجھ گئی مگر ایسا صرف چند سیکنڈ کے لئے ہوا۔ شاید اُس نے دیکھا تھا کہ اسد چھت پر موجود ہے یا نہیں؟

رات دس بجے کے لگ بھگ وقت تھا۔ جب وہ سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلی آئی۔ اسد کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اُس نے سگریٹ پاؤں تلے مسل دیا۔ سال ڈیڑھ سال پہلے دونوں گھروں کی چھتوں کے درمیان کوئی رُکاوٹ نہیں تھی۔ مگر اب ایک تین چار فٹ اُونچی منڈیر سی بنا دی گئی تھی۔ آمد و رفت کے لئے اس منڈیر نما دیوار کے درمیان ایک در بھی موجود تھا۔ یعنی یہ منڈیر برائے نام رُکاوٹ تھی...... اصل رُکاوٹ دلوں میں تھی جو دونوں کو ایک دوسرے سے دُور رکھے ہوئے تھی۔

دونوں اپنی اپنی چھتوں پر ٹہلتے رہے۔ مست کر دینے والی ہوا سے اسد کی کلف لگی قمیض پھڑپھڑا رہی تھی اور شمیم کے بال ہوا میں اُڑتے رہے۔ اسد کو آئے ہوئے پانچ روز ہو چکے تھے۔ اُسے بس تین چار دن مزید رُکنا تھا...... اور یہ بات یقیناً شمیم بھی جانتی تھی۔ اسد کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اُس سے بات کرنا چاہ رہی ہے۔ وہ بھی کرنا چاہ رہا تھا مگر درمیان میں بے زبانی کی خلیج حائل تھی۔ چار پانچ منٹ اسی سنگین کشمکش میں گزر گئے۔ پھر پہل شمیم نے ہی کی تھی۔ وہ منڈیر پر کہنیاں ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔ نیم تاریکی کے

سبب اُس کا چہرہ صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہاں، سفید پھولوں والے آنچل کی جھلک نمایاں تھی۔ وہ بولی۔

''آپ کب تک ہیں یہاں؟''

''شاید سوموار کو چلا جاؤں گا۔''

''اتنی دیر سے آ کر اتنی جلدی جا رہے ہیں؟''

''تو اس سے کیا ہوتا ہے؟''

''بہت کچھ ہوتا ہے۔ تائی جان اکثر روتی رہتی ہیں۔ آپ کو پتہ بھی ہے کہ وہ بیمار رہتی ہیں۔ پھر بھی آپ مہینوں صورت نہیں دکھاتے۔'' وہ اسد کو آپ کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔ پتہ نہیں کیوں؟

''آہستہ آہستہ بندہ ہر بات کا عادی ہو جاتا ہے۔'' اسد نے کہا۔

''آپ ہر کسی کو اپنی مرضیوں کا عادی کیوں بنانا چاہتے ہیں؟''

''بالکل غلط ہے...... میں تو مرضیاں کرنے والوں سے چھپتا پھر رہا ہوں۔''

چند لمحے خاموشی رہی۔ دونوں ایک دوجے سے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ بیچ میں پختہ دیوار تھی۔

''کیا آپ معاف نہیں کر سکتے؟'' اچانک شمیم نے کہا۔

''کک...... کس کو؟''

''مجھے......'' وہ بولی۔

''تمہارا ذکر درمیان میں ایک دم کہاں سے آ گیا؟'' اسد نے پوچھا۔

''میں جانتی ہوں، ان ساری خرابیوں کی جڑ میں ہی ہوں۔ میری ہی وجہ سے آپ شاد پور سے دُور ہوئے ہیں۔ میری ہی وجہ سے تائی جی ہر وقت روتی رہتی ہیں۔ اس سارے گھرانے کی خوشیاں میری ہی وجہ سے غارت ہوئی ہیں۔''

''تم سب کچھ جانتی ہو پھر بھی کچھ نہیں جانتی ہو...... ہر بات کا پتہ ہے پھر بھی انجان بنتی ہو۔ تم کیوں کرتی ہو ایسا؟ کیوں ایک ہٹ دھرمی پر سب کچھ قربان کر رہی ہو؟ اتنی سنگدلی کا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔''

''میں کیا کروں...... میں کیا کروں......؟'' وہ روتے ہوئے بولی۔

انا کا ایک پہاڑ اسد کے اندر کھڑا ہو گیا تھا۔ اُسے لگا کہ وہ ایک عظیم فتح سے چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ اُس نے اپنی اندرونی بے تابی کو چھپاتے ہوئے کہا۔

''تم سب جانتی ہو شمیم...... تم سے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔''

چند لمحے خاموشی رہی۔ یہ چند لمحے چند برسوں کی طرح تھے۔ پھر شمیم نے کہا۔

''میں...... ایسا نہیں کر سکتی اسد...... پلیز...... آپ ذرا ہمدردی سے سوچیں...... آپ نے ایک چھوٹی سی بات کو ضد کیوں بنا لیا ہے؟ آپ کیوں چاہتے ہیں کہ میں اندھیرے میں چوروں کی طرح چل کر آپ کے پاس پہنچوں؟''

انا کا پہاڑ ایک دم مسمار ہو کر زمین میں دھنستا ہوا محسوس ہوا۔ اسد نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''چھوٹی بات کو بڑا بنانے والی تم ہو...... میں نہیں۔ اب یہ بات بڑی بن چکی ہے شمیم!''

وہ سسکیاں لے کر روتی چلی جا رہی تھی۔ شاید کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہیں پاتی تھی۔ اُس کی آواز میں ایک جانکاہ کرب تھا۔ بے چارگی تھی اور شاید خاموش التجا بھی تھی۔ دفعتاً سیڑھیوں کی طرف سے ہاجرہ بی بی کی آواز بلند ہوئی۔ ''اسدی بیٹا! کہاں ہو...... تمہارے ابا بلا رہے ہیں۔''

اسد ٹھٹکا اور پھر ''آیا امی جی'' کہتا ہوا نیچے چلا گیا۔

نجانے کیوں ایک بار پھر اسد کی اُمید بڑی شدت سے بندھ گئی تھی۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ ایک دو دن میں کچھ ہونے والا ہے۔ شاید شمیم نے اسد کی خواہش کے سامنے ''سرنڈر'' کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے...... رات ہوئی تو وہ ایک بار پھر انتظار کی اُس سولی پر لٹک گیا جس پر پہلے بھی ان گنت مرتبہ لٹکا تھا۔ اُس کے کان قدموں کی چاپ پر تھے اور ہر پل ایک صدی کی طرح سرک رہا تھا۔ دس بجے کا وقت ہو گا جب اچانک اسد کو اپنا دل بلیوں اچھلتا محسوس ہوا...... شمیم چھت پر تھی۔ وہ اُس کا ہیولا صاف دیکھ سکتا تھا۔ مگر وہ اپنی چھت پر تھی۔ کل ہی کے انداز میں ٹہل رہی تھی۔ اسد کا دل شدید اُمید و بیم کے درمیان ڈولنے لگا۔ کبھی وہ سوچتا شاید رات کی طرح اس طرح چھت پر ٹہلنا شمیم کا معمول ہے، کبھی سوچتا شاید وہ اُسی کی خاطر چھت پر آئی ہے، اب تذبذب میں ہے کہ اسد کے پاس برساتی میں آئے یا نہیں؟ اسد نے برساتی کی لائٹ روشن کر رکھی تھی۔ اُس

نے ریڈیو کی آواز بھی تیز کر دی تا کہ شمیم اس شبہے میں نہ رہے کہ شاید برساتی خالی ہے۔

چار پانچ منٹ اسی طرح گزرے، پھر اچانک شمیم کے گھر کے بیرونی دروازے پر دستک ہوئی اور وہ بدک کر نیچے چلی گئی۔ اسد کا تیزی سے دھڑکتا ہوا دل ایک بار پھر برف کا گولا بن گیا۔ وہ نڈھال سا ہو کر نیم دراز ہو گیا۔ آنسوؤں کی نمی اُس کی آنکھوں میں تیر رہی تھی۔

حالات ایک بار پھر اُسی نہج پر چل نکلے تھے۔ ''اُسی کلہاڑی میں دستے والا محاورہ'' ان حالات پر صادق آتا تھا۔ ایک بار پھر وہی گریز تھا، پھر وہی شدید کشمکش اور پھر وہی اعصاب توڑنے والا انتظار۔ رات جیسے تیسے کٹ گئی۔ مگر دن بھی تو رات جیسا ہی تھا۔ وہی بے کلی، وہی نارسائی...... سہ پہر کے وقت وہ ذرا دل بہلانے کے لئے کھیل کے میدان میں چلا گیا۔ لڑکے بالے جمع تھے۔ خوب ہلا گلا تھا۔ کرکٹ کھیلنے والے اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ وہ اُسے زبردستی پکڑ کر وکٹوں کے سامنے لے آئے۔ وہ اُس کی بیٹنگ دیکھنا چاہ رہے تھے۔ اُن کی خوشی کے لئے اسد نے اپنا ''اپ سیٹ'' موڈ ٹھیک کیا اور دو تین اوورز کھیلے۔ اس کے بعد زوردار شارٹس پر سب چھوٹے بڑوں نے تالیاں بجائیں۔ اور تو اور جن باؤلروں کی پٹائی ہوئی تھی اُنہوں نے بھی ''داد'' دی۔ اسد کی زخمی کلائی ایک بار پھر دُکھنے لگی تھی۔ اُس کے پرانے دوست بہت کہتے رہے مگر اُس نے باؤلنگ نہیں کرائی۔

شام ہوتے ہی وہ گھر آ گیا۔ اُسے بڑی شدت سے رات کا انتظار تھا۔ مگر رات سے بہت پہلے ہی اُسے ایک ایسا جھٹکا لگا جس نے اُس کے سارے جذبات پر اوس ڈال دی۔ اُسے یقین ہو گیا کہ شمیم آج رات بھی نہیں آئے گی اور شاید آنے والی راتوں میں بھی نہیں آئے گی۔ علی نے اُسے اطلاع دیتے ہوئے کہا۔

''بھائی جان! آپ کو نہیں پتہ کہ باجی بیمار ہیں؟''

''کیا ہوا ہے؟''

''اُنہیں کل رات سے بڑا تیز بخار ہے۔ سر میں بھی درد ہو رہا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے چچا نے ڈاکٹر کو گھر بلایا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ باجی کے کمرے میں تیز پنکھا چلایا جائے اور ان کے سر پر برف کی پٹیاں رکھی جائیں۔ اگر بخار پھر بھی کم نہ ہو تو انہیں ہسپتال لے جایا جائے۔''

اس دوران اسد کی امی بھی آ گئیں۔ اُنہوں نے کہا۔ ''جاؤ بہن کا پتہ لے آؤ۔ اُسے تیز بخار ہے۔''

اسد کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد چچا کے گھر پہنچا۔ وہ جب سے آیا تھا چچا کے گھر نہیں گیا تھا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی، چچا کے گھر میں داخل ہوتے ہی ان گنت یادیں اُسے گھیر لیتی تھیں اور اُس کا دل زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑانے لگتا تھا۔ وہ اُس کمرے میں پہنچا جہاں شمیم بیڈ پر لیٹی تھی۔ نازو اُس کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔ چچی سرہانے کی طرف بیٹھی تھیں۔ شمیم آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ اُس کا رنگ سرسوں کی طرح زرد ہو رہا تھا۔

چچی نے بتایا۔ ''اللہ کا شکر ہے بخار اب کم ہو گیا ہے۔ ہمیں تو فکر پڑ گئی تھی کہ کہیں ہسپتال کا منہ ہی نہ دیکھنا پڑ جائے۔''

نازو بولی۔ ''بھائی جان! آپ ہاتھ لگا کر دیکھیں...... اب بخار کم لگ رہا ہے نا؟''

اسد نے جھجکتے ہوئے شمیم کی کلائی پر ہاتھ رکھا۔ کلائی اب بھی تپ رہی تھی مگر بہت زیادہ نہیں۔ اسد کا ہاتھ شمیم کی کلائی پر آیا تو اُس نے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔ اُس کی آنکھوں میں بخار کی سرخی تھی۔ وہ عجیب غنودگی کی سی کیفیت میں اسد کی طرف دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ چچی سلطانہ نے اسد سے مخاطب ہو کر کہا۔

''اچھا تم بیٹھو! میں تمہارے لئے شربت بنا کر لاتی ہوں۔''

وہ باہر چلی گئیں اور جاتے جاتے نازو کو بھی لے گئیں۔ کچھ بھی تھا وہ شمیم کی ماں تھیں۔ اُنہیں بیٹی کے سینے میں پلنے والے پرانے روگ کا علم تھا۔ اُنہیں خبر تھی کہ پچھلے تین چار سال سے اس گھر کی چار دیواری میں چپکے چپکے کیا کہانی پروان چڑھ رہی ہے؟ کبھی کبھی تو اسد کو یوں لگتا تھا جیسے شمیم اپنی والدہ کو بھی کچھ بتا چکی ہے۔ اُس نے اسد کے حوالے سے کوئی بات بھی ماں سے چھپا کر نہیں رکھی ہوئی۔ چچی باہر چلی گئیں تو اسد نے رسمی انداز میں پوچھا۔

''اب کیسی ہو شمی؟''

شمیم، اسد کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ''اسد! آپ کو میری محبت کا یقین کیسے آئے گا؟ کیا میں اپنی جان دے دوں؟'' وہ غنودگی کے عالم میں تھی، ورنہ

واشگاف انداز میں محبت کا لفظ اُس کی زبان پر نہ آتا۔

اسد نے کہا۔ ''تم سے جان کون مانگ رہا ہے؟''

''لیکن آپ جو کہہ رہے ہیں، وہ میں نہیں کر سکتی۔ میں اپنی جان دے سکتی ہوں...... ہاں اسد! میں آپ کے کہنے پر جان دے سکتی ہوں۔ مگر مجھ سے کچھ اور نہ مانگیں...... بس میری جان مانگ لیں...... جان مانگ لیں......!''

اُس نے اٹل انداز میں اسد کی طرف سے منہ پھیر لیا تھا اور بند آنکھوں کے ساتھ بڑبڑاتی چلی جا رہی تھی۔ اسی دوران میں نازو واپس آ گئی۔ اُس کی موجودگی میں بھی شمیم کی مدھم بڑبڑاہٹ جاری رہی، تاہم پھر وہ چپ ہو گئی۔ چچی شربت لے آئی تھیں۔ اُن کا چہرہ شمیم کی تکلیف کے سبب ستا ہوا تھا۔ کہنے لگیں۔ ''پتہ نہیں کس کی نظر لگ گئی ہے اسے...... اچھی بھلی تھی۔ اب تو لگتا ہے کہ اندر ہی اندر گھلتی جا رہی ہے۔''

''اچھی بھلی تو ہے چچی جان...... بخار ہو جانا کوئی بیماری تو نہیں ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔''

گھر آ کر اسد بڑی دیر تک برساتی میں گم صم پڑا رہا۔ غنودگی کے عالم میں شمیم کی زبان پر محبت کا لفظ آیا تھا۔ گویا وہ اقرار کر رہی تھی، مگر اس کے ساتھ ساتھ اُس کا گریز بھی برقرار تھا۔ اُس کے دل میں آئی، کیوں نہ وہ شمیم کو اس کڑی آزمائش کے دباؤ سے نکال دے۔ بات تو بے شک معمولی تھی۔ وہ اُس سے پیار کرتی تھی اور اگر پیار کرتی تھی تو پھر اُس کے کہنے پر اُس کے کمرے میں بھی آ سکتی تھی۔ لیکن یہ معمولی بات وقت کے ساتھ غیر معمولی بن گئی تھی۔ اس غیر معمولی بات کا تناؤ اسد کو بری طرح محسوس ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ شمیم کو بھی یہ تناؤ ہلکان کر دیتا تھا۔ تو کیوں نہ وہ مثبت رُخ پر ایک قدم آگے بڑھائے اور اس تناؤ کو ختم کر ڈالے......

وہ اپنے خیالوں میں مگن نیم دراز تھا جب اچانک قدموں کی آہٹ نے اُسے چونکا دیا۔ یہ اُس کے والد محمد حیات تھے۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''کیوں پتر! کیا حال ہے تیری وِینی (کلائی) کا؟'' محمد حیات نے ٹھیٹ لہجے میں پوچھا۔

''بس ٹھیک ہی ہو گئی تھی ابا جی! آج پھر تھوڑی درد کر رہی ہے۔''

''اوہو...... کہیں دُکھ تو نہیں گئی؟''

''ہاں جی...... کچھ دُکھ ہی گئی ہے۔ آج شام ویلے میں میدان کی طرف گیا تھا۔ لڑکوں نے کھینچ تان کر مجھے بلا پکڑا دیا۔ تھوڑا سا کھیلا، شاید اسی وجہ سے درد ہو رہی ہے۔''

''ویسے یار! سچی بات ہے تیری وجہ سے اب مجھے بھی اس کھیڈ میں تھوڑا تھوڑا مزا آنے لگا ہے۔ چلو کسی وقت لاہور آئیں گے تو تیرا کوئی میچ شیچ دیکھیں گے۔''

''آپ کہیں تو میں آپ کو سوموار والے دن لاہور لے چلتا ہوں۔ موسم بھی اچھا ہے۔''

''چلو، لاہور بھی چلے جائیں گے۔ پر ابھی تو تم میرے ساتھ چلو۔''

''کہاں ابا جی؟''

''ڈیرے چلتے ہیں۔ کافی مدت ہو گئی ہے گئے ہوئے۔ مجھے تھوڑا سا کام ہے، تمہاری بھی سیر ہو جائے گی۔''

ڈیرے کا سنتے ہی اسد کے پژمردہ چہرے پر زندگی دوڑ گئی۔ ڈیرہ دراصل وہی نیم پختہ حویلی تھی جہاں وہ لوگ کبھی کبھی سیر و تفریح کے لئے جاتے تھے۔ حویلی کے عقب سے نہر بہتی تھی۔ پاس ہی وہ جھیل نما جگہ تھی جہاں سے عبداللہ اور اسد نے بچپن سے اب تک منوں مچھلی پکڑی تھی...... ڈیرہ کے بارے میں اسد تک جو معلومات ابا اور چچا کے ذریعے سے پہنچی تھیں، وہ کچھ اس طرح تھیں، یہ نیم پختہ عمارت اسد کے پڑدادا یعنی محمد حیات کے دادا کی ملکیت تھی۔ اُن کا نام عطا محمد تھا۔ اس وقت علاقے میں اُن کی کافی زمین تھی۔ اس زمین کی دیکھ بھال کے لئے اُنہوں نے نہر کنارے یہ حویلی بنوائی تھی۔ حویلی قریبی گاؤں عباس پورہ سے قریباً ایک میل کے فاصلے پر تھی۔ یہاں ایک چھوٹا سا باغ بھی تھا۔ اس باغ کی وہ شان و شوکت تو باقی نہیں رہی تھی جو قریباً ستر سال پہلے تھی مگر اب بھی وہاں کافی درخت موجود تھے......

بچپن میں اسد اکثر ابا جان کے ساتھ ڈیرے جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی والدہ بھی ساتھ ہوتی تھیں۔ ابا جان کو ڈیرے سے بڑا لگاؤ تھا۔ پھر وہاں زمینداری بھی تھی۔ مگر آہستہ آہستہ ابا جان کی دلچسپی ڈیرے میں کم ہوتی چلی گئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ شاد پور میں اُن کی ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں۔ ایک اور اہم وجہ بلکہ اہم ترین وجہ سیم اور تھور تھی۔ علاقے کی زمین آہستہ آہستہ سیم تھور کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔ اس بیماری کی زد میں وہ زمین بھی آ گئی جس پر محمد حیات کاشتکاری کرواتے تھے۔ محمد حیات کو زمینداری اور

کاشتکاری سے عشق تھا۔ اُنہوں نے اپنی زمین کو اس روگ سے بچانے کی بڑی کوشش کی...... آس پاس کے کاشتکاروں کو ساتھ ملا کر اجتماعی کوششیں بھی کیں مگر ناکامی ہوئی۔ دھیرے دھیرے اُنہوں نے صبر شکر کر لیا...... وہ اب شاذ و نادر ہی عباس پورہ کا رُخ کرتے تھے۔ کچھ زمین تو اُنہوں نے جیسے تیسے بیچ دی تھی، جو باقی تھی اُس کی نگہداشت کے لئے دادا کے وقت کا نمک خوار اور وفادار ملازم رنگی بابا وہاں موجود رہتا تھا۔ ڈیرے کی حفاظت بھی رنگی بابا ہی کے سپرد تھی۔ ڈیرے کا ایک حصہ رنگی بابا کے استعمال میں تھا۔ وہ اپنے بال بچے سمیت وہاں رہائش پذیر تھا۔ ابھی سیم وتھور کا روگ ڈیرے سے کافی دُور تھا۔ لہٰذا ڈیرے کے گرد جو باغ تھا وہ پھل دے رہا تھا۔ امرود، جامن اور آم وغیرہ اپنے اپنے موسم میں باقاعدگی سے شاد پور پہنچتے تھے۔

والد کے منہ سے ڈیرے کا سنا تو اسد فوراً تیار ہو گیا۔ دراصل وہ بچپن میں والدین کے ساتھ اتنی مرتبہ ڈیرے پر گیا تھا کہ اُسے اُس مقام سے لازوال وابستگی پیدا ہو گئی تھی۔ ابا جان شاید اُس جگہ سے بیزار ہو چکے تھے مگر وہ اُس جگہ سے اب بھی اُسی طرح پیار کرتا تھا۔ اردگرد کی ویرانی اور اُداسی کے باوجود ڈیرہ اُسے اسی طرح بھاتا تھا۔

محمد حیات نے کہا۔ ”مجھے پتہ تھا، تم نے فٹافٹ تیار ہو جانا ہے۔“

”لیکن ابا جان! میں زیادہ رہ نہیں سکوں گا۔ سوموار کو مجھے ہر صورت واپس لاہور پہنچنا ہے۔“

”تو ٹھیک ہے بھئی...... ہم کل کی رات رہ کر پرسوں آ جائیں گے۔“

”عبداللہ کو ساتھ نہ لے چلیں؟“ اسد نے کہا۔

”مجھے یہ بھی پتہ تھا کہ تم نے عبداللہ کی بات ضرور کرنی ہے۔ بھلا عبداللہ کے بغیر تمہیں ڈیرے جانے کا کیا مزہ آئے گا؟“ محمد حیات مسکراتے ہوئے بولے۔

چچا شوکت نے ایک اچھی حالت کی جیپ لے لی تھی۔ اگلے روز صبح سویرے وہ لوگ جیپ پر سوار ہوئے اور کچے پکے راستوں پر سفر کرتے دو گھنٹوں میں ڈیرے پہنچ گئے۔ نہر کے چمکتے پانی کے کنارے دُور ہی سے وہ حویلی نظر آ گئی جو پون صدی گزرنے کے باوجود ابھی تک خستہ حال نہیں ہوئی تھی۔

نہر کو دیکھ کر عبداللہ نے ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔ ”اس نہر نے ہمارے کم از کم سو

گیند تو ضرور کھائے ہوں گے۔ تمہیں یاد ہے، ایک مرتبہ میلے پر دادا جان نے ہمیں پورے دو درجن گیند لے کر دیئے تھے۔ وہ سارے ہم نے دو روز میں نہر کے حوالے کر دیئے تھے۔“

اسد نے کہا۔ ”لیکن گیندوں کے بدلے اس نہر نے ہمیں بہت کچھ دیا بھی تو ہے۔ اس کے پانی میں ہم نے ڈھیروں تربوز اور خربوزے ٹھنڈے کئے ہیں، اس کے پانی میں ہم نے تیراکی سیکھی ہے۔ اس کے پانی سے مچھلیاں پکڑی ہیں۔ گرمی کی حبس زدہ راتوں میں اس نہر نے ہمیں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے دیئے ہیں۔ تمہیں بس اپنے گیند ہی یاد رہ گئے ہیں۔“

ڈرائیور انیس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اور ویسے بھی نہر گیند کھاتی تو نہیں ہے جی...... گیند تو اُس کے اوپر تیرتی رہتی ہے۔ کسی نہ کسی کے کام آ ہی جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ نہر وہ گیند کسی ایسے بچے کے پاس لے گئی ہو جسے اُن کی بہت زیادہ ضرورت ہو۔“

”یار! تم اپنی چونچ بند رکھ کے گاڑی چلانے کی طرف دھیان دو۔“ عبداللہ نے اُسے ٹوکا۔

اس جیپ میں اسد، عبداللہ اور محمد حیات کے علاوہ صرف ڈرائیور ہی تھا۔ یہ کافی باتونی اور ہنس مکھ شخص تھا۔ اسد جانتا تھا کہ اگر اسے چچا شوکت نے ملازم رکھا ہوا ہے تو یقیناً کسی خوبی کی وجہ سے ہی رکھا ہو گا۔

جیپ ڈیرے کے دروازے پر پہنچی بھی نہیں تھی کہ رنگی بابا دروازے پر آن کھڑا ہوا۔ رنگی کی عمر ستر سال کے قریب تھی۔ مگر مضبوط کاٹھی اور اچھی آب و ہوا کی وجہ سے وہ عمر سے دس بارہ سال چھوٹا لگتا تھا۔ اُس کے دو بیٹے تھے۔ دونوں اُس کے فرمانبردار تھے۔ ایک کی شادی ہو چکی تھی اور وہ شہر میں تھا، دوسرا رنگی کے ساتھ ہی ڈیرے پر رہتا تھا اور باغبانی میں رنگی کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ جونہی وہ لوگ جیپ سے اُترے، رنگی نے بڑی محبت سے اسد کا سر چوما۔ رنگی کے جسم سے محنت مشقت کی خوشبو اُٹھ رہی تھی اور اُس کی آنکھوں میں اُن سب کے لئے محبت کا سمندر موجزن تھا۔ وہ اسد کا شانہ تھپکتے ہوئے بولا۔

”مبارک ہو اسدی پتر! تو، تو اب سچ مچ کا کھلاڑی بن گیا ہے۔ ایک دن پتر ناصر شہر سے اخبار لے کر آیا تھا، اُس میں تیرا فوٹو بھی چھپا ہوا تھا۔“

پھر وہ محمد حیات سے مخاطب ہوا۔ ''بھائیا جی! میں آپ سے کہا کرتا تھا نا کہ آپ اسدی پُتر کا خاص خیال رکھیں، یہ ضرور کچھ نہ کچھ بنے گا۔ یا تو بڑا افسر بن جائے گا یا بڑا کھلاڑی بن جائے گا۔ اب دیکھیں، یہ بن گیا ہے نا کھلاڑی۔''

اسد بولا۔ ''رنگی بابا! ابھی کہاں کھلاڑی بنا ہوں؟ ابھی تو الف ب سیکھ رہا ہوں۔ اخبار میں فوٹو چھپنے سے کوئی کھلاڑی تھوڑا ہی بن جاتا ہے؟''

رنگی نے ایک بار پھر اسد کا سر چوما، پھر اُن لوگوں کا مختصر سامان جیپ سے اُتارنے لگا۔

اسد اور عبداللہ قریباً دو سال بعد ڈیرے پر آئے تھے۔ اس سے پہلے اتنا بڑا وقفہ کبھی نہیں پڑا تھا۔ معمولی تبدیلیوں کے علاوہ ڈیرہ اندر سے ویسے کا ویسا ہی تھا۔ باہر کا گیٹ نما دروازہ، اندر کی محرابی ڈیوڑھی جس میں نانک چندی اینٹیں لگی تھیں اور طاق بنے ہوئے تھے۔ ڈیوڑھی سے آگے وسیع احاطہ جس کے بیچوں بیچ برگد کا ایک قدیم درخت تھا۔ احاطے کے تین اطراف میں برآمدے تھے، برآمدے سے آگے کمروں کے دروازے تھے۔ ان محرابی دروازوں کو دیہی انداز میں رنگ دار پھول بوٹوں سے سجایا گیا تھا۔ سامنے والے برآمدے کے عین درمیان محرابی سی پیشانی تھی۔ اُس پر پلستر تھا۔ پلستر پر سرخ اور نیلے رنگ سے کچھ مٹے مٹے الفاظ لکھے تھے۔ ایسے ہی الفاظ دو تین اور جگہوں پر بھی موجود تھے لیکن وہ بہت مدھم تھے۔ گزرے ماہ و سال نے ان الفاظ کے رنگ اُڑا دیئے تھے اور پلستر بھی کئی جگہوں سے اُکھڑا ہوا تھا۔ یہ الفاظ ہندی انداز سے لکھے گئے تھے مگر یہ ہندی نہیں تھی، شاید سنسکرت تھی۔ بچپن سے اب تک اسد نے یہ الفاظ اور ڈیرے میں موجود دیگر اشیاء اتنی مرتبہ دیکھی تھیں کہ اب ان کا انوکھا پن ختم ہو گیا تھا۔ یہ سب کچھ اُسے ڈیرے کا حصہ ہی نظر آتا تھا اور اس کے بارے میں گہرائی میں جانے کی ضرورت اُس نے کبھی محسوس نہیں کی تھی......

ڈیرے یعنی حویلی کے اندرونی حصے میں ایک بڑا اسٹور روم بھی تھا۔ اس میں بہت سا کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ ٹوٹی ہوئی کلہاڑیاں، میخوں والی لاٹھیوں کے بقایا جات، توڑے دار بندوقوں کے دو تین دستے، گھوڑوں کی پھٹی پرانی زینیں، ایک بہت بڑا شکستہ حقہ جس کی نالی قریباً دس فٹ لمبی تھی۔ پرانے وقت کی چارپائیوں کے ٹوٹے ہوئے رنگین پائے اور پتہ نہیں کیا کچھ...... ایک دو بار اسد کے والد محمد حیات نے سوچا بھی تھا کہ یہ کاٹھ کباڑ

یہاں سے نکال دیا جائے۔ مگر پھر شاید اس خیال سے ارادہ ترک کر دیا کہ بزرگوں کی نشانیاں ہیں، پڑی ہیں تو پڑی رہیں۔

اسد اور عبداللہ چونکہ کافی عرصے بعد آئے تھے اس لئے ایک ایک چیز کو بڑے غور اور اپنائیت سے دیکھ رہے تھے۔ احاطے میں ایک طرف نانک چندی اینٹوں کی دیوار پر سفید روغن سے بنائی گئی تین لکیریں ابھی تک موجود تھیں۔ یہ لکیریں چار پانچ سال پہلے اسد اور عبداللہ نے ہی کھینچی تھیں۔ یہ اُن کی وکٹیں تھیں۔ یہاں وہ گھنٹوں کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ قریباً دو سال پہلے جب وہ آخری بار آئے تھے اُس وقت بھی انہوں نے خوب کھیلا تھا۔ رنگی بابا کا چھوٹا بیٹا صغیر اور بیٹی گڑیا بھی کبھی کبھی وہاں آ جاتے تھے اور فیلڈنگ میں ان کی مدد کرتے تھے۔ پچھلی مرتبہ اُن کی کرکٹ سے حویلی کے جو ایک دو شیشے ٹوٹے تھے وہ حسبِ دستور رنگی بابا نے مرمت کرا چھوڑے تھے۔ بہرحال یہ مرمت دُور ہی سے صاف نظر آ جاتی تھی۔ یہ عام سے سفید شیشے تھے اور پرانے وقتوں کے پھولدار رنگین شیشوں کی کمی پوری نہیں کر سکتے تھے۔

وہ سب لوگ برآمدے میں موڑھوں پر بیٹھ گئے۔ رنگی کا بیٹا صغیر اُن کے لئے چینی کے شربت میں لیموں نچوڑ کر لایا اور بڑے احترام سے پیش کیا۔ رنگی اپنی بیٹی گڑیا کے ساتھ مل کر دو کمروں کی صفائی ستھرائی کرنے لگا۔ رنگی کی بیٹی ایک دم جوان ہوئی تھی۔ دو سال پہلے تک وہ قلانچیں بھرتی پھرتی تھی مگر اب اُس کے سر پر آنچل آ گیا تھا اور چال میں ایک شرم آمیز تمکنت پیدا ہو گئی تھی۔ گڑیا کی صورت میں دراصل رنگی کی ایک دیرینہ خواہش پوری ہوئی تھی۔ اُسے بیٹی کا بڑا چاؤ تھا۔ یہی بیٹی اُسے آخری عمر میں ملی تھی۔ وہ گندمی رنگ کی قبول صورت لڑکی تھی۔ اُس کی ناک میں چاندی کی کیل ہمیشہ سے بہت اچھی لگتی تھی۔

''چھوٹے مالک سلام!'' اُس نے اسد کے قریب سے گزرتے ہوئے جھجک کر کہا۔

اس سے پہلے وہ اسد اور عبداللہ کو بابو جی کہتی تھی اور اُس کے بھائی بھی اُن دونوں کے لئے یہی لقب استعمال کرتے تھے۔ مگر اب وہ چھوٹے مالک کہہ رہی تھی۔ یقیناً ایسا وہ اپنے والد کے کہنے پر ہی کر رہی تھی۔ بڑی پھرتی کے ساتھ ہاتھ چلاتے ہوئے گڑیا نے دو کمرے صاف کر دیئے۔ وہ جب بھی ڈیرے پر آتے تھے یہی دونوں کمرے اُن

کے استعمال میں آتے تھے۔ تھوڑی دیر تک آرام کرنے کے بعد اسد کے والد نے رنگی بابا کو ساتھ لیا اور اپنے کام کے لئے نکل گئے۔ اسد اور عبداللہ صاف ستھرے بستروں پر نیم دراز ہو کر باتیں کرنے لگے اور پرانی یادیں تازہ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ کچھ دیر بعد صغیر بھی اُن کے پاس آ بیٹھا۔ باتوں کے دوران میں وہ بولا۔

''اسد بابو! مجھے یاد آ گیا۔ میں آپ کو ایک چیز دکھانا چاہتا ہوں۔''

وہ اُٹھ کر گیا اور دو ہی منٹ بعد لکڑی سے تراشی ہوئی ایک چھوٹی سی مورتی لے کر آ گیا۔ یہ ایک فٹ اُونچی اور پون فٹ چوڑی مورتی غالباً آبنوس کی لکڑی سے تراشی گئی تھی۔ اُس پر سیاہ رنگ کیا گیا تھا جو جگہ جگہ سے اُڑ چکا تھا۔ اس مورتی میں ایک جاگیردار ٹائپ شخص ہاتھ میں کوڑا لئے کھڑا تھا، ایک نیم برہنہ عورت اُس کے پاؤں میں گری ہوئی تھی، اُس کے چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے۔

''یہ کہاں سے ملی؟'' اسد نے صغیر سے پوچھا۔

''سٹور سے۔'' صغیر نے جواب دیا۔ ''برآمدے کی ایک پھولدار ٹائل ٹوٹ گئی تھی۔ اسی طرح کی ٹائل میں نے ایک دفعہ سٹور میں پڑی دیکھی تھی۔ وہ ٹائل ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک جستی ٹرنک کے نیچے سے یہ مورتی ملی...... یہ دیکھیں...... یہاں نیچے سے یہ ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں نے یہاں کیل ٹھونکی ہے۔''

اسد اور عبداللہ اُلٹ پلٹ کر مورتی کو دیکھنے لگے۔ اگلے وقتوں میں اس طرح کے ڈیکوریشن پیس اکثر حویلیوں میں سجائے جاتے تھے۔ مگر اس ڈیکوریشن پیس میں جو منظر نظر آ رہا تھا وہ خاصا توجہ طلب تھا۔ وڈیرے اور جاگیردار، عورتوں پر جو ظلم و ستم روا رکھتے ہیں اس کی کہانیاں پرانے وقتوں سے مشہور چلی آ رہی ہیں۔ جہاں تک اسد کو یاد پڑتا تھا اُس کے خاندان میں کوئی وڈیرا یا جاگیردار ٹائپ شخص کئی نسلوں سے موجود نہیں تھا۔ اپنے پڑدادا کے بارے میں اُس نے اتنا ضرور سنا تھا کہ وہ شکار اور گھڑ سواری میں دلچسپی رکھتے تھے۔ لیکن جاگیردارانہ مزاج تو اُن کا بھی نہیں تھا...... وہ سیدھے سادھے زمیندار تھے۔ اُنہوں نے فقط ایک شادی کی تھی۔ یہ بزرگوں کی طے کی ہوئی شادی تھی۔ اُن کا صرف ایک بچہ تھا۔ بعد ازاں اُن کی بیوی ناراض ہو کر والدین کے گھر چلی گئی تھی۔ اس کے بعد اُنہوں نے کبھی شادی نہیں کی تھی۔

اسد کا خیال یہی تھا کہ پڑدادا نے اپنی بیوی کی محبت میں دوسری شادی نہیں کی ہو گی...... ایک دو بار اسد نے اپنے والد سے اس بارے میں پوچھا بھی تھا۔ اسد کے والد کا خیال بھی یہی تھا کہ بیوی کی محبت اور اپنے بچے کی وجہ سے اُن کے دادا نے دوسری شادی نہیں کی ہو گی...... لیکن جس وقت اسد کے والد یہ بات کہہ رہے تھے اسد کو اُن کے لہجے میں اُلجھن آمیز شک کی ہلکی سی جھلک نظر آئی تھی...... اسد کو یوں لگا تھا جیسے وہ خود بھی اس بارے میں پُر یقین نہیں ہیں۔

اسد اور عبداللہ مورتی کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ اس دوران میں دوپہر کا کھانا تیار ہو گیا تھا۔ صغیر کی بہن گڑیا نے صغیر کو آواز دے کر بتایا کہ کھانا لگ گیا ہے۔ مورتی کا ملنا اُن کے لئے کوئی انوکھی یا اہم بات نہیں تھی۔ اس قسم کی ان گنت چیزیں یہاں موجود تھیں اور مزید بھی ملتی رہتی تھیں...... کھانا ہمیشہ سے زیادہ اچھا تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے رنگی کی بیوی پکایا کرتی تھی، اب اُس کی بیٹی نے پکایا تھا۔ زاہدہ عرف گڑیا ہمیشہ سے ہی سگھڑ اور سلیقہ شعار تھی۔ اُس کے ہر کام میں سلیقہ نمایاں تھا۔ فرش صاف کرتی تھی تو اُسے آئینہ بنا دیتی تھی، کمرہ سنبھالتی تھی تو وہ چم چم کرنے لگتا تھا۔

کھانا وغیرہ کھا کر وہ لوگ پرانی یاد تازہ کرنے کے لئے کرکٹ کھیلنے لگے۔ ڈیرے کا احاطہ کافی وسیع تھا۔ صغیر ایک پرانا سا بیٹ اور ٹینس بال ڈھونڈ لایا۔ عبداللہ نے اُس پر ٹیپ چڑھائی اور وہ کھیلنے لگے۔ اسد کی کلائی میں اب بھی درد ہو رہا تھا لہٰذا وہ صرف ایک ہاتھ سے بیٹنگ کا ٹھرک پورا کرتا رہا۔ شام کو اُنہوں نے احاطے میں فوارے کے پاس کھلے میں کوئلے دہکائے اور مرغیاں بھونیں۔ محمد حیات، رنگی اور ڈرائیور بھی ڈیرے پر واپس آ گئے تھے۔ سب نے انجوائے کیا۔ اسد کو یہ ساری یادیں تازہ کرنا اتنا اچھا لگا کہ وہ عبداللہ اور صغیر کے ساتھ مل کر رات گئے تک جاگتا رہا۔ وہ آیا تو بس ایک رات کے لئے تھا مگر اب اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ دو تین دن یہاں رہے بغیر اور مچھلی شکار کئے بغیر واپس نہ جائے۔ ویسے بھی اُس کی کلائی ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ وہ سخت کرکٹ سے ابھی چند دن دُور ہی رہتا تو بہتر تھا۔

صبح تک اُس کا کچا پکا ارادہ پختہ ہو گیا۔ اس ارادے کو پختہ کرنے میں عبداللہ کا بھی بہت ہاتھ تھا۔ اگلے روز اُس نے والد صاحب سے کہہ دیا کہ وہ جانا چاہتے ہیں تو چلے

جائیں۔ وہ اور عبداللہ پرسوں تک آ جائیں گے۔ اُس نے والد صاحب سے کہہ دیا کہ اگر لاہور سے قدیر صاحب نے فون پر رابطہ کیا تو وہ اُنہیں بتا دیں کہ اُس کی کلائی ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی لہٰذا وہ چار پانچ دن تک آئے گا۔

اسد نے اگر واپسی ملتوی کی تھی تو اس کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ شاد پور سے یہاں ڈیرے پر آتے ہوئے اُس نے شمیم سے بستر علالت پر ملاقات کی تھی۔ شمیم کی حالت دیکھ کر نجانے کیوں اُس کے دل میں ایک نرم گوشہ پیدا ہوا تھا۔ بخار کی غنودگی میں جو خوابیدہ الفاظ شمیم کی زبان سے نکلے تھے وہ ابھی تک اسد کی سماعت میں گونج رہے تھے۔ 'اسد! آپ کو میری محبت کا یقین کیسے آئے گا؟ کیا میں اپنی جان دے دُوں؟' اسد نے جواب میں کہا تھا۔ 'تم سے جان کون مانگ رہا ہے؟' وہ بولی تھی۔ 'لیکن...... آپ جو کہہ رہے ہیں وہ میں نہیں کرسکتی۔ میں اپنی جان دے سکتی ہوں...... ہاں اسد! میں آپ کے کہنے پر جان دے سکتی ہوں، مجھ سے کچھ اور نہ مانگیں...... بس میری جان مانگ لیں۔'

شاید وہ بھی اپنے آپ سے کیے ہوئے کسی عہد یا پھر کسی قسم کی پابند ہو چکی تھی۔ شمیم کا چہرہ بار بار اسد کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ بچپن سے اب تک کی ایک ایک بات آج کل یاد آ رہی تھی۔ کبھی اُسے محسوس ہوتا تھا کہ کہیں کہیں اُس سے بھی غلطی ہوئی ہے۔ اُس کی سب سے بڑی غفلت یہی تھی کہ شمیم کی شادی سے پہلے وہ شمیم کی شدید بے قراری کو نہ سمجھ سکا۔ وہ شرم و حیا کے دائرے میں رہ کر شب و روز اسد کے سینے میں محبت کی چنگاری جگانے کی کوشش کرتی رہی مگر وہ اپنی ہی ہوا میں رہا...... اُس کی محویت ٹوٹی تو اُس وقت ٹوٹی جب شمیم کے گھر میں ڈھولک بج رہی تھی۔

ڈیرے میں قیام کے دوران میں اس موضوع پر عبداللہ سے بھی اُس کی کئی بار بات ہوئی۔ اگلے روز جھیل کے لہریں مارتے پانی میں جال سے مچھلیاں پکڑتے ہوئے جب وہ دونوں کچھ دیر ستانے کے لئے گھاس پر لیٹے تو عبداللہ نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے تم نے شمی کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

''اس میں ہتھیار ڈالنے والی کوئی بات نہیں عبداللہ...... دیکھو یار! وہ کافی سزا بھگت چکی ہے۔ تم نے دیکھا نہیں اُسے، برسوں کی بیمار نظر آتی ہے۔''

''ٹھیک ہے بھئی...... جیسے تمہاری مرضی۔ تم اس معاملے کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہو۔''

''نہیں...... ایسی بات نہیں...... میں تو سمجھتا ہوں کہ تم اس معاملے میں میرے گرو گھنٹال ہو۔ اس رستے پر چلتے ہوئے ہر مرحلے میں تمہارا مشورہ شامل حال رہا ہے۔''

عبداللہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ویسے ایک بات تو ہے...... بخار کی بیہوشی میں ہی سہی، شمی نے اپنی زبان سے تمہاری محبت کا اقرار تو کیا ہے۔ وہ کیا شعر ہے ایک اچھا سا...... ہونٹوں پہ کبھی اُن کے میرا نام تو آئے...... آئے تو سہی بطورِ الزام ہی آئے۔''

''بطورِ الزام نہیں شہزادے...... برسرِ الزام۔''

شام کے بعد وہ عبداللہ اور صغیر کے ساتھ دیر تک نہر کے کنارے گھومتا رہا۔ رات ابر آلود تھی۔ پھر ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی۔ وہ ڈیرے پر واپس آ گئے۔ صغیر کی بہن نے اُن کے لئے انڈوں کا حلوہ بنا رکھا تھا۔ ساتھ میں تلی ہوئی مچھلی تھی اور آلو کے پراٹھے تھے۔ کھانا کھا کر عبداللہ جلد ہی سو گیا۔ اسد جاگتا رہا۔ اُس نے کھڑکی کھول رکھی تھی۔ ہلکی ہلکی بارش کا جلترنگ بج رہا تھا۔ بوندیں کھڑکیوں کے رنگین شیشوں سے ٹکراتی تھیں اور دل میں عجیب سا سوز جگاتی تھیں...... اچانک...... بالکل غیر متوقع طور پر ایک بار پھر وہی کچھ ہوا جو اس سے پہلے ہو چکا تھا۔ اور ایک بار نہیں کئی بار ہو چکا تھا۔ وہی پراسرار آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''کیا سوچ رہے ہو تم؟ کیوں سوچ رہے ہو؟ تمہیں ایسا نہیں سوچنا چاہئے۔ یہ تمہاری شان کے خلاف ہے......''

وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اُس کا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ حسب معمول آس پاس کوئی نہیں تھا...... سبھی کچھ معمول کے عین مطابق تھا۔ چھ فٹ کے فاصلے پر عبداللہ بے خبر سو رہا تھا۔ میز پر گیس لیمپ روشن تھا۔ دروازے کا پردہ ہولے ہولے ہل رہا تھا۔ آواز پھر گونجی۔

''یہ تمہاری شان کے خلاف ہے۔ کیا تم اُس سے سچی محبت نہیں کرتے ہو؟ اگر تم سچی محبت کرتے ہو تو پھر اُس کے سامنے گھٹنے کیوں ٹیکتے ہو؟ محبت سرنگوں نہیں ہوتی۔ اور وہ تمہاری محبت کو سرنگوں کرنا چاہ رہی ہے۔ وہ تمہیں شکست خوردہ دیکھنا چاہتی ہے۔ کیا تم ایک شکست خوردہ شخص کی حیثیت سے اُس کے ساتھ ساری زندگی گزار سکو گے؟ بولو......

کیا تمہارے دل میں ٹوٹا ہوا یہ کانٹا تمہاری ساری زندگی کو روگ نہیں بنا دے گا؟ اور ایک بات اور بھی یاد رکھو۔ تمہاری یہ پہلی شکست...... آخری نہیں ہوگی۔ یہ شکستوں اور ندامتوں کا ایک سلسلہ ہوگا۔ تم اُس لڑکی کے سامنے ایک بار پسپا ہوئے تو پھر ہوتے چلے جاؤ گے...... ہوتے چلے جاؤ گے۔"

اسد نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا۔ اُس کی پیشانی پسینے سے تر ہو رہی تھی۔ نجانے اُس کے دل میں کیا آئی کہ اُس نے عبداللہ کا کندھا جھنجھوڑ کر اُسے جگا دیا۔ عبداللہ ہڑبڑا کر اُٹھا اور سرخ سرخ آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا...... کیا بات ہے؟" عبداللہ نے پوچھا۔

اسد نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھی اور "شی" کی آواز نکال کر اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ عبداللہ گھبرا کر خاموش ہو گیا۔ اسد کے کان اُسی غیر مرئی آواز پر لگے تھے۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ "آواز" عبداللہ کو بھی سنائی دیتی ہے یا نہیں۔ بیس تیس سیکنڈ مکمل خاموشی رہی۔ پھر وہی بارُعب آواز آئی۔

"میری باتوں پر غور کرنا...... اچھا خدا حافظ!"

"یار...... کک...... کیا بات ہے؟ کیوں ڈرا رہے ہو مجھے؟" عبداللہ ہکلایا۔

اسد نے ایک بار پھر ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر اُسے خاموش کیا۔ جب ایک منٹ مزید اسی طرح گزر گیا تو اسد نے اپنے تکیے کے نیچے سے رُومال نکالا۔ وہ صاف محسوس کر رہا تھا کہ اُس کی پیشانی پر پسینہ رینگ رہا ہے۔ اُس نے پسینہ صاف کیا۔ عبداللہ اُس کے بستر پر آ بیٹھا۔ "کیا بات ہے؟" اُس نے ڈری ڈری آواز میں پوچھا۔

"وہی آواز آئی ہے......"

"کب؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے...... کیا تم نے کچھ سنا؟"

"نن...... نہیں تو...... مجھے تو بس تمہاری آواز ہی سنائی دی ہے۔"

"شاید تم نے غور نہیں کیا۔"

عبداللہ نے اُٹھ کر کمرے کا دروازہ اندر سے چیک کیا، وہ بند تھا۔ وہ اسد کے قریب بیٹھ گیا اور اُس کا ہاتھ اپنے لرزاں ہاتھ میں تھام کر بولا۔

"میں نے پہلے بھی تم سے کہا تھا۔"

"کیا کہا تھا؟"

"یہی کہ میرے ساتھ پشاور پیر برکات احمد کے مزار پر چلو۔ اُن کے گدی نشین گل جی حضرت بڑے کرنی والے ہیں۔ ایک دو تعویذوں میں ہی بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ یہ شیطانی وسوسے تمہارے دماغ سے ایسے نکلیں گے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ مجھے کوئی وہم وسوسہ ہے۔"

"یار! جو کچھ بھی ہے، مگر کچھ نہ کچھ تو ہے۔ جادو برحق ہے...... اور ہوائی چیزوں کا ہونا بھی کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ تمہیں یاد ہی ہوگا، دو سال پہلے میری پھوپھی کی کیا حالت ہوگئی تھی۔ بیٹھے بیٹھے ہاتھ پاؤں مُڑ جاتے تھے، منہ سے جھاگ نکلنے لگتی تھی۔ کہتی تھی مجھے ڈراؤنی شکلیں نظر آتی ہیں۔ دو ہفتوں میں مرنے والی ہوگئی تھی۔ گل جی حضرت سے ہی آرام آیا تھا۔"

"یار! یہ وہ چکر نہیں ہے۔" اسد نے بیزاری سے کہا۔ "مجھے کوئی دورہ شورہ نہیں پڑتا ہے۔ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ میں نے تمہیں بتایا تھا۔ بس ایک آواز سی ہے...... کبھی تو لگتا ہے کہ دماغ کے اندر سے ہی اُٹھتی ہے اور کانوں میں گونجنے لگتی ہے۔"

"اچھا...... تو پھر کسی ڈاکٹر شاکٹر کو دکھا لے۔ اس طرح اپنے آپ سے لڑتا رہے گا اور سوچتا رہے گا تو کوئی بیماری لگا لے گا۔ سیانے کہتے ہیں کہ بندے کا دماغ بڑا نازک ہوتا ہے۔ زیادہ بوجھ پڑے تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

اسد خاموش رہا۔ عبداللہ بھی خاموشی سے اُسے گھورتا رہا۔ کمرے کی فضا بہت بوجھل ہوگئی تھی۔ عبداللہ نے اپنا اعصابی تناؤ کم کرنے کے لئے سگریٹ سلگایا اور کش لیتے ہوئے بولا۔ "اچھا ایک بات تو بتا...... یہ آواز پہلے پہل کب آئی تھی تیرے کانوں میں؟"

"ٹھیک سے یاد نہیں۔ میرا خیال ہے......" ایک دم اسد کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ اُس کے ذہن میں جیسے ایک دم بہت بڑا قمقمہ سا روشن ہو گیا تھا۔ اُسے یوں لگا جیسے سارے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا ہو۔ اُس نے پہلے بھی کئی بار سوچا تھا کہ سماعت میں گونجنے والی یہ پراسرار آواز اُس نے پہلے پہل کہاں سنی تھی؟ آج ان لمحوں میں بیٹھے بٹھائے اچانک اُس پر انکشاف ہوا کہ یہ آواز سب سے پہلے اُس نے یہیں ڈیرے پر سنی تھی۔ وہ بھی

ایک ایسی ہی بارش کی رات تھی۔ وہ اس کمرے میں تھا یا شاید ساتھ والے کمرے میں... سردیوں کا موسم تھا۔ وہ لحاف لے کر لیٹا ہوا تھا۔ آواز سن کر وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا تھا اور کتنی ہی دیر پریشان رہا تھا۔ اسد کو یاد تھا، تب اُس کے سرہانے ایک ٹرانسسٹر ریڈیو پڑا ہوا تھا۔ اسد نے خود کو یہ کہہ کر تسلی دی تھی کہ شاید اس کا ہاتھ لگنے سے ریڈیو آن ہو گیا تھا اور یہ آواز ریڈیو سے اُبھری تھی۔

''یار! کیا ہو گیا ہے تمہیں...... کس سوچ میں پڑ گئے ہو؟'' عبداللہ کی آواز نے اُسے خیالوں سے چونکایا۔

''نن...... نہیں کچھ نہیں۔ یونہی ایک بات یاد آ گئی تھی...... ہاں کیا پوچھا تھا تم نے؟''

''میں نے پوچھا تھا، یہ آواز والا چکر کب سے شروع ہوا تھا؟''

''ٹھیک سے یاد نہیں یار! شروع میں تو مجھے بھی یہی لگتا تھا جیسے صرف وہم ہے اور میرے کان بج رہے ہیں۔ پہلے پہل یہ آواز غنودگی کی حالت میں آتی تھی جیسے بندہ آدھا سو رہا ہو اور آدھا جاگ رہا ہو۔ پھر یہ آواز جاگنے کی حالت میں بھی آنے لگی۔''

''یعنی تجھے ٹھیک سے پتہ نہیں کہ شروع میں آواز تم نے کب سنی تھی؟''

اسد نے نفی میں سر ہلا کر عبداللہ کو ٹال دیا۔ وہ ڈیرے والی بات بتا کر عبداللہ کو ڈرانا نہیں چاہتا تھا۔

بہرحال رات پچھلے پہر جب عبداللہ پھر سے سو گیا تو اسد تب بھی جاگتا رہا۔ وہ اُٹھ کر ننگے پاؤں کمرے کے فرش پر ٹہلنے لگا۔ اُس کا ذہن مختلف النوع خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ باوجود نہ چاہنے کے وہ الفاظ بار بار اُس کے تصور میں گونج رہے تھے جو آج رات پہلے پہر اُس نے کھڑکی کے قریب بیٹھ کر سنے تھے۔ ان الفاظ کی تاثیر براہِ راست اُس کے دل پر اثر کر رہی تھی، اور یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ وہ جب کبھی یہ الفاظ سنتا تھا وہ اُس پر اثر پذیر ہوتے تھے۔ اُن کا مفہوم اُس کے ذہن میں گہرائی تک سرایت کرتا تھا اور اسد کو اپنا ہم خیال بناتا چلا جاتا تھا۔ اس وقت بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ اسد کی سوچ میں تبدیلی آ رہی تھی۔ کل شام وہ جو کچھ شمیم کے بارے میں سوچ رہا تھا، وہ اب اُسے کچھ نامناسب سا لگنے لگا تھا۔ شاید اُس وقت وہ جذبات کی رو میں بہہ گیا تھا۔ حالات وہی تھے، مؤقف وہی تھا، ہٹ دھرمی وہی تھی تو پھر شمیم کو رعایت دینے کا خیال اُس کے

ذہن میں کیوں آیا تھا؟ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی تو نہیں سرکی تھی۔ اسد کی ایک معمولی سی خواہش کے راستے میں اُس نے اپنی انا کا پہاڑ کھڑا کر دیا تھا۔ اب اس پہاڑ کو وہ مختلف نام دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اپنے بے رحم مؤقف پر وہ مختلف پردے ڈال رہی تھی...... اُس کی بیماری بھی تو پردے کی ایک قسم ہی تھی۔ وہ محبت کی طاقت کو سرنگوں کر کے اسد کی زندگی میں آنا چاہتی تھی جبکہ اسد محبت کی طاقت کو سربلند کر کے اُسے زندگی میں لانا چاہتا تھا۔

وہ دن چڑھے تک حویلی کے در و دیوار میں بے قرار پھرتا رہا اور اپنے آپ میں اُبلتا اور کھولتا رہا۔ ایک بار پھر وہی شدید قسم کی جھلاہٹ اُس پر سوار ہو چکی تھی جو دو سال پہلے شادپور چھوڑتے وقت ہوئی تھی۔ یہ جھلاہٹ اکثر اُس کے اندر ایک خوفناک آگ بھڑکا دیا کرتی تھی۔ جب یہ آگ بھڑکتی تھی تو اسد کو کھیل کے میدان کی فوری ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ کھیل کا میدان ہی وہ جگہ تھی جہاں وہ اپنی اس آتشیں توانائی کو ٹھنڈا کر سکتا تھا۔ ایسے میں اُسے محسوس ہونے لگتا تھا کہ اگر اُسے کھیل کا میدان نہ ملا تو وہ کسی بھی شخص سے بے وجہ اُلجھ جائے گا۔ اُس سے لڑ پڑے گا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں توڑ دے گا یا اپنے تڑوا لے گا۔ ایک ناقابل برداشت بے کلی اُس کے رگ و پے میں پھیل جاتی تھی۔

دوپہر تک اُسے ہلکا بخار محسوس ہونے لگا۔ عبداللہ اور صغیر مچھلی پکڑنے اور تیراکی کرنے جھیل کی طرف چلے گئے۔ اسد وہیں کمرے میں کانٹوں کے بستر پر لوٹتا رہا۔ دوپہر کو زاہدہ عرف گڑیا اُسے کھانا دینے آئی تھی۔ اسد نے اُس سے پوچھا کہ رنگی بابا کدھر ہیں؟

وہ بولی۔ ''چھوٹے مالک! آپ کے لئے مکئی کا آٹا لینے گاؤں گئے ہیں۔ کہتے تھے کہ شام کو آپ کے لئے مکئی کی میٹھی روٹیاں بنائیں گے۔''

''لیکن بھئی مجھے تو بخار ہو رہا ہے۔ میرے لئے تو کوئی ہلکی سی چیز بنا لینا۔ میٹھی روٹیاں عبداللہ اور صغیر کھا لیں گے۔''

''اگر زیادہ بخار ہے تو میں حکیم جی کو بلا لاؤں؟'' زاہدہ نے پریشان ہو کر کہا۔

''نہیں کوئی اتنا زیادہ بھی نہیں۔ بس حرارت سی ہے۔ شام تک ٹھیک ہو جاؤں گا۔ تم بس ذرا غسل خانہ دیکھتی جاؤ۔''

"اچھا جی......" وہ شتابی سے بولی۔ "میں ابھی صاف کر دیتی ہوں۔"

ٹرے اسد کے سامنے رکھ کر وہ غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔ اُس کی پتلی کمر پر بھاری چوٹی کسی ناگن کی طرح لہرا رہی تھی۔ ایک دم ہی اُس کا جسم بھر کر پُرکشش ہو گیا تھا۔ اسد پلنگ پر بیٹھا اُسے غسل خانے کی طرف جاتے دیکھتا رہا۔ پھر نجانے کیا ہوا اُس کے سینے میں چنگاری چمکی اور بھک سے شعلہ بن گئی...... اُس کا دل سینے میں بے پناہ تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کچھ وہی کیفیت تھی جو ایک مرتبہ لاہور میں ہوئی تھی۔ اُس کی فرمائش پر جب فریحہ پہلی مرتبہ اُس کے بیڈ روم میں آئی تھی، شب کے سناٹے میں اُس کے قدموں کی ڈری ڈری چاپ اسد کے کمرے سے باہر اُبھری تھی، کچھ ایسے ہی انداز میں اسد کا دل سرپٹ دوڑا تھا۔

زاہدہ غسل خانے میں داخل ہو چکی تھی۔ غسل خانے کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ بکھری ہوئی چیزوں کو سنبھال رہی تھی۔ اُس کی چوڑیوں کی مدھم چھن چھن سنائی دے رہی تھی۔ اسد بے اختیار اپنی جگہ سے اُٹھا اور غسل خانے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ وہ اُس کی طرف پشت کئے کھڑی تھی اور اُس کی موجودگی سے بے خبر تھی۔ اسد اُس کے پُرکشش جسم کو دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ اسد نے صبح شیو کی تھی۔ صابن اور بالوں میں لتھڑا ہوا شیونگ برش شیلف پر پڑا تھا۔ زاہدہ کے گورے گورے ہاتھ بڑی نرمی سے برش کو دھونے لگے۔ یہی وقت تھا جب اچانک زاہدہ کو اپنے عقب میں اسد کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ پلٹی، اسد کے تاثرات دیکھ کر وہ چونک سی گئی...... اسد نے اُس کے شانوں پر ہاتھ رکھا تو اُس کا رنگ فق ہو گیا اور وہ ایک دم سمٹ کر دیوار سے لگ گئی۔ اسد نے اُسے بانہوں میں لے لیا اور اُس کے ہونٹوں اور رُخساروں پر بوسوں کی بارش کر دی......

"چھوٹے مالک...... چھوٹے مالک......" وہ منمنا رہی تھی اور کمزور مزاحمت کر رہی تھی۔ وہ غالباً سکتے کی سی کیفیت میں رہ گئی تھی اور کھل کر مزاحمت بھی نہیں کر سکی تھی۔

اُس نے بمشکل خود کو اسد کی گرفت سے آزاد کیا اور ہوا کی طرح کمرے سے نکل گئی۔ اسد شام تک خاصا پریشان رہا۔ اُسے خطرہ تھا کہ زاہدہ اپنے بھائی صغیر یا والد رنگی سے شکایت نہ کر دے۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہاں، اتنا ضرور ہوا کہ اس واقعے کے بعد زاہدہ ڈیرے کے رہائشی حصے میں نظر نہیں آئی۔ ایک مرتبہ صغیر کھانا لایا جبکہ دو مرتبہ رنگی

نے خود یہ خدمت انجام دی۔ غالباً زاہدہ نے نہ آنے کے لئے کوئی بہانہ کر دیا تھا......

اگلے روز دوپہر کے فوراً بعد چچا شوکت کی جیپ اُنہیں واپس لے جانے کے لئے ڈیرے پر پہنچ گئی۔ صغیر، رنگی بابا اور اُس کی بیوی نے بڑی گرم جوشی سے اُنہیں رخصت کیا۔ یقیناً اُن میں سے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ کل دوپہر کمرے میں کیا واقعہ پیش آیا ہے۔

اُسی روز رات کو اسد کی دعوت چچا کے گھر میں تھی۔ صبح وہ لاہور واپس جا رہا تھا لہٰذا چچا نے شمیم سے اسد کی پسندیدہ ڈش آلو قیمہ پکوائی تھی۔ اس کے علاوہ مرغ پلاؤ اور کھیر وغیرہ بھی تھی۔ شمیم کی طبیعت اب بہتر تھی مگر رنگ بدستور زرد تھا۔ وہ نقاہت سے اُٹھتی بیٹھتی تھی۔ چچی نے کہا۔ "میں نے اس سے کہا بھی کہ تمہاری طبیعت پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی میں خود پکا لوں گی۔ منع کرنے کے باوجود میرے ساتھ لگی رہی اور آلو قیمہ تو اس نے اپنے ہاتھ سے پکایا ہے۔"

مجبوراً اسد نے تھوڑا سا کھانا کھایا۔ اُسے ہر چیز زہر لگ رہی تھی اور بات صرف کھانے ہی کی نہیں تھی۔ اُسے شمیم کا اُٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، دیکھنا سب زہر لگ رہا تھا۔ وہ اسد کے سینے میں سلگتی ہوئی آتش سے قطعی بے خبر تھی۔ وہ شاید کسی خوش فہمی میں تھی۔ چند دن پہلے جب اسد اُس کی تیمارداری کے لئے آیا تھا تو اُس نے اسد کے رویئے میں تھوڑی سی لچک محسوس کی تھی۔ شاید وہ سمجھ رہی تھی کہ اسد کے سلوک میں مزید تبدیلی رُونما ہو گی۔ اس لئے وہ اُس کے آگے پیچھے پھر رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اپنی اس خوش خلقی سے وہ اسد کے غضب کو اور ہوا دے رہی ہے۔

چچا کے گھر میں وہ قریباً دو گھنٹے رہا۔ اس دوران اُسے چند لمحے ایسے بھی مل گئے جن میں وہ شمیم سے بات کر سکتا تھا۔ اُس نے بے دریغ لہجے میں کہا۔

"شمی! کیا تم میری خاطر اپنی ضد چھوڑ نہیں سکتی ہو؟"

شمیم کا رنگ فق ہو گیا۔ "کک...... کیا؟" اُس نے سہم کر کہا۔

"کیا ایک بار میری بات نہیں مان سکتی ہو؟"

شمیم کے نازک ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔ اُس نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہیں سکی۔

اسد دوٹوک لہجے میں بولا۔ "بے شمار پہلی راتوں کی طرح آج بھی میں رات بھر برساتی میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

شمیم کا جواب سننے سے پہلے ہی اسد نے اپنا رُخ پھیر لیا تھا۔ رُخ پھیرنے سے پہلے اُس نے شمیم کے چہرے پر جو آخری منظر دیکھا وہ آنکھوں کے گوشے بھیگنے کا منظر تھا۔

وہ جانتا تھا کہ شمیم آج رات بھی نہیں آئے گی۔ مگر وہ پھر بھی انتظار کرنا چاہتا تھا، کسی موہوم اُمید کے سہارے، کسی ٹمٹماتی شمع جیسی آس کے سہارے...... پتہ نہیں وہ کون سا بے مہر لمحہ تھا جب اس ''انہونی'' کی پرستش اُس کی ذات کا حصہ بن گئی تھی۔ یہ کیسا انتظار تھا جس کا انجام معلوم ہونے کے باوجود وہ سراپا ساعت اور مجسم آنکھ تھا...... رات شروع ہوئی اور دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگی۔ وہی کھڑکی، وہی چھت، وہی بیکراں اندھیرے میں چھپے ہوئے کھیت کھلیان...... اور وہی نہ آنے والے کا انتظار...... رات سسکتی رہی، سلگتی رہی اور پھر حسبِ معمول اُجالے کی گود میں سر رکھ کر سو گئی...... منتشر بالوں اور آنکھوں کے ساتھ اسد اپنے عقوبت خانے سے نکلا۔ اُس نے چچا کے صحن پر ایک آتشیں نگاہ ڈالی اور سیڑھیاں اُتر کر نیچے آ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ لاہور جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔

اسد اپنے اندر کی آگ میں پھنکتا ہوا لاہور آیا تھا۔ کرکٹ کے میدان میں پہنچ کر اُسے یوں لگا جیسے مچھلی پانی میں آ گئی ہو۔ اُس کا پرانا حریف سجاد بھی آج کل بہت تپا ہوا تھا۔ اسد کے ہاتھوں ایک گیند سجاد کے دوست کو لگی تھی، اب اُس کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اس قسم کی صورتحال اسد کے لئے آئیڈیل ہوتی تھی۔ وہ سرتاپا فائٹر بن جاتا تھا...... اسد کی کلائی کا معائنہ کرنے کے بعد کلب کے ڈاکٹر نے اُسے کھیل کے لئے فٹ قرار دے دیا تھا۔ اسد نے نیٹ پریکٹس شروع کر دی۔ پتہ نہیں کیا بات تھی باؤلنگ پر اُس کی توجہ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اُس کی باؤلنگ میں زبردست بہتری بھی پیدا ہو رہی تھی۔ اگلے دو چار روز میں اُس نے نیٹ پریکٹس کے دوران سجاد اور اُس کے ایک دو ساتھیوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ اسد کی باؤلنگ پر اُن کے لئے بیٹنگ کرنا دُشوار تر ہو رہا تھا۔

سجاد کو خود پر اتنا بھروسہ تھا کہ وہ اکثر نیٹ پریکٹس کے دوران ٹانگوں پر پیڈ نہیں باندھتا تھا۔ مگر اب اسد کی برق رفتار گیندوں نے پیڈ کے ساتھ ساتھ اُسے ہیلمٹ پہننے پر بھی مجبور کر دیا تھا۔ اسد کو یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے کرکٹ میں اُس کی اصل فیلڈ

باؤلنگ ہی تھی۔ باؤلنگ میں اُسے اپنی فطری صلاحیتوں کے بھرپور استعمال کا موقع مل رہا تھا۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا کہ جتنی محنت اُس نے بیٹنگ پر کی ہے، اُتنی باؤلنگ پر کی ہوتی تو اب تک کہیں سے کہیں پہنچ چکا ہوتا۔

ٹرافی کے پہلے میچ میں ہی اسد کی کارکردگی شاندار رہی تھی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس میچ میں اسد کی اہمیت بیٹسمین سے زیادہ باؤلر کی حیثیت سے تھی۔ اُسے اپنی ٹیم کی طرف سے باؤلنگ کا آغاز کرنا تھا۔ میچ کی صبح اُس کی ملاقات عبداللہ سے ہوئی۔ وہ ٹرافی کا میچ دیکھنے کے لئے ہی شیخوپورہ سے لاہور آیا تھا۔ عبداللہ کی باتوں سے جہاں اسد کو کئی اور باتوں کا پتہ چلا، وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ گھر میں شمیم کے رشتے کی بات پھر چل رہی ہے۔ چچی جان کی قریبی سہیلی اس معاملے کو آگے بڑھانے کے لئے شاد پور آئی ہوئی ہے اور شمیم کے ہاں ٹھہری ہوئی ہے۔ اس قسم کی اطلاعات اسد کی اندرونی آگ کو بھڑکا کر شعلہ جوالا بنا دیا کرتی تھیں۔ اُس میچ کے آغاز سے قبل بھی وہ شعلہ جوالا بن گیا تھا۔ اُس کے کھیل میں وہی تندی پیدا ہو گئی تھی جو اُس کے مدِمقابل کو ہراساں کر دیتی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ آج یہ تندی بیٹنگ کی بجائے باؤلنگ کے شعبے میں تہلکہ مچا رہی تھی۔ انتہائی برق رفتار باؤلنگ کراتے ہوئے اُس میچ میں اسد نے چھ کھلاڑی آؤٹ کئے اور سنسنی پھیلا دی۔ بیٹنگ میں بھی اُس نے قیمتی چالیس رنز بنائے تھے۔ وہ جس وقت ٹورنامنٹ کی یادگار اور تباہ کن باؤلنگ کر رہا تھا اُس کے ذہن میں صرف اور صرف شمیم ہی سمائی ہوئی تھی۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کے سامنے مخالف ٹیم کا بیٹسمین نہیں بلکہ شمیم کی ہٹ دھرم انا کھڑی ہے۔ یہ انا اسد پر طنزیہ انداز میں مسکرا رہی ہے۔ اُس پر آوازے کس رہی ہے۔ اُسے بتا رہی ہے کہ وہ بہت جلد اُسے شکست سے دوچار کرے گی اور ہمیشہ کے لئے تڑپنے کے لئے چھوڑ جائے گی...... وہ باؤلنگ کراتے ہوئے مخالف کھلاڑیوں کی وکٹوں کو نہیں بلکہ اس انا کو نشانہ بنائے ہوئے تھا۔ وہ اُس انا کی دھجیاں اُڑا دینا چاہتا تھا۔ اُسے پرزے پرزے کر دینا چاہتا تھا۔ اُس کی وحشت بڑھتی چلی گئی اور چھ وکٹیں خزاں رسیدہ پتوں کی طرح جھڑ گئیں۔

اتفاقاً ایک بڑے بینک کی ٹیم کے کپتان صاحب بھی یہ میچ دیکھ رہے تھے۔ یہ کپتان صاحب قومی ٹیم کے سابق کھلاڑی بھی رہ چکے تھے۔ کرکٹ سے وابستہ حلقوں میں اُنہیں

بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اُن کا نام تو عارف تھا لیکن یار لوگ اُنہیں بے تکلفی سے جانی بھائی کہتے تھے۔ میچ کے بعد جانی بھائی نے اسد کو اپنے پاس بلایا، اُسے اپنا کارڈ دیا اور تاکید کی کہ ٹورنامنٹ کے فوراً بعد وہ اُن سے اُن کے دفتر میں ملاقات کرے۔ کلب لیول کے کھلاڑی جانی بھائی سے بات کرنا بھی باعث عزت سمجھتے تھے۔ کہاں یہ کہ اُنہوں نے خود اُسے بلایا تھا، اُس کی تعریف کی تھی اور اُسے اپنے دفتر میں آنے کی دعوت دی تھی۔ یہ کامیابی اسد کے لئے بڑی خوش آئند تھی۔ اُس نے اپنے محسن دمربی قدیر صاحب کو بھی اس بارے میں بتایا۔ اُس کا خیال تھا کہ قدیر صاحب خوشی کا اظہار کریں گے۔ وہ ہر ایسے موقعے پر خوشی کا اظہار کرتے تھے جو اسد کے لئے کامیابیوں کا دروازہ کھولتا تھا۔ اور اس حوالے سے کسی طرح کا حسد یا کاروباری تحفظ اُن کے راستے میں حائل نہیں ہوتا تھا...... مگر نجانے کیا بات تھی جانی بھائی کا ذکر سن کر وہ زیادہ خوش نہیں ہوئے۔ اُن کی آنکھوں میں ایک طرح کا گدلا پن نمایاں ہو گیا اور اُنہوں نے اس موضوع پر اسد سے کوئی سوال جواب نہیں کیا۔

''کیا آپ جانی بھائی کی بات سے خوش نہیں ہیں......؟'' اسد نے قدیر صاحب سے پوچھا۔

وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولے۔ ''دیکھو بھئی...... آنے والے دنوں میں تمہیں بہت سے لوگ ملیں گے۔ اُن میں سے کچھ مخلص ہوں گے اور کچھ مخلص نہیں ہوں گے۔ پھر کچھ ایسے بھی ہوں گے جو مخلص تو شاید ہوں لیکن وہ اس بات کے اہل نہیں ہوں گے کہ تمہیں آگے بڑھنے میں مدد دے سکیں۔ تم جانتے ہی ہو کہ کرکٹ کی سیاست کتنی گندی ہے۔ اس سیاست نے بڑے بڑے نگینے خاک میں ملا دیئے ہیں۔ یہاں بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔''

اسد نے کہا۔ ''جناب! آپ کے ہوتے ہوئے مجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ ہمارا کام تو کھیلنا ہے۔ ہمارے بارے میں اچھے برے کا فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔''

قدیر صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں تو صرف مشورے دے سکتا ہوں۔ حتمی فیصلے تو تم لوگوں کو ہی کرنے ہوتے ہیں اور تمہیں کرنے بھی چاہئیں۔ اَب یہی باؤلنگ والا فیصلہ دیکھ لو۔ اگر بات میرے تجربے اور صوابدید کی ہوتی تو میں شاید کبھی تمہیں باؤلنگ

شروع کرنے کا مشورہ نہ دیتا۔ بلکہ میں نے تو شروع میں تم سے یہ بھی کہا تھا کہ باؤلنگ والی مہم جوئی نہ کرو اور بیٹنگ کو بہتر بناؤ...... تم نے باؤلنگ شروع کرنے کا فیصلہ اپنے طور پر کیا اور یہ فیصلہ درست ثابت ہو رہا ہے۔''

تھوڑی دیر تک اسد اور قدیر صاحب میں اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ پھر سجاد بھی وہاں چلا آیا اور دونوں کو خاموش ہونا پڑا۔

ٹرافی کے میچوں میں اسد کی کارکردگی شاندار رہی۔ وہ اس ٹورنامنٹ میں بیٹسمین کے علاوہ ایک انتہائی خطرناک باؤلر کی حیثیت سے بھی اُبھرا تھا۔ اُس کی برق رفتار گیندوں نے مخالف کھلاڑیوں کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔ اسد کی کارکردگی کی بدولت ہی اے ون کلب کی ٹیم وکٹری سٹینڈ تک پہنچی۔ اے ون نے فائنل کھیلنے کا اعزاز حاصل کیا اور رنر اپ رہی...... آخری دو میچ بے حد کانٹے دار تھے۔ اسد کو بڑی جان مارنا پڑی۔ اُس کی کلائی میں پھر ہلکا ہلکا درد شروع ہو گیا تھا۔ ٹورنامنٹ کے بعد قدیر صاحب نے اسد کو ماہرانہ مشورہ دیا کہ وہ کم از کم دو ہفتے مکمل آرام کرے۔

قدیر صاحب نے آرام کی بات کی تو پلک جھپکتے میں اسد کے ذہن میں ڈیرے کا خیال آ گیا۔ اگر ڈیڑھ دو ہفتے تک آرام کرنا تھا تو پھر اُس کے لئے ڈیرے سے بہتر کوئی جگہ نہیں تھی۔ لیکن ڈیرے پر جانے سے پہلے اسد ایک اور کام کرنا چاہتا تھا۔ یہ وہ کام تھا جو وہ بڑے عرصے سے کرنا چاہ رہا تھا۔ لیکن کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ بس ایک عجیب سی جھجک آڑے آ جاتی تھی۔ بہرحال کافی کوشش کے بعد وہ بالآخر اس جھجک پر تھوڑا بہت قابو پانے میں کامیاب رہا تھا۔

اُس شام وہ جیل روڈ پر واقع ایک PSYCHIATRIST کے کلینک میں داخل ہو رہا تھا...... یہ ایک کوالیفائیڈ نفسیات دان تھے اور ڈاکٹر شا کے نام سے جانے جاتے تھے.... اگلے ایک گھنٹے میں اسد نے اس مہربان معالج کے سامنے اپنی نفسیاتی اُلجھن کا ہر بل پیچ تفصیل سے بیان کر دیا۔ دوسرے لفظوں مین وہ تحلیل نفسی کے عمل سے گزرا۔ اُس نے اپنی سماعت سے ٹکرانے والی پراسرار آواز کے حوالے سے کوئی بات بھی نہیں چھپائی۔

پوری بات سننے کے بعد ڈاکٹر شا نے کہا۔ ''مسٹر اسد! تم مجھے پڑھے لکھے اور سمجھدار لگتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ میں تم سے کھل کر بات کر سکتا ہوں۔ شیزوفرینیا کا لفظ تو تم نے

سنا ہوگا۔ شیزوفرینیا کی مختلف اقسام اور Stages ہوتی ہیں۔ شیزوفرینیا کی ایک قسم ایسی ہے جس میں متاثرہ شخص ایسی چیزیں دیکھتا یا ایسی آوازیں سنتا ہے جو حقیقت میں موجود نہیں ہوتیں یا اُن کی نوعیت مختلف ہوتی ہیں۔ اس کو ہم اپنی اصطلاح میں PERCEPTUAL DISORDERS کہتے ہیں......''

''قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں ڈاکٹر صاحب!'' اسد نے تیزی سے کہا۔ ''میں نے اس پہلو پر بہت مرتبہ سوچا ہے۔ مگر میں اس آواز کو بقائمی ہوش و حواس سنتا ہوں۔ اس آواز کے سوا مجھے کوئی وہم، کوئی بیماری لاحق نہیں ہے۔ میں بالکل صحت مند ہوں۔''

ڈاکٹر شا نے کہا۔ ''میں کب کہتا ہوں کہ تم صحت مند نہیں ہو۔ شیزوفرینیا کی ابتدا ہوتی ہے تو اسے بیماری نہیں کہا جاتا...... تم نوجوان ہو...... تمہارے اندر توانائی ہے۔ ہر قسم کی نفسیاتی کیفیت سے لڑنے کی طاقت ہے۔ میں تمہیں بتانا یہ چاہتا ہوں کہ......''

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے پھر ایک طویل لیکچر دے دیا۔ اس لیکچر میں نفسیات کی دقیق اصطلاحات استعمال کی گئیں اور مختلف نفسیاتی اور طبّی مشورے دیئے گئے۔ اسد نے یہ سب کچھ سنا لیکن اُس کے دل کی گہرائی کو کوئی بھی بات نہ چھو سکی اور چھوتی بھی کیسے؟ ڈاکٹر اور مریض کی سوچ میں بنیادی اختلاف موجود تھا۔ ڈاکٹر جسے وہم قرار دے رہا تھا ''مریض'' کے نزدیک وہ ٹھوس حقیقت تھی۔ وہ کلینک سے مایوس ہو کر نکلا تھا۔

......اگلے روز اسد چھٹیاں گزارنے کے لئے ڈیرے جانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ ڈیرے کا خیال ذہن میں آتے ہی اسد کے دل میں عجیب کھدبدسی ہونے لگی۔ اُسے ایک خوبصورت سراپا یاد آیا جو اُس کی طرف سے رُخ پھیرے کھڑا تھا اور اُس کا شیونگ برش دھو رہا تھا...... رنگی بابا کی بیٹی کے حسن کا ذائقہ ابھی تک اسد کی زبان پر تھا۔ وہ ایک بار پھر اس ذائقے سے آشنا ہونا چاہتا تھا...... فریحہ کے بعد یہ دوسرا ذائقہ تھا جو اُس کی زبان پر آیا تھا۔ کبھی کبھی تو اُس کا دل چاہتا تھا کہ وہ بے مہار ہو جائے۔ اپنے جذبوں کے سارے بند کھول کر اُنہیں آزاد چھوڑ دے۔ فریحہ جیسی بہت سی خوبصورت لڑکیوں کو فتح کرے، اُن مفتوح لڑکیوں کی ایک فہرست بنائے...... یہ فہرست یا البم وہ ایک روز شمیم کے سامنے رکھے اور اُسے بتائے...... دیکھو میری کامرانیوں کے نشان۔ تم کیا سمجھتی تھیں اپنے آپ کو......؟ کوئی حور پری؟ کوئی آسمانی مخلوق تھی تم......؟ شاد پور میں رہنے

والی، بھینسوں کے آگے چارا ڈالنے والی، مکئی اور ساگ کھانے والی، دہی سے سر دھونے والی ایک نیم دیہاتن لڑکی......! دیکھو ان اسمارٹ جسموں اور حسین چہروں کو...... یہ وہ لڑکیاں ہیں جو میری نگاہِ التفات کی منتظر رہی ہیں......

اگلے ہی دن وہ شاد پور جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اشفاق اُس کے ساتھ جانا چاہتا تھا مگر عین موقع پر اُسے ضروری کام سے اسلام آباد جانا پڑ گیا۔ اب اسد کو اکیلے ہی جانا تھا۔ اُس کا ارادہ تھا کہ ایک دن شاد پور رُکے گا پھر وہاں سے عبداللہ کو لے کر ڈیرے چلا جائے گا۔ جانی بھائی نے جو کارڈ دیا تھا وہ ابھی تک اسد کے پاس موجود تھا مگر فی الحال اسد، جانی بھائی سے ملنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اُس نے محسوس کیا تھا کہ قدیر صاحب، جانی بھائی کے ذکر پر خوش نہیں ہوئے تھے۔ اُن کی خوشی اسد کو ہر چیز پر مقدم تھی۔ ٹرافی کے میچوں میں اسد کی دُھواں دار کارکردگی نے جہاں بہت سے دیگر لوگوں کو متاثر کیا تھا وہاں اُس کے پڑوسی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے تھے۔ فریحہ کے والد نے خالو جان کے گھر آنے کی زحمت کی تھی اور اسد کو مبارکباد دی تھی۔ فریحہ کے والد افضال صدیقی کرکٹ سے خاصا شغف رکھتے تھے اور کھیل کی باریکیوں کو بھی سمجھتے تھے۔ اُنہوں نے بھی ٹرافی کا ایک میچ دیکھا تھا۔ اسد کی باؤلنگ کی تعریف کئے بغیر وہ بھی نہیں رہ پائے۔ دو روز پہلے اُنہوں نے اپنے گھر میں اسد اور اشفاق کی باقاعدہ دعوت کر ڈالی تھی۔ اس دعوت کے دوران فریحہ کی بہنوں شاہین، نادیہ وغیرہ نے اسد کو گھیرے رکھا۔ وہ اسد اور اشفاق کو بالکل گھر کے فرد کی طرح ٹریٹ کر رہی تھیں...... ہاں فریحہ کا رویہ سرد مہری کا تھا۔ شاید اسد سے اپنے کھچاؤ اور بیگانگی کا اظہار کرنے کے لئے ہی وہ عین کھانے کے موقع پر اپنی کسی سہیلی کے ''ہنگامی بلاوے'' پر اُس کے گھر چلی گئی تھی۔ بہرحال اسد کو اُس کی کوئی خاص پرواہ نہیں تھی۔ اُس کے لئے یہ ''تم رُوٹھے ہم چھوٹے'' والا معاملہ ہی تھا۔

دوسرے روز اسد شاد پور پہنچ گیا۔ شاد پور میں بھی اُس کی کامیابیوں کے چرچے تھے۔ کہتے ہیں کہ بات پر لگا کر اُڑتی ہے۔ اس کہاوت کی سچائی کا اندازہ اسد کو شاد پور پہنچ کر ہوا۔ حالانکہ اسد اور جانی بھائی کے درمیان ہونے والی ملاقات کا علم معدودے چند لوگوں کو تھا مگر یہ بات شاد پور تک بھی پہنچ چکی تھی۔ بلکہ یہ افواہ بھی پھیلی ہوئی تھی کہ اسد عنقریب ملک کی بہترین بینک ٹیم میں شامل ہونے والا ہے۔ شاد پور پہنچتے ہی

علاقے کے سابق ایم این اے صاحب اپنے تحصیلدار دوست کے ساتھ اسد سے ملنے پہنچے اور اُسے شاباش دی...... محمد حیات خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے تک وہ بیٹے کی کھیل کود سے نالاں تھے مگر اب یہی کھیل کود اُن کی عزت افزائی کا سبب بن رہی تھی۔ ایم این اے چودھری بابر جیسے لوگ اُن کے مہمان بن رہے تھے۔

چچا شوکت نے بڑے بھائی کو مخاطب کر کے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بیٹے کو شاباش دے رہے ہیں بھا جی! لیکن شاباش کا اصل حق دار تو میں ہوں۔ آپ اسے کھیلنے پر مارتے تھے اور میں بچاتا تھا۔''

محمد حیات نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''کچھ بھی ہے بھائی! کھیل کو پیشہ تو نہیں بنایا جا سکتا نا...... ساری زندگی تو بندہ کھیل نہیں سکتا۔ زندگی گزارنے کے لئے کوئی پکا روزگار ہونا چاہئے۔''

چچا شوکت بولے۔ ''بھا جی! اب کھیل، روزگار بھی بن جاتا ہے۔ اور کرکٹ تو ایسا کھیل ہے جس میں کھلاڑی آج کل ٹھیک ٹھاک پیسہ کما رہے ہیں۔ بس دُعا کریں ہمارا اسد کسی ادارے کی اچھی ٹیم میں شامل ہو جائے۔''

ماں نے پیار سے اسد کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''میرا پُتر ضرور آگے نکلے گا۔ دن رات جان مار رہا ہے۔ گھر بار، سیر تفریح، یاری دوستی سب کچھ تو اس نے چھوڑ رکھا ہے۔''

اسد قریباً چوبیس گھنٹے گھر میں رہا۔ ان چوبیس گھنٹوں میں بس ایک مرتبہ اُسے شمیم کی جھلک نظر آئی۔ وہ چچی کے کندھے کے اُوپر سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے دونوں کی آنکھیں ملیں۔ اسد کی نگاہوں نے کہا۔ ''شمی! تم میری دُلہن بننا چاہتی ہو۔ میں بھی تمہیں اپنی دُلہن بنانا چاہتا ہوں۔ لیکن جب تک میری بات نہیں مانو گی، کچھ نہیں ہو گا۔ اپنی ضد پر اڑی رہو گی تو سب کچھ تمہاری ضد کی بھینٹ چڑھ جائے گا۔''

جواب میں شمی کی نگاہوں نے کہا تھا۔ ''اگر تمہاری ضد ہے، تو پھر میری بھی ضد ہے۔ میں دن رات تمہاری محبت میں تڑپوں گی، اپنا آپ وار دُوں گی لیکن اپنی شرم و حیا اور ماں باپ کی عزت پر آنچ نہیں آنے دُوں گی۔''

نگاہوں کی یہ ہم کلامی صرف ایک لمحے کے لئے تھی، پھر دونوں اپنے اپنے رُخ پر

دیکھنے لگے۔

اگلے روز سہ پہر کے وقت اسد اور عبداللہ ڈیرے پر پہنچ گئے۔ چچا شوکت کا ڈرائیور اُنہیں چھوڑ کر واپس آ گیا۔ اس مرتبہ اسد کا ارادہ دس پندرہ روز رہنے کا تھا۔ لہٰذا دونوں دوستوں کے پاس تھوڑا بہت سامان بھی تھا۔ حسبِ سابق رنگی بابا، صغیر اور دیگر لوگوں نے گرمجوشی سے اُن کا استقبال کیا۔ چونکہ اس مرتبہ ان لوگوں کو اسد کے آنے کی اطلاع پہلے سے ہو گئی تھی لہٰذا زاہدہ نے اُن کی رہائش کے کمرے صاف ستھرے کر کے آئینہ بنا رکھے تھے۔ برآمدہ بھی صاف تھا۔ احاطے میں برگد کے درخت تلے کرسیاں رکھی تھیں۔

زاہدہ کا ''کام'' جگہ جگہ نظر آ رہا تھا مگر وہ خود کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ جس روز اسد نے باتھ رُوم میں اُس پر جارحانہ یلغار کی تھی، اس کے بعد وہ اسد کو نظر ہی نہیں آئی تھی۔ ڈیرے پر پہنچتے ہی اسد کے جسم میں سنسنی کی ایک دھیمی لہر سی دوڑنے لگی تھی۔ نجانے کیوں اُسے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ وہ غیر مرئی آواز اُس کے آس پاس ہی کہیں موجود ہے جو گا ہے گا ہے اُس کے روز و شب کا رُخ متعین کرتی ہے۔

دو دن اسد نے ڈیرے پر سخت بے چینی میں گزارے۔ تیسرے دن اُس سے رہا نہیں گیا۔ رنگی بابا اُس کے لئے چائے لے کر آیا تو اسد نے کہا۔

''رنگی بابا! گڑیا کہاں ہے؟ اُسے دیکھا نہیں۔''

رنگی بولا۔ ''بس ذرا بڑی ہو گئی ہے نا، اس لئے شرمانے لگی ہے۔ پاگل ہے۔ بھلا اپنوں سے بھی کوئی شرماتا ہے؟ میں ابھی اُسے بھیجتا ہوں۔''

کچھ دیر بعد زاہدہ وہاں چلی آئی۔ اُس کے آنے سے پہلے اسد نے عبداللہ کو بہانے سے باہر بھیج دیا تھا۔ ابھی تک اُس نے عبداللہ کو اپنے اس نئے کارنامے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ زاہدہ گلابی شلوار قمیض میں تھی، کپڑوں کے اندر سے اُس کا شباب چھوٹا پڑ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ غریب و خستہ حال کپڑوں سے اُس کی امیر جوانی سنبھالی نہیں جا رہی۔

''سلام چھوٹے مالک!'' اُس نے نظریں ملائے بغیر کہا۔

''وعلیکم...... لیکن اتنے دن ہو گئے تم نے صورت ہی نہیں دکھائی۔''

اُس نے لرزاں پلکیں اُٹھا کر اسد کو دیکھا، شرم کے بوجھ نے پلکیں فوراً جھکا دیں۔ وہ

بولی۔ ''آ تو گئی ہوں جی۔''

زاہدہ کے انداز سے اسد کا حوصلہ بڑھا۔ وہ بولا۔ ''یہ آنا تو کوئی آنا نہیں بھئی۔ مزہ تو تب تھا کہ خود چل کر آتیں۔''

''خود ہی چل کر تو آئی ہوں۔''

''مگر رنگی چاچا کے کہنے پر چلی ہو نا۔''

وہ خاموش رہی۔ اُس کے چہرے پر دُھوپ چھاؤں کی سی کیفیت تھی۔ بیتے ہوئے وہ چند لمحے جن کے بارے میں صرف وہ دونوں جانتے تھے، دونوں کے دلوں کو انوکھے انداز میں دھڑکا رہے تھے۔ اسد نے اپنے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھ کر دیوار سے ٹیک لگائی اور بولا۔ ''رات کو آ سکتی ہو؟ میں تم سے کوئی بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''اب بات کر لیں۔''

''اب نہیں...... عبداللہ بس آ ہی رہا ہو گا۔ میں رات کو اُسے دوسرے کمرے میں سلا دوں گا۔ تم آ جانا۔ دروازہ کھلا ہو گا۔''

''مم...... میں نہیں آ سکتی۔ ابا کو پتہ چل گیا...... تو مجھے جان سے مار ڈالے گا۔ ویسے بھی...... ویسے بھی......''

''ویسے بھی کچھ نہیں ہو گا۔'' اسد نے تیزی سے اُس کی بات کاٹی۔ ''میں تمہیں یقین دلاتا ہوں میرے ہوتے رنگی چاچا تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا...... کچھ بھی نہیں۔''

''لیکن...... چھوٹے مالک...... آپ......''

ایک دم اُس کی آواز حلق میں گھٹ گئی۔ حویلی کے دروازے پر صغیر کے سائیکل کی گھنٹی سنائی دی تھی۔ زاہدہ نے جلدی سے کہا۔ ''ہائے اللہ! بھائی آ گیا..... میں چلتی ہوں۔''

اُس نے اجازت طلب نظروں سے اسد کو دیکھا، پھر بے تاب ہو کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اُس کے مڑنے سے اُس کی لمبی چوٹی لہرائی تھی اور وہ سامنے کی طرف چلی گئی تھی۔

''آنا ضرور زاہدہ.... میں رات کو تمہارا انتظار کروں گا۔'' اسد نے پیچھے سے آواز دی۔

آواز زاہدہ کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔ مگر وہ کسی طرح کا منفی یا مثبت ردِعمل ظاہر کئے بغیر باہر نکل گئی۔ زاہدہ کے جانے کے بعد اسد دیر تک سوچتا رہا۔ کچھ عجیب سا مزاج ہو

گیا تھا اُس کا...... اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ جو بات شمیم سے نہیں منوا سکا تھا وہ اپنے سامنے آنے والی ہر لڑکی سے منوانا چاہ رہا ہے۔ وہی الفاظ تھے جو بار بار اُس کے منہ سے نکل رہے تھے، وہی سوچ تھی، وہی تلخی تھی۔ شاد پور میں اُس نے جو کچھ شمیم سے کہا تھا، وہی لاہور میں فریحہ سے کہا تھا اور اب وہی ڈیرے پر زاہدہ سے کہہ رہا تھا۔

اُسے معلوم نہیں تھا کہ رات کو زاہدہ آئے گی یا نہیں؟ مگر انتظار تو اُسے کرنا تھا۔ وہ اپنے ساتھ کرکٹ کی ایک معروف کتاب ''تین عظیم باؤلر'' لایا تھا۔ رات کو یہ کتاب پڑھنے کا بہانہ کر کے اُس نے عبداللہ کو ساتھ والے کمرے میں سلا دیا۔ پل پل سرکتی رات میں کسی چاپ کا انتظار کرنا اُس کی اُلجھن بن کے رہ گیا تھا۔ جب دل بے چین ہو کر دھڑکتا تھا، سناٹا سانپ کی طرح ڈستا تھا، ہزارہا امکانات ذہن میں سرسراتے تھے تو جہاں بے پناہ کرب کا احساس ہوتا تھا وہاں ایک طرح کا نشہ بھی رگ و پے میں سرایت کر جاتا تھا۔

وہ رات بھر جاگتا رہا اور انتظار کرتا رہا، مگر جس نے نہیں آنا تھا وہ نہیں آئی۔ رات آخری پہر اسد کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ اُس نے ایک سگریٹ سلگایا اور آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ وہ سوچنے لگا، شمیم یا فریحہ کی تو اور بات تھی۔ وہ دونوں لڑکیاں اُس کی ہم پلہ تھیں۔ وہ اُس کی بات ماننے کا اختیار رکھتی تھیں، مگر زاہدہ تو ایک ڈری سہمی ملازمہ تھی۔ اُس میں اتنی ہمت شاید نہیں تھی کہ یوں اسد کی فرمائش پر اتنا بڑا قدم اُٹھا سکتی...... اسد نے سوچا کہ اس سے تھوڑی سی رعایت کرنی چاہئے۔ اُسے ''چل کر آنے'' کی فرمائش میں نہیں ڈالنا چاہئے۔ مگر جس وقت وہ یہ بات سوچ رہا تھا اچانک اُس کی توجہ کمرے کی کھڑکی کی طرف مبذول ہو گئی۔ برگد کے گھنے درخت کو چھو کر آنے والی ہوا برآمدے کے محرابی دروازوں سے گزری تھی اور کھڑکی کو ہولے سے دھکیل دیا تھا۔ ہوا کا جھونکا کمرے میں سرسرایا۔ اُس نے پردوں کو ہلایا اور شمعدان کی شمعوں کو ذرا سا لرزا دیا۔ اسد کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہی جانی پہچانی آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائی......

''غلط سوچ رہے ہو...... مرد کی پہچان اُس کی مضبوطی اور اُس کی سختی ہے۔ عورت کی پہچان اُس کی نرمی اور آمادگی ہے۔ عورت میں لچک نہ ہو تو وہ عورت نہیں۔ مرد میں کرختگی نہ ہو تو وہ مرد نہیں۔ عورت اپنی زیردستی سے پہچانی جاتی ہے، مرد اپنی زبردستی سے......''

آواز اسد کے کانوں میں گونج رہی تھی اور وہ بڑے دھیان سے اپنا تجزیہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیا یہ آواز واقعی باہر سے آ رہی تھی؟...... کہیں یہ اُس کے دماغ کے اندر ہی سے اُٹھنے والا کوئی مضبوط خیال تو نہیں تھا؟ اُس نے اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ آواز پھر ہوا کی لہروں پر اُبھری۔ آواز کے ساتھ ہلکا سا شور بھی تھا۔ جیسے یہ غیر مرئی صدا ریڈیائی لہروں کے دوش پر سوار ہو......

''عورت کے سامنے ایک بار جھکو گے تو پھر جھکتے چلے جاؤ گے۔ پھر ہر عورت کے سامنے جھکو گے۔ اس عورت کے سامنے بھی جو تمہارے دل کا روگ ہے۔''

ایک دم اسد کے دل میں آئی کہ وہ اس آواز کو مخاطب کرے۔ آج تک وہ اس کو سنتا رہا تھا، اُس کو مخاطب نہیں کیا تھا۔ اس کے اندر سے ایک لہر سی اُٹھی اور وہ بولا۔

''کون ہو تم؟ کہاں ہو؟ میرے سامنے کیوں نہیں آتے؟''

جواب میں خاموشی تھی۔ وہ انتظار کرتا رہا، مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ اُسے یوں لگا جیسے اُس نے دیواروں سے بات کی ہو۔ جیسے کسی نے اُسے سنا ہی نہ ہو۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔ کسی ردِعمل کا انتظار کرتا رہا۔ ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ وہ خاص کیفیت ختم ہو گئی جس میں اسد کو غیر مرئی آواز سنائی دیتی تھی۔ وہ دوبارہ پلنگ پر لیٹ گیا۔ آواز کی حقیقت پر ایک بار پھر اُس کا یقین ڈانواں ڈول ہونے لگا۔ اُس نے سوچا عبداللہ ٹھیک ہی کہتا ہے یہ سب اُس کے دماغ کا خلل ہے۔ جو کچھ اُسے سنائی دیتا ہے وہ اُس کے دماغ کے اندر سے ہی اُبھرتا ہے...... ایک عجیب سی بے چینی اُس کے رگ و پے میں سرایت کرنے لگی...... وہ پھر سے اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ وہ یہ سوچ کر پشیمان ہونے لگا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اُس نے دیواروں سے بات کی ہے۔ اگر عبداللہ یا کوئی دوسرا اس طرح اُسے ہم کلامی کرتے دیکھ لیتا تو کیا سمجھتا؟ شاید وہ اُس کی ہوش مندی پر شبہ کرنے لگتا۔ وہ کوئی نفسیاتی مریض یا فاتر العقل نشے باز نہیں تھا۔ ایک صحت مند کھلاڑی تھا۔ اپنے ساتھیوں میں ہر دلعزیز تھا۔ پھر اُس کے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا تھا؟

عبداللہ کی آواز نے اُسے خیالوں سے چونکایا تو اُسے اندازہ ہوا کہ صبح ہو چکی ہے۔

عبداللہ بڑی گہری نظروں سے اُسے گھور رہا تھا، کہنے لگا۔ ''دیکھو اسدی! یہ ٹھیک ہے کہ تم ایک بڑے کھلاڑی بن گئے ہو۔ لاہوریئے بھی ہو گئے ہو۔ مگر کچھ بھی ہے آخر تو میرے لنگوٹیے

ہو۔ مت سمجھو کہ تمہاری کوئی بات مجھ سے چھپی رہ سکتی ہے...... مجھے بتاؤ! کیا چکر ہے؟''

''کیسا چکر؟''

''دیکھو، بنو مت...... میں اتنا کاکا نہیں ہوں۔ تم نے رات کو کتاب کا بہانہ کر کے مجھے زبردستی دوسرے کمرے میں سلایا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ تم نے رات کو کچھ پڑھا شڑھا بھی نہیں ہے۔''

''تم تو بال کی کھال اُتارنے لگ پڑتے ہو۔''

''تم ایسی نوبت کیوں لے آتے ہو کہ مجھے بال کی کھال اُتارنی پڑے۔''

عبداللہ ایک مرتبہ پیچھے پڑ جاتا تھا تو پھر آسانی سے جان نہیں چھوڑتا تھا۔ اُس نے اسد سے زاہدہ کے بارے میں سب کچھ پوچھ کر ہی چھوڑا۔

جب اسد سب کچھ بتا چکا تو عبداللہ نے گول گول دیدے گھمائے اور بولا۔ ''تم تو ہر طرف وکٹیں ہی اُڑا رہے ہو...... اب آگے کیا ارادے ہیں؟''

''لڑکے کے ارادے سے کیا بنتا ہے؟ بات تو لڑکی کے ارادے کی ہوتی ہے۔ ہمارے تجربے کا نچوڑ تو یہی ہے۔''

عبداللہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا اشارہ شاید شمیم کی طرف ہے...... مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس معاملے میں تم سے بھی دو چار غلطیاں ہوئی ہیں۔ خیر چھوڑو اس بات کو۔ جو قسمت میں لکھا ہے ہو جائے گا۔ فی الحال یہ جو نیا پیچ تم نے شروع کیا ہے اس کی کمنٹری سناؤ۔ کیا خیال ہے، آج رات آئے گی وہ؟''

''ابھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' اسد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ایک تو تم یار ہر لڑکی کو کمرے میں آنے کا پنگا ڈال دیتے ہو۔ پتہ نہیں کیا کیڑا رینگ رہا ہے تمہارے دماغ میں۔''

اسد نے کچھ نہیں کہا۔ بس کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی تو واقعی اُسے لگتا تھا کہ اُس کے دماغ میں کوئی کیڑا رینگتا ہے۔ کچھ نہ کچھ انوکھا اُس کے ساتھ ضرور تھا۔ ابھی اُس نے رات والی بات عبداللہ کو نہیں بتائی تھی۔ اگر وہ بتاتا کہ رات پھر اُس نے وہی کیفیت محسوس کی ہے اور وہی آواز سنی ہے تو بحث کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ عبداللہ اس صورتِ حال کو دماغ کا خلل قرار دیتا یا پھر آسیب وغیرہ کا شاخسانہ قرار دیتا۔ اس

کے بعد رُوحانی وجسمانی علاج معالجے کا تذکرہ شروع ہو جاتا۔

شام تک زاہدہ نے اپنی صورت نہیں دکھائی۔ اسد چپکے ہی چپکے اپنے اندر کھولتا رہا۔ وہ اپنی کھولن زاہدہ پر ظاہر کرنا چاہتا تھا مگر کیسے کرتا......؟ پھر ایک ترکیب اُس کے ذہن میں آئی۔ رات کو جو کھانا صغیر اُن کے لئے لے کر آیا وہ اسد نے نہیں کھایا۔ اسد کے کہنے پر عبداللہ نے بھی نہیں کھایا۔ صغیر نے پوچھا مگر اسد نے کوئی وجہ بھی نہیں بتائی۔ بس یہی کہا کہ اُس کا دل نہیں چاہ رہا۔ اگلے روز بھی وہ دونوں سویرے سویرے ہی ڈیرے سے نکل گئے۔ شاٹ گن اُن کے پاس تھی، دوپہر تک وہ چڑیا اور فاختہ وغیرہ کا شکار کھیلتے رہے۔ پھر قریبی گاؤں احسن آباد چلے گئے۔ وہاں اُن کا ایک پرانا دوست نذیر رہتا تھا۔ اُس کے گھر اُنہوں نے کھانا کھایا، پھر تاش کی بازی ہوتی رہی۔ رات کا کھانا کھا کر وہ نذیر کی موٹر سائیکل پر واپس ڈیرے آ گئے۔ صغیر اور رنگی صبح سے اُن دونوں کے بارے میں پریشان تھے...... اسد نے اُنہیں بتایا کہ وہ اپنے دوست نذیر کی طرف چلے گئے تھے۔ صغیر اُن کے لئے گرما گرم کھانا لینے جا رہا تھا مگر اسد نے اُسے یہ بتا کر مزید پریشان کر دیا کہ وہ نذیر کے ہاں سے کھانا کھا کر آئے ہیں۔

اگلے روز بھی اسد نے یہی کچھ کیا۔ وہ صبح کا نکلا اور رات گئے ڈیرے پر واپس آیا اور آ کر یہ بتایا کہ وہ دونوں کھانا کھا کر آئے ہیں۔ رنگی نے اسد کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"چھوٹے مالک! اگر ہم بے وقوفوں سے کوئی گستاخی ہوگئی ہے تو خدا کے لئے ہمیں معاف کر دیں۔ کہیں صغیر کی ماں یا گڑیا سے تو کوئی غلطی نہیں ہوگئی؟"

"نہیں چاچا! ایسی کوئی بات نہیں...... تم تو اپنی ہمت سے بڑھ کر ہماری خدمت کرتے ہو۔ اور اب بھی کر رہے ہو۔" اسد نے کہا۔

"تو پھر...... کس کی خدمت میں کمی رہ گئی ہے؟"

اسد کیسے بتاتا کہ تمہاری بیٹی کی خدمت میں کمی رہ گئی ہے۔ اُس نے اپنے چھوٹے مالک کی نگاہِ التفات کی قدر نہیں کی...... اور اُس سے چھپتی پھر رہی ہے۔

اسد نے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے رنگی کو ٹال دیا۔

اسد جو کچھ کر رہا تھا اس کا نتیجہ اگلے روز نکلا اور یہ نتیجہ اسد کی خواہش کے عین مطابق تھا۔ اُس روز رنگی کے پُر زور اصرار پر اسد اور عبداللہ شام کے کھانے پر گھر آ گئے۔ کھانا

خود زاہدہ ہی لے کر آئی تھی۔ زاہدہ کو آتے دیکھ کر عبداللہ کمرے سے کھسک گیا۔ زاہدہ نے کھانا سامنے میز پر رکھا اور خاموش کھڑی ہوگئی۔ اسد اُس کی طرف دیکھے بغیر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ زاہدہ نے لرزاں آواز میں کہا۔

"کیا بات ہے...... آپ سب کو پریشان کیوں کر رہے ہیں؟ اگر کسی کی کوئی غلطی ہے تو بتائیں۔"

"غلطی تو میری تھی۔ اور اس پر پچھتا رہا ہوں۔ مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا تم سے اس طرح کی باتیں کرنے کا۔ میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔"

وہ جلدی سے بولی۔ "مجھے میری نظروں سے نہ گرائیں چھوٹے مالک! میں تو آپ کے قدموں کی خاک بھی نہیں ہوں۔ مم...... مجھے پتہ ہے کہ میری وجہ سے آپ کا دل دُکھا ہے۔ لیکن میں کیا کر سکتی ہوں؟"

"میں نے کسی بہت بڑی آزمائش میں تو نہیں ڈالا تھا تمہیں...... ایک چھوٹی سی خواہش ہی کی تھی نا۔" وہ بے حد مغموم لہجے میں بولا۔

"چھوٹے مالک...... اگر...... کسی کو پتہ چل گیا تو......؟"

"تو ٹھیک ہے، نہ آنا...... میری قسمت میں جتنے آنسو لکھے ہیں وہ بہا کر صبر شکر کر لوں گا۔ میں کل جا رہا ہوں یہاں سے...... اور شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہو۔"

اُس نے چور نظروں سے دیکھا، زاہدہ کی آنکھوں میں دُکھ کا گہرا سایہ لہرا گیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک شدید تذبذب میں رہی، پھر اُس کے ہونٹوں سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

"اچھا...... آپ غصے نہ ہوں۔ مم...... میں کوشش کروں...... گی۔"

وہ مُڑی اور تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔

اسد نے ہوا میں اپنی کامیابی کی خوشبو سونگھ لی تھی۔ فتح مندی کے احساس نے اُسے مسرور کر دیا۔ رات تک کا وقت اُس نے جس بے چینی سے گزارا وہ کچھ اُسے ہی معلوم تھا۔ وہ ایک ایک پل گن کر گزار رہا تھا۔ اُس کی تمام حسیات سمٹ کر اُس کی آنکھوں اور اُس کے کانوں میں آ گئی تھیں۔ رنگی اور اُس کا گھرانہ احاطے کے دوسرے سرے پر تھا۔ وہاں سے اسد کے کمرے میں آنے کے لئے زاہدہ کو قریباً سو گز کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا اندھیرے میں پتہ نہیں وہ اتنی دُور آ بھی سکے گی یا نہیں؟ وقت ایک ایک پل

سرکتا رہا...... اور پھر ایکا ایکی اسد کی قسمت جاگ اُٹھی۔ پہلے کمرے کے پاس قدموں کی آہٹ سنائی دی، پھر گھبرائی ہوئی زاہدہ اندر آ گئی......

وہ موٹی اوڑھنی میں یوں چھپی ہوئی تھی جیسے ڈری سہمی چڑیا گھونسلے میں...... اسد نے اُسے بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ پلنگ کے بالکل سرے پر بیٹھ گئی۔

''جی چھوٹے مالک! کیا کہنا تھا آپ نے؟'' اُس نے سرگوشی کے لہجے میں پوچھا۔

اسد نے اُس کے قریب ہوتے ہوتے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''زاہدہ! تم نے سنا ہی ہو گا کہ محبت پر زور نہیں ہوتا۔ یہ کسی وقت، کسی جگہ، کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ اور مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے زاہدہ!''

''چھوٹے مالک! کہاں آپ، کہاں میں...... آپ کو خدا کا واسطہ مجھے ایسا خواب نہ دکھائیں جس کی کوئی تعبیر ہی نہ ہو۔''

''یہ خواب نہیں زاہدہ...... حقیقت ہے...... اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ لفظ میری زبان سے نکل رہے ہیں جو اس سے پہلے کبھی نہیں نکلے۔ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں زاہدہ!'' اسد نے بازو سے کھینچ کر اُسے گلے سے لگا لیا۔ وہ سرتاپا لرز رہی تھی۔

''چھوٹے مالک! کوئی دیکھ لے گا...... عبداللہ بھائی کہاں ہیں؟''

''وہ دوسرے کمرے میں ہے۔ گہری نیند سویا ہوا ہے۔''

''آپ نے اُسے بھی سب کچھ بتا دیا ہے نا؟''

''نہیں بتایا زاہدہ...... اور اگر بتا بھی دوں گا تو وہ میرا دوست ہے۔ ہماری باتیں ایک دوسرے کے سینے میں دفن ہو جاتی ہیں۔''

''لیکن پھر بھی......'' بات زاہدہ کے منہ میں ہی رہ گئی۔ کیونکہ اسد نے اُس کے ہونٹ بند کر دیئے تھے۔ وہ اُسے لپٹانے لگا۔

رات کے ریشمی سناٹے میں آتشیں سانسوں کی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ ڈیرے کے پرانے خدمت گار رنگی بابا کی بیٹی اسد کی بانہوں میں تھی...... وہ کافی دیر بعد ان بانہوں کے حصار سے نکل پائی تھی۔ اُس نے اپنے بکھرے بال سمیٹے، اوڑھنی درست کی، ایک شرگیں نگاہ اسد پر ڈالی اور کل رات آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔

○○○

ڈیرے کی خاموش و تاریک دیہاتی راتوں میں رنگی بابا کی بیٹی بڑی رازداری سے اسد کے کمرے میں آتی رہی۔ اسد کا ہمراز دوست دوسرے کمرے میں ہوتا تھا۔ وہ جاگتے ہوئے بھی سویا ہوا رہتا تھا۔ اسد اور زاہدہ ایک دوجے کی بانہوں میں کھو جاتے۔ زاہدہ جب اسد کے پاس پہنچتی تو خوفزدہ ہوتی۔ اُس کے دل میں راز فاش ہو جانے کا دھڑکا ہوتا لیکن جب وہ اسد کے قریب آتی تو وہ اُس کے کانوں میں ایسی سرگوشیاں کرتا کہ زاہدہ کا خوف بتدریج خود فراموشی کی کیفیت میں ڈھل جاتا۔ وہ اسد میں گم ہو جاتی...... ایک دو مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ وہ دیر تک کمرے میں موجود رہے...... لیکن کچھ بھی تھا، ایک خوبی اسد میں تھی اُس نے تمام حالات میسر ہونے کے باوجود حد سے تجاوز کرنے کی کوشش نہیں کی...... پتہ نہیں کیسا کیڑا تھا اُس کے دماغ میں؟ فریحہ کی طرح اب وہ زاہدہ سے بھی کھیل رہا تھا...... لیکن اُس کے دماغ کے کسی گوشے میں شمیم ہر وقت موجود رہتی تھی۔ یہ بات بڑی پختگی سے اُس کے دماغ میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اگر اُس نے جذبات کی رو میں بہہ کر کسی لڑکی سے ''مرد وزن'' والا تعلق قائم کر لیا تو پھر شمیم اُس سے ہمیشہ کے لئے چھن جائے گی...... اور وہ شمیم کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ بے شک وہ شمیم سے بہت دُور تھا اور مزید دُور ہو رہا تھا مگر ایک آس ایسی تھی جو مٹ کر بھی مٹتی نہیں تھی۔ ایک اُمید ایسی تھی جو مر کر بھی مرتی نہیں تھی...... بلکہ کسی وقت تو اُسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ زاہدہ میں بھی شمیم کو ہی ڈھونڈ رہا ہے۔ کمرے کے دلفریب اندھیرے میں جب اُس کے دہکے ہوئے ہونٹ زاہدہ کے ریشمی لمس سے ہمکنار ہوتے تو وہ لمس اُسے شمیم کا لمس محسوس ہوتا۔ وہ کچھ اور بھی بے مہار ہو جاتا۔ اُس کی محبت میں اور بھی جارحانہ پن آ جاتا۔

وہ دس پندرہ روز کے لئے آیا تھا مگر ڈیرے میں جو دلفریب مصروفیت شروع ہوئی تھی اُس نے اسد کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنا قیام چھ سات روز بڑھا دے...... ایک دن

اسد اور عبداللہ دوپہر کا کھانا کھا کر اینٹھ رہے تھے کہ نذیر کی موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی...... نذیر اُن دونوں کا پرانا دوست تھا۔ خاص طور سے اسد اور نذیر میں خاصی انڈر سٹینڈ نگ تھی۔ نذیر پڑھائی میں بھی کافی اچھا رہا تھا۔ اُس نے بی ایس سی کر لی تھی اور اب نوجوانی میں ہی اُسے ملازمت بھی مل گئی تھی۔ وہ عباس پورہ کے ہائی سکول میں ماسٹر لگ گیا تھا۔ نذیر کو ادب سے بھی تھوڑا بہت لگاؤ تھا۔ وہ شعر و شاعری بھی کر لیا کرتا تھا۔

یہ ہفتے کا دن تھا۔ وہ تینوں گپ شپ لگاتے رہے اور تاش بھی کھیلتے رہے......

ڈیرے میں قیام کے دوران بھی اسد نے روزانہ کی ورزش ترک نہیں کی تھی۔ روزانہ کی ورزش اُس کے لئے ''عبادت'' کا درجہ اختیار کر چکی تھی۔ قدیر صاحب فٹ نس پر غیر معمولی زور دیتے تھے۔ وہ جب بھی لڑکوں کو لیکچر دیتے تھے ''فٹ نس'' اُن کا بنیادی موضوع ہوتا تھا۔ وہ کہتے تھے۔ ''کرکٹ پہلے دور میں ڈکوٹا جہاز کی طرح سست رفتار تھی، مگر اب سپر سانک ہو چکی ہے۔ اگر تم آگے بڑھنا چاہتے ہو اور اس میدان میں کوئی نام پیدا کرنے کی خواہش رکھتے ہو تو اس کے لئے جسمانی موزونیت سب سے اہم ہے۔ آج کل ہم دیکھ رہے ہیں کہ جو ٹیم فیلڈنگ میں پیچھے ہے وہ بہترین صلاحیتوں کے باوجود کسی کام کی نہیں...... اور فیلڈنگ کے لئے فٹ نس بنیادی شرط ہے۔ لہٰذا آپ لوگوں کو میرا مشورہ ہے کہ اگر جسمانی طور پر سپر فٹ نہیں رہ سکتے ہو تو ابھی سے کرکٹ کو خدا حافظ کہہ دو۔''

اسد احاطے میں ورزش کرنے لگا۔ نذیر اُس کے پاس ہی گھاس کے قطعے پر بیٹھ گیا۔ نذیر کی نگاہ اُن الفاظ پر پڑی جو ایک شعر کی صورت میں برآمدے کی پیشانی پر درج تھے۔ اس سے پہلے بھی نذیر کئی دفعہ ان الفاظ کو دیکھ چکا تھا مگر آج ان الفاظ کو دیکھ کر اُس کے چہرے پر عجیب سی دلچسپی نظر آئی۔ وہ اس تحریر کی طرف اُنگلی اُٹھاتے ہوئے بولا۔

''پتہ ہے اسد! اس پر کیا لکھا ہے؟''

''کیا لکھا ہے؟''

''یہ سنسکرت ہے۔ پچھلی دفعہ جب میں آیا تھا تو یہ شعر ایک کاغذ پر لکھ کر لے گیا تھا۔ سکول میں ہمارے ایک بزرگ ساتھی ماسٹر خدا بخش ہیں۔ وہ سنسکرت اور ہندی وغیرہ سمجھتے ہیں۔ اُنہوں نے فوراً اس کا ترجمہ کر دیا۔ انہوں نے بتایا ہے کہ یہ ایک پرانے

لوک شاعر شنکر ناتھ کا مشہور شعر ہے۔ اس کا مطلب کچھ اس طرح ہے۔ جب بھی نیم کی شاخوں پر ہریالی آتی ہے میرے دل کے زخم بھی ہرے ہو جاتے ہیں۔ میں سرتا پا آنکھ بن جاتا ہوں اور میرے انتظار کی شدت اتنے گنا بڑھ جاتی ہے جتنے نیم کے پتے ہوتے ہیں۔''

''یعنی یہ انتظار کا شعر ہے۔'' اسد نے کہا۔

''شاید میں اس کا ترجمہ ٹھیک طور پر نہیں کر سکا۔'' نذیر نے کہا۔ ''ورنہ ماسٹر خدا بخش کہتے تھے کہ انتظار اور جدائی کے بارے میں سنسکرت، ہندی اور گجراتی وغیرہ میں جو بہترین شعر کہے گئے ہیں یہ ان میں سے ایک ہے......'' اُس نے ایک لمحہ توقف کیا پھر بولا۔ ''لگتا ہے اسد! کہ تمہارے پڑدادا صاحب کے ساتھ کوئی زبردست ٹریجڈی رہی ہے۔ انہوں نے ساری زندگی تنہا گزاری ہے۔ آخر کوئی تو وجہ ہوگی۔''

''وجہ تمہیں بتائی تو تھی۔ اپنی بیوی یعنی ہماری پڑدادی صاحبہ کے ساتھ اُن کی ناچاقی ہوگئی تھی۔ یہ ناچاقی اتنی لمبی ہوئی کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔''

''یار! انسانوں کی زندگیوں کو یہ ضد اور ہٹ دھرمی کی جونک کیوں لگتی ہے؟ کیوں وہ اپنے آپ کو نہیں بدل سکتے؟ اپنی پوری زندگی کو بدل کر کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ سب کچھ ہی ختم کر دیتے ہیں۔''

''شاید اس کو قسمت کا لکھا کہتے ہیں۔'' اسد نے کہا۔

نذیر بولا۔ ''کسی وقت دل چاہتا ہے کہ رنگی بابا کے پاس بیٹھ کر یہ ساری کہانی پوری تفصیل سے سنیں۔''

''رنگی نہیں بتائے گا۔''

''میرا خیال ہے کہ بتائے گا۔ پہلے ہم کم عمر تھے۔ وہ تھوڑا بہت بتا کر ہمیں ٹال دیتا تھا۔ لیکن اب تو ماشاء اللہ جوان ہیں۔ ہم اصرار کریں گے تو وہ بتائے گا۔ کم از کم اتنا تو ضرور بتائے گا جتنا اُسے معلوم ہے۔''

''اس کا فائدہ؟'' اسد نے کہا۔

''میری کئی اُلجھنیں دُور ہوں گی۔ پتہ نہیں کیا بات ہے، جب بھی یہاں ڈیرے پر آتا ہوں یوں لگتا ہے کہ ان دیواروں میں کسی پرانی غمزدہ کہانی کی گونج رچی بسی ہے۔''

"بھئی اس غمزدہ کہانی کے بارے میں تم اچھی طرح جانتے ہو اور میں بھی جانتا ہوں۔ وہی پڑدادا جی کی ناکام شادی۔"

"لیکن یہ شادی کیسے ناکام ہوئی؟ میاں کا قصور تھا یا بیوی کا؟ اُن کے جھگڑے نے اتنا طول کیوں کھینچا؟ اور پھر اگر بات ختم ہی ہوگئی تھی تو پھر تمہارے پڑدادا صاحب نے نئی شادی کیوں نہ کرلی...... ایسے بہت سے سوال ذہن میں اُبھرتے ہیں......"

اچانک نذیر بات کرتے کرتے رُک گیا۔ اُس کی نگاہ برآمدے میں سے گزر کر کمرے میں گئی تھی۔ وہاں پلنگ کے نیچے لکڑی کی وہی مورتی پڑی تھی جو کچھ دن پہلے صغیر نے اسد کو دکھائی تھی۔ نذیر احمد جلدی سے اُٹھ کر گیا اور پلنگ کے نیچے سے وہ مورتی نکال لایا۔ "اوئے اسد! یہ کہاں سے ملی ہے؟" اُس نے مورتی کو اُلٹتے پلٹتے ہوئے کہا۔

"صغیر کہیں سے نکال کر لایا ہے۔ کہتا تھا بڑے سٹور میں سے ملی ہے۔"

نذیر احمد بڑے دھیان سے دیکھ رہا تھا۔ نیم عریاں عورت کو کوڑے سے پیٹتا ہوا شخص اُس کے سامنے تھا۔ تھوڑی دیر بعد نذیر احمد بولا۔ "تمہیں یاد ہے اسی طرح کی ایک مورتی ہم نے تین چار سال پہلے بھی دیکھی تھی۔ سردیوں کے دن تھے ہم چچا شوکت کے ساتھ مرغابی کے شکار کے لئے یہاں آئے تھے۔ شاید سٹور سے ہی ایک مورتی نکلی تھی۔"

"مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔" اسد نے کہا۔

"مجھے تو یاد ہے نا یار! وہ مورتی پھر میں ہی لے گیا تھا کپڑے میں چھپا کر اپنے گھر...... ہم ڈر رہے تھے کہ چچا شوکت کی نظر نہ پڑ جائے اس پر...... جوان عورت کی مورتی تھی۔ اُس کا اوپری جسم ننگا تھا اور سینے میں ایک خنجر کھبا ہوا تھا۔"

"ہاں...... ہاں...... کچھ کچھ یاد آ رہا ہے مجھے۔" اسد نے کہا۔ "میں نے ہی تم سے کہا تھا کہ مورتی لے جاؤ......"

"وہ پچھلے سال تک میرے پاس تھی۔ پھر اس ڈر سے کہ کوئی دیکھ ہی نہ لے میں نے اسے توڑ کر جلا دیا تھا۔"

دونوں تھوڑی دیر تک خاموش رہے اور اپنی اپنی جگہ کچھ سوچتے رہے۔ پھر نذیر احمد نے ہی اس خاموشی کو توڑا تھا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ مورتیاں تمہارے پڑدادا صاحب

نے ہی بنائی ہوں؟"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔" اسد نے کہا۔ "چچا شوکت کو لکڑی پر کشیدہ کاری کا تھوڑا بہت شوق ہے۔ تم نے چچا کے گھر کا اندرونی دروازہ دیکھا ہے نا اُس پر بڑے خوبصورت پھول بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ وہ چچا نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ چچا کو یہ شوق پڑدادا سے ہی وراثت میں ملا ہو۔"

نذیر احمد دیر تک مورتی کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا، پھر ایک گہری سانس لے کر وہ گھاس کے قطعے پر نیم دراز ہوگیا۔ اُس نے نظر کی عینک اُتار کر اُس کے شیشے رُومال سے صاف کئے اور بولا۔ "اس ڈیرے پر کئی چیزیں عجیب ہیں اسد! جیسے کہ ہم پہلے بھی بات کر چکے ہیں، حویلی کی ساری کھڑکیاں مشرق کی طرف کھلتی ہیں، مغرب کی طرف ایک کھڑکی بھی نہیں ہے۔"

"ہاں یہ بات تو واقعی عجیب ہے۔ میں نے چچا شوکت سے پوچھا تھا۔ اُن کا کہنا ہے کہ پہلے دونوں طرف کھڑکیاں تھیں مگر پھر بعد میں مغرب کی طرف والی کھڑکیاں بند کر دی گئیں۔ یہاں ہوا عام طور پر مشرق سے مغرب کی طرف چلتی ہے۔ آندھیاں بھی بہت آتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ مغربی کھڑکیاں اسی وجہ سے بند کی گئی ہوں۔"

"یہ ایک مفروضہ ہے اور زیادہ مضبوط مفروضہ نہیں ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ مفروضے قائم کرنے کی بجائے رنگی سے اُس کے ماضی کی باتیں سنی جائیں۔"

ابھی وہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ رنگی آتا دکھائی دیا۔ وہ پلیٹ میں کچھ لا رہا تھا۔ یہ گھر میں تیار کئے گئے میدے اور سوجی کے بسکٹ تھے۔ گرما گرم بسکٹس کی خوشبو دُور ہی سے بڑی مزیدار لگ رہی تھی۔ رنگی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"گڑیا نے بنائے ہیں۔"

رنگی نہ بھی بتاتا تو اسد کو معلوم تھا کہ گڑیا یعنی زاہدہ آج بسکٹ بنا کر بھیجے گی۔ بسکٹ بنا کر بھیجنے کی بات کل رات اُس نے اسد کی آغوش میں بیٹھ کر کی تھی۔

نذیر احمد نے رنگی سے کہا کہ وہ اندر سے تین کرسیاں اُٹھا لائے۔ رنگی نے حکم کی تعمیل کی۔ اسد ورزش سے فارغ ہوگیا تھا۔ وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ نذیر احمد نے اصرار کر کے رنگی کو بھی اپنے برابر کرسی پر بیٹھا لیا۔ پہلے تو وہ دونوں رنگی سے اِدھر اُدھر کی باتیں

کرتے رہے...... پھر اصل موضوع کی طرف آ گئے۔

اسد نے کہا۔ ''رنگی چاچا! آج ہمیں پڑدادا جی کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ ابا جی بتایا کرتے ہیں کہ تمہاری شادی پندرہ سولہ سال کی عمر میں ہو گئی تھی اور اُس وقت تک پڑدادا جی زندہ تھے۔''

رنگی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اُن دنوں وہ بیمار ہو چکے تھے۔ بہت کمزور ہو گئے ہوئے تھے۔ ڈیرے سے باہر کم ہی نکلتے تھے۔''

''تمہاری شادی میں شریک ہوئے تھے وہ؟''

رنگی کے چہرے پر عجیب سی یاس بھری مسکراہٹ اُبھری اور معدوم ہو گئی۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ ''شادی میں شرکت تو دُور کی بات ہے، اُنہوں نے کبھی میری بیوی کی صورت تک نہیں دیکھی۔ وہ مجھ سے بڑا پیار کرتے تھے۔ اس کے باوجود شادی کے بعد مجھے ڈیرہ چھوڑنا پڑا تھا۔ میں عباس پورہ چلا گیا تھا۔ وہیں ایک مکان میں رہنے لگا تھا۔ صبح منہ اندھیرے ڈیرے پر آ جاتا تھا۔ سارا دن تمہارے پڑدادا جی کی خدمت کرتا تھا، رات گئے گھر واپس چلا جاتا تھا۔ پھر جب شادی ذرا پرانی ہو گئی اور ایک بچہ بھی ہو گیا تو میں نے روزانہ گھر جانا چھوڑ دیا۔ بس ہفتے کے ہفتے جاتا تھا اور اگلے دن پھر بھائیا جی کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ چھوٹے بڑے، بچے بوڑھے سب ہی تمہارے پڑدادا جی کو بھائیا جی کہا کرتے تھے۔ اُن کا یہ نام اتنا پکا ہو گیا تھا کہ بھائیا جی سے بڑے لوگ بھی اُنہیں بھائیا جی ہی کہتے تھے۔''

''تمہاری دُلہن کی صورت کیوں نہیں دیکھی بھائیا جی نے؟'' نذیر احمد پھر سے رنگی کو اصل موضوع کی طرف لاتے ہوئے بولا۔

''وہ عورت کی صورت دیکھتے ہی نہیں تھے۔'' رنگی عجیب لہجے میں بولا۔

''کیوں؟'' اسد نے پوچھا۔

رنگی نے چونک کر اسد اور نذیر کی طرف دیکھا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ''بڑے مالک نے مجھے ایک دفعہ سختی سے کہا تھا کہ بچوں سے بھائیا جی کے بارے میں لمبی چوڑی باتیں مت کیا کرو۔ اس کے بعد میں نے بڑی احتیاط رکھی تھی۔ مگر...... اب......'' رنگی کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

''اب کیا؟'' اسد نے پوچھا۔

''اب تم بچے نہیں رہے ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہیں بتانے میں کوئی ایسا حرج نہیں ہے۔''

''تم نے میرے منہ کی بات چھینی ہے رنگی چاچا!'' اسد نے کہا۔

رنگی نے اپنی آنکھیں سکوڑیں۔ وہ جیسے کہیں بہت دُور ماضی کے جھروکے میں دیکھ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر جھریوں کا ایک جال سا تن گیا تھا۔ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

''میں نے بھائیا جی کو زیادہ دیر تک نہیں دیکھا۔ بس دس بارہ سال ہی اُن کی خدمت کر سکا ہوں...... اب تو اُن کی صورت بھی آنکھوں میں دُھندلا سی گئی ہے۔ اُس وقت بھائیا جی کی عمر پچپن سال کے قریب تھی۔ وہ بیمار رہتے تھے پھر بھی خود کو مصروف رکھنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے تھے۔ میں نے اُن کی جوانی کا ایک فوٹو حویلی کے بڑے کمرے میں دیکھا تھا۔ وہ اتنے خوبصورت تھے کہ اُن پر نظر کا ٹکنا مشکل تھا۔ چھ فٹ سے لمبا قد تھا، خوبصورت گورے چٹے تھے، آنکھیں کالی سیاہ، بال گھنگھریالے، ناک بالکل کھڑی تھی۔ جاگیردار تو نہیں تھے مگر وڈیروں اور جاگیرداروں جیسی شکل صورت پائی تھی۔ مجھے بس اتنا ہی پتہ ہے کہ بھائیا جی نے محبت کی شادی کی تھی۔ اُن کی بیگم بھی زمیندار گھرانے کی تھی اور بھائیا جی کی طرح لاکھوں میں ایک تھی۔ سنا ہے کہ اُن کے لئے بڑے بڑے امیر کبیر گھرانوں کے رشتے آئے تھے مگر اُن کے لیکھ بھائیا جی کے ساتھ لکھے تھے، اس لئے کہیں اور شادی کیسے ہو جاتی؟ بھائیا جی کی شادی میں کچھ رُکاوٹیں بھی آئیں اور یہ معاملہ دو ڈھائی سال تک لٹکا رہا۔ پھر ہونی ہو کر رہی اور بھائیا جی کی شادی ہو گئی۔ سنا ہے کہ شادی کے صرف دو مہینے بعد ہی میاں بیوی میں ناچاقی ہو گئی۔ بیگم صاحبہ اپنے میکے چلی گئیں۔ سنا ہے کہ بھائیا جی ایک مرتبہ اُنہیں لینے بھی گئے مگر وہ نہیں آئیں۔ اس کے بعد بھائیا جی بھی خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ تمہارے دادا صاحب میاں رب نواز کی پیدائش بھی ننھیال میں ہی ہوئی تھی۔ بچے کی پیدائش بھی میاں بیوی کو ایک دُوجے کے قریب نہ لا سکی۔ اُن کی جدائی لمبی ہوتی چلی گئی۔ پتہ نہیں کہ بزرگوں نے صلح کرانے کی کوشش کی یا نہیں...... اور اگر کی تو کس نیت سے کی؟ میاں بیوی میں دُوریاں بڑھتی گئیں۔ بھائیا جی کے لئے کئی اچھے گھرانوں کے رشتے آئے، اُن کے والدین نے بھی بڑا زور لگایا کہ جوان بیٹے کی زندگی یوں برباد نہ ہو لیکن جو قسمت

میں لکھا ہوا تھا وہ تو ہونا ہی تھا۔ بھائیا جی کے دل کو روگ لگ چکا تھا۔ اُنہوں نے شاید قسم کھائی ہوئی تھی کہ اُنہوں نے اپنی رُوٹھی بیوی کا انتظار کرنا ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں کرنا۔ جن لوگوں نے اُس وقت بھائیا جی کو دیکھا ہے، اُن کا کہنا ہے کہ بھائیا جی دنیا جہان سے بے خبر ہو چکے تھے۔ داڑھی بڑھا لی ہوئی تھی، تن من کا ہوش نہیں تھا۔ زمینداری کا سارا کام اُن کے چھوٹے بھائی صاحب چلا رہے تھے۔ وہ بس صبح سویرے حویلی کی دوسری منزل پر کھڑکی کھول کر بیٹھ جاتے تھے۔ اُنہیں یقین تھا کہ ایک دن رُوٹھی ہوئی بیگم صاحبہ تانگے پر سوار ہو کر حویلی میں آ جائیں گی...... دراصل اُنہوں نے بیگم صاحبہ سے کہہ دیا ہوا تھا کہ وہ اُنہیں لینے نہیں آئیں گے۔ اگر انہوں نے آنا ہوگا تو خود آئیں گی۔ بھائیا جی کا انتظار لمبا ہوتا چلا گیا۔ اسی طرح پانچ چھ سال گزر گئے...... کہتے ہیں کہ بھائیا جی نے اپنے بیٹے کی صورت بس ایک بار دیکھی تھی۔ وہ بھی بس اس طرح کہ کسی انگریز افسر کے گھر شادی تھی۔ اس شادی میں علاقے کے بڑے زمینداروں کو بلایا گیا تھا۔ بھائیا جی اُس شادی میں گئے تھے۔ وہاں بیگم صاحبہ کا گھرانہ بھی آیا ہوا تھا۔ بھائیا جی کا بیٹا رب نواز اُس وقت ڈیڑھ دو سال کا تھا۔ کوئی عورت اُسے بھائیا جی کے پاس لے آئی۔ بھائیا جی نے بیٹے کو گود میں لیا، اُس کی پیشانی چومی اور عورت کو واپس کر دیا۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا بھائیا جی سب سے الگ تھلگ اور خاموش ہوتے گئے۔ زمینداری سے اُن کا دل اُچاٹ ہو کر رہ گیا تھا۔ شادی سے پہلے اُنہیں شکار کا بڑا شوق تھا۔ یہ شوق بھی اب کم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ یاروں دوستوں کی محفلیں، دعوتیں، کھیل تماشے سب ہی کچھ ختم ہو گیا تھا...... تمہیں یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ بھائیا جی کو زمینداری کے سارے کاموں سے نفرت ہو گئی تھی۔ سب کچھ اُن کے چھوٹے بھائی سراج احمد نے سنبھالا ہوا تھا۔ دوسرے لوگوں کی طرح سراج احمد بھی اپنے بڑے بھائی کی عزت کرتا تھا اور اُن کا دل دُکھانے والی کوئی بات اُس نے کبھی نہیں کی۔ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ بھائیا جی نے حویلی کی وہ کھڑکیاں ہی بند کروا دی تھیں جو اُن کی زمینوں کی طرف کھلتی تھیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اُن کی نظر اُس طرف اُٹھے۔ وہ سارا دن اُوپر والی منزل کی بڑی کھڑکی میں بیٹھے رہتے تھے۔ یہ کھڑکی بھائیا جی کے سسرال کی طرف کھلتی

تھی...... کہنے والے کہتے ہیں کہ بھائیا جی کی نظریں ہر وقت اُس راستے پر لگی رہتی تھیں جو عباس پورہ سے ڈیرے کی طرف آتا ہے۔ بھائیا جی کو آس تھی کہ ایک نہ ایک دن اُن کی بیوی کو اپنی غلطی کا احساس ہوگا اور وہ بچے کے ساتھ واپس آ جائے گی۔ اب پتہ نہیں کہ دونوں میں سے غلطی کس کی تھی؟ مگر جس کی بھی تھی، اُس کا نتیجہ بہت برا نکل رہا تھا۔ میاں بیوی کی دُوریاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ پھر ایک وقت ایسا آیا جب بھائیا جی نے اپنے سسر سے کہہ دیا کہ اگر اُن کی بیوی واپس نہیں آئے گی تو وہ اُسے طلاق بھیج دیں گے۔ شاید بھائیا جی کو اُمید تھی کہ یہ تدبیر کامیاب رہے گی۔ ہمیشہ کی جدائی کا سوچ کر اُن کی بیوی اپنی ضد چھوڑ دے گی اور اپنے گھر واپس آ جائے گی...... ہوسکتا ہے کہ ایسا ہو بھی جاتا مگر بھائیا جی کے سسر اس موقع پر آڑے آ گئے۔ اُن کے مشورے پر بھائیا جی کی بیوی نے ایک بار پھر اپنا ارادہ بدل دیا اور شوہر سے صلح کا خیال دل سے نکال دیا۔ دراصل بھائیا جی کے سسر اور اُن کی بیٹی میں بہت پیار تھا۔ بھائیا جی کی بیگم اپنے والد صاحب کی مرضی کے خلاف چلنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ شاید یہ اُس کے والد ہی تھے جن کی وجہ سے میاں بیوی کے درمیان دُوری اتنی بڑھی کہ آخرکار طلاق ہو گئی۔ بھائیا جی نے آٹھ سال کی لمبی جدائی سہنے کے بعد بیوی کو طلاق بھیج دی۔ اُن کی ہر آس آخرکار ختم ہو گئی تھی۔ اس واقعے کے بعد بھائیا جی کی زندگی ایک دم بدلنا شروع ہو گئی۔ وہ پہلے سگریٹ اور پھر حقہ بھی پینے لگے۔ سنا ہے کہ کبھی کبھی نشہ بھی کرنے لگے تھے۔ وہ بڑی اچھی اور ہنس مکھ طبیعت کے مالک تھے مگر بیوی کو طلاق دینے کے بعد وہ غصے کے بڑے تیز ہو گئے تھے۔ نوکر اُن سے بات کرتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔ وہ اپنے پاس کسی عورت کا سایہ بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کے دو پرانے نوکر نشان علی اور رمزی بال بچے دار تھے۔ اُنہوں نے دونوں کو چھٹی دے دی تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، بھائیا جی کی نشے کی عادت پکی ہوتی گئی۔ اُن کا ایک نوکر اُن کے لئے حویلی کے اندر ہی دیسی شراب تیار کرتا تھا۔ وہ رات دن نشے میں غرق رہنے لگے...... کبھی کبھی بیمار بھی ہو جاتے تھے مگر کسی طرح کی پرہیز بالکل نہیں کرتے تھے...... وہ بیوی کو طلاق دے چکے تھے، سب کچھ ختم ہو چکا تھا، پھر بھی پتہ نہیں کیوں اُن کے دل میں یہ اُمید باقی تھی کہ ایک نہ ایک دن اپنی بچھڑی ہوئی دُلہن سے اُن کا میل ضرور ہوگا۔ وہ چاندنی راتوں میں

نشے میں ڈوب کر اُونچی آواز سے روتے تھے اور اپنی دُلہن کو آوازیں دیتے تھے۔ ساری ساری رات وہ کسی پرچھائیں کی طرح حویلی کے اندر چکراتے رہتے تھے۔ پر جب سویرا ہوتا تھا تو سب کچھ بھول چکے ہوتے تھے......''

بوڑھا رنگی بات کرتے کرتے تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر گیا۔ اُس نے اپنی سفید داڑھی کھجائی، کچھ دیر تک خلا میں کسی نادیدہ شے کو تکتا رہا پھر عجیب سے لہجے میں بولا۔

''چھوٹے مالک! آپ بھوت پریت اور ہوائی چیزوں پر یقین رکھتے ہیں؟''

''میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔'' اسد نے کہا۔

رنگی کی بوڑھی آنکھوں میں عجیب سا دُھندلا پن تھا۔ وہ بولا۔ ''آپ پڑھے لکھے لوگ ہیں جی...آپ کا علم ہم جیسے لوگوں سے بہت زیادہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کو میری بات عجیب لگے، لیکن میں آپ کو وہی کچھ بتا رہا ہوں جو میں نے اپنے بڑوں سے سنا ہے۔''

''کیا سنا ہے تم نے؟'' نذیر احمد نے پوچھا۔

''کہتے ہیں کہ بھائیا جی اچانک بیٹھے بیٹھے بالکل ختم ہو جاتے تھے۔ یہ سمجھیں کہ جیسے اُن کے جسم سے جان نکل جاتی تھی۔ نہ سانس چلتی تھی نہ دل دھڑکتا تھا، جسم بالکل پتھر ہو جاتا تھا......کوئی اُنہیں دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ زندہ ہیں۔ بس اُن کی آنکھوں کے اندر پتلیاں ہلتی رہتی تھیں، ان پتلیوں کو دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خدانخواستہ مرے نہیں ہیں...... بھائیا جی کی ماں اُس وقت تک زندہ تھیں۔ وہ بیٹے کی حالت پر بہت روتی دھوتی تھیں۔ وہ زبردستی بھائیا جی کے لئے حکیم وید وغیرہ لے کر آ جاتی تھیں۔ پیروں فقیروں اور تعویذ گنڈے والوں کے پاس بھی جاتی تھیں۔ اُنہوں نے بے شمار تعویذ حویلی میں دبوائے تھے اور لکڑی کی چوکھاٹوں میں کیل ٹھکوا ٹھکوا کر عمل کروایا تھا۔ پتہ نہیں کہ ان چیزوں کا کوئی اثر ہوا یا نہیں مگر کچھ ہی عرصے بعد بھائیا جی کی والدہ اچانک بیٹھے بیٹھے اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ اُن کی موت کے بعد بھائیا جی کی زندگی اور بھی اُجڑ پجڑ گئی۔ وہ آٹھوں پہر نشے میں غرق رہنے لگے...... اُن کی حالت دن بدن بگڑتی چلی گئی۔

جن دنوں میں اس حویلی میں ملازم کے طور پر آیا تھا میری عمر مشکل سے بارہ تیرہ سال تھی، مجھے بھائیا جی کی شکل بس تھوڑی تھوڑی یاد رہ گئی ہے۔ وہ گرمیوں کے دن تھے۔ شام کے وقت میں نے بھائیا جی کو سامنے اُس بوڑھ (برگد) کے نیچے دیکھا تھا۔ وہ

جہاں اب موٹر سائیکل کھڑی ہے۔ بھائیا جی ایک بڑی چارپائی پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ اُن کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔ اس داڑھی کے آدھے کے قریب بال سفید تھے۔ بھائیا جی کا چہرہ لمبوترا تھا یا شاید کمزوری کی وجہ سے لمبوترا نظر آتا تھا۔ اُن کی ناک کا بانسہ بڑا اُونچا تھا۔ مجھے اُن کی آنکھیں دیکھ کر بڑا ڈر لگا تھا۔ اُن کی آنکھیں بہت بڑی بڑی تھیں اور بالکل سرخ تھیں۔ اُنہوں نے بالکل سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ سفید کرتہ اور سفید تہبند...... وہ بہت بھاری آواز میں بولتے تھے اور بہت تھوڑا بولتے تھے۔ میں نے جب اُنہیں پہلی بار دیکھا اُس وقت بھی اُن کے پاس سفید شراب کی بوتل رکھی تھی اور گلاس اُن کے ہاتھ میں تھا۔ ایک بارعب سا بندہ بھائیا جی کے پاؤں دبا رہا تھا۔ جیسا کہ مجھے بعد میں پتہ چلا وہ بھائیا جی کا چھوٹا بھائی سراج احمد تھا۔ بھائیا جی کے چہرے پر اتنی تکلیف اور اتنا دُکھ نظر آتا تھا کہ میں...... آپ کو بتا نہیں سکتا۔''

پرانی یادیں تازہ کرتے ہوئے رنگی کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ پھر وہ سسکیوں سے رونے لگا۔ اسد اور نذیر احمد بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ وہ بھی جیسے رنگی کے ساتھ ہی ماضی کے ایک پُر درد دور میں چلے گئے تھے۔ دو تین منٹ کی خاموشی کے بعد نذیر احمد نے کہا۔

''رنگی چاچا! ایک بات بتاؤ۔ کیا بھائیا جی لکڑی کی مورتیاں وغیرہ بھی بناتے تھے؟''

رنگی نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے خود تو نہیں دیکھا تھا مگر میرا خیال ہے کہ وہ لکڑی پر نقش و نگار بناتے تھے۔ میں نے اُن کے کمرے میں لکڑی تراشنے والے اوزار دیکھے تھے......لیکن کبھی کوئی مورتی وغیرہ میں نے نہیں دیکھی اور نہ ہی اُنہیں مورتی بناتے دیکھا۔

نذیر احمد نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے وہ مورتیاں بناتے ہوں مگر کسی کو دکھاتے نہ ہوں۔''

''ہاں ہوسکتا ہے...... وہ بالکل الگ تھلگ ہو گئے تھے۔ اپنا بہت کچھ دوسروں سے چھپاتے تھے۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ کبھی وہ پورا پورا دن کمرے میں بند رہتے تھے۔

نذیر احمد نے کہا۔ ''رنگی چاچا! تم نے بھائیا جی پر پڑنے والے دورے کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ بس اُن کی آنکھیں زندہ رہتی تھیں، کیا کبھی تمہاری موجودگی میں بھی اُن پر ایسا دورہ پڑا؟''

رنگی کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرا گئے۔ ''صرف ایک بار......'' اُس نے کہا۔

''سردیوں کا موسم تھا۔ پورے چاند کی رات تھی۔ حویلی کے پرانے ملازم منصب علی نے مجھ سے کہا کہ میں اوپر جا کر بھایا جی کو دودھ دے آؤں۔ جب بھایا جی اُوپر کی منزل پر ہوتے تھے، مجھے اُوپر جاتے ہوئے خوف سا آتا تھا۔ مگر منصب علی کی بات ٹالنا بھی میرے لئے آسان نہیں ہوتا تھا۔ میں دودھ لے کر اوپر بھایا جی کے کمرے میں پہنچا۔ وہ تکیے سے ٹیک لگائے آدھے لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے اُنہیں سلام کیا۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے دُودھ کا گلاس پلیٹ میں رکھا ہوا تھا۔ ادب سے جھک کر میں نے پلیٹ اُن کی طرف بڑھا دی۔ میں کتنی ہی دیر جھکا رہا مگر بھایا جی نے پلیٹ نہیں اُٹھائی۔ میں نے کہا۔ ''مالک! دودھ میز پر رکھ دُوں؟''

اُنہوں نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے اُن کی طرف دیکھا۔ ایک دم میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ لگتا تھا کہ وہ میری طرف دیکھ رہے ہیں لیکن وہ سامنے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ میں نے اُنہیں دوتین بار آواز دی۔ دودھ میرے ہاتھ سے گر گیا۔ میں چیختا ہوا سیڑھیوں کی طرف گیا۔ منصب علی اور دیگر ملازموں کو آوازیں دیں۔ وہ دوڑے ہوئے اُوپر آئے۔ منصب علی نے بھایا جی کو دیکھا۔ اُس نے کہا۔ ''بھایا جی کو دورہ پڑ گیا ہے۔''

منصب علی نے بھایا جی کو سیدھا لٹا دیا۔ اُن کے سر کے نیچے سے تکیہ نکال دیا۔ پھر ایک دو دوائیں اُن کے منہ میں ٹپکائیں۔ ایک نئے ملازم نے بھایا جی کی ہتھیلیوں کی مالش کرنی چاہی مگر منصب علی نے منع کر دیا۔ اُس نے کہا کہ ابھی کچھ دیر میں خود ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔ پھر وہ واقعی ٹھیک ہو گئے۔ بے ہوشی کے دوران کی کوئی بات اُنہیں یاد نہیں رہی تھی۔''

اسد اور نذیر احمد بڑی محویت سے رنگی کی باتیں سن رہے تھے۔ نذیر احمد نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''بھایا جی کا انتقال کیسے ہوا؟ کچھ یاد ہے تمہیں؟''

اب تاریکی پھیل چکی تھی۔ ڈیرے کی فضا میں ایک بے نام سی پراسرار کیفیت تھی۔ رنگی نے تاریکی میں گھورا۔ اُس کی گھنی پلکوں کے نیچے آنکھوں میں غم کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ جیسے اپنے روبرو بھایا جی کا آخری وقت دیکھ رہا تھا۔ وہ کہنے لگا۔ ''شاید آپ کو بھی معلوم ہوگا بھایا جی کی وفات اسی حویلی میں ہوئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ چاند

رات تھی۔ اگلے روز چھوٹی عید تھی...... بھایا جی نے اُس روز عام دنوں سے زیادہ شراب پی تھی۔ ڈاکٹروں نے اُنہیں نشے سے منع کر رکھا تھا اور وہ کسی حد تک منع ہو بھی گئے تھے۔ مگر پتہ نہیں کیا بات تھی، کسی بھی دن دیہاڑ اور خوشی کے موقع پر وہ زیادہ غمزدہ ہو جاتے تھے۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ اچانک بھایا جی کے کمرے سے گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ ملازم خوشی میں پٹاخے چلا رہے ہیں، لیکن پھر منصب علی کی چیختی ہوئی آواز سن کر میں بھی بھایا جی کے کمرے کی طرف دوڑا۔ جب ہم کمرے کے سامنے پہنچے تو فائرنگ کی آواز رُک چکی تھی۔ اندر بالکل خاموشی تھی۔

پہلے ہم دروازہ کھٹکھٹاتے رہے، پھر ایک ملازم کھلی ہوئی کھڑکی کے راستے اندر گیا اور دروازہ اندر سے کھول دیا۔ بھایا جی نے ساری گولیاں کھڑکی پر چلائی تھیں۔ کھڑکی کے دو تین شیشے چور ہو گئے تھے۔ بعد میں غصے کی حالت میں بھایا جی نے اپنا پستول بھی کھڑکی پر دے مارا تھا۔ یہ پستول کھڑکی سے باہر برآمدے میں پڑا ہوا ملا۔ اس کے بعد بھایا جی پر دورہ پڑ گیا۔ جب ہم نے اُنہیں دیکھا وہ پلنگ پر گرے ہوئے تھے۔ اُن کا آدھا دھڑ پلنگ سے نیچے لٹکا ہوا تھا...... منصب علی نے فٹا فٹ دراز سے اُن کی دوائیاں نکالیں، اُن کو کھینچ کر پلنگ پر لٹایا اور اُن کے سر کے نیچے سے تکیہ نکال دیا۔ مگر جب منصب علی دوائی دینے لگا تو شیشی خالی تھی۔ اُس نے دوسری شیشی دیکھی، وہ بھی خالی تھی۔ وہ بہت گھبرایا۔ اُسی وقت ایک بندہ دوائی کے لئے شہر دوڑایا گیا، لیکن بھایا جی کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ اُنہیں سخت دورہ پڑا تھا اور وہ نشے میں بھی تھے۔ آدھ پون گھنٹے کے اندر وہ ختم ہو گئے۔ اُن کے مرنے کے بعد بھی ہمیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ مر گئے ہیں۔ اُن کی سانس اور نبض تو پہلے بھی بند ہو جاتی تھی۔ ہم اُن کی آنکھیں دیکھ رہے تھے، اُن کی آنکھیں حرکت نہیں کر رہی تھیں۔ آخر ڈاکٹر پہنچا، اُس نے بڑی دیر تک معائنہ کیا اور بتایا کہ بھایا جی اَب دنیا میں نہیں ہیں...... بھایا جی مر گئے مگر عزیز رشتے دار اُنہیں دفنانا نہیں چاہتے تھے۔ ہر ایک کو یہی لگتا تھا کہ بھایا جی زندہ ہیں اور اُٹھ کر بیٹھ جائیں گے۔ اُنہیں آٹھ پہر گھر میں ہی رکھا گیا۔ یہاں تک کہ اُن کا جسم سخت ہو گیا اور لاش کی رنگت بدلنے لگی۔ شہر سے دو بڑے ڈاکٹر آئے۔ اُنہوں نے بھی دیر تک بھایا جی کو دیکھا اور کہا کہ اُنہیں دفنا دیا جائے نہیں تو لاش خراب ہونے لگے گی...... عید سے اگلے روز صبح

سویرے اُنہیں عباس پورہ کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔''

رنگی کی باتوں نے اسد اور نذیر احمد کے سامنے ماضی کا نقشہ سا کھینچ دیا۔ وہ اس رُوئیداد میں کھو گئے۔ اُنہوں نے رنگی سے کئی سوال کئے جن کے جواب رنگی نے اپنے علم کے مطابق دیئے۔ اسد نے پوچھا۔

''دوائیوں کا کیا چکر تھا؟ کیا واقعی دوائیاں ختم ہو گئی تھیں؟''

''اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا چھوٹے مالک! ہو سکتا ہے کہ دوائیں سچ مچ ختم ہو گئی ہوں یا پھر ڈھکن کھلا رہنے سے ضائع ہو گئی ہوں۔ پر کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ دوائیاں بھایا جی نے خود گرا دی تھیں، وہ اور زندہ رہنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ بہت زیادہ نشہ بھی اسی لئے کرنے لگے تھے۔''

نذیر احمد نے کہا۔''فائرنگ کے بارے میں تو میں نے بھی سنا تھا لیکن میں نے سنا تھا کہ بھایا جی نے ہوا میں گولیاں چلائی تھیں۔''

''نہیں جی..... اُنہوں نے کھڑکی پر گولیاں چلائی تھیں۔ بالکل یوں لگتا تھا جیسے اُنہوں نے کسی کا نشانہ لیا ہے۔ مجھے پتہ ہے اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ اُنہوں نے اپنے حقے کی وزنی چلم اُتار کر کھڑکی پر دے ماری تھی اور اُس کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا۔ تیز نشے میں اُن سے ایسی حرکتیں ہوتی رہتی تھیں۔''

وہ تینوں دیر تک باتوں میں مصروف رہے۔ رات بھیگ گئی۔ ایک اُداس زرد چاند برگد کے بوڑھے درخت کے عقب سے نکلا اور اُس کی چاندنی برآمدے کے گول ستونوں کے سائے تاریک فرش پر نمایاں کرنے لگی۔ اب کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ صحن سے اُٹھ کر کمرے میں آ گئے۔ کھانے کے دوران میں بھی اسد اور نذیر احمد کے درمیان یہی باتیں ہوتی رہیں۔

نذیر احمد نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔''کبھی کبھی تو بھایا جی مجھے کسی قدیم ناول کا نیم دیوانہ کردار لگتا ہے۔ وہ یونان کے کسی غار میں بیٹھا اپنی محبوبہ کا انتظار کرتا رہا ہے جسے کسی جادوگر نے پتھر کا بنا رکھا ہے، یا چڑیا مینا کی شکل دے کر کسی پنجرے میں بند کر رکھا ہے۔''

اسد نے کہا۔''تم اس کہانی کو جتنا کھوجو گے اُتنا ہی اُلجھن میں پڑو گے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم ایک ایک کپ گرم چائے پئیں اور تاش کھیلیں۔ ورنہ یہ خوبصورت رات بیکار

ہو جائے گی۔''

نذیر احمد نے اسد کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔''اندھیرے کا راز جاننے میں جو مزا آتا ہے وہ تاش کھیلنے میں کہاں؟''

یکا یک اسد کے جی میں یہ بات آئی کہ وہ نذیر احمد کو اپنی پراسرار اُلجھن کے متعلق کچھ بتائے...... اُسے اُن غیر مرئی سرگوشیوں کے متعلق بتائے جو اُس کے کانوں میں گونجا کرتی ہیں۔ اس حوالے سے سبھی کچھ نذیر احمد کے گوش گزار کر دے۔ مگر پھر اُس نے خود پر ضبط کیا۔ بے شک عبداللہ کی طرح نذیر بھی اُس کا قریبی دوست تھا لیکن اسد کو اندیشہ تھا کہ عبداللہ کی طرح نذیر بھی اسد کی بات کا مذاق ہی اُڑائے گا۔ وہ ان غیر مرئی آوازوں کو اسد کا وہم قرار دے گا اور ہو سکتا ہے کہ کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کا مشورہ بھی دے ڈالے۔ درحقیقت اسد اس بات پر بھی پچھتا رہا تھا کہ اُس نے عبداللہ کو اس بارے میں بتایا ہے...... عبداللہ جب کبھی گہری نظروں سے اُس کی طرف دیکھتا تھا تو اُسے یوں لگتا تھا کہ وہ اُس کی ذہنی حالت پر شک کر رہا ہے۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' نذیر احمد نے اُسے ٹھوکا دیا۔

''کچھ نہیں...... رنگی کی باتوں کے بارے میں ہی سوچ رہا ہوں۔''

''غلط کہہ رہے ہو...... کچھ اور سوچ رہے تھے...... شاید شمیم کے بارے میں پلاننگ بنا رہے ہو گے کہ اُس محبت کی ماری کو مزید کس طرح ستایا جا سکتا ہے۔''

''بس تمہیں تو وہی مظلوم نظر آتی ہے۔'' اسد نے جل کر کہا۔''ویسے میں اُس کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔''

''تو پھر کرکٹ کے بارے میں سوچ رہے ہو گے۔ کسی نئے ٹورنامنٹ کے بارے میں..... یار! لوگ بتاتے ہیں کہ آج کل تمہاری باؤلنگ بڑی دُھومیں مچا رہی ہے...... وہ کیا کہتے ہیں بیٹسمینوں کے پرخچے اُڑا رہی ہے۔''

''نہیں...... میں کرکٹ کے بارے بھی نہیں سوچ رہا۔''

''تو پھر جناب کی سوچ کے گھوڑے کہاں گھاس چرنے گئے ہوئے ہیں؟''

''میں عبداللہ کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ وہ شکار کے لئے جال مرمت کرانے گیا تھا، ابھی تک آیا نہیں۔''

''لو بھئی ...... بڑی لمبی عمر ہے تمہارے شہزادے کی۔ لگتا ہے کہ اس صدی میں تو یہ مرے گا نہیں۔'' نذیر نے عبداللہ کو صحن کی طرف سے اندر آتے دیکھ کر کہا۔

عبداللہ کے پیچھے ہی پیچھے صغیر بھی چلا آ رہا تھا۔ اُن دونوں کے آنے سے محفل گرم ہو گئی۔ عبداللہ نے ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا، صغیر نے تاش کھیلنے کے لئے چادر بچھا دی۔ چاروں بیٹھ گئے اور کھیلنے لگے۔ یہاں تک کہ کافی رات ہو گئی۔ اسد اور نذیر کو جمائیاں آنے لگی تھیں۔ اتنے میں زاہدہ ایک ٹرے میں دودھ کا بڑا جگ اور چار گلاس لے آئی۔ ٹرے میں رکھتے ہوئے اُس کا ہاتھ کانپا اور ایک گلاس گر گیا۔ اسد نے ماہر کرکٹر کی حیثیت سے لپک کر گلاس دبوچ لیا اور ٹوٹنے سے بچا لیا۔ نذیر احمد اور عبداللہ مزاحیہ انداز میں تالیاں بجانے لگے، جیسے اسد نے گلاس نہ پکڑا ہو کسی کانٹے دار میچ میں مشکل کیچ پکڑا ہو۔

صغیر نے بہن کو سرزنش کے انداز میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا ہو گیا ہے تمہیں؟''

وہ نہیں جانتا تھا کہ اُسے کیا ہوا ہے نہ ہی ابھی تک نذیر احمد جانتا تھا۔ بس اسد اور عبداللہ جانتے تھے جو اندھیرے میں چھپ کر یہاں آتی تھی اور روشنی میں بغیر چھپے ہوئے آئی تھی تو گڑبڑا گئی تھی۔

زاہدہ واپس چلی گئی۔ کچھ دیر بعد صغیر بھی اُٹھا اور ادب سے اجازت لے کر چلا گیا۔ اسد، عبداللہ اور نذیر کچھ دیر تک گپ شپ کرنے کے بعد سو گئے۔ بند کمرے سے باہر حویلی کی بالائی منزل پر مشرق کی طرف کھلنے والی کھڑکیاں ہوا کے زور سے ہولے ہولے ہل رہی تھیں۔ چاندنی میں اُن کے سائے کبھی طویل ہوتے تھے، کبھی مختصر ...... لیکن ہوا ...... ہوا تو شاید نہیں تھی۔

صبح اسد اور عبداللہ جلدی اُٹھ گئے۔ اُنہیں مچھلی کے شکار پر جانا تھا۔ آج وہ سائفن کی طرف جا رہے تھے۔ صغیر نے دو تانگوں کا انتظام کر لیا تھا۔ عباس پورہ کے تین چار لڑکے بھی اُن کے ساتھ تھے۔ پانی میں بڑے جال کے ذریعے مچھلیاں پکڑنا کافی محنت طلب کام تھا اور اس کے لئے چار پانچ بندوں کا ہونا ضروری تھا۔

وہ سارا دن اُنہوں نے سائفن پر مچھلیاں پکڑتے ہوئے گزارا۔ وہیں پانی کے کنارے ہی مچھلی پکانے کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ ٹھنڈے پانی سے باہر آ کر اور تھکن سے چور ہو کر گرما گرم مچھلی کھانے کا مزا ہی کچھ اور تھا ...... اُن کا پروگرام تھا کہ وہ سہ پہر چار

بجے تک ڈیرے واپس پہنچ جائیں گے۔ لیکن وہ ایسے مست ہوئے کہ شام سے بھی ایک گھنٹہ بعد پہنچے۔ چھوٹے بڑے سائز کی آٹھ دس کلو مچھلی بھی اُن کے ہمراہ تھی۔ دو دو تین تین کلو اُن کے ساتھی لے گئے تھے۔ نذیر احمد کو شکار کا زیادہ شوق نہیں تھا، وہ اُن کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ وہ ڈیرے واپس پہنچے تو وہ بڑی بے چینی سے اسد کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات نے اسد کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔ ضرور کوئی خاص بات تھی۔ اُنہوں نے ذرا دم لے لیا تو اسد نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے نذیر ......! کوئی خاص بات ہے؟''

اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''تم میرے ساتھ آؤ۔''

عبداللہ اُس وقت نہا رہا تھا۔ اسد اور نذیر طویل برآمدے میں سے گزر کر سٹور رُوم کی طرف آ گئے۔ اُسے ''بڑا سٹور رُوم'' کہا جاتا تھا۔ رنگی اسے دیہاتی لہجے میں ''سٹوٗر'' کہا کرتا تھا۔ یہ سٹور رُوم ایک بڑے اور ایک چھوٹے کمرے پر مشتمل تھا اور کاٹھ کباڑ سے اٹا ہوا تھا۔ یہاں بہت سی بیکار چیزیں پڑی رہتی تھیں۔ ان میں سے کچھ قریباً ایک صدی پرانی تھیں مثلاً کسی بگھی کی لالٹینیں اور کسی تلوار کا دستہ ...... جبکہ کچھ کا تعلق ماضی قریب سے تھا، مثلاً اسد کا ٹوٹا ہوا بیٹ اور چچا شوکت کی پہلی جیپ کا بیکار ٹائر ...... یہ تو صرف دو تین مثالیں تھیں ورنہ یہ سٹور رُوم نیچے سے اُوپر تک ہر قسم کے الا بلا سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں جالے لگے ہوئے تھے اور بہت سی اشیاء پر گرد کی دبیز تہ چڑھی ہوئی تھی۔

نذیر احمد کے ہاتھ میں لیمپ تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اسٹور میں داخل ہوئے اور اُس پچھلے کمرے میں پہنچ گئے جہاں کاٹھ کباڑ کے عقب میں پرانی وضع کے تین جستی صندوق اُوپر نیچے رکھے رہتے تھے۔ اُن میں سے دو کو پیتل کے تالے بھی لگے ہوئے تھے۔ تالوں کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا۔

اسد نے دیکھا کہ وہ تینوں جستی صندوق آج اپنی جگہ پر موجود نہیں ہیں، اُنہیں اوپر تلے سے اُتارا گیا تھا اور کھینچ کر کمرے کے وسط میں کر دیا گیا تھا۔ جہاں سے صندوق ہٹائے گئے تھے وہاں دیوار میں ایک مستطیل خانہ نظر آ رہا تھا۔ اس خانے کی لمبائی اتنی تھی کہ اس میں درمیانے سائز کی ایک میز رکھی جا سکتی تھی۔ گہرائی بھی کافی تھی۔ اس خانے کو ایک تختے سے بند کر دیا گیا تھا۔ تختے پر جو رنگ کیا گیا تھا وہ دیوار کا رنگ تھا۔

طائرانہ نظر سے دیکھا جاتا تو اس خانے کی موجودگی کا اندازہ لگانا دُشوار تھا۔ اسد نے نوٹ کیا کہ پلاس وغیرہ کے ذریعے تختے کی میخیں اُکھاڑی گئی ہیں اور اب تختہ یونہی خانے کے اوپر دھرا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ سارا کام ابھی ابھی کیا گیا ہے۔ شاید دو تین گھنٹے پہلے۔

''یہ سب کیا ہے؟'' اسد نے پوچھا۔

''میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔'' نذیر احمد بولا۔

اُس نے آگے بڑھ کر تختہ خانے کے اُوپر سے ہٹا دیا اور لیمپ آگے کر دیا تاکہ اسد کو خلا کے اندر جھانکنے میں آسانی رہے۔ اسد نے جھک کر خلا میں دیکھا اور اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ جھکا جھکا ہی زمین پر بیٹھ گیا اور محویت سے تکنے لگا۔ قریباً پانچ ضرب چار فٹ کا وہ چار فٹ گہرا خلا لکڑی کی مورتیوں سے بھرا ہوا تھا۔ چھوٹے بڑے سائز کی یہ درجنوں مورتیاں تھیں۔ ایک نظر میں ہی اسد کو اندازہ ہو گیا کہ یہ ویسی ہی مورتیاں ہیں جیسی اس سے پہلے وہ دیکھ چکے ہیں۔ ان کو بڑی مہارت سے تراشا گیا تھا۔ کچھ مورتیاں ساگوان اور آبنوس جیسی مہنگی لکڑی کی تھیں اور کچھ دیودار اور شیشم وغیرہ کی۔ جو مورتیاں اچھی بنی تھیں اُن پر پالش وغیرہ بھی کی گئی تھی۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ ان ساری مورتیوں میں عورت موجود تھی۔ کچھ میں عورت تنہا تھی اور کچھ میں اس کے ساتھ مرد بھی نظر آتا تھا۔ عورت جواں سال لڑکی تھی۔ اُس کے خدوخال دلکش تھے اور جسم بھرپور تھا۔ مرد ایک جاگیردار ٹائپ شخص نظر آتا تھا۔ اُس کی مونچھیں اُوپر کو اُٹھی ہوئی تھیں۔ نقوش سخت گیری کو ظاہر کرتے تھے۔ وہ جس مورتی میں بھی موجود تھا لڑکی پر ظلم و ستم کرتا نظر آتا تھا۔ کہیں وہ نیم برہنہ لڑکی کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ رہا تھا، کہیں اُسے ٹھوکریں رسید کر رہا تھا، کہیں لڑکی اُس کے پاؤں میں گری ہوئی تھی اور رحم طلب انداز میں اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک مورتی میں وہ شخص لڑکی کی لاش کے قریب کھڑا تھا۔ اُس نے شیر کے شکاری کی طرح اپنا پاؤں لڑکی کے سر پر رکھا ہوا تھا، اُس کے ہاتھ میں رائفل بھی دکھائی دے رہی تھی۔ ایک مورتی میں روتی ہوئی لڑکی کے گلے میں رسّی دکھائی گئی تھی۔

کئی مورتیاں اچھی بنی تھیں اور کئی ذرا بھدی تھیں۔ بہرحال ساری مورتیوں کا

موضوع ایک ہی تھا۔ عورت سے نفرت...... چند مورتیاں ایسی بھی تھیں جن میں مرد کو عورت سے ریپ کرتے دکھایا گیا تھا۔ اور یہ مورتیاں خاص طور سے قابل نفرت تھیں۔

اسد اور نذیر احمد کتنی ہی دیر ان مورتیوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ ان مورتیوں کے علاوہ سٹور رُوم کے اس خلا میں لکڑی کا ایک چھوٹا سا ڈبہ بھی تھا۔ اس ڈبے میں کچھ سادہ کاغذ تھے بلکہ اُنہیں کاغذوں کے پرزے کہنا چاہئے۔ مورتیاں دیکھنے کے بعد اسد اور نذیر احمد نے خلا کو اُسی طرح لکڑی کے تختے سے بند کر دیا اور میخیں ٹھونک دیں۔ اس کے بعد جستی صندوق بھی ترتیب سے تختے کے سامنے جوڑ دیئے۔ پھر وہ بوجھل دل کے ساتھ سٹور رُوم سے نکلے اور دروازہ مقفل کر کے اپنے کمرے میں واپس پہنچ گئے۔

نذیر احمد نے کہا۔ ''سب سے پہلے تو میں تم سے معافی چاہتا ہوں کہ تمہاری اجازت کے بغیر میں سٹور میں گیا اور چیزوں کو اُلٹ پلٹ کیا۔''

''نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں۔ تم کوئی غیر تھوڑے ہی ہو۔'' اسد نے جواب دیا۔

''دراصل یار! کل رنگی کی باتیں سننے کے بعد میں ساری رات ہی سوچتا رہا ہوں...... دماغ میں کھلبلی سی مچی رہی ہے۔ آج سویرے تم شکار کے لئے نکل گئے تو میں ناشتہ کر کے سٹور میں گھس گیا۔ مجھے یقین تھا کہ جو دو مورتیاں ہم نے دیکھی ہیں اس طرح کی اور مورتیاں بھی سٹور میں ہوں گی۔ لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ اتنی زیادہ ہوں گی اور انہیں اس طرح محفوظ کیا گیا ہوگا۔''

اسد نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''اس میں تو اب شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ یہ مورتیاں میرے جدامجد بھائیا جی نے بنائی تھیں...... عورت ذات سے اُنہیں نفرت تھی وہ اُس کا سایہ بھی اپنے قریب برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کی یہی نفرت ان مورتیوں سے بھی جھلکتی ہے۔''

نذیر نے کہا۔ ''میں نے تھوڑی بہت نفسیات بھی پڑھی ہے۔ نفسیات کہتی ہے کہ انسان جن شدید جذبوں کا اظہار کرنے سے قاصر رہتا ہے، وہ کسی اور رُوپ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ انسان کے رویئے میں کسی بھی شکل میں داخل ہو سکتے ہیں۔ یہ شاعری، مصوری، گلوکاری اور مارشل آرٹ وغیرہ انہی دبے ہوئے جذبات کے اظہار کی مختلف شکلیں ہیں۔ لگتا ہے کہ بھائیا جی عورت ذات سے بہت نفرت کرنے کے باوجود کسی بھی

طرح اس نفرت کا مؤثر اظہار کرنے سے قاصر تھے۔ غیر ارادی طور پر انہوں نے اس اظہار کے لئے مورتیوں کا سہارا لے لیا...... وہ مورتیاں بناتے رہے لیکن اُن کی یہ مصروفیت عام لوگوں کی نظر سے اوجھل ہی رہی۔''

نذیر احمد بڑی عالمانہ گفتگو کر رہا تھا۔ اسد توجہ سے سنتا رہا۔ اس گفتگو میں لکڑی کے چوکور ڈبے میں موجود سادہ کاغذ کے ٹکڑوں کا ذکر بھی آیا۔ ان کاغذوں پر کوئی تحریر نہیں تھی، پھر اُنہیں پھاڑا کیوں گیا تھا؟ اور اگر پھاڑا ہی گیا تھا تو پھر سنبھال کیوں لیا گیا تھا؟ گفتگو کے دوران میں نجانے کیوں ایک بار پھر اسد کے دل میں یہ بات آئی کہ وہ نذیر احمد سے اپنی اہم ترین اُلجھن کے بارے میں بات کرے۔ اُسے بتائے کہ اُس کی سماعت کو کبھی کبھی ایک غیر مرئی آواز کا تجربہ ہوتا ہے...... وہ پورے ہوش وحواس میں ہوتے ہوئے اس آواز کو سنتا اور سمجھتا ہے... مگر ایک بار پھر اُس نے اپنا یہ ارادہ بدل دیا۔

اگلے روز نذیر احمد کو ضروری کام تھا۔ اُسے نو بجے سے پہلے ہر صورت سکول پہنچنا تھا۔ وہ اسد اور عبداللہ سے رُخصت ہو کر چلا گیا...... اُس رات اسد کے نیم تاریک کمرے میں پھر زاہدہ کی چوڑیوں کی چھن چھن گونجی...... آج رات وہ تین چار دن بعد ملے تھے اس لئے ملاقات میں والہانہ شدت تھی۔ صبح اسد کو ویسے بھی واپس چلے جانا تھا۔ دونوں ایک دُوجے کی قربت میں گم ہو گئے۔ جذبات اُنہیں اپنے تند ریلے میں بہانے لگے۔ زاہدہ خود فراموشی کی کیفیت میں اسد کی بانہوں میں تھی۔ مگر اسد کو کبھی بھی اپنی حدود بھولتی نہیں تھیں۔ اُسے یہی لگتا تھا کہ جس دن وہ اپنی حد پار کر گیا، شمیم اُس سے ہمیشہ کے لئے چھن جائے گی...... یہی وجہ تھی کہ وہ انتہا کے قریب ہوتے ہوئے بھی انتہا سے بہت دُور رہتا تھا۔

اُس نے زاہدہ کو خود سے جدا کرتے ہوئے کہا۔ ''اچھا...... اب تم جاؤ۔''

''کیوں...... آپ کو بہت جلدی ہے؟'' زاہدہ کے لہجے میں شکوے کی جھلک تھی۔

''نہیں بھئی...... ایسی بات نہیں۔ تم خود ہی کہا کرتی ہو کہ کوئی جاگ گیا تو قیامت برپا ہو جائے گی۔''

''کبھی کبھی تو سچ مچ بڑا ڈر لگتا ہے۔ پر آج ایسی بات نہیں ہے۔ صغیر شکار کی وجہ سے سارے دن کا تھکا ہوا ہے، بڑی پکی نیند سو گیا ہے۔ ابا عباس پورہ گیا ہوا ہے، ماں بھی

سوئی پڑی ہے۔''

اسد نے زاہدہ کی آنکھوں میں دیکھا جہاں گلابی ڈورے تیر رہے تھے۔ وہ بولا۔

''زاہدہ! میں تمہیں کوئی جھوٹا خواب دکھانا نہیں چاہتا۔ میں نے ایک بار تم سے شادی کی بات ضرور کی تھی لیکن مجھے ٹھیک سے پتہ نہیں کہ میرے گھر والے اس پر راضی ہو سکیں گے یا نہیں؟''

زاہدہ کے ہونٹوں پر ایک غیر محسوس مسکراہٹ اُبھری۔ ''چھوٹے مالک! آپ کو صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں...... آپ سے ملنے کے بعد میں یہ بات ایک سیکنڈ کے لئے بھی نہیں بھولی ہوں کہ آپ مالک ہیں اور میں ادنیٰ نوکر۔ ابا کہا کرتا ہے کہ آپ ہماری جند جان کے مالک ہیں۔ ہم اپنی کھال کی جوتیاں بنوا کر آپ کے پاؤں میں ڈالیں تو بھی آپ کی مہربانیوں کا حق ادا نہ ہو...... میں آپ سے کچھ نہیں مانگتی۔ میں جانتی ہوں مجھے کچھ مل نہیں سکتا۔ جو مل رہا ہے یہی بہت ہے......''

وہ ایک بار پھر اسد کے سینے سے لگ گئی۔

زاہدہ کی سوچ کا یہی حقیقی انداز تھا۔ اس حقیقی انداز میں سوچ کر زاہدہ نے ایک بڑا بوجھ اسد کے سینے سے ہٹا دیا تھا...... وہ اُس کی بانہوں میں سماتی چلی جا رہی تھی۔ آج قیام کے آخری دن اُس کی محبت کا انداز والہانہ تھا۔ اسد نے بھی اُسے لپٹا لیا۔ وہ اُسے چومتا رہا، لپٹاتا رہا لیکن اپنی حد کے اندر رہ کر......

اور جب وہ رات کے اندھیرے میں اُس موم جیسی مطیع و غیر مزاحم لڑکی سے پیار کر رہا تھا اُس کے ذہن میں شمیم کی شبیہ اُبھر رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کاش زاہدہ کی جگہ وہ ہوتی۔ زاہدہ کے ساتھ شمیم کا موازنہ کرتے ہوئے اُس کے ذہن میں انگارے بھرنے لگے تھے...... متکبر، مغرور، بے حس...... میں لعنت بھیجتا ہوں تیری خود پسندی پر اور تجھ پر۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں تیری...... کوئی ضرورت نہیں۔ دیکھ سکتی ہے تو دیکھ! ایسے چاہا جاتا ہے چاہنے والے کو...... محبت کی بانہوں میں خود کو ایسے ڈالا جاتا ہے۔

اگلے روز صبح سویرے اسد ڈیرے سے براہِ راست لاہور روانہ ہو گیا۔ اُس نے اپنا سامان بعد میں منگوانے کا فیصلہ کیا تھا۔ دراصل وہ شاد پور جا کر شمیم کی صورت دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ پتہ نہیں کیوں، اُس کی صورت دیکھ کر وہ اندر سے بھسم ہونے لگتا تھا۔

لاہور میں کرکٹ کی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ اسد کے لاہور پہنچنے کے دو تین دن بعد ہی لیگ کرکٹ کا سب سے بڑا ٹورنامنٹ شروع ہو گیا۔ حالانکہ اسد کو لاہور آ کر زیادہ پریکٹس نہیں ملی تھی، پھر بھی اُس نے ٹورنامنٹ کا آغاز بڑے اچھے طریقے سے کیا۔ پہلے دو میچوں میں اُس نے نہ صرف معقول سکور کیا بلکہ اپنی برق رفتار باؤلنگ سے مخالف ٹیم کے کھلاڑیوں کے پرخچے اُڑا کر رکھ دیئے۔ قدیر صاحب کا اے ون کلب یہ دونوں میچ جیت گیا تھا۔ دوسرے میچ کے بعد جب شام کو اسد گھر پہنچا تو اشفاق اُس کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ راستے میں ہی اپنی سپورٹس کی دُکان کی طرف چلا گیا تھا۔ ابھی اسد کٹ وغیرہ اُتار کر بیٹھا ہی تھا کہ بیرونی دروازے کی بیل ہوئی۔ اسد سمجھا کہ شاید حسب معمول فریحہ کی کوئی بہن ہے جو تازہ میچ کا رزلٹ جاننے آئی ہے۔ مگر باہر ایک دراز قد آدمی کھڑا تھا۔ سلام دُعا کے بعد اُس نے اسد سے کہا کہ جانی بھائی اس سے ملنا چاہتے ہیں۔

جانی بھائی کا نام سن کر اسد کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ یہ وہی جانی بھائی تھے جو ایک معروف بینک کی ٹیم کے کپتان و کرتا دھرتا تھے۔ وہ قومی ٹیم کے لئے بھی کھیل چکے تھے۔ کرکٹ کے حلقوں میں اُن کا بڑا نام تھا۔

''کہاں ہیں جانی بھائی؟'' اسد نے پوچھا۔

''وہ سامنے گاڑی میں بیٹھے ہیں۔'' دراز قد شخص نے اُنگلی سے سڑک کے موڑ کی طرف اشارہ کیا۔

شاندار ٹویوٹا کرولا مخالف سمت میں رُخ کئے کھڑی تھی۔ اسد دراز قد شخص کے ہمراہ گاڑی میں پہنچا۔ دراز قد شخص گاڑی کا ڈرائیور تھا۔ جانی بھائی پچھلی نشست پر براجمان تھے۔ اُنہوں نے اسد سے مصافحہ کیا اور کہا۔ ''ادھر سے گزر رہا تھا، سوچا تم سے دو باتیں ہو جائیں۔ کیا تم میرے ساتھ گھر تک چلنا پسند کرو گے؟''

''جیسے آپ کا حکم جناب! لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ باقی باتیں وہاں چل کر ہوں گی۔'' جانی بھائی نے قیمتی سگریٹ کا کش لے کر مسکراتے لہجے میں کہا۔

اُس رات اسد کے لئے کامیابیوں کے چند نئے دروازے کھل گئے۔ جانی بھائی

نے اسد کو بینک میں پُرکشش ملازمت کی پیشکش کی اور ساتھ ہی بینک کی ٹیم میں شامل ہونے کی درخواست دی۔ اُنہوں نے اسد کو بتایا کہ بینک کی ٹیم میں شامل ہونے سے وہ اُونچے لیول کی کرکٹ کھیل سکے گا اور اس کا وہ خواب بھی پورا ہو سکتا ہے جو ہر کرکٹر کی آنکھوں کا سنہرا ترین خواب سمجھا جاتا ہے۔ پاکستان کے لئے کھیلنے کا خواب......!

جب اسد نے یہ کہا کہ وہ اس سلسلے میں قدیر صاحب سے مشورہ کر کے بتائے گا...... تو جانی بھائی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اُبھری۔ وہ بولے۔ ''بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔ قدیر تمہیں کبھی اجازت نہیں دے گا۔ خاص طور سے میری ٹیم میں آنے کی اجازت تو کبھی نہیں دے گا۔ وہ تاجرانہ ذہن رکھتا ہے اور تاجر کو اپنے کاروبار سے زیادہ کوئی شے عزیز نہیں ہوتی...... اگر تم اُونچا اُڑنا چاہتے ہو تو پھر تمہیں کچھ فیصلے اپنے طور پر کرنے ہوں گے۔''

جانی بھائی دیر تک اسد کو کرکٹ کی سیاست اور اس سیاست کی اُونچ نیچ سمجھاتے رہے۔ اسد نے محسوس کیا کہ جانی بھائی، قدیر صاحب کے مقابلے میں ایک بھاری بھرکم اور دبنگ شخصیت ہیں۔ نہ صرف اُن کی ٹیم بڑی تھی بلکہ کرکٹ کے ناخداؤں سے اُن کے وسیع رابطے بھی تھے۔ وہ پورے یقین کے ساتھ اُسے ایک شاندار مستقبل کی پیشکش کر رہے تھے۔

دو دن بعد اسد نے اشفاق سے مشورہ کیا اور اس کے بعد ایک دن ہمت کر کے قدیر صاحب سے بھی بات کر ڈالی۔ نتیجہ وہی نکلا جس کا اسد کو اندیشہ تھا اور اشفاق کو بھی...... قدیر صاحب نے فوراً اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا۔ اُنہوں نے کہا۔

''اسد! آج میں تمہیں صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ جانی کرکٹ کے کھیل میں میرا پرانا رقیب ہے۔ تمہیں تو اب پتہ چلا ہے لیکن مجھے ایک ڈیڑھ سال پہلے ہی معلوم تھا کہ وہ تمہیں مجھ سے توڑنے کی کوشش ضرور کرے گا۔''

اسد نے دبے لہجے میں کہا۔ ''لیکن جناب! اس میں توڑنے والی تو کوئی بات نہیں۔ میں نے جانی بھائی سے پہلی بات ہی یہ کی تھی کہ میں اے ون کلب کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا۔ قدیر صاحب جب بھی مجھے کہیں گے، مجھے اُن کی طرف سے کھیلنا ہوگا...... اس کے علاوہ......''

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں اسد!" قدیر صاحب نے تیزی سے اُس کی بات کاٹی۔
"وہ خبیث بس تمہیں ورغلا رہا ہے۔ تم نے ایک بار اُس کی بات مان لی تو پھر وہ تمہیں پوری طرح بے بس کر ڈالے گا۔ وہ بس مجھے تکلیف پہنچانا چاہ رہا ہے...... اور ایک بات میں تمہیں اور بتاؤں...... وہ تمہاری کرکٹ تباہ کر ڈالے گا۔ وہ بدنیت شخص ہے۔ جتنا میں اُسے جانتا ہوں اتنا اور کوئی نہیں جانتا۔"
"میں آپ کی حکم عدولی کا سوچ بھی نہیں سکتا...... لیکن......"
"یہ "لیکن" کا لفظ مت استعمال کرو میرے سامنے۔" قدیر صاحب بھنا کر بولے۔
"یہ لفظ ہی سارے فساد کی جڑ ہوتا ہے۔ اگر تمہارے دماغ میں کوئی کیڑا رینگنے لگا ہے تو پھر وہ میری کوشش سے رُک نہیں سکتا ہے۔ جو تمہاری مرضی ہے کرو...... جہاں جی چاہے جاؤ۔" وہ اُٹھے اور پاؤں پٹختے ہوئے باہر چلے گئے۔
یہ بات تو اسد اب اچھی طرح جان گیا تھا کہ قدیر صاحب اور جانی بھائی میں پرانی رقابت ہے۔ یہی رقابت تھی جس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے قدیر صاحب کو اچانک آگ بگولا کر دیا تھا۔ اُنہوں نے اسد کی کوئی بات سننا ہی گوارا نہیں کی تھی...... اسد کے دل و دماغ میں ایک جنگ سی برپا ہوگئی۔ قدیر صاحب کے احسانات بے شمار تھے۔ شاد پور کے دُور دراز قصبے سے اُٹھا کر اُسے لاہور پہنچانے والے وہی تھے۔ لاہور میں اُنہوں نے قدم قدم پر اُسے سہارا دیا تھا اور رہنمائی کی تھی۔ ایک طرح سے اُنہوں نے اُنگلی پکڑ پکڑ کر اُسے چلنا سکھایا تھا...... لیکن دوسری طرف بھی کچھ باتیں ٹھوس حقیقت کی صورت میں موجود تھیں۔ "اے ون" کی ٹیم کے مقابلے میں بینک کی ٹیم کہیں بڑی تھی۔ ملازمت کے علاوہ وہ لوگ کئی ایک سہولتیں بھی دے رہے تھے۔ پھر وہ ایک ایسا زینہ بھی تھا جو بڑی تیزی سے اُسے بلندی پر لے جا سکتا تھا۔ اسد نے اپنے چند ایک قریبی دوستوں سے بھی مشورے کئے۔ اُنہوں نے بھی یہی کہا کہ اگر جانی بھائی تمہیں آفر کر رہے ہیں تو پھر اس آفر کو ٹھکرانا نہیں چاہئے، ہر قیمت پر قبول کر لینا چاہئے۔"
اگلے دو تین ہفتوں میں اسد اور قدیر صاحب کے تعلقات عجیب سے تعطل اور کھچاؤ کا شکار رہے۔ اسد، قدیر صاحب کے پاس بیٹھنے اور اُن سے طویل بات کرنے سے کتراتا رہا۔ دوسری طرف جانی بھائی سے اُس کی دو تین طویل ملاقاتیں ہوئیں۔ آخر

ایک دن وہی ہوا جو ہونا تھا۔ اسد "اے ون" کلب چھوڑ کر بینک کی ٹیم میں چلا گیا......
ایک ہفتے کے اندر اندر اُسے اسسٹنٹ آفیسر کی حیثیت سے بینک کی ملازمت مل گئی اور رہائش کے لئے چھوٹا سا مکان بھی مل گیا۔

○

بینک کی ٹیم میں جانے کے بعد اسد کے لئے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ وہ اب فرسٹ کلاس کرکٹر تھا۔ اُسے اچھے ماحول میں اچھے کھلاڑیوں سے کھیلنے کا موقع مل رہا تھا۔ اُس کی توجہ اور دلچسپی باؤلنگ میں مزید بڑھ گئی تھی۔ ایک اُبھرتے ہوئے اچھے فاسٹ باؤلر کی حیثیت سے اُس کی شناخت ہونے لگی تھی۔ اُس کی رفتار اور تکنیک دیکھتے ہوئے سینئر کھلاڑی اُس کے اچھے مستقبل کی پیش گوئی کر رہے تھے۔ بینک کی ٹیم میں جانے کے بعد قدیر صاحب اُس سے ناراض ہو گئے تھے۔ وہ دو تین بار اُن سے ملنے کے لئے گیا لیکن وہ گھر پر موجود ہونے کے باوجود اُس سے نہیں ملے۔ ایک دن وہ "اے ون" کے نیٹ پر پہنچا۔ کھیل ہو رہا تھا۔ قدیر صاحب بھی موجود تھے۔ اُنہوں نے اسد کے سلام کا جواب تو دیا لیکن اس کے بعد جو گفتگو ہوئی وہ اتنی مختصر اور رُوکھی پھیکی تھی کہ اسد کا دل کٹ کر رہ گیا۔ قدیر صاحب کے نہایت خشک رویئے نے اُسے آزردہ کر دیا تھا۔ وہ آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک لئے واپس آ گیا۔
نئے مکان میں آنے کے بعد اسد کو کافی آزادیاں بھی نصیب ہوئی تھیں۔ یہاں اُس کے دوست باآسانی آ جا سکتے تھے۔ رات گئے تک محفلیں جمتی تھیں اور گپ شپ ہوتی تھی...... ہفتے میں ایک آدھ بار عبداللہ بھی شاد پور سے آ جاتا تھا۔ کبھی کبھی رات بھی وہیں اسد کے ساتھ گزارتا تھا۔ اُس کی کامیابیاں دیکھتے ہوئے اُسے بھی پھر سے کرکٹ کا شوق چرایا تھا۔ ایک طرح سے یہ باسی کڑی میں اُبال والی بات تھی۔ ایک تو عبداللہ کی عمر اسد سے زیادہ تھی۔ دوسرے اُس کی کرکٹ بھی بس گلی ڈنڈے کے سٹائل والی تھی۔ عبداللہ سے اسد کو شاد پور کے حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔ شمیم کے حوالے سے سب کچھ جوں کا توں تھا۔ وہ اپنی پڑھائی میں مگن تھی۔ اُس کے رشتے کی بات بھی اب ٹھنڈی پڑی ہوئی تھی۔ غالباً یہ بات شمیم کی وجہ سے ہی ٹھنڈی پڑی تھی۔ عبداللہ سے شمیم نا باتیں سن کر اسد کا دم سا گھٹنے لگتا تھا۔ اُسے شمیم کی آخری نظریں یاد آنے لگتی تھیں۔

اس مرتبہ جب وہ شاد پور گیا تھا تو شمیم کی بس ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا۔ وہ چچی کے کندھے کے اُوپر سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اس مرتبہ شمیم کی نگاہوں میں اُسے عجیب سی بیگانگی اور خود سری نظر آئی تھی۔ اسد کو یوں لگا تھا جیسے اُس کی بیگانگی کے جواب میں وہ بھی بیگانگی دکھا رہی ہے۔ شمیم کا یہی انداز تھا جس نے اسد کے طیش کو مزید ہوا دی تھی اور وہ واپسی میں ڈیرے سے شاد پور جانے کی بجائے سیدھا لاہور آ گیا تھا۔ درحقیقت اس مرتبہ شاد پور میں اسد کا قیام بہت ہی مختصر رہا تھا۔ وہ دو دن کے لئے ڈیرے پر گیا تھا، وہاں زاہدہ عرف گڑیا کے ساتھ اُس کا ایسا دل لگا تھا کہ ساری چھٹیاں ڈیرے پر ہی بیت گئی تھیں...... اسد جانتا تھا کہ شمیم شاد پور میں اُس کا انتظار کرتی رہی ہو گی۔ اور اس کی خواہش بھی یہی تھی کہ وہ ایسا کرتی رہی ہو۔ شمیم کے حوالے سے اُس کا رویہ جارحانہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہی رویہ جو کھیل کے میدان میں بیٹسمین کے حوالے سے ہوتا تھا۔ وہ بیٹسمین کو ہراساں کر دیتا تھا۔ جب اُس کی تیز رفتار بال بیٹسمین کو کہیں چوٹ لگاتی تھی اور بیٹسمین کا چہرہ ہلدی ہوتا تھا تو عجیب سی طمانیت اُس کے رگ و پے میں دوڑ جاتی تھی۔ بیٹسمین کو تکلیف پہنچا کر اور اُسے صرف اپنے دفاع تک محدود کر کے اسد کو اندرونی مسرت ملتی تھی...... اسد کی گیندیں بلے بازوں کی نیندیں حرام کر رہی تھیں۔ اُس کی ایک ''لیگ کٹر'' گیند تو اتنی خطرناک تھی کہ یار لوگوں نے اُسے اپنے طور پر ''Man Eater'' کا نام دے دیا تھا۔ اسد محبت کے میدان میں ایسی ہی کوئی گیند شمیم کو بھی پھینکنا چاہتا تھا۔ کوئی ایسی بات، کوئی ایسی چوٹ جو اُس کی راتوں کی نیندیں حرام کر ڈالے، اُس کا جینا دوبھر کر دے۔

لاہور آمد کے ڈیڑھ دو ماہ بعد ہی اسد کی زندگی میں ایک اور مہ جبیں آ گئی...... اُس کا نام کنول تھا۔ وہ ایک فیشن ایبل اور ایکسٹرا ماڈرن گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ کرکٹ کی شیدائی تھی اور یونیورسٹی کے دور میں خواتین کی کرکٹ ٹیم کی ممبر رہ چکی تھی۔ جانی بھائی کے ساتھ اس فیملی کی دُور کی رشتے داری تھی۔ کنول اور اُس کے گھر والوں کا جانی بھائی کے گھر آنا جانا تھا۔ اسد بھی وہاں آتا جاتا تھا۔ وہیں کنول سے اُس کی ملاقات ہوئی۔ اُونچا لمبا مضبوط قد کاٹھ کا اسد اب اچھے رہن سہن کے سبب کچھ اور بھی نکھر آیا تھا۔ کنول نے اُسے دیکھا اور اُس کی آنکھوں میں پسندیدگی کی اتنی نمایاں چمک نظر آئی

کہ اسد نوٹ کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اگلی ایک دو ملاقاتوں میں وہ دونوں کچھ اور کھل گئے۔ کنول نے اُسے اپنا فون نمبر بھی دیا تھا۔ ایک دو بار فون پر بھی ہیلو ہیلو ہوئی۔ کنول کا سراپا تو دلکش تھا ہی، اُس کی آواز اُس کے سراپے سے بھی حسین تھی۔ موسیقی کی طرح کانوں کے راستے دل میں اُترتی ہوئی آواز...... اس آواز میں نسوانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ ایک مکمل اور بھرپور نسوانی آواز ہے۔ نازک نازک، میٹھی میٹھی، خفتہ جذبات کو جگاتی اور اُکساتی ہوئی۔

اسد تنہائی میں بیٹھ کر کبھی کبھی اپنا تجزیہ بھی کیا کرتا تھا۔ یہ بات وہ خود بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ اُس کے اندر نئی نئی مہمات سر کرنے کا جنون ہے۔ کوئی بھی مہم جتنی مشکل ہوتی تھی اُسے سر کرنے میں وہ اتنا ہی سرگرم ہو جاتا تھا۔ پھر جب مہم سر ہو جاتی تھی ایک دم اُس کے جذبات پر بھی اوس پڑ جاتی تھی۔ جس طرح لشکر جرار اپنے مفتوحہ علاقے کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے وہ بھی سب کچھ بھول بھال کر آگے بڑھ جاتا تھا۔ کئی بار وہ خود احتسابی کے انداز میں سوچتا تھا، غور کرتا تھا کہ اُسے اس طرح کرنا چاہئے یا نہیں؟ جواب اکثر نفی میں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود وقت آنے پر وہ خود کو اس عمل سے روک نہیں پاتا تھا۔ وہی کرتا تھا جو اس سے پیشتر کیا ہوتا تھا...... اُس کا یہ رویہ کوئی اب کی بات نہیں تھی۔ وہ بچپن سے ہی ایسا تھا۔ تاہم جب سے وہ شمیم کی بے وفائی اور بے رُخی کا شکار ہوا تھا یہ کیفیت کچھ اور شدت اختیار کر گئی تھی۔

اب کنول کے معاملے میں بھی کچھ ایسی ہی صورت حال پیش آ رہی تھی۔ کنول میں وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو اسد کے شوق کو ہوا دیتی تھیں۔ وہ جوان اور خوبصورت تھی، اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی، نہایت اُونچے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی...... پھر ایک خاص بات اور تھی۔ وہ شادی شدہ تھی، شادی شدہ ہونے کی وجہ سے وہ اسد کو خود سے بڑے فاصلے پر نظر آئی۔ اس فاصلے اور دُوری نے کنول کو اسد کے لئے ایک مشکل مہم بنا دیا۔ اس مہم کو سر کرنا اُسے بہت دلچسپ نظر آنے لگا۔

ایک دن کنول سے فون پر بات ہوئی۔ وہ بولی۔ ''ویل ڈن اسد! کل تو تم نے سنگل وکٹ کے میچ میں کمال کر دیا۔ زبردست باؤلنگ بھئی...... میں نے ابھی اخبار میں پڑھا ہے۔''

''بہت شکریہ...... اس خبر کے طفیل ایک بار پھر آپ کی آواز سننے کو مل گئی۔''

وہ ہنسی۔''اوہو...... پھر وہی آواز...... بھئی کیا ہے میری آواز کو؟ تم نے تو مجھے چکر میں ڈال دیا ہے۔''

''آپ بالکل غلط کہہ رہی ہیں۔ میں پہلا بندہ نہیں ہوں جو آپ کی آواز کی تعریف کر رہا ہوں۔ بہت سوں نے آپ سے یہ بات کہی ہوگی۔''

''بالکل نہیں کہی۔'' وہ ادا سے بولی۔

''پھر آپ کے اردگرد رہنے والے سارے لوگ بہرے ہیں۔''

وہ ہنسی تو جیسے جلترنگ بج اُٹھے۔''اچھا مجھے زیادہ بانس پر مت چڑھاؤ۔ اور ویسے بھی آوازوں اور شکلوں پر توجہ دینے کی بجائے اپنے کھیل پر زیادہ توجہ دو۔''

''لیکن میں صرف کھلاڑی ہی نہیں انسان بھی ہوں، بلکہ انسان تو پہلے ہوں۔''

''اچھا انسان صاحب! اب مجھے اجازت دیں۔ میری ایک فرینڈ کراچی سے آ رہی ہیں، اُنہیں ریسیو کرنے ایئرپورٹ جانا ہے۔''

''آپ اپنے اُن سے کب ملوا رہی ہیں؟''

''تمہیں بتایا تو تھا کہ وہ اگلے مہینے کے آخر میں آئیں گے۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ انگلینڈ سے سیدھے پاکستان آنے کی بجائے ہالینڈ سے ہوتے ہوئے آئیں۔ اگر اُنہیں ہالینڈ جانا پڑا تو پھر ایک مہینہ اور بھی لگ سکتا ہے۔ اُن کا کام ہی ایسا ہے، کبھی یہاں کبھی وہاں۔ اور جب جائیں تو پھر آنے کا نام ہی نہ لیں۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں میں جاب کے ایسے ہی بکھیڑے ہوتے ہیں۔''

اسد، کنول کی باتیں ہمدردی سے سن رہا تھا۔ لیکن نجانے کیوں کنول کے شوہر نامدار کی غیر موجودگی اور مزید غیر موجودگی کا امکان اُسے اچھا لگ رہا تھا۔

اگلے روز شاد پور سے عبداللہ آ گیا۔ اُس نے اسد کو ایک اہم خبر سنائی۔ خبر یہ تھی کہ ڈیرے پر بے چاری زاہدہ کی بہت کم بختی آئی تھی۔ وہ عشق و محبت کے معاملوں میں قطعی طور پر نا تجربہ کار لڑکی تھی۔ یہ تو اسد ہی تھا جس نے اُسے ورغلایا تھا اور اپنے رستے پر لگایا تھا۔ اُس نے کہیں اپنی ایک سہیلی کو اسد کے متعلق بتایا تھا اور اُن خفیہ ملاقاتوں کی روئیداد بھی سنائی تھی جو ڈیرے میں ہوتی رہی تھیں۔ وہ اس بات سے لاعلم تھی کہ راز اُسی وقت

تک محفوظ ہوتا ہے جب تک وہ اپنے سینے میں ہو...... سہیلی سے ان حالات کی بھنک سہیلی کی ماں کو پڑی تھی اور وہاں سے بات آگے نکل گئی تھی۔ جب زاہدہ کے گھر والوں کو معلوم ہوا تھا تو زاہدہ کا والد رنگی بابا آگ بگولا ہو گیا تھا۔ اُس نے مار مار کر زاہدہ کی ہڈیاں نرم کر دی تھیں۔ سر پر چوٹ لگنے سے وہ پورے آٹھ پہر بے ہوش رہی تھی۔ اب اُس کی ماں اُسے باپ اور بھائی کے غصے سے بچا کر اپنے میکے لے گئی تھی۔

یہ خبر اسد کے لئے تکلیف دہ تھی۔ زاہدہ کے ساتھ اُس نے کچھ اچھا وقت گزارا تھا۔ اُس کی سیدھی سادی دیہاتی لگن نے اسد کو متاثر کیا تھا۔ بہرحال اسد کے لئے یہ کوئی ایسی اندوہناک خبر نہیں تھی کہ وہ دل تھام کر بیٹھ جاتا یا پریشانی میں بال بکھیر لیتا...... اگر کام خراب ہوا تھا تو زاہدہ کی اپنی غلطی سے ہوا تھا۔ ملاقاتوں کے دوران اسد اُسے تواتر سے کہتا رہا تھا کہ وہ بھولے سے بھی کسی سے ذکر نہیں کرے گی۔ شاید زاہدہ نے سوچا تھا کہ اگر عبداللہ، اسد کا ہمراز ہو سکتا ہے تو کوئی قریبی دوست اُس کی ہمراز بھی ہو سکتی ہے۔ اب اسد کو اندیشہ ایک ہی بات کا تھا۔ اُسے اپنے حوالے سے رنگی بابا اور صغیر وغیرہ کے ردِعمل کا ڈر تھا۔ ممکن تھا کہ اُن میں سے کوئی یہاں تک پہنچ جاتا اور اسد سے ناراضگی کا اظہار کرتا۔ اور اگر کوئی نہ بھی پہنچتا تو اسد کو تو کبھی نہ کبھی ڈیرے جانا ہی تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ رنگی اور صغیر وغیرہ کا سامنا کیسے کرے گا؟

بہرحال عبداللہ کی بات سے اسد کو قدرے تسلی ہوئی۔ عبداللہ نے بتایا کہ رنگی نے اسد کے والد یا چچا شوکت سے اس واقعے کی شکایت نہیں کی، بلکہ شاد پور میں کسی کو اس بات کا علم ہی نہیں ہے۔ عبداللہ کو بھی صرف اس لئے پتہ چل گیا تھا کہ وہ نذیر احمد سے اپنے ٹیوب ویل کے لئے درخواست لکھوانے عباس پورہ گیا تھا۔

پانچ چھ دن خیریت سے گزر گئے تو اسد کو اطمینان ہو گیا۔ وہ ایک بار پھر اپنی نئی رنگین مصروفیت کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ایک دن اسد کو کنول کا فون آیا۔

''کیسے ہو اسد؟''

''بالکل ٹھیک...... اور تمہاری آواز سننے کے بعد اور بھی ٹھیک ہو گیا ہوں۔'' وہ اب بے تکلفی سے اُسے تم کہہ کر مخاطب کرنے لگا تھا۔

''اچھا زیادہ بنایا مت کرو...... تم سے ایک ضروری کام ہے۔''

"بسر و چشم......"

وہ بولی۔ "تم سے اپنے چھوٹے بھائی وکی کا ذکر کیا تھا نا؟"

"وہی جنہیں کرکٹ کا بہت شوق ہے؟"

"بالکل وہی...... اب اُس کے شوق کو مزید ہوا مل گئی ہے۔ ویسے بھی امتحانات کے بعد آج کل فارغ ہے۔ بڑی سنجیدگی سے کلب جا رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں تم تھوڑا سا ٹائم نکال کر اُس کی کوچنگ کرو۔"

"کوئی پرابلم نہیں۔ میں صبح کے نیٹ کے بعد تقریباً فارغ ہی ہوتا ہوں۔ وہ میرے پاس آ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ......"

"لیکن مسئلہ تو یہ ہے کہ وہ اتنی دُور آئے گا کیسے؟ وہ میرے پاس ہی رہتا ہے۔ کینٹ سے کینال پارک کا کافی فاصلہ ہے۔ وہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ تم صبح کے نیٹ کے بعد ہمارے ہاں سے ہوتے جاؤ۔ بس ایک گھنٹہ دے دیا کرو۔ فیس کے طور پر تمہیں فنٹاسٹک قسم کا ناشتہ مل جایا کرے گا۔"

"فنٹاسٹک ناشتے میں تو میرے لئے کوئی اتنی کشش نہیں ہے۔ لیکن فنٹاسٹک آواز میں ہے۔ اور جب......" وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

"رُک کیوں گئے؟ کہہ دو۔ آج کل تمہاری زبان بڑی رواں ہے۔"

وہ بولا۔ "اور جب آواز کے ساتھ تصویر بھی ہو تو بات کچھ اور ہی ہو جاتی ہے۔"

وہ ہنسی، پھر مصنوعی ناراضگی سے بولی۔ "تم کچھ زیادہ ہی باتونی نہیں ہوتے جا رہے ہو؟"

"یار لوگ مجھے گونگا کہتے ہیں۔ لیکن پتہ نہیں کبھی کبھی کیسا موسم ہوتا ہے کہ بولنے کو دل چاہتا ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ سکندر (کنول کا شوہر) سے تمہیں اس وقت ملواؤں گی جب تمہارے بولنے کا موسم ہو گا۔ اُنہیں باتونی لوگ بڑے پسند ہیں۔"

"اس کی وجہ بھی میں جانتا ہوں۔ تمہاری خوبصورت آواز نے اُنہیں "گفتگو پسند" بنایا ہو گا۔ ورنہ عام شوہر تو گفتگو سے بڑے بیزار ہوتے ہیں۔"

وہ ہنسی۔ "تم اُنہیں بھی عام شوہر ہی سمجھو۔"

"کیا مطلب؟" اسد نے پوچھا۔ "اُنہوں نے کبھی تمہاری آواز کو سراہا نہیں؟"

"توبہ کرو جی۔ اُن کے تو سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ اُنہیں تو میرا بس ایک ہی فقرہ اچھا لگتا ہے۔"

"وہ کون سا؟"

"سکندر! آ جائیں، کھانا لگ گیا ہے۔"

دونوں کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

کنول کے گھر اسد کا آنا جانا ہو گیا۔ وکی "ممی ڈیڈی ٹائپ" کا تیرہ چودہ سالہ لڑکا تھا۔ انگریزی کثرت سے بولتا تھا۔ اُس کا کھیل اتنا برا نہیں تھا۔ تھوڑی سی کوچنگ کی جاتی تو مزید اچھا ہو سکتا تھا۔ کوٹھی کے وسیع لان میں کنول نے چھوٹا نیٹ لگوا دیا تھا۔ سیمنٹ کی پچ پہلے سے بنی ہوئی تھی۔ اسد روزانہ ایک گھنٹہ وکی کے ساتھ رہتا...... کہنے کو تو وہ وکی کے ساتھ رہتا تھا مگر حقیقت میں کنول کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ اپنی عادت سے مجبور تھا اور عادت کا تقاضا تھا کہ وہ کنول پر کمند پھینکے۔ کنول شادی شدہ تھی۔ اُس کا شوہر سکندر ایک جواں سال "ایم بی اے" تھا۔ دونوں کی شادی کو تقریباً ڈیڑھ سال ہوا تھا۔ ابھی بچہ وغیرہ کوئی نہیں تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شوہر صاحب زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہتے تھے۔ اب بھی پچھلے دو ماہ سے وہ انگلینڈ میں تھے۔ ہر دوسرے تیسرے روز اُن کا فون آتا تھا۔ ایک دو مرتبہ یہ فون اسد کی موجودگی میں بھی آیا۔ کم از کم فون پر ہونے والی گفتگو سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ میاں بیوی میں محبت ہے۔ کنول، شوہر کو بڑی ادا سے ڈارلنگ کہہ کر پکارتی تھی۔

کنول اپنے شوہر سے فون پر جو گفتگو کرتی تھی اُسے سن کر اسد کے اندر کمند پھینکنے کی خواہش کو مزید ہوا ملی...... وہ وکی کی کوچنگ کے بعد بھی ڈیڑھ دو گھنٹے کنول کی کوٹھی میں ہی گزارتا۔ گپ شپ ہوتی، کنول ریڈرز ڈائجسٹ کے نئے لطیفے سناتی، پوئٹری کی باتیں ہوتیں۔ پوئٹری اور خاص طور سے انگلش پوئٹری سے اسد جیسے کھلاڑی کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ لیکن کنول کی خاطر اسد نے دلچسپی لینی شروع کر دی۔ اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ شاعری اور شعر فہمی کی گفتگو میں ایک دوسرے کے قریب آنے کے مواقع بہت زیادہ ہوتے ہیں اور بے تکلفی تیزی سے بڑھتی ہے۔

وہ دھیرے دھیرے اور غیر محسوس طور پر ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے۔ فون پر بھی اُن کی بہت لمبی لمبی باتیں ہونے لگیں۔ کبھی کبھی تو وہ رات بھر باتیں ہی کرتے رہتے۔ اسد کی پُر زور فرمائش پر ایک دن کنول نے فون پر ہی اُسے اپنی آواز میں ایک انگریزی گیت سنایا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ اُردو انگریزی کے بہت سے گیت اسد نے کنول کی دلکش آواز میں سنے...... پھر ایک رم جھم برستی رات میں جیسے خود بخود ہی اسد سے اظہارِ محبت بھی ہو گیا...... فون پر دوسری طرف کئی سیکنڈ تک گہری خاموشی چھائی رہی۔ پھر کنول نے کہا۔

''یہ مناسب نہیں اسد...... دوستی کی حد تک تو ٹھیک ہے۔ لیکن اس سے آگے...... بہت خرابی ہے۔''

''پیار اصول اور قاعدے کہاں دیکھتا ہے کنول؟ یہ تو جنگلی پھولوں کی طرح خود رو ہوتا ہے۔'' اسد نے بے حد جذباتی لہجے میں کہا۔

اسد نے کمند پھینک دی تھی اور اب رسے کو جھٹکے دے کر فصیل پر کمند کی گرفت کو مضبوط کر رہا تھا۔

ایک دن وہ کنول کے گھر بیٹھا تھا۔ وکی بازار سے آئس کریم لینے گیا ہوا تھا۔ ایک بڑے ہی جذباتی ماحول میں اسد نے کنول کو چھونا چاہا۔ وہ ایک دم بھڑک سی گئی۔ اُس نے رُوکھے لہجے میں اسد سے کہا۔ ''ہم دونوں کو اپنی حدود میں رہنا چاہئے اسد!''

اسد کوئی بات کہے سنے بغیر کنول کے گھر سے اُٹھ آیا اور دوبارہ وہاں نہیں گیا۔ آٹھ دس روز اسی طرح گزر گئے۔ پھر کنول کا فون آیا۔ اُس کا رویہ معذرت کا سا تھا۔ وہ بولی۔ ''لگتا ہے کہ ہمیں ایک دُوجے کی عادت ہو گئی ہے۔ جب بات نہیں ہوتی تو بہت کچھ کھویا کھویا لگتا ہے۔''

''دو چار دن کی بات ہے۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بھول جاؤ گی سب کچھ۔ پھر کبھی یاد بھی نہیں آئے گا کہ اسد نام کا کوئی پاگل تمہاری زندگی میں آیا تھا۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو اسد...... میں تم سے دُور جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''وہ کیا کہتے ہیں کہ جس افسانے کو انجام تک لانا نہ ہو ممکن، اُسے ایک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا۔''

اُس دن اسد نے اپنی دلگداز گفتگو سے کنول کو باقاعدہ رُلا دیا۔ اُس نے اسد کو گھر آنے اور وکی کو چنگ پھر سے شروع کرنے کے لئے کہا اور بار بار اصرار کیا۔ لیکن اسد کا رویہ اٹل رہا۔ اُس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''یاد کرو کنول! میں کتنی مرتبہ تمہارے دولت خانے پر گیا ہوں۔ کیا ایک مرتبہ بھی تمہارے یا وکی کے دل میں آیا ہے کہ میرے گھر آئیں؟ اب میں اُس وقت تک نہیں آؤں گا جب تک تم دونوں میں سے کوئی نہیں آئے گا۔''

دو چار منٹ مزید گفتگو کرنے کے بعد اسد نے سلسلہ منقطع کر دیا...... اگلے ہی روز وکی اپنے ایک دوست کے ساتھ اسد کے فلیٹ پر پہنچا اور ایک شاگرد کی حیثیت سے اُسے منا کر اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی۔ اسد نہیں گیا۔ صرف اتنا کہا کہ وہ ایک دو دن تک آ جائے گا۔ اُس نے دل میں ٹھان رکھی تھی کہ جب تک کنول خود نہیں آئے گی وہ اُس کے گھر نہیں جائے گا اور نہ کو چنگ وغیرہ کرے گا...... صنفِ نازک کے حوالے سے وہی بے لچک رویہ جو اُس کی عادت بنتا جا رہا تھا، وہی انا پرستی، وہی ضد...... اتنا عرصہ گزر گیا تھا لیکن وہ شاید آج بھی شاد پور میں اپنے گھر کے اُسی کمرے میں لیٹا تھا جہاں اُس نے شمیم کو اپنے قریب آنے کے لئے کہا تھا اور وہ اُس کی بات مانے بغیر چلی گئی تھی۔ شمیم کی چھوڑی ہوئی خالی کرسی اُس کے دماغ میں آج بھی موجود تھی۔ اُس کی موجودگی کسی ناسور کی موجودگی کی طرح بے حد پختہ ہو چکی تھی۔

چار پانچ روز مزید گزر گئے۔ اسد وہاں نہیں گیا اور نہ ہی وہاں سے کوئی فون وغیرہ آیا۔ ایسے دن اسد کے لئے بے حد اضطراب کے حامل ہوتے تھے۔ وہ دن رات ایک آگ میں جلتا تھا...... اب بھی اُس کی نظریں ہر گھڑی فون پر لگی رہتی تھیں۔ اُسے توقع تھی کہ کنول یا وکی کا فون ضرور آئے گا۔ جب رات گئے تک بھی فون کی توقع پوری نہ ہوتی تو وہ سوچتا شاید یہ ''معاملہ'' ختم ہو چکا ہے۔ وہ اب دوبارہ کنول کو نہیں دیکھ سکے گا...... مگر اگلے روز صبح سویرے پھر اُس کی آس بندھ جاتی۔ وہ پھر انتظار کرنے لگتا......

یہ چھٹے روز کی بات ہے۔ اسد دوپہر کا کھانا کھا کر سونے کے لئے لیٹا تھا۔ یہ وقت فراغت اور فرصت کا ہوتا تھا۔ اکثر کوئی دوست بھی موجود نہیں ہوتا تھا۔ اسد چار بجے تک آرام سے سوتا تھا لیکن آج کل تو کنول کی وجہ سے سکون چین حرام ہو رہا تھا۔ وہ بستر پر

کروٹیں لے رہا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ اُس نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے کنول کھڑی تھی...... اُس کی صورت غمزدہ تھی اور آنکھیں سرخ نظر آتی تھیں۔

اسد اور کنول میں رسمی کلمات کی ادائیگی ہوئی، پھر وہ اندر آ گئی...... اسد ایک اور مشکل فصیل سر کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ ایک اور دُشوار گھاٹی اُس نے طے کی تھی......

اُس روز کنول قریباً ایک گھنٹہ اسد کے فلیٹ میں رہی۔ گلے شکوے ہوئے، آنکھوں میں آنسو چمکے، ہونٹ تھرائے، اسد نے کنول کو بانہوں میں بھر لیا...... قریباً ایک گھنٹے بعد وہ اسد کے فلیٹ سے رُخصت ہوئی تو اسد مسکرا رہا تھا۔ کنول کے ہونٹوں پر بھی ہلکی سی مسکان تھی۔ لیکن یہ شفاف مسکان نہیں تھی۔ اس میں آلودگی تھی۔ شاید احساسِ جرم کی آلودگی...... اسد نے کنول سے وعدہ کیا کہ وہ اگلے روز ہر صورت اُن کے گھر آئے گا۔

ایک بار پھر اُس نے کنول کے ہاں جانا شروع کر دیا۔ وکی کے ساتھ بھی اسد کی گاڑی چھننے لگی تھی۔ اگر کسی دن اسد نہ پہنچ سکتا تو وکی پریشان ہو جاتا۔ درحقیقت اسد ایک موثر اور پُرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ اُس کے روز افزوں ہنر نے اُس کی ذات کو مزید اہم بنا دیا تھا...... اسد کے معاملے میں آزاد خیال کنول کا پاؤں ایک بار پھسلا تھا تو پھر پھسلتا ہی چلا گیا تھا۔ وہ ہوش مند لڑکی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ اچھے بُرے کی تمیز رکھتی ہے۔ لیکن آج کل اُس کے ہوش اُڑے ہوئے تھے۔ نہ نہ کرتے ہوئے بھی وہ اسد کے دکھائے ہوئے راستے پر ہی چلی جا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اسد کی تیز رفتاری اُسے کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں دے رہی۔ اسد اپنی اس نئی فتح پر مسرور تھا۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ شمیم اُس کے سامنے ہو اور وہ اُسے دکھائے کہ چاہنے والے اُسے کیسے چاہتے ہیں۔ کیسے اُس کے لئے ہر دیوار پھاندتے ہیں اور ہر حد کو پار کرتے ہیں......

تین چار بار ایسا موقع آیا کہ اسد، کنول کو اپنے تیز رو جذباتی رویّے میں بہا کر لے گیا۔ وہ اُس کے والہانہ انداز کے سامنے بے بس سی ہو گئی...... لیکن کنول کے معاملے میں بھی اسد نے بہرحال اپنی بنائی ہوئی حدود کا پاس کیا تھا...... اُس کے پیار کا ایک پیمانہ تھا۔ اُس کی قربت کی ایک حد تھی۔ وہ اس حد سے کبھی آگے نہیں گیا تھا، نہ اب جانا چاہتا تھا۔ یہ بات اُس کے دل و دماغ میں راسخ ہو چکی تھی کہ اگر وہ اپنی حدود سے آگے گیا تو اُس کی زندگی کا حسین ترین خواب چکنا چور ہو جائے گا...... شمیم کے نام کا ورق

اُس کی زندگی کی کتاب سے علیحدہ ہو جائے گا۔

کنول کے ساتھ میل جول کے دوران میں ہی ایک اور واقعہ ہوا اور وہ یہ کہ فریحہ کے ساتھ اُس کی ملاقات ہو گئی۔ فریحہ وہ پہلی لڑکی تھی جس نے اسد کو جیت کے احساس سے آشنا کیا تھا۔ فریحہ کی نسبت سے ہی اسد کو یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ اتنا اہم ہے کہ ایک خوبرو لڑکی اُس کی خاطر خطرات مول لے سکتی ہے، شب کے اندھیرے میں چل کر اُس کی بانہوں میں آ سکتی ہے۔ فریحہ کی بڑی خالہ زاد بہن کنول کی گہری سہیلی تھی۔ وہ تو اب امریکہ جا چکی تھی، تاہم فریحہ اور کنول کبھی کبھار آپس میں ملتی رہتی تھیں۔ فریحہ سے اسد کی ملاقات کنول کے گھر ہی ہوئی تھی۔ وہ لان میں وکی کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ پورچ میں گاڑی رُکی اور کنول آگے بڑھ کر فریحہ سے بغلگیر ہو گئی۔ پھر فریحہ کی نگاہ اسد پر پڑی اور وہ حیران رہ گئی۔

فریحہ اور اسد میں رسمی کلمات کا تبادلہ ہوا۔ فریحہ نے کنول کو بتایا کہ اسد صاحب کچھ عرصہ پہلے تک اُن کے پڑوسی رہے ہیں۔ تینوں نے اکٹھے چائے پی اور گپ شپ کرتے رہے۔ فریحہ کی خوبصورت آنکھوں کی گہرائی میں کہیں وہ ناراضگی بدستور موجود تھی جو اسد کی بے رُخی کے سبب پیدا ہوئی تھی۔ وہ موسلا دھار رات فریحہ کو بھولی نہیں تھی جب وہ اسد کے رویّے سے مایوس ہو کر اشکبار ہوئی تھی اور پھر پاؤں پٹختی ہوئی اسد کے کمرے سے چلی گئی تھی۔ اسد نے اس کے بعد مُڑ کر فریحہ کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ لیکن فریحہ کے رویّے سے ایک دو بار اندازہ ہوا تھا کہ وہ تجدید ملاقات چاہتی ہے...... اسی دوران میں اسد وہ گھر ہی چھوڑ آیا تھا اور اس معاملے کو ایک طرح سے فُل سٹاپ لگ گیا تھا۔

فریحہ سے ملاقات کو اسد نے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ یوں لگتا تھا کہ فریحہ نے بھی کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اگلے دس پندرہ روز میں کنول ہی کے ہاں اُن کی دو اتفاقیہ ملاقاتیں ہوئیں لیکن یوں محسوس ہوتا تھا کہ شاید دونوں ہی ایک دوسرے میں کوئی کشش محسوس نہیں کر رہے۔ اسد تو ان دنوں کنول کے لب و رُخسار میں گم تھا۔ اُس نے سوچا عین ممکن ہے کہ فریحہ بھی کوئی اس قسم کی مصروفیت رکھتی ہو اور یہ بات کوئی ایسی بعید از قیاس بھی نہیں تھی۔ اسد کی دخل اندازی سے پہلے سجاد اور فریحہ کے درمیان ہلکا پھلکا معاملہ چل رہا تھا۔ اب اسد تو یہاں شفٹ ہو گیا تھا مگر سجاد اب بھی اشفاق کے گھر آتا

جاتا تھا۔ بلکہ اسد کی معلومات کے مطابق کچھ زیادہ ہی آتا جاتا تھا۔ ایک دن اشفاق نے اشارتاً اسد کو بتایا بھی تھا کہ سجاد اپنی شکست کا دُکھ بھولا نہیں۔ اور اُسے جب بھی موقع ملا وہ فریحہ پر ڈورے ڈالنے کی کوشش ضرور کرے گا۔

○

وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔ کھیل کے میدان میں بھی اسد کو خاطر خواہ کامیابی مل رہی تھی۔ جانی بھائی اسد پر خصوصی توجہ دے رہے تھے۔ وہ اُس کی سہولت اور آسائش کا خیال رکھتے تھے۔ شاید وہ اسد پر ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اس سے پہلے وہ قدیر احمد کے بنائے ہوئے کنوئیں کا مینڈک تھا اور اسد کو واقعی یہی لگ رہا تھا کہ وہ ایک محدود پانی سے ایک دم کھلے سمندر میں آ گیا ہے...... کسی وقت قدیر صاحب کا خیال اُس کے ذہن میں آتا۔ اُسے لگتا کہ قدیر صاحب ایک دُھند کے پار سے اُسے دیکھ رہے ہیں۔ گم صم، افسردہ اُسے قدیر صاحب کی نوازشات یاد آتیں اور سینے میں کسک سی جاگ اُٹھتی۔

ایک دن وہ اپنے فلیٹ میں بیٹھا وڈیو پر ایک کرکٹ میچ دیکھ رہا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ باہر جا کر اُس نے دیکھا اور ایک دم اُس کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا...... باہر رنگی بابا کھڑا تھا۔ اُس کے سر پر پگڑی تھی۔ اُس نے چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ وہ بے حد سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ رنگی اور زاہدہ وغیرہ کے حوالے سے اسد کو وہ ساری باتیں یاد آ گئیں جو کچھ روز پہلے عبداللہ نے اُسے بتائی تھیں...... سلام دُعا کے بعد وہ رنگی کو اندر لے آیا۔ وہ اندر ہی اندر خوفزدہ تھا مگر اگلے دو چار منٹ میں اُس کا بیشتر خوف دُور ہو گیا۔ رنگی نے اسد سے کسی طرح کی باز پرس کرنے کی بجائے اپنی آنکھوں میں آنسو بھر لئے اور بڑی لجاجت سے بولا۔

''چھوٹے مالک! میں اچھی طرح جانتا ہوں، ساری بے وقوفی اُسی مرن جوگی کی ہے۔ اُسی نے نادانی کی ہے۔ ورنہ آپ کو کیا میں جانتا نہیں ہوں؟ تین پشتوں سے جانتا ہوں...... مجھے آپ سے کسی طرح کا کوئی شکوہ نہیں ہے۔ نہ ہی آپ اپنے دل میں کوئی بات رکھنا۔''

وہ ہچکیوں سے روتا چلا جا رہا تھا۔ اسد نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھ کر بمشکل رنگی کو

چپ کرایا۔ وہ دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا۔ رنگی اور اُس کے خانوادے کی غیر مشروط وفاداری اور اطاعت گزاری کی بابت اُس نے ابا جان اور چچا شوکت سے بھی بہت کچھ سنا تھا مگر ان باتوں کا تجربہ اُسے آج ہو رہا تھا۔ رنگی نے بڑی لجاجت سے اُسے بتایا۔

''بس دو چار ہفتوں میں ہی اُس کم ذات کا بیاہ کر دینا ہے میں نے...... اتنی دُور پھینکوں گا کہ اُس کا پرچھانواں بھی ڈیرے پر نہیں پڑے گا۔''

رات اسد کے پاس ہی گزار کر اگلے روز رنگی واپس چلا گیا۔ اُس کے جانے کے بعد اسد کے سر سے ایک بڑا بوجھ اُتر گیا۔ حالانکہ زاہدہ والی بات کو اُس نے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ پھر بھی اتنے دن ایک کانٹا سا اُس کے دل میں چبھ رہا تھا۔ وہ سوچتا رہا تھا کہ معلوم نہیں زاہدہ کے سلسلے میں رنگی اور صغیر وغیرہ کا ردِعمل کیا ہو گا؟ وہ اُس سے کس طرح پیش آئیں گے؟ لیکن رنگی کے رویئے نے اُسے بالکل شانت کر دیا تھا...... اسد کے لاہور آ جانے کے بعد زاہدہ پر جو مشکلات آئی تھیں، اُن کا قلق اسد کو ضرور تھا لیکن وہ اب ایسی باتوں کو بہت جلد فراموش کر دیتا تھا۔

انہی دنوں ایک ٹورنامنٹ کے سلسلے میں اسد کو بینک کی ٹیم کے ساتھ راولپنڈی جانا پڑ گیا۔ اس ٹورنامنٹ میں دو چار ایسے کھلاڑی بھی شرکت کر رہے تھے جو قومی سطح پر کرکٹ کھیل چکے تھے۔ اس کے علاوہ اے ون کلب کی ٹیم بھی ٹورنامنٹ میں کھیل رہی تھی۔ اے ون کا سپر سٹار سجاد بھی ٹیم میں شامل تھا۔ یہی وجوہات تھیں جن کے سبب اسد میں زبردست جوش پایا جا رہا تھا۔ وہ باؤلنگ میں اپنی برتری منوانے کے لئے بے تاب تھا۔

ٹورنامنٹ میں شروع میں تو اسد کی کارکردگی کچھ دبی رہی، لیکن دو میچوں کے بعد اُس نے اپنے جوہر دکھانے شروع کر دیئے۔ ٹورنامنٹ میں اسد کی باؤلنگ کا سب سے پہلا شکار سجاد ہی تھا۔ اسد کی باؤلنگ پر کھیلتے ہوئے اکثر کھلاڑی نروس ہو جاتے تھے مگر سجاد کچھ زیادہ ہی ہوتا تھا۔ اُس کا نیچرل کھیل ایک دم اُڑن چھو ہو جاتا تھا۔ وہ گھبراہٹ میں جارحانہ انداز اختیار کرنے کی کوشش کرتا اور یہ انداز اُسے مہنگا پڑتا تھا۔ کرکٹ میں بیٹسمین اور باؤلر کی چپقلش اکثر بیٹسمین کو مہنگی پڑتی ہے۔ بیٹسمین کے پاس غلطی کی گنجائش نہیں ہوتی جبکہ باؤلر کے پاس کافی مارجن ہوتا ہے۔ اُس کو اُوپر تلے دو چار چھکے بھی پڑ جائیں تو وہ اگلے اوور میں اس پٹائی کا بدلہ لے سکتا ہے۔ جبکہ بیٹسمین کو غلطی کی

پاداش میں واپس پویلین میں جانا پڑتا ہے۔

سجاد کا زرد رنگ دیکھ کر اور اُس کے اعصابی تناؤ کو محسوس کر کے اسد کو عجیب سی راحت محسوس ہوتی تھی۔ اُس کی باؤلنگ میں مزید اسپارک آ جاتا تھا۔ وہ اُسے ہراساں کرنے کے لئے اُٹھتی ہوئی گیندیں پھینکتا تھا اور پھر ان کٹر یا، یارکر پھینک کر اُسے پویلین کا راستہ دکھا دیتا تھا۔ اس ٹورنامنٹ میں بھی اسد نے سجاد کو چار مرتبہ آؤٹ کیا۔ اور اس میں سے تین مرتبہ وہ کلین بولڈ ہوا۔ اسد کی باؤلنگ نے ٹورنامنٹ کے سینئر ترین کھلاڑیوں کو بھی کافی پریشان کیا تھا اور اُس کی گیندوں پر بہت کم سکور بنے تھے۔ مجموعی طور پر اس ٹورنامنٹ میں اسد کی کارکردگی لاجواب رہی۔ خاص طور سے اُس کی باؤلنگ متعلقہ لوگوں میں موضوع بحث بنی رہی۔ ٹورنامنٹ کے دوران ایک دو مرتبہ قدیر صاحب سے بھی اسد کا سامنا ہوا۔ اُن کی بات چیت سلام دُعا سے آگے نہیں بڑھی۔ اسد کو دیکھتے ہی قدیر صاحب کی کشادہ پیشانی پر دُکھ کی لکیریں نمودار ہو جاتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اسد اُن کے چہرے پر نگاہیں ڈالتے ہوئے کتراتا تھا۔ اس ٹورنامنٹ میں بینک کی ٹیم نے ''وننگ'' کارکردگی دکھائی اور نمبر ون رہی۔ قدیر صاحب کا کلب کوئی خاص کارکردگی نہیں دکھا سکا۔ ویسے بھی اُن کی ٹیم کے دو کھلاڑی ان فٹ ہو گئے تھے۔ اے ون کلب چھٹی پوزیشن حاصل کر سکا۔

راولپنڈی سے اسد کی واپسی قریباً ایک ماہ بعد ہوئی۔ اس دوران میں چند بار ہی اُس نے فون پر کنول سے رابطہ کیا تھا۔ لیکن جب فائنل میچ شروع ہو گئے تھے تو وہ اُسے فون نہیں کر سکا تھا۔ لاہور روانگی سے پہلے وہ اُسے فون کرنا چاہتا تھا لیکن پھر اُس نے سوچا کہ اچانک پہنچ کر اُسے سرپرائز دے گا...... وہ رات گئے لاہور پہنچا۔ دن چڑھے تک سویا رہا، پھر نہا دھو کر اور تیار ہو کر کنول کے گھر پہنچ گیا۔ وہ اُس کے لئے ایک چھوٹا سا لیکن نہایت خوبصورت نیکلس بھی لایا تھا۔ نیکلس اُس کی پتلون کی جیب میں تھا۔ اُس نے بیل دی تو چوکیدار احسان خاں نے دروازہ کھولا۔

''بی بی گھر میں ہیں؟'' اسد نے پوچھا۔

''جی ہاں......''

''اور وکی؟''

''وہ مارکیٹ تک گئے ہیں ابھی آ جاتے ہیں۔''

اسد اندر چلا گیا۔ کامن رُوم میں پہنچ کر اُس نے کنول کو آواز دینی چاہی لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ کچن کی طرف سے کھٹ پٹ کی آواز آ رہی تھی۔ کنول وہیں موجود تھی۔ اسد خاموشی سے ٹانگیں پسار کر صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ ہاتھ بڑھا کر اُس نے ڈیک آن کر دیا۔ غلام علی کی گائی ہوئی غزل ''چپکے چپکے رات دن......'' کمرے میں گونجنے لگی۔ اسد کو معلوم تھا کہ اب کنول کمرے کا رُخ کرے گی اور اسد کو دیکھ کر ششدر رہ جائے گی۔ پھر قدموں کی چاپ اُبھری......لیکن جو صورت دروازے میں دکھائی دی وہ کنول کی نہیں، ایک جواں سال لمبے تڑنگے شخص کی تھی۔ اُس کی گھنی مونچھوں کے نیچے اُس کے ہونٹ سانولائے ہوئے سے نظر آتے تھے...... وہ گہری نظروں سے اسد کو دیکھنے لگا...... اسد ایک دم اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے البم میں کنول کے شوہر سکندر کی تصویریں دیکھی تھیں۔ وہ ہکلا کر بولا۔

''آپ......آپ سکندر......صاحب ہیں؟''

''جی ہاں......لگتا ہے کہ مجھے یہاں دیکھ کر آپ کو بہت حیرت ہوئی ہے۔''

''ج......جی ہاں......نن......نہیں۔ دراصل میرا خیال تھا......'' وہ گڑبڑا کر چپ ہو گیا۔

سکندر نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''اور میرا اندازہ ہے کہ آپ اسد صاحب ہیں۔ کرکٹر اسد۔''

''ج......جی ہاں......''

''پھر تو آپ ضرور کنول سے ملنے آئے ہوں گے۔'' سکندر نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''نہیں......جی......میں وکی کے لئے آیا تھا۔''

''وکی تو باہر گیا ہوا ہے۔ میں آپ کی دوسری میزبان کو بھیجتا ہوں۔'' میزبان سے سکندر کی مراد یقیناً کنول ہی تھی۔ سکندر کا طنزیہ لہجہ اسد کے دل میں انجانے خدشے جگا رہا تھا۔

سکندر چلا گیا۔ چند منٹ بعد کنول نظر آئی۔ وہ ہفتوں کی بیمار دکھائی دے رہی تھی۔ بال منتشر، رنگت اُڑی ہوئی، اُس کی آنکھیں سرخ اور متورم تھیں۔ اُس نے ایک ڈری

ہوئی نگاہ اسد پر ڈالی اور نمناک آنکھوں سے بولی۔

''اسد! تم یہاں کیوں آئے ہو؟ پلیز چلے جاؤ یہاں سے...... اب یہاں نہ آنا۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔''

''ہوا کیا ہے؟''

''میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینا نہیں چاہتی۔ بس اب میرے حال پر رحم کرو۔ یہاں سے نکل جاؤ۔''

اسد خاموشی سے واپس آ گیا تھا۔

آٹھ دس روز اسی طرح گزر گئے۔ اسد کو کنول کی کوئی خبر نہیں ملی۔ مختلف قسم کی سوچیں اسد کے ذہن پر یلغار کرتی رہیں...... آخر ایک دن دوپہر کے وقت کنول کی کال آئی۔ اُس کی خوبصورت آواز جو ہمیشہ اسد کے کانوں کے راستے اُس کے دل کی گہرائی میں اُتر جاتی تھی آج بیٹھی ہوئی اور پھٹی پھٹی تھی۔ پس منظر میں ٹریفک کا شور بھی تھا۔ وہ ہراساں لہجے میں بولی۔

''اسد! میں پی سی او سے بات کر رہی ہوں.... سکندر کو سب کچھ معلوم ہو گیا ہے.... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ پتہ نہیں وہ کیا کر گزریں۔ چند دن پہلے تک تو یہی لگ رہا تھا کہ ہمارا گھر ٹوٹ جائے گا، لیکن اب اُنہوں نے خود کو کچھ سنبھالا ہے۔ میں نے بھی رو رو کر اُن سے معافی مانگی ہے، اُن کے پاؤں پکڑے ہیں۔ پتہ نہیں اُنہوں نے مجھے معاف کیا ہے یا نہیں؟...... ہم سے بڑی غلطی ہوئی ہے اسد...... ہم نے ایسا کیوں کیا؟ کیوں ہم دوستی میں اتنے دُور نکل گئے؟ مجھے نہیں یقین کہ سکندر مجھے دل سے معاف کر سکیں گے......'' وہ سسکیوں سے رونے لگی۔

اسد خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد وہ بولی۔ ''اسد! اگر تمہارے دل میں میرے لئے تھوڑا بہت بھی پیار ہے تو پلیز...... اب میری زندگی میں مت آنا۔ اگر کر سکتے ہو تو میرے لئے دُعا کرنا کہ میں اپنے حالات کو ٹھیک کر سکوں...... پلیز اسد!'' وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

اسد نے کنول کے ساتھ تسلی تشفی کی چند باتیں کیں۔ اس کے بعد اُنہوں نے فون بند کر دیا۔

اسد کا مزاج اب ایک پلے بولائے کا سا ہو گیا تھا۔ پھر بھی کنول کی حالت زار پر

اُسے دُکھ ہوا۔ اُسے اشفاق کی طرف جانا تھا، وہ پروگرام بھی اُس نے ملتوی کر دیا اور بیٹھا سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا۔ سگریٹ نوشی کی عادت اُسے بینک کی ٹیم میں آنے کے بعد پڑی تھی۔ جب تک وہ قدیر صاحب کے پاس تھا سگریٹ اور پان وغیرہ کے قریب بھی نہیں پھٹکا تھا...... وہ بیٹھا کنول کے بارے میں سوچتا رہا۔ اُس کی کربناک سسکیاں اُس کے کانوں میں گونجتی رہیں۔ پھر سوچتے سوچتے اُس کا دھیان زاہدہ عرف گڑیا کی طرف چلا گیا۔ وہ بھی تو اسد کی وجہ سے ایسے ہی حالات کا شکار ہوئی تھی اور باپ کے ڈر سے ننھیال میں چھپی بیٹھی تھی۔ اپنے باپ رنگی کی مار کھا کر وہ بھی ایسے ہی سسک سسک کر روئی ہو گی۔ ایک دم اسد کو اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ وہ ایسا کیوں کرتا تھا؟ کیوں اُسے فریق ثانی کے دُکھ اور تکلیف کا احساس نہیں ہوتا تھا؟ شمیم تو خیر تھی ہی اس قابل...... مگر فریحہ، زاہدہ اور کنول کا کیا قصور تھا؟ وہ کیوں اُنہیں بیچ منجدھار کے کھینچ کر لایا اور پھر منجدھار میں چھوڑ کر ایک طرف ہو گیا تھا۔ وہ کھیل کے میدان میں تو ہیرو کے طور پر اُبھر رہا تھا مگر عام زندگی میں اس کے برعکس جا رہا تھا...... وہ بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ کمرے کی کھڑکیوں سے باہر سردیوں کے موسم کی تیز ہوا شب کی تیرگی سے اُلجھ کر شیشوں اور کواڑوں سے سر ٹکراتی رہی...... ایک دم اسد کی جسمانی و ذہنی کیفیت میں وہی تبدیلی رُونما ہوئی جو ایک خاص موقعے کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ وہی ماورائی تجربہ جو اسد اب تک درجنوں مرتبہ کر چکا تھا...... صدا اور ساعت کا وہی انجانا رشتہ جو اکثر طوفانی رات کے بطن سے جنم لیتا تھا اور اسد کے دل و دماغ پر گہرے اثرات چھوڑتا تھا۔

جانی پہچانی آواز اسد کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''جانتا ہوں کیا سوچ رہے ہو...... جو سوچ رہے ہو غلط سوچ رہے ہو۔ تم قصور وار نہیں ہو۔ قصور وار عورت ہے۔ یہ عورت روزِ ازل سے مرد کو دھوکہ دیتی رہی ہے۔ یہ ایک ایسی ٹیڑھی ہستی ہے جو خود اپنے بارے میں بھی نہیں جانتی کہ وہ کیا شے ہے۔ اگر عورت خود نہ چاہے تو مرد اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ یہ عورت ہی ہے جو پہلے بہکاتی ہے، پھر گناہ گار ٹھہراتی ہے۔ عورت کے آنسو اس کا سب سے بڑا ہتھیار ہیں۔ ان آنسوؤں پر نہ جانا۔ اپنے دماغ میں کوئی پچھتاوا مت لانا...... اور نہ کسی عورت کا غم دل سے لگانا۔ یہ ہستی اس قابل نہیں کہ اس کے غم کو دل کا روگ بنایا جائے...... تم نے کسی سے کوئی زبردستی تو نہیں کی۔ جو تمہارے

پاس آتی ہے، اپنی مرضی سے آتی ہے۔ جب مرضی ہوتی ہے چلی جاتی ہے۔ وہ اس کو کھیل سمجھتی ہے تو تم بھی کھیل سمجھو۔ تم اچھے کھلاڑی ہو اور اچھے کھلاڑی پیچھے نہیں، آگے دیکھتے ہیں۔"

کمرے میں سگریٹ کا دُھواں بھرا تھا۔ اس میں عام سگریٹوں کا دُھواں تھا اور ایک دو خاص سگریٹوں کا بھی۔ یہ خاص سگریٹ وہی تھے جنھیں سینئر لڑکے "گرل فرینڈ سگریٹ" کہتے تھے۔ کسی حسین گرل فرینڈ کی طرح یہ سگریٹ بھی نشے اور سرور سے لبریز ہوتے تھے۔ ان میں تھوڑی سی چرس شامل کی جاتی تھی۔ اسد کا ذہن بھاری ہو رہا تھا۔ ایک عجیب سی خواب ناک کیفیت طاری تھی اُس پر۔ آواز کی بازگشت ابھی تک اُس کے کانوں میں تھی۔ اُس نے اپنے اندر حوصلہ جمع کیا اور آواز کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"تم کون ہو؟ مجھے بتاتے کیوں نہیں ہو، کون ہو تم؟ اگر میں تمہاری آواز سن سکتا ہوں، تو تم بھی میری آواز سن سکتے ہو۔ مجھے جواب دے سکتے ہو۔ مجھے جواب کیوں نہیں دیتے تم؟ مجھے جواب کیوں نہیں دیتے......؟"

جواب میں خاموشی طاری رہی۔ لیکن ذہن میں جو کیفیت موجود تھی وہ اسد کو بتا رہی تھی کہ آواز اُس کے آس پاس ہی کہیں موجود ہے۔ اسد نے ایک بار پھر ذرا بلند آواز میں کہا۔ "تم جو کوئی بھی ہو، میں تمہاری عزت کرتا ہوں، دل سے تمہاری اور تمہاری باتوں کی قدر کرتا ہوں۔ مگر تم میرے قریب ہو کر بھی مجھ سے دُور کیوں ہو؟ کیوں میرا دماغ خراب کر رہے ہو تم؟"

ایک دم اسد کے جسم کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ اُسے یوں لگا کہ پورے جسم میں تیز سنسناتی ہوئی لہر دوڑ گئی ہے...... آواز نے اُسے جواب دیا تھا۔ اور یہ پہلی بار ہوا تھا۔ بارعب لہجہ اُس کی سماعت میں گونجا۔

"سوال نہ کرو تو اچھا ہے..... سوال تمہیں مشکلات میں مبتلا کریں گے۔ سننا تمہارے لئے اچھا ہے۔"

اسد نے اپنے اندرونی لرزے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "مجھے بتاؤ تم کون ہو؟ کیا تمہارا تعلق میرے ماضی سے ہے؟ کہیں تم...... کہیں تم......"

اچانک اسد خاموش ہو گیا۔ ایکا ایکی وہ کیفیت ختم ہو گئی تھی جو اسد کو احساس دلاتی

تھی کہ غیر مرئی آواز اُس کے قریب موجود ہے۔ وہ چلا گیا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا چلا گیا تھا۔ کھڑکیوں سے باہر دیوانی ہوا اسی طرح سر پٹخ رہی تھی۔ اسد نے محسوس کیا کہ وہ بستر پر موجود نہیں، کمرے کے وسط میں کھڑا ہے اور اُس کا سارا جسم پسینے سے بھیگا ہوا ہے...... سلگتی ہوئی "گرل فرینڈ" اُس کی اُنگلیوں میں ہی بجھ گئی تھی اور اُسے ایک اُنگلی کی پشت پر جلن کا احساس ہو رہا تھا۔

وہ کون ہے؟...... وہ کون ہے؟...... اسد رات بھر سوچتا رہا۔ اُس کا کمرہ سگریٹ کے دُھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ اُس کا سر چکرا رہا تھا اور تصور میں ڈیرے کے کہنہ سال در و دیوار گھوم رہے تھے...... یہی در و دیوار تھے جہاں اُس نے زندگی میں پہلی بار یہ پراسرار آواز سنی تھی...... پچھلے دنوں ڈیرے میں جو واقعات پیش آئے تھے اُن کی فلم بھی اسد کے ذہن میں چل رہی تھی۔ رنگی کی طویل روئیداد...... نذیر احمد کے متجسس سوالات، اسٹور رُوم کے ایک پوشیدہ خانے سے مورتیوں کی برآمدگی، حویلی کی پیشانی پر لکھا ہوا سنسکرت کا قدیم شعر...... اسد ایک ایک بات کی کڑیاں ملانے لگا...... وہ سوچتا رہا اور کڑیاں جوڑتا رہا۔ اُس کے دل کے اندر کہیں بہت گہرائی سے ایک صدا اُبھرتی رہی۔ یہ صدا جیسے اسد سے ایک سوال کرتی رہی۔ "اسد! تم جو آواز سنا کرتے ہو، کہیں وہ بھائیا جی کی آواز تو نہیں؟...... تمہارا وہی جد امجد جس کی درد بھری کہانی ڈیرے کے قدیم در و دیوار میں بکھری ہوئی ہے......؟"

OOO

دن گزرتے رہے۔ جانی بھائی کے پاس آ کر اسد کے رہن سہن میں نمایاں تبدیلیاں واقع ہوئی تھیں۔ اُس کے پاس نئے ماڈل کی موٹر سائیکل تھی۔ وہ اچھا لباس پہنتا تھا، اچھے رہائشی علاقے میں رہتا تھا۔ اُس کے ملنے جلنے والے بھی سب کے سب امیر خاندانوں کے لڑکے تھے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ قدیر صاحب کو چھوڑ کر اسد لوئر کلاس سے اپر کلاس میں آ گیا تھا...... اب اُس کا حلیہ اور سٹائل دیکھ کر کوئی اُسے پینڈو کہنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ جب وہ لوگ بینک کی طرف سے دیگر شہروں کے دورے پر جاتے تھے تو اُنہیں قیام و طعام اور سواری کی بہترین سہولتیں حاصل ہوتی تھیں۔ وہ اچھے ہوٹلوں میں ٹھہرتے تھے اور بہترین تفریحات سے مستفید ہوتے تھے۔ اب اسد کو اُمید پیدا ہو چلی تھی کہ وہ بہت جلد کسی بیرونی دورے پر بھی جا سکے گا۔ چچا شوکت اور دیگر اہل خانہ اُس کی ترقی پر بہت خوش تھے۔ اہل خانہ میں سے کوئی نہ کوئی اکثر اُس کے پاس آتا رہتا تھا۔ ہاں وہ خود بہت کم شاد پور جاتا تھا۔ شاد پور نہ جانے کی کئی ایک وجوہات تھیں مگر سب سے اہم وجہ شمیم ہی تھی۔ نجانے کیوں اُس پتھر کو دیکھ کر اسد خود بھی پتھر ہونے لگتا تھا۔ اُسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اُس کا سراپا ایک ضد کے زہر سے زہریلا ہو جاتا تھا اور اُسے لگتا تھا کہ وہ شمیم کے ساتھ کچھ کر بیٹھے گا۔

لاہور میں اسد کی مصروفیات بڑی دلچسپ تھیں۔ کھیل، اچھا کھانا، اچھی تفریح، اچھے چہرے۔ اور کبھی کبھی ہمراز دوستوں کے ساتھ مل کر ''گرل فرینڈ'' کے پُر لطف کش...... اُس کی اس عادت کا پتہ معدودے چند دوستوں ہی کو تھا۔

لڑکیوں کے حوالے سے اسد کی نفسیات عجیب تھی۔ کنول کے بعد بھی وہ اس میدان میں مسلسل ''وکٹیں اُڑاتا'' رہا تھا۔ مزید چار پانچ لڑکیاں اُس کی تنہائیوں کو چمکا چکی تھیں۔ کھیل کے میدان میں اور میدان سے باہر اُس کی پُرکشش شخصیت صنفِ مخالف کو

مقناطیس کی طرح اُس کی طرف کھینچتی تھی۔ کرکٹ کے کھیل میں فاسٹ فاؤلنگ کا شعبہ خصوصی دلکشی کا حامل ہوتا ہے۔ فاسٹ باؤلر ون ڈے اور ٹیسٹ میچ کا اہم ترین کردار ہوتا ہے۔ اگر فاسٹ باؤلر لمبا تڑنگا اور خوبرو بھی ہو تو یہ سونے پر سہاگے والی بات ہے۔ اسد میں یہ ساری خصوصیات موجود تھیں۔ اب وہ باتیں بھی اچھی کرنے لگا تھا۔ لڑکیاں بہت جلد اُس کے دائرۂ کشش میں آ جاتی تھیں۔

اسد کا طریقہ کار یہ تھا کہ پہلے لڑکی کو میل ملاقات کے ذریعے یا فون وغیرہ کی مدد سے اپنی ''عادت'' ڈالتا تھا۔ جب وہ ایک خاص حد تک اُس کی عادی ہو جاتی تھی تو پھر اسد کی نفسیاتی اُلجھن متحرک ہو جاتی تھی۔ وہ لڑکی کو اسی آزمائش میں ڈالتا تھا جس میں اپنی پہلی محبوباؤں کو ڈالتا رہا تھا۔ وہ لڑکی کو مجبور کرتا تھا کہ وہ اُس کے پاس آئے اور اُسے تنہائی میں ملے۔

ایک طرح سے اسد اس طریقے سے لڑکی کے جذبات کی شدت کو ناپتا تھا...... اکثر لڑکیاں ایسے موقعے پر تذبذب کا شکار ہو جاتی تھیں۔ وہ ایک دوراہے پر آ کھڑی ہوتی تھیں۔ ایک طرف وہ اسد کی قربت کا موقع کھونا نہیں چاہتی تھیں، دوسری طرف اسد کی فرمائش پوری کرنا بھی اُن کے لئے ایک نہایت کٹھن مرحلہ ہوتا تھا۔ وہ اسد کو دیگر طریقوں سے رِجھانے اور منانے کی کوشش کرتی تھیں لیکن اسد کا رویہ اٹل ہوتا تھا۔ جس طرح کرکٹ کے کھیل میں باؤلنگ کراتے ہوئے وہ اپنے مخالف کھلاڑی کے منفی پوائنٹس کو نظر میں رکھتا تھا اسی طرح رومانس کے میدان میں بھی اُس کی نگاہ صنفِ نازک کی کمزوریوں پر رہتی تھی اور وہ ان کمزوریوں سے فائدہ اُٹھاتا تھا۔ اب تک صرف دو لڑکیاں ایسی تھیں جنھوں نے اسد کی فرمائش پوری نہیں کی تھی۔ ورنہ ہر لڑکی کو اُس کی اٹل ضد کے سامنے ہار ماننی پڑی تھی۔

لڑکی جب چل کر اُس کے پاس آتی تھی، فتح مندی کا ایک عجیب سا احساس اسد کے رگ وپے میں بھر جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ شمیم کا خیال اسد کے دل میں آتا تھا اور اُس کی سوچ غائبانہ اُسے پکارتی تھی۔ ''دیکھ لے شمیم! یہ لڑکی جو آج کچے دھاگے سے بندھ کر میرے پاس آئی ہے تجھ سے کم نہیں ہے، بلکہ تجھ سے بہتر ہے۔ تجھ سے زیادہ خوبصورت، زیادہ پڑھی لکھی اور باحیثیت ہے۔ تو نے مجھے ٹھکرایا تھا۔ ایک چھوٹی سی خواہش

کی سزا میں دن رات مجھے تڑپایا تھا۔ اب تو اپنے اس انکار کو ضد بنا کر بیٹھی ہوئی ہے۔ ٹھیک ہے اگر تو ضدی ہے تو میں تجھ سے بڑا ضدی ہوں۔ میرے دل پر جو کچھ بھی بیتتی رہے لیکن اب کبھی تیرا نام میرے لب پر نہیں آئے گا۔ میں کبھی تجھے پکاروں گا نہیں......''

اسد کا مزاج عجیب سا ہو چکا تھا۔ ایک خاص قسم کا ہرجائی پن اُس کے رویئے میں شامل ہو چکا تھا۔ وہ نئی محبوبہ کی طرف بڑے جوش وخروش سے متوجہ ہوتا تھا۔ چند دنوں یا ہفتوں کے لئے اُس لڑکی کے سوا اُسے کچھ سوجھتا نہیں تھا۔ وہ اتنا تیز رفتار تھا کہ اپنی پارٹنر کو زیادہ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیتا تھا، بس اپنے جذبات کے ریلے میں اُسے بہائے چلا جاتا تھا۔ اپنی ''حدود'' کے اندر رہتے ہوئے وہ اُس کے قریب تر چلا جاتا تھا، اُسے دریافت کرتا تھا، اُس سے کھیلتا تھا، اُسے کھلاتا تھا۔ لیکن پھر ایک دم...... آناً فاناً اُس کے جذبات کا تند ریلا اچانک سوکھ جاتا تھا۔ وہ بڑی لاپرواہی بلکہ سنگدلی سے اپنا راستہ بدل لیتا تھا...... اور جب ایک بار راستہ بدلتا تھا تو پھر مڑ کر نہیں دیکھتا تھا۔ لاہور کی حسین فضاؤں میں کھیلے جانے والے اس سارے کھیل کے اندر صرف ایک لڑکی ایسی تھی، جس کو چھوڑنے کے بعد بھی وہ اکثر اُس کے بارے میں سوچتا تھا...... وہ فریحہ تھی۔

فریحہ وہ پہلی لڑکی تھی جس نے اسد کو صنفِ نازک کی قربت سے آشنا کیا تھا۔ فریحہ ہی کی وساطت سے اسد نے پہلی بار لب و رُخسار کا ذائقہ چکھا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اُسے مکمل طور پر فراموش نہیں کر سکا تھا۔ جن دنوں شادی شدہ کنول کے ساتھ اسد کا فلرٹ چل رہا تھا، فریحہ کے ساتھ اتفاقاً دوبارہ اُس کی ملاقات ہوگئی تھی۔ یہ تعلق ابھی تک قائم تھا۔ گاہے گاہے فون پر یا آمنے سامنے فریحہ سے اُس کی بات ہو جاتی تھی......

ایک دن شام کو اسد کی نیٹ پریکٹس نہیں تھی۔ وہ گھر ہی میں پڑا اینٹھ رہا تھا۔ اچانک مین گیٹ کے پاس گاڑی کے دروازے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ اسد کو شک ہوا کہ یہ فریحہ ہوگی۔ فریحہ کو اُس کے ڈیڈی نے ایک چھوٹی سوزوکی کار لے دی تھی۔ ڈرائیونگ لائسنس بھی بنوا دیا تھا۔ فریحہ کا بھائی تو کوئی تھا نہیں۔ صرف بہنیں ہی بہنیں تھیں۔ فریحہ نے بی سی ایس کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ اب اُس کے پاس کافی فارغ وقت ہوتا تھا۔ وہ بہنوں کو سکول لے جانے اور لانے کا شغل اختیار کئے ہوئے تھی۔ اس کے علاوہ بھی مختلف ضروریات کے تحت وہ گاڑی نکالتی رہتی تھی۔ چند لمحوں بعد کال بیل کی آواز

آئی۔ اسد دروازے پر پہنچا تو اُس کا اندازہ درست نکلا۔ وہاں فریحہ ہی تھی۔ سفید پھولوں والے سرخ سوٹ میں وہ ایک دم شعلہ نظر آ رہی تھی۔

وہ مسکراتی ہوئی اندر آ گئی۔ اس سے پہلے بھی وہ ایک دو بار کسی کے ساتھ یا اکیلی اُس کے فلیٹ پر آ چکی تھی۔ یہ فیشن ایبل علاقہ تھا۔ یہاں اس قسم کی سرگرمیوں پر آس پاس کے لوگ کوئی خاص توجہ نہیں دیتے تھے۔ ویسے بھی اب اسد اور فریحہ کے درمیان کسی طرح کا رومانی تعلق نہیں تھا۔ وہ بس اچھے دوستوں کی طرح ملتے تھے۔ اسد نے خود اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر فریحہ کو پلائی۔ دونوں باتیں کرتے رہے۔

فریحہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''فلمی دنیا میں وحید مراد کو ''لیڈی کلر'' کہا جاتا تھا...... لگتا ہے کہ اب اُس کی جگہ تم نے سنبھال لی ہے۔''

''کیوں کیوں...... کیا ہوا؟''

وہ شوخی سے مسکرائی۔ ''کوئی ایک افسانہ ہو تو بات ہے۔ یہ تو افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اور ایک سے بڑھ کر ایک دردناک افسانہ۔''

''دردناک؟ میں سمجھا نہیں۔''

''دردناک تمہارے حوالے سے نہیں، دوسروں کے حوالے سے۔''

''دوسرے کون......؟'' اسد نے پوچھا۔

''کئی ایک ہیں...... مثلاً کنول ہی کو لے لیں۔ میں پچھلے اتوار اُس کے گھر گئی تھی۔ گھر کو تالا پڑا ہوا تھا۔ پتہ چلا ہے کہ میاں بیوی میں بہت جھگڑا ہوا ہے۔ سکندر ناراض ہو کر واپس انگلینڈ چلا گیا ہے۔ کنول بھی سیخ پا ہے۔ وہ گھر کو تالا لگوا کر میکے جا بیٹھی ہے۔ اگر حالات یونہی رہے تو کوئی پتہ نہیں Divorce تک نوبت پہنچ جائے۔''

''لل...... لیکن یہ سب تم مجھے کیوں سنا رہی ہو؟ کیا تمہارا خیال ہے کہ اُن کے جھگڑے میں میرا کوئی قصور ہے؟''

وہ گہری نظروں سے اُسے دیکھتی رہی۔ پھر بات بدلنے والے انداز میں بولی۔ ''میں یہ کب کہہ رہی ہوں؟ میں تو اس لئے بتا رہی ہوں کہ تمہارا وہاں آنا جانا تھا۔''

اسد نے کہا۔ ''میرا ذاتی اندازہ ہے کہ کنول اپنے شوہر کے کردار سے مطمئن نہیں تھی۔ اُسے شبہ تھا کہ باہر کے ملک جا کر سکندر وہ سب کچھ کرتا ہے جو وہاں کے معاشروں

میں ہوتا ہے۔ جب کہ وہ یہاں چار دیواری میں بند ہو کر اُس کی راہ تکتی رہتی ہے۔''

فریحہ بولی۔ ''اس قسم کی باتیں وہ پہلے تو نہیں کیا کرتی تھی۔ یہی کوئی پانچ چھ ماہ سے اُس کی سوچ میں تھوڑی سی تبدیلی آئی تھی۔''

اسد نے اُسے گھورا۔ ''تم کہنا کیا چاہتی ہو...... کیا میں اُسے ورغلاتا رہا ہوں؟''

''توبہ......توبہ......میں یہ بات کیسے کہہ سکتی ہوں؟'' فریحہ نے جلدی سے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''میں تو یونہی عام سی بات کر رہی تھی۔ میرا اشارہ تمہاری طرف ہرگز نہیں تھا۔''

دونوں چائے کی چسکیاں لینے لگے۔ فریحہ کی آنکھوں میں اب بھی شوخی کروٹیں لے رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بولی۔ ''کم از کم میڈیکل کالج والی لڑکی کے افیئر سے تو تم انکار نہیں کر سکتے۔ اُس کے بارے میں تو تم نے خود بھی تھوڑی سی بریفنگ دی تھی مجھے۔''

اسد نے کہا۔ ''پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ وہ معاملہ تقریباً یکطرفہ تھا۔ وہ لڑکی پیچھے پڑ گئی تھی۔ اس کی وجہ سے میں نے قریباً ایک مہینہ اپنا فون بند رکھا ہے۔''

''وہ تو بعد کی بات ہے۔ پہلے تو تم اُس کا فون سنتے بھی تھے اور اُسے کرتے بھی تھے۔''

''تمہیں کہا ہے نا کہ وہ ہاتھ دھو کر پیچھے پڑی ہوئی تھی۔''

''اب سنا ہے کہ کالج والے ہاتھ دھو کر اُس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اس بات کا بھی خطرہ ہے کہ کہیں بے چاری کالج سے ہی فارغ نہ ہو جائے۔''

''کچھ نہیں ہوگا۔ کالج سے فارغ کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ سب کہنے سننے کی باتیں ہیں۔'' اسد نے بیزاری سے کہا۔

فریحہ نے بے باکی سے اسد کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''ایک طرف تم یہ کہتے ہو کہ یہ یکطرفہ معاملہ تھا، دوسری طرف تم ہوسٹل جا کر اُس سے ملتے بھی رہے ہو۔''

''یہ سب بکواس ہے فریحہ! میں کبھی اُس سے ملنے ہوسٹل نہیں گیا ہوں۔'' اسد نے جھلا کر کہا۔

''گویا یہ یکطرفہ ٹریفک تھی۔''

''بالکل......''

''شاید ایسا ہی ہو۔'' فریحہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''دوطرفہ معاملہ تو تمہاری زندگی میں بس ایک ہی لگتا ہے۔''

''کون سا معاملہ؟''

''وہی پہلی محبت۔'' فریحہ ادا سے بولی۔ ''پہلا پیار...... جو عورت کبھی بھولتی ہے نہ مرد بھولتا ہے۔''

''تم شاید پھر وہی پرانا قصہ چھیڑنے لگی ہو۔'' اسد نے آنکھیں اُلٹ کر کہا۔

''تو تم شمیم کے قصے کو پرانا قصہ کہتے ہو...... اوہ مائی گاڈ۔ اسد! کچھ خدا کا خوف کرو۔ بندے کو کم از کم اپنے آپ سے تو سچ بولنا چاہئے۔''

''میں نے کون سا جھوٹ بکا ہے؟''

''کوشش تو کر رہے ہو...... لیکن تمہاری یہ کوشش کامیاب ہونے والی نہیں۔ میں تمہاری ہر بات مان سکتی ہوں لیکن یہ نہیں مان سکتی کہ شمیم والا قصہ اب پرانا ہو گیا ہے۔ وہ قصہ اب بھی پہلے دن کی طرح نیا ہے۔ تمہارے اندر کہیں گہرائی میں چھپا ہوا ہے۔ وہ قصہ ہی تو ہے جو دوسرے سارے قصوں کو جنم دے رہا ہے۔''

''کیا تم مجھ پر یہ ثابت کرنا چاہ رہی ہو کہ تم بہت بڑی نفسیات دان ہو؟''

''بالکل...... میں نفسیات دان ہوں اور میں نے تم پر پی ایچ ڈی کی ہے۔'' وہ ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ سجا کر بولی۔ ''میں سب جانتی ہوں، تم خوبصورت چہروں کے پیچھے کیوں دوڑتے ہو؟ اور ان چہروں کے بالکل قریب پہنچ کر رُک کیوں جاتے ہو یہ بھی جانتی ہوں۔''

اسد چونک کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے بڑی گہری بات کی تھی...... یہ گہری بات کرنے کے بعد وہ لاپرواہی سے چائے کی چسکیاں لینے لگی تھی۔

کچھ دیر گپ شپ لگانے کے بعد وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اچھا چلتی ہوں...... شاہین کو امتحانی سنٹر سے واپس لینا ہے۔ اگلا پرچہ بدھ کو ہے۔ اگر شاہین کو خود چھوڑنے آئی تو تمہاری طرف بھی چکر لگاؤں گی۔ بدھ کو تو تم اس وقت فارغ ہی ہو گے نا؟''

اسد چونک کر بولا۔ ''تمہیں کیسے پتہ چلا کہ بدھ کو فارغ ہوں گا؟''

''جیسے آج پتہ چلا کہ تم فارغ ہو۔'' وہ چنچل انداز میں بولی۔ پھر بیگ شولڈر پر لٹکاتے ہوئے کہنے لگی۔ ''جناب! آپ کی پل پل کی خبر رکھتے ہیں ہم۔ ہمیں پتہ ہے کہ ہر منگل کو آپ کا میچ ہوتا ہے اور میچ سے اگلے روز آپ کی نیٹ پریکٹس کی چھٹی ہوتی ہے۔''

"تم تو بی بی سی کے بھی کان کاٹنے لگی ہو۔" اسد نے کہا۔

"شکریہ....." وہ مسکرائی اور خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔

فلیٹ کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے اُس کی خوبصورت آنکھوں میں ایک عجیب سی تپش تھی۔ یہ آتش نما تپش اسد نے نہیں دیکھی تھی، ورنہ وہ ضرور چونکتا۔

O

کرکٹ میں اسد کی کارکردگی مناسب ہی جا رہی تھی۔ صرف اتنا ہوا تھا کہ گرمی کی وجہ سے اُسے کچھ دن شدید بخار رہا تھا۔ بعد میں نزلہ سر اور چھاتی میں جم گیا تھا جس کی وجہ سے کھانسی اور سر درد کی شکایت رہی۔ آٹھ دس روز وہ کھیل سے دُور رہا۔ فاسٹ باؤلر کے لئے جسمانی فٹ نس اور روزانہ پریکٹس عام کرکٹر سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس روٹین میں تھوڑا سا بھی فرق آ جائے تو "ردھم" ٹوٹ جاتا ہے اور آسان ٹارگٹ مشکل لگنے لگتے ہیں۔

کرکٹ کے حوالے سے اسد کو آج کل ایک پریشانی اور بھی لاحق تھی۔ ٹیم کے دوسرے کھلاڑیوں کا تو پتہ نہیں تھا مگر اسد کے لئے یہ ایک بہت بڑی پریشانی تھی۔ پچھلے تین مہینوں میں کم از کم چار میچ ایسے ہوئے تھے جن میں اسد کو اندازہ ہوا تھا کہ اُن کی ٹیم جان بوجھ کر ہاری ہے۔ ایک تین روزہ میچ میں اسد اپنے ایک کولیگ کے ساتھ مل کر بڑی شاندار بیٹنگ کر رہا تھا۔ مگر کپتان نے بالکل غیر متوقع طور پر اننگ ڈکلیئر کر دی۔ یہ ایک نہایت غلط فیصلہ تھا۔ مخالف ٹیم ایک کارپوریشن کی تھی۔ اُنہوں نے بینک کی ٹیم کو بڑے مارجن سے ہرا دیا۔ ایک اہم ون ڈے میچ میں اسد کو اٹیک باؤلنگ نہیں دی گئی۔ کپتان اور کوچ نے بہانہ بنایا کہ وکٹ بالکل بے جان ہے اور سیم باؤلر کے لئے مناسب نہیں۔ اسد سے پندرہ اوورز کے بعد باؤلنگ کرائی گئی۔ اُس وقت تک میچ کا پانسہ مخالف ٹیم کے حق میں پلٹ چکا تھا۔ اسی طرح ایک میچ میں اسد کو ٹیم سے باہر رکھا گیا اور چند دن بعد ایک دوسرے کانٹے دار مقابلے میں اسد سے صرف چار اوورز کرانے کے بعد اسپنرز کو لگا دیا گیا۔ یہ میچ بھی بینک کی ٹیم ہار گئی۔ اسد بچہ نہیں تھا، کرکٹ اُس کی ہر رگ میں رچ بس چکی تھی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ بینک کی اے اور بی ٹیمیں کئی میچ جان بوجھ کر ہار رہی تھیں۔ اور یہ کام جانی بھائی کی بے خبری میں نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اس ساری

صورت حال کے بارے میں اچھی طرح جانتے تھے۔

کرکٹ میں جوئے کی لعنت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ اسد ایسے بہت سے کھلاڑیوں کے متعلق جانتا تھا جو پیسے کما کر اپنی ہی ٹیم کے خلاف لڑتے تھے..... لیکن اسد کو جانی بھائی سے کم از کم ایسی توقع نہیں تھی۔ ایک دن اسدؔ سے نہیں رہا گیا۔ اُس نے جانی بھائی کے گھر جا کر اُن سے ملاقات کی۔ وہ اپنے بہت بڑے ڈرائنگ رُوم میں موجود تھے۔ اور اسٹیٹس میں کسی سے فون پر لمبی بات کر رہے تھے۔ اُن کی بات ختم ہوئی تو اسد نے محتاط الفاظ میں اپنی شکایتیں بیان کیں۔

جانی بھائی نے سب کچھ تحمل سے سنا۔ پھر مسکراتے ہوئے کہا۔ "دیکھو بیٹا جی! یہ کرکٹ کی سیاست بہت گہری ہے۔ یہاں جو جیتا ہوا نظر آتا ہے وہ اکثر ہارا ہوا ہوتا ہے..... یہاں کے داؤ پیچ آہستہ آہستہ تمہاری سمجھ میں آئیں گے۔ ایک بات یاد رکھو، چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف توجہ دینے کی بجائے آخری اور حتمی رزلٹ کی طرف دھیان رکھو۔ اور آخری و حتمی رزلٹ یہ ہے کہ بینک کی ٹیم کا نام کرکٹ کے کھیل میں نمایاں ہو رہا ہے اور ہم سب بڑے پُر آسائش ماحول میں کرکٹ کو انجوائے کر رہے ہیں۔ کر رہے ہیں یا نہیں؟"

اسد نے بڑی مشکل سے اثبات میں سر ہلایا۔

جانی بھائی نے اُسے چھوٹا سا لیکچر پلایا۔ اس لیکچر میں ڈھکے چھپے الفاظ میں اسد سے کہا گیا کہ وہ زیادہ باریکی میں جانے کی بجائے اپنے کام سے کام رکھے..... جانی بھائی نے اسد کو یہ خوشخبری بھی سنائی کہ ٹیم کے تین ممبران کو بینک پرموشن دے رہا ہے اور ان میں اسد بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ مستقبل قریب میں اسد کو ملنے والی ایک دو مزید سہولتوں کی طرف بھی جانی بھائی نے اشارہ کیا۔

جانی بھائی کے سامنے تو اسد خاموش ہی رہا لیکن فلیٹ میں واپس آ کر بہت دیر تک اپنے اندر ہی اندر کھولتا رہا۔ وہ کسی بھوکی ننگی فیملی سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ اُس کے والد زمیندار تھے۔ چچا کا ٹھیک ٹھاک کاروبار تھا۔ اپنے قصبے شاد پور میں بھی اُس کے لئے سب کچھ موجود تھا۔ وہ کرکٹ کے جنون میں لاہور پہنچا تھا۔ عام زندگی میں وہ جو کچھ بھی تھا مگر کرکٹ سے سچی محبت رکھتا تھا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے جانی بھائی کرکٹ سے

بے وفائی کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے کھلاڑیوں کو بھی بے وفائی پر مائل کر رہے ہیں۔

پریشانی کے عالم میں اسد اکثر خاص سگریٹ یعنی ''گرل فرینڈ'' کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ اُس نے اپنے بیڈ کے گدے کے نیچے سے ایک ''گرل فرینڈ'' نکالی، اُسے سلگایا اور لمبے لمبے کش لینے لگا۔ جلد ہی کمرہ دُھوئیں سے بھر گیا۔ ایسے دُھواں دُھواں کمرے میں اُسے اپنی پریشانیاں تحلیل ہوتی محسوس ہونے لگتی تھیں۔ اسی اثنا میں یاروں کی ایک ٹولی بھی فلیٹ پر آ دھمکی۔ ان میں ٹیم کا نائب کپتان عدنان پاشا بھی تھا۔ یہ پاشا ہی تھا جس نے شروع شروع میں اسد کو سگریٹ نوشی کی طرف مائل کیا تھا اور پھر چرس بھری ''گرل فرینڈ'' شروع کرادی تھی۔

پاشا نے آتے ساتھ ہی خبر سنائی۔ ''کچھ پتہ ہے اسدی! تمہارا وہ پرانا یار بھی چاچائے کرکٹ (قدیر صاحب) کو چھوڑ کر اپنی ٹیم میں آ رہا ہے۔''

''کون؟'' اسد نے چونک کر پوچھا۔

''وہی سجاد...... تیرا پرانا مہربان۔''

''تمہیں کیسے پتہ چلا؟''

''آج ہی فون پر اے ون کے کپتان سے بات ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا اے ون کی حالت اب گڑبڑ ہے۔ سمجھو کہ آئی سی یو میں ہے اور آکسیجن لگی ہوئی ہے۔ بچ بھی گیا تو پہلے کی طرح ہٹا کٹا نہیں ہو سکے گا۔''

ایک دوسرے لڑکے نے کہا۔ ''ہاں بھئی...... ڈوبتے ہوئے جہاز سے چوہے تو بھاگتے ہی ہیں۔''

اسد کو یہ بات بری لگی لیکن اپنی عادت کے مطابق اُس نے خود پر ضبط کیا اور خاموش رہا۔ ایک لڑکے ندیم نے کہا۔ ''ویسے معاف کرنا یار! حالت اپنی ٹیم کی بھی کچھ اتنی اچھی نہیں ہے۔ اور سچ پوچھو تو ہم سب کی کارکردگی پر بھی اثر پڑ رہا ہے۔''

''اوئے تو اپنی بات کر...... ہم سب کو بیچ میں شامل نہ کر۔ رات رات بھر پڑوسیوں کی لڑکی کو باؤلنگ کراتا رہے گا تو صبح نیٹ پریکٹس کے وقت پٹھا تو چڑھے گا تیرا۔''

''اور باقی سب تو جیسے مولوی ہیں۔'' ندیم نے چڑ کر کہا۔

''مولوی نہیں ملنگ ہیں...... دم مارو دم۔'' پاشا نے مزاحیہ انداز میں کہا اور گرل فرینڈ کو مٹھی میں دبا کر ایک زوردار کش لیا۔

ندیم اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''تو ٹھیک ہے...... تم سب یہاں دھونی رماؤ۔ چند دن بعد جانی بھائی کو بھی یہاں بلا لینا چمٹا بجانے کے لئے۔''

فلیٹ میں اس قسم کی محفلیں دن بدن زور پکڑتی جا رہی تھیں۔ کسی وقت تو اسد کو اُلجھن سی ہونے لگتی تھی۔ اُسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ اور اُس کا کھیل دن بدن زوال پذیر ہیں۔ جو ڈسپلن، جو پاکیزگی اور سنجیدگی قدیر صاحب کے ہاں تھی وہ یہاں مفقود نظر آتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ بینک کی ٹیم کا اصل مقصد کرکٹ نہیں، روپیہ اور آسائش و آرام ہے۔ اور اگر آسائش و آرام کی یہ منزل کرکٹ کھیلے بغیر بھی مل جاتی ہے تو اس میں کیا قباحت ہے؟

...... وہ اپریل کے آخری دن تھے۔ ہوا میں تمازت آ گئی تھی۔ خاص طور سے دوپہر کے وقت گرمی محسوس ہوتی تھی۔ وہ بھی ایک گھٹن زدہ اور گرم دوپہر تھی۔ اسد کھانا بازار سے کھاتا تھا لیکن کبھی کبھی موڈ ہوتا تو وہ خود بھی پکا لیتا۔ اُس روز اُس نے خود ہی اپنے لئے چکن سینڈوچ تیار کئے۔ گرمی کی وجہ سے اُس نے صرف بنیان اور نیکر پہن رکھی تھی۔ سہ پہر دو ڈھائی بجے کے وقت اچانک بادل گھر کر آئے اور دن میں ہی رات کا سماں ہو گیا۔ پہلے تیز ہوا چلی، پھر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ کافی تیز بارش تھی۔ مسلسل برس رہی تھی۔ پھر بھی تاریکی چھٹ رہی تھی نہ پانی کا زور کم ہو رہا تھا۔ ایسے موسم میں نیٹ پریکٹس کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا...... بلکہ آنے والے چند دنوں میں بھی کرکٹ کی سرگرمیاں منقطع رہنی تھیں۔ موسم کا لطف لینے کے لئے اسد نے بنیان بھی اُتار دی اور مختصر صحن میں نہانے لگا۔ اچانک بیرونی دروازے پر کسی نے دستک دی۔ اسد بھیگتا ہوا باہر آیا۔ دروازے پر فریحہ کو دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا۔ وہ بارش میں بری طرح بھیگی ہوئی تھی۔ اُس کے بال، رُخساروں اور گردن سے چپک گئے تھے۔ لان کا ہلکا پھلکا پھولدار سوٹ بھی بھیگ کر پیاز کا چھلکا نظر آنے لگا تھا۔

وہ تیزی سے اندر آتے ہوئے بولی۔ ''گاڑی اگلے سٹاپ پر بند ہو گئی ہے۔ لاک کر کے آ گئی ہوں۔''

''کہاں جا رہی تھیں؟'' اسد نے پوچھا۔

"مارکیٹ...... کالج کی ایک دوست کی سالگرہ ہے۔ اُس نے کبھی منائی نہیں۔ سوچا تھا ایک دم اُسے پہنچ کر سرپرائز دوں گی۔ کوئی گفٹ لینے جا رہی تھی کہ بارش نے سرپرائز دے دیا۔"

برآمدے میں رُک کر فریحہ نے خود کو تھوڑا بہت نچوڑا اور اندر آ گئی۔ اسد کو عرصہ پہلے کا وہی منظر یاد آ گیا تھا جب ایک رات اسی طرح فریحہ بھیگتی ہوئی اُس کے پاس آئی تھی لیکن اُن کی ملاقات رُومان انگیز ثابت ہونے کی بجائے طیش انگیز ثابت ہوئی تھی اور نہایت تلخ و ترش گفتگو کے بعد فریحہ اُسے خدا حافظ کہہ کر واپس لوٹ گئی تھی۔

بارش کے ساتھ تیز ہوا بھی چل رہی تھی۔ فریحہ سردی محسوس کرنے لگی۔ اسد نے اُسے اپنا عوامی سوٹ دیا اور کہا کہ اگر وہ چاہے تو اپنے کپڑے سکھانے کے لئے یہ سوٹ پہن سکتی ہے۔ فریحہ چند لمحے تذبذب میں رہی، پھر اندر جا کر کپڑے تبدیل کر آئی۔ اپنے کپڑے نچوڑ کر اُس نے اوون کے سامنے پھیلا دیئے تھے۔ اسد نے اُس کے لئے چائے بنائی۔ دو چکن سینڈوچ فریج میں موجود تھے، وہ بھی گرم کر کے ساتھ رکھ دیئے۔ بادل ایک دم پھر گھر کر آ گئے۔ دن میں ہی رات کا سماں ہو گیا۔ لائٹ تو تیز ہوا کے پہلے جھونکے کے ساتھ ہی رُخصت ہو چکی تھی۔ کمروں میں گہری تاریکی محسوس ہو رہی تھی...... کہتے ہیں کہ تاریکی اور گناہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مرد اور عورت کی تنہائی ہی کچھ کم تشویش ناک نہیں ہوتی۔ اس پر تیرگی بھی تعاون پر آمادہ ہو جائے تو چٹانیں بھی اپنی جگہ سے ہل جاتی ہیں۔

فریحہ کی آنکھوں میں آج اسد کو ایک عجیب رنگ نظر آ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے تک خنکی محسوس کر رہی تھی مگر اب اُس کے رُخسار حدت سے تپ رہے تھے اور شاید سارا بدن ہی اس کیفیت میں تھا۔ وہ ایک دم ہی جیسے کسی تیز نشے کے اثر میں نظر آنے لگی تھی۔ اُس کی آنکھیں اجنبی ہو گئی تھیں اور حرکات و سکنات بھی بیگانی سی لگ رہی تھیں...... وہ اُٹھ کر کچن میں اپنے کپڑے دیکھنے گئی۔ واپس آئی تو سامنے سے نہیں، عقب سے آئی۔ اسد چائے دانی میں سے کپ میں مزید چائے اُنڈیل رہا تھا۔ ایک دم اُسے اپنی پشت پر نرم گرم لمس کا احساس ہوا۔ فریحہ نے عقب سے اُس کے گلے میں بانہیں ڈال دی تھیں۔ انہیں کیا ڈال دی تھیں اُس پر لدسی گئی تھی۔

اس سے پہلے کہ اسد کچھ کہتا دو تپتے ہوئے ہونٹ اُس کے بالوں سے ٹکرائے اور

پھر رُخسار سے چپک گئے...... فریحہ کی پیش قدمی اتنی اچانک اور تیز تھی کہ اسد کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ایک جوان حسین جسم اُس کی بانہوں میں تھا...... وہ سرتاپا شعلہ تھی...... شعلے کی خوشبو نہیں ہوتی لیکن اس شعلے کی خوشبو ہوش اُڑا رہی تھی...... اسد بکھرنے لگا...... جذبات کے تند ریلے میں فریحہ کے ساتھ بہنے لگا...... باہر بادل گرج رہے تھے اور اندر جسموں میں برق دوڑ رہی تھی......

فریحہ آج نجانے کیسا تہیہ کر کے آئی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک ہیجانی سی چمک تھی۔ آج وہ اسد کی مزاحمت کی ہر دیوار گرا دینا چاہتی تھی۔ اُس کے حسن و شباب کی پے درپے یورش سے اسد کے قدم ڈگمگانے لگے...... ایک دو موقعوں پر تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک تند ریلے میں بہہ جائے گا...... لیکن پھر اُس نے خود کو سنبھالا، شمیم کی شبیہ اُس نے اپنے پردۂ تصور پر STILL کر دی۔ وہ ہر طرف سے دھیان ہٹا کر شمیم کو سوچنے لگا۔ اگر آج وہ آخری حدیں بھی پار کر گیا تو پھر شمیم کی انا سے ٹکرانے کے لئے اُس کے پاس کون سا ہتھیار باقی رہ جائے گا؟ یہی جوہر تو تھا جس کے بل بوتے پر وہ آج بھی یقین رکھتا تھا کہ کبھی نہ کبھی شمیم کو اپنے سامنے جھکا لے گا...... پھر اُس کے کانوں میں وہ الفاظ گونجنے لگے جو کچھ روز پہلے فریحہ نے کہے تھے۔ فریحہ کا وہ انداز اور لہجہ اسد کو ابھی تک یاد تھا۔ اُس نے کہا تھا۔ "میں جانتی ہوں...... تم خوبصورت چہروں کے پیچھے کیوں دوڑتے ہو؟ اُن چہروں کے بالکل قریب پہنچ کر رُک کیوں جاتے ہو یہ بھی جانتی ہوں۔" فریحہ نے بڑی گہری بات کی تھی۔ اُس نے اسد کے اس جذبۂ مزاحمت کی بات کی تھی جس نے اسد کو عورت کے قریب ہوتے ہوئے بھی آج تک عورت سے دُور رکھا تھا۔ آج وہ غالباً اسی جذبۂ مزاحمت کو شکست دینے آئی تھی۔ شاید اس طوفانی موسم میں گاڑی کا خراب ہو جانا بھی ایک بہانہ ہی تھا...... وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھی اور آج کے موسم نے اُسے یہ موقع فراہم کر دیا تھا۔ فریحہ کے قرب کے ان ہوشربا لمحات میں بھی اُس کا ذہن تیزی سے سوچنے میں مصروف تھا۔ عورت کو پہیلی کہا جاتا ہے۔ فریحہ آج ایک پہیلی بن کر ہی سامنے آئی تھی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اُس کی یہ قربت حقیقت میں محبت ہے یا نفرت...... ممکن تھا کہ اُس کے اندر رقابت کے جذبات اتنے قوی ہوں کہ اُن کا اظہار اس اچانک قربت کی صورت میں ہوا

ہو۔ اپنے رقیبانہ جذبات کی تسکین کے لئے اور شمیم پر برتری حاصل کرنے کے لئے وہ اپنا آپ اسد کے حوالے کرنے پر آمادہ ہوگئی ہو...... اسد کی کیفیت اُس شخص کی سی تھی جو شوریدہ سر پانی میں ہاتھ پاؤں چلاتا ہے تاکہ ڈوبنے سے بچ سکے...... یہ ایک جاں گسل عمل تھا...... یہ ایک جگر پاش کوشش تھی۔ یہ کوشش کرتے ہوئے اسد کو جیسے آگ اور برف کے سات سمندروں پر سے گزرنا پڑا...... مگر وہ اس کوشش میں کامیاب ہوا۔ اُس نے فریحہ کو ایک جھٹکے سے خود سے علیحدہ کیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

فریحہ دم بخود سی اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسد نے دروازہ کھول دیا اور کھڑکیاں بھی کھول دیں۔ تازہ سرد ہوا اندر آئی تو جیسے اُڑے ہوئے ہوش ٹھکانے آنے لگے۔

''بارش اب کچھ کم ہوگئی ہے۔ میں چھتری دیکھتا ہوں۔'' اسد نے کہا۔

فریحہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ہونٹ تھرا کر رہ گئی۔ کچھ بھی تھا، آخر وہ لڑکی تھی۔ اسد دیوار گیر الماری میں چھتری ڈھونڈنے لگا۔ اب تاریکی قدرے کم ہوگئی تھی۔ ایک ٹھنڈی سانس لے کر فریحہ بستر سے اُٹھی۔ اُس نے اپنا بے ترتیب لباس درست کیا، منتشر بال جوڑے کی شکل میں باندھے اور اپنے گیلے کپڑوں کا جائزہ لینے کے لئے ایک بار پھر کچن میں چلی گئی۔ اُس کی آنکھوں میں ''شکست فاش'' کی کرچیاں ٹوٹی ہوئی تھیں اور ان کرچیوں کے عقب میں ایک نیلی آگ سی روشن تھی۔ کچھ دیر بعد اسد اور فریحہ ایک بڑی چھتری کے نیچے مین روڈ کی طرف جا رہے تھے۔ اُسی جگہ جہاں فریحہ کی گاڑی خراب ہوئی تھی یا اُس نے خود کی تھی۔ بارش اب بوندا باندی کی شکل اختیار کر گئی تھی۔

○

کل کی تیز بارش کی وجہ سے اگلے دن بھی اسد کو فراغت ہی فراغت تھی۔ کھیل کے میدان ہی نہیں، آدھا لاہور بھی پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ابھی حالات معمول پر آتے چار پانچ دن تو لگنا ہی تھے اور وہ بھی تب اگر مزید بارش نہ ہوتی۔ گھر سے بار بار فون آ رہے تھے کہ ایک بار آ کر مل جاؤ۔ اس کا دل بھی چاہتا تھا۔ چھوٹے بھائی علی کی یاد اُسے شدت سے ستا رہی تھی۔ وہ اب نویں کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ چچا شوکت کی شکل دیکھے بھی دو تین مہینے ہو گئے تھے۔ مگر پھر شمیم کا خیال آتے ہی اُس کا دل ہولنے لگا۔ شمیم کو دیکھ کر، چچا کے صحن کو دیکھ کر اور اپنے گھر کی بدنصیب برساتی کو دیکھ کر اُس کے سارے زخم ہرے ہو

جاتے تھے۔ ساری بھولی بسری ٹیسیں پھر سے اپنی اپنی جگہ سنبھال لیتی تھیں۔

ناشتے کے بعد وہ سو گیا اور سہ پہر تک سویا رہا۔ اُٹھا تو یوں لگا کہ شام ہوگئی ہے۔ مگر صرف تین ہی بجے تھے۔ کھڑکیوں سے پردہ ہٹایا تو ایک بار پھر کل کا سا سماں نظر آیا۔ بادل گھر کر آئے تھے اور ہوا بھی چل رہی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے گرج چمک کے ساتھ مینہ برسنے لگا۔ قریباً یہی وقت تھا، یہی موسم تھا، یہی کمرہ تھا لیکن آج وہ آفت جاں یہاں نہیں تھی۔ اسد کھڑکی کھول کر نیم دراز ہوگیا اور اُس فتنہ پرور کے بارے میں سوچنے لگا۔ کل اُس کے شب خون نے اسد کے اندر کے موسم کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ بڑے جتن سے خود کو سنبھالا تھا اُس نے۔

وہ سوچنے لگا، وہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟ کیا وہ خود کو ایسا کرنے کا حقدار سمجھ رہی ہے؟ کل اُس نے چونکا دینے والی دلیری کا مظاہرہ کیا تھا...... یہ دیدہ دلیری اُس میں کیسے آئی؟ کیا اب وہ ایک مختلف لڑکی بن گئی تھی؟ کیا کوئی اور لڑکا بھی اُس کی زندگی میں موجود تھا؟ ایسے ہی بکھرے بکھرے سوالات تھے جو بار بار اسد کے ذہن میں اُبھر رہے تھے۔

بارش کل کی طرح پھر زور پکڑتی جا رہی تھی۔ تیز ہوا کے ساتھ کھڑکیاں دروازے تھرا رہے تھے۔ اسد کا دل چاہا کہ اس موسم میں کوئی بے تکلف دوست ساتھ ہو۔ اُس نے فون اُٹھایا اور اشفاق کو بلا لیا۔ آج کل اشفاق کے پاس ایک FX سوزوکی موجود تھی۔ وہ اس بارش میں بھی اسد کی فرمائش پوری کر سکتا تھا۔ فون کرنے کے بعد اسد ابھی کچن میں ہی پہنچا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ اُس نے جا کر دروازہ کھولا اور سامنے سجاد کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سجاد کے پیچھے دو لڑکے بھی کھڑے تھے۔

''آ...... آ جاؤ سجاد!'' وہ گڑبڑا کر بولا۔

شاید وہ آنے کی دعوت نہ بھی دیتا تو سجاد اندر آ جاتا۔ دونوں لڑکے بھی اُس کے ساتھ ہی اندر آ گئے۔ اُن کے کیچڑ آلود شوز نے فرش پر گلکاریاں کر دیں۔

''خیریت ہے؟'' اسد نے سجاد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہے بھی...... اور نہیں بھی۔'' وہ خشک لہجے میں بولا۔

''بب...... بیٹھ جاؤ...... بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' اسد نے کہا۔

''بیٹھ جاؤ بھئی......'' سجاد نے تیکھے لہجے میں ساتھیوں سے کہا۔

اُس کے ساتھیوں میں سے ایک تو ''اے ون کلب'' کا وہی افضل تھا، جو ایک مرتبہ اسد کی گیند سے زخمی ہوا تھا اور بعد میں یہ زخم جھگڑے کا سبب بنا تھا...... دوسرا لڑکا اسد کے لئے اجنبی تھا، اُس کے بال لمبے تھے، شیو بڑھی ہوئی تھی اور ایک ابرو پر چوٹ کا نشان تھا۔ وہ بھی بڑی کرخت نظروں سے اسد کو گھور رہا تھا۔ اسد کو انجانے خطرے کی بو محسوس ہونے لگی۔

کمرے کی خاموشی بوجھل ہوتی جا رہی تھی۔ اس خاموشی کو توڑنے کے لئے اسد نے سجاد سے کہا۔''اور سناؤ! کیا حال ہے...... سنا ہے تم بھی ہماری ٹیم میں آ گئے ہو۔''

سجاد نے اسد کے سوال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے سگریٹ کا کش لیا اور بولا۔

''کل فریحہ تمہارے پاس آئی تھی؟''

اسد سناٹے میں رہ گیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔''میں سمجھا نہیں تم یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''میری بات کا جواب دو......'' سجاد غرایا۔''کل فریحہ تمہارے پاس آئی تھی؟''

''ہاں آئی تھی۔ اُس کی گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ وہ مدد لینا چاہتی تھی۔''

''اور تم نے کیا، کیا؟'' افضل نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

''میں نے کیا، کیا ہے؟'' اسد کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''تم نے وہ کیا جو تم کر سکتے تھے۔'' سجاد دانت پیس کر بولا۔''تم نے اُسے کمرے میں بند کیا، اُس کے کپڑے پھاڑے، اُس کی عزت لوٹنے کی کوشش کی۔'' سجاد کے لہجے میں نفرت کے شعلے پھنکار رہے تھے۔

''سجاد! تم ہوش میں تو ہو...... یہ کیسی باتیں کر رہے ہو تم؟''

''یہ وہی باتیں ہیں جو فریحہ نے بتائی ہیں...... حرامزادے...... گندی نسل کے پینڈو. تیری بے غیرتی کے نشان میں خود فریحہ کے چہرے پر دیکھ کر آ رہا ہوں۔''

''دیکھ سجاد...... گالی مت نکالنا ورنہ......''

اس سے پہلے کہ اسد اپنا فقرہ مکمل کرتا، لمبے بالوں والے نے ایک زوردار مکہ اسد کے جبڑے پر مارا۔ اسد اس حملے کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔ لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرایا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، سجاد عقاب کی طرح اُس پر جھپٹا اور کئی مکے اُس کے چہرے اور

پیٹ میں مارے۔ وہ تیورا کر گھٹنوں کے بل گرا تو افضل نے سینے پر ٹانگ رسید کر کے اُسے پشت کے بل فرش پر گرا دیا۔

اسد بری طرح کھانستا ہوا اُٹھا۔ کمرہ اُس کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھل گیا تھا۔ اُس نے دُھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا، اُس کا رقیب روسیاہ سجاد اپنی قمیض کے اندر سے لوہے کا ایک وزنی راڈ نکال رہا تھا۔ اُس کا غضب سے بگڑا ہوا چہرہ بتا رہا تھا کہ آج اُس نے اسد کی جان نہ بھی لی تو اُس کی ہڈیاں ضرور چکنا چور کر دے گا۔ پھر سجاد کی غضب سے پھٹی ہوئی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''حرامزادے...آج کے بعد تیرا ناپاک سایہ کبھی کرکٹ گراؤنڈ میں نظر نہیں آئے گا۔''

وہ اسد کی طرف بڑھا۔ یہی دو تین لمحے تھے جن میں اسد نے ایک اہم فیصلہ کر لیا...

یہ پوری قوت سے اپنے دفاع کا فیصلہ تھا۔ اُس کے ذہن نے اُسے سمجھا دیا تھا کہ اب اگر وہ ان حملہ آوروں کا ہاتھ نہ روک سکا تو پھر ساری زندگی ایک پچھتاوا بن کر رہ جائے گی...... ان دو تین لمحوں کے اندر ہی اُس نے خود کو سنبھالا، تیار کیا اور سینہ سپر کر دیا......

سجاد نے اسٹین لیس سٹیل کے راڈ سے اسد کے سر پر ضرب لگائی تھی۔ اسد نے جھک کر یہ وار بچایا۔ راڈ اُس کے کندھے سے پھسلتا ہوا دیوار سے ٹکرایا۔ لمبے تڑنگے اسد نے نیچے جھک کر سجاد کے پیٹ سے اپنا کندھا لگایا اور ایک جھٹکا سے اُسے ہوا میں اُٹھا کر دیوار سے جا ٹکرایا۔ یہ ایک زوردار تصادم تھا۔ سجاد کے ہاتھ سے راڈ گر گیا اور حلق سے کراہ نکل گئی۔ اس دوران میں لمبے بالوں والے نے اسد کو عقب سے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اسد کے توانا جسم میں دیہاتی خون نے انگارے بھر دیئے تھے۔ وہ ایک ساعت ضائع کئے بغیر اُلٹے قدموں تیزی سے پیچھے کی طرف گیا۔ لمبے بالوں والے کا تصادم باتھ رُوم کے بند دروازے سے ہوا اور دونوں باتھ رُوم کے فرش پر گرے۔ اسد اُوپر اور حملہ آور نیچے تھا۔ گرتے ہوئے حملہ آور کا سر بڑی شدت سے دیوار کے ساتھ ٹکرایا تھا۔ اسد پر سے اُس کی گرفت ختم ہو گئی۔ اسد نے پلٹ کر کئی طوفانی مکے اُس کے چہرے پر رسید کئے۔ یہ سارا شور شرابہ بادلوں کی گھن گرج اور طوفانی بارش کے شور میں دب کر رہ گیا تھا، ورنہ شاید قریبی فلیٹ کا کوئی مکین اسد کی مدد کو پہنچ جاتا۔ جس دوران اسد لمبے بالوں والے مد مقابل سے گتھم گتھا تھا، افضل اُس کی پشت پر آہنی راڈ سے ضربیں لگا رہا

تھا۔ اسد نے بھنا کر اُس کے جبڑے پر ٹانگ رسید کی اور دُور پھینک دیا۔ اسی دوران میں سجاد نے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی کا وزنی پایہ پکڑ لیا اور اسد پر حملہ آور ہونے کے لئے پل تول رہا تھا۔ اسد نے محسوس کیا کہ سجاد زیادہ خطرناک ثابت ہونے والا ہے، لمبے بالوں والے کو چھوڑ کر اسد ایک بار پھر سجاد پر جھپٹا۔ بالکل پہلے ہی کی طرح اُس نے ایک بار پھر نیچے جھک کر اُسے کندھے پر اُٹھا لیا۔ جس طرح فاسٹ باؤلر اسٹارٹ لیتا ہے، اُسی طرح چار پانچ قدم بھاگ کر اُسے پھر دیوار سے ٹکرا دیا۔ یہ ایک طرح سے سجاد کو لگنے والی پہلی چوٹ کا ایکشن ری پلے تھے۔ سجاد کا مٹکے جیسا سر دیوار سے ٹکرایا اور وہ نیم بے ہوش ہو کر فرش پر گر گیا۔ وہ ایک سائیڈ بورڈ سے ٹکراتا ہوا گرا تھا۔ سائیڈ بورڈ میں رکھے ہوئے کرکٹ کے بیٹ اور وکٹیں وغیرہ فرش پر لڑھک گئیں۔

لمبے بالوں والا ایک بار پھر اسد پر حملہ آور ہوا۔ وہ کچھ حیران نظر آ رہا تھا۔ شاید اُسے اسد سے اتنی سخت مزاحمت کی توقع نہیں تھی۔ اُس نے بھنا کر دو تین گھونسے اسد کو رسید کئے مگر پھر اپنے جوش میں خود ہی کسی شے سے ٹکرا کر گر گیا۔ اسد نے اُس کے کرخت چہرے پر جنون کی سی کیفیت دیکھی۔ فرطِ غضب سے اُس کا چہرا بگڑ گیا تھا۔ اُس نے اپنا ہاتھ قمیض کے اندر ڈالا اور اسد کو ایک تیز دھار خنجر کی جھلک نظر آئی۔ اسد کے دل نے گواہی دی کہ اگر وہ اس خطرناک شخص کو روک نہ سکا تو وہ اُسے قتل کر دے گا۔ ایک سرخ دُھندسی اسد کے ذہن پر چھا گئی۔ اُس نے نیچے جھک کر ایک وکٹ اُٹھائی، اُسے دونوں ہاتھوں میں بلند کیا اور پلک جھپکتے میں لمبے بالوں والے کے پیٹ میں گھونپ دیا......

اُس کے حلق سے ایک کربناک چیخ نکلی۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپا اور پیٹ سے اُچھلنے والے خون کی پچکاریوں نے اُس کے چہرے کو لتھڑ دیا۔ خنجر اُس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔

یہ منظر دیکھ کر افضل نامی لڑکے کا رنگ برف کی طرح سفید ہو گیا تھا۔ وہ چند لمحے سکتے کی سی کیفیت میں رہا، پھر بھاگ کھڑا ہوا۔

اسد حیرت زدہ کھڑا تھا۔ اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے لمبے بالوں والے کے جسم نے چند جھٹکے کھائے اور ساکت ہو گیا۔ وکٹ ابھی تک اُس کے پیٹ میں سینے سے ذرا نیچے گڑی ہوئی تھی۔ وکٹ کی دھاتی نوک اُس کی قمیض اور گوشت کو پھاڑتی ہوئی پانچ چھ انچ تک گھس گئی تھی۔ مضروب کی کھلی ہوئی سفید آنکھیں یہ لرزہ خیز اعلان کر رہی تھیں کہ وہ

ختم ہو چکا ہے...... قتل ہو چکا ہے۔

اسد نے گھوم کر سجاد کی طرف دیکھا۔ وہ بے سدھ پڑا تھا۔ بے ہوشی کی حالت میں اُس کے ہونٹوں سے خرخر کی آواز نکل رہی تھی۔

''یہ کیا ہو گیا؟...... یہ کیا ہو گیا؟......؟'' اسد نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

کمرہ اور قرب و جوار اُس کی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ اُسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ جاگتی آنکھوں سے ایک بھیانک خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ کیسے ہوا... کب ہوا؟... اُس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے سامنے پڑی لاش کو دیکھا۔ اُس کا سارا جسم کانپتا چلا جا رہا تھا۔

پھر جیسے اُسے ہوش آیا۔ اُس نے جلدی سے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا۔ پہلا خیال اُس کے ذہن میں یہی آیا کہ وہ چچا شوکت کو ٹیلیفون کرے...... لیکن کیا چچا شوکت سے رابطہ ہو سکے گا؟

ابھی وہ فون کے قریب پہنچا ہی تھا کہ کال بیل ہوئی۔ کال بیل کی آواز اسد کے لئے صورِ اسرافیل سے کم نہیں تھی۔ وہ چند لمحے سکتہ زدہ کھڑا رہا، پھر دروازہ کھول کر بیرونی دروازے کی طرف دوڑا۔

''کک...... کون ہے؟'' اُس نے پھٹی سی آواز میں پوچھا۔

''میں ہوں یار! جلدی دروازہ کھول۔ بھیگ رہا ہوں۔'' اشفاق کی آواز آئی۔

اسد نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری، پھر چند لمحے سوچ کر دروازہ کھول دیا۔

اشفاق نے چھتری سمیٹتے ہوئے اسد کے چہرے پر نگاہ ڈالی اور بری طرح چونک گیا۔

''کیا بات ہے اسد! کیا ہوا؟''

''کک...... کچھ نہیں۔''

اشفاق نے اندر آ کر ذرا دھیان سے اسد کا چہرہ دیکھا اور وہ بھی گھبرا گیا۔ ''کیا ہوا ہے یار...... یہ چوٹیں کیسی ہیں؟ کیا کسی سے لڑائی ہوئی ہے؟''

اسد نے کانپتے ہاتھوں سے بیرونی دروازے کو کنڈی لگائی اور گلوگیر آواز میں بولا۔

''اشفاق! کچھ نہ پوچھو کیا ہو گیا ہے...... میرے ہاتھوں...... میرے ہاتھوں......''

''کیا ہو گیا ہے تمہارے ہاتھوں......؟'' اشفاق چیخا۔

''میرے ہاتھوں...... قتل ہو گیا ہے...... ایک بندہ مر گیا ہے۔''

اشفاق کا رنگ ایک لمحے میں ہلدی ہو گیا۔ وہ اسد کے ساتھ کمرے میں آیا اور کمرے کا نقشہ دیکھ کر لڑکھڑا گیا۔ کتنی ہی دیر کوئی لفظ اُس کی زبان سے نہ نکل سکا۔

اسد نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں نہایت اختصار سے اُسے سارا واقعہ سنایا۔ اشفاق نے نیچے جھک کر سجاد کو دیکھا۔ اُس نے اب ہوش میں آنے کے لئے کسمسانا شروع کر دیا تھا۔ اُس کے حلق سے مدھم کراہیں بھی نکل رہی تھیں۔ اشفاق اور اسد نے مل کر اُسے باتھ رُوم مین گھسیٹا اور باتھ رُوم کو باہر سے چٹخنی چڑھا دی۔ یہ چٹخنی ٹوٹنے سے بچ گئی تھی۔

اشفاق نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا۔ ”اسد! یہاں سے بھاگ جاؤ...... کہیں دُور نکل جاؤ۔“

”کہاں جاؤں؟“

”کہیں بھی...... لیکن لاہور سے نکل جاؤ۔ یہ لاش تمہیں پھانسی کے پھندے تک پہنچا دے گی۔“ اُس نے فرش پر پڑے مقتول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”چچا سے مشورہ......“

”چچا تایا کو چھوڑو یار...... ایسے معاملوں میں کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ بس تم بھاگ جاؤ۔ ہو سکے...... ہو سکے تو علاقہ غیر کی طرف نکل جاؤ۔ روپے تو تمہارے پاس ہوں گے بس وہ لے لو۔“ اشفاق کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

”مگر یار! یہ قتل میں نے خود کو بچانے کے لئے کیا ہے۔“

”تمہیں یاد ہے جب تم ہمارے ہاں رہتے تھے۔ گلی نمبر تین میں شاہ اکرام کے ہاتھوں ایک بندہ مرا تھا۔ بالکل ایسا ہی کیس تھا۔ مقتول پارٹی زور والی تھی۔ اُنہوں نے شاہ کو پھانسی لگوا کر چھوڑا ہے۔ اس حرامی سجاد کی ”بیک“ بھی بڑی مضبوط ہے۔“

ایک دم بیرونی دروازے کے پاس آہٹ ہوئی۔ اشفاق ٹھٹک کر خاموش ہو گیا۔ کوئی دروازے کے سامنے سے گزر کر دوسرے فلیٹ میں چلا گیا تھا۔ اشفاق نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ”میری بات مان لے...... نکل جا یہاں سے...... افضل سب کچھ دیکھ گیا ہے۔ اب پولیس کو یہاں پہنچتے ہوئے زیادہ دیر نہیں لگنی ہے۔“

اسد نے جلدی جلدی ایک اٹیچی کیس میں سے کچھ رقم نکال کر بٹوے میں رکھی؛ کانپتے ہاتھوں سے اپنے سپورٹس شوز پہنے، در و دیوار پر ایک الوداعی نظر ڈالی، پھر دونوں

دوست ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے۔ اشفاق نے اُس کے رُخسار چومتے ہوئے کہا۔

”قسمت ملائے گی تو پھر ملیں گے۔ بس ہمت نہ ہارنا اور اچھے وقت کا انتظار کرنا۔“

”یار! تجھ پر تو کوئی مصیبت نہیں آئے گی؟“ اسد نے پوچھا۔

”نہیں آئے گی یار...... اور اگر آئے گی تو جھیل لیں گے۔“

تھوڑی ہی دیر بعد اسد اور اشفاق فلیٹ سے باہر تھے۔ دونوں نے آخری بار ایک دُوجے کو دیکھا، پھر دو مختلف راستوں پر ہو لئے۔ اشفاق کا رُخ اپنے گھر کی طرف تھا۔ اسد کا رُخ کسی نامعلوم منزل کی طرف...... عین اُسی وقت فلیٹ کے باتھ رُوم میں زخمی سجاد نے باتھ رُوم کا دروازہ زور زور سے پیٹنا شروع کر دیا تھا......!

○

برستی بارش میں اسد ریلوے سٹیشن پہنچا تھا۔ وہاں اُسے جو ٹرین شمال کی طرف جاتی ہوئی ملی اُس میں بیٹھ گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ خیبر میل تھی۔ اسد نے راولپنڈی تک کا ٹکٹ لیا تھا۔ ساری رات وہ ٹرین میں رہا۔ ٹرین کے گھومتے ہوئے پہیئے اُسے لاہور سے دُور لے جاتے رہے...... اور شاد پور سے دُور لے جاتے رہے۔ شاد پور جہاں اُس کا گھر تھا...... ماں باپ تھے...... چچا کا صحن تھا اور ایک برساتی تھی...... وہ سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں اب کبھی وہ ان در و دیوار کو دیکھ سکے گا یا نہیں؟ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب کچھ کتنی دُور چلا گیا تھا اُس سے......

اُس کے چہرے پر چوٹیں تھیں جو ہر کسی کو اُس کی طرف متوجہ کر دیتی تھیں۔ گریبان بھی اُدھڑا ہوا تھا۔ گریبان کا تو کچھ نہیں ہو سکتا تھا، چہرے کی چوٹیں چھپانے کے لئے اُس نے وزیر آباد کے سٹیشن سے ایک رُومال لے لیا اور اُسے منہ کے سامنے پھیلا کر کانوں کے پیچھے اڑس لیا۔ دیکھنے میں یوں لگتا تھا جیسے گرد و غبار سے بچنے کے لئے ایسا کیا ہے۔

راستے میں ایک اسٹیشن پر پولیس کے دو کانسٹیبل ڈبے میں سوار ہوئے۔ اسد کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا...... یہ کانسٹیبل جب تک ڈبے میں موجود رہے اسد شدید اعصابی تناؤ کا شکار رہا۔ کانسٹیبل جہلم کے اسٹیشن پر اُترے تو اسد کی جان میں جان آئی۔ وہ دن چڑھے پنڈی پہنچا۔ اُس کی جیب میں کل پندرہ سو تیس روپے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ان

پندرہ سو تیس روپوں کے ساتھ وہ کب تک چھپ سکتا ہے اور کیسے؟ رُومال بدستور اُس کے چہرے پر تھا۔ وہ کسی گمنام علاقے کے سستے سے ہوٹل میں ایک دو دن کے لئے کمرہ کرائے پر لینا چاہتا تھا اور سوچنا چاہتا تھا کہ آئندہ اسے کیا کرنا ہے؟

سٹیشن کے قریب سے ہی اُس نے ڈرتے ڈرتے ایک اخبار خریدا۔ ایک پارک میں گھاس پر بیٹھ کر اُس نے ڈرتے ڈرتے اخبار کی ورق گردانی کی۔ یہ لاہور کا ایڈیشن نہیں تھا، اس میں قتل کی خبر موجود نہیں تھی۔ خبر نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا تھا؟ قتل ہو چکا تھا اور اب دنیا کی کوئی طاقت وقت کو اُلٹا نہیں چلا سکتی تھی۔ اسد اُٹھا اور کمرے کی تلاش میں لگ گیا۔ نجانے کیوں اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ ہر آنکھ اس کو دیکھ رہی ہے۔ وہ جلد سے جلد کسی چار دیواری میں محصور ہو جانا چاہتا تھا۔

تھوڑی سی کوشش سے اُسے صدر کے علاقے میں ایک سستا سا کمرہ مل گیا۔ اسد نے دروازہ بند کیا اور بستر پر گر گیا۔ جو کچھ ہوا تھا ایک ڈراؤنا خواب تھا۔ مناظر اسد کے پردۂ تصور پر اُجاگر ہوئے، اپنے پیاروں کی شکلیں اُس کی نگاہوں میں گھومیں اور پتہ نہیں کیوں اُس کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہنے لگے۔

"کیا کروں...... کیا کروں؟......" وہ بار بار خود سے سوال کر رہا تھا۔

اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ ایک بار چچا شوکت سے رابطہ ضرور کرے۔ وہ اُس کے بزرگ ہی نہیں، دوست بھی تھے۔ ابا جان تو ایک دم آگ بگولا ہو جاتے تھے لیکن وہ تحمل سے اُس کی بات سنا کرتے تھے۔ وہ کسی پبلک بوتھ سے شاد پور رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ وہ رات بھر اپنے اندر حوصلہ جمع کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اگلے روز صبح نو بجے وہ فون کرنے کے لئے کمرے سے نکل آیا۔ محفوظ چار دیواری سے کھلی سڑک پر آنا ایک بار پھر نہایت اعصاب شکن مرحلہ ثابت ہوا۔ کوئی ایک فرلانگ دُور اُسے پی سی او مل گیا۔ پانچ دس منٹ کی کوشش کے بعد وہ شاد پور رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ ٹیلی فون چچا نے اپنے کارخانے میں لگوایا تھا...... چچا کے ایک ملازم نے فون اُٹھایا۔ اسد نے چچا کو بلانے کا کہا۔ بیک گراؤنڈ میں شیلر چلنے کی آواز آیا کرتی تھی لیکن آج نہیں آ رہی تھی۔ اسد سوچ رہا تھا کتنا ہی اچھا ہو کہ سلام دُعا کے بعد چچا اُس کا حال چال پوچھیں، پھر کہیں کہ وہ ابھی تک شاد پور کیوں نہیں آیا؟ کیوں سب کو ستا رہا ہے......

اُنہیں پتہ ہی نہ ہو کہ لاہور میں کیا واقعہ ہوا ہے؟ بلکہ کسی کو بھی معلوم نہ ہو۔ کسی دستِ غیب نے اس سارے سانحے کو ایک نامعلوم پردے میں چھپا دیا ہو...... لیکن یہ سب خواب خیال کی باتیں تھیں...... کچھ دیر بعد چچا شوکت کی بھاری آواز اُس کے کانوں میں پڑی۔

"ہیلو چچا! میں اسد بول رہا ہوں۔"

"کہاں سے بول رہے ہو؟"

"میں آپ کو بتا نہیں سکتا...... میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا۔"

"لیکن ہم تمہیں بہت کچھ بتا سکتے ہیں۔" چچا نے عجیب لہجے میں کہا۔ "تم نے ایک بندہ ہی نہیں مارا، ساتھ ساتھ اپنی ماں کو بھی مار دیا ہے...... مر گئی ہے تمہاری ماں۔ ابھی دو گھنٹے پہلے ہم اُس کی قبر بنا کر آئے ہیں۔ جاتے وقت وہ بہت خوش تھی تم پر...... تم نے اُس کے سارے ارمان پورے کر دیئے۔ شاباش اسد! تم نے بیٹا ہونے کا حق ادا کر دیا۔" چچا کی آواز شدتِ جذبات سے بیٹھ گئی۔

اسد پتھر کا بت بنا کھڑا تھا۔ اُسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن چچا کی بات کو جھٹلایا کیونکر جا سکتا تھا؟ وہ قریباً چیختے ہوئے بولا۔ "کیا کہہ رہے ہو چچا...... کک کیا ہوا امی کو؟"

یوں لگا کہ چچا سے ریسیور کسی نے چھین لیا ہے۔ پھر اسد کو ابا جان کی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی قہرناک آواز سنائی دی۔ "تم مر گئے ہو ہمارے لئے...... آج کے بعد مر گئے ہو۔ کبھی مجھے اپنی منحوس صورت نہ دکھانا سنا ہے تم نے...... جہاں جی چاہے دفع ہو جاؤ۔ جیو یا مرو...... ہمارا کوئی تعلق واسطہ نہیں تم سے......"

"ابا جان...... ابا جان......"

"مت کہو مجھے ابا جان...... میں کسی لوفر بدمعاش کا باپ نہیں ہوں۔ تم گندی نالی میں گرے ہوئے وہ کتے ہو جس کا سایہ بھی میں اپنے گھر کے آس پاس برداشت نہیں کروں گا۔ تیری پاگل ماں تیری صورت دیکھنے کو ترستی رہی۔ تو نے اُسے اپنی صورت نہیں دکھائی، اپنے قاتل بننے کی خبر سنا دی اور وہ مر گئی۔ اب تو بھی مر گیا ہے ہمارے لئے......" اس کے ساتھ ہی اُنہوں نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

یہ کیسے دن رات اسد کی زندگی میں آئے تھے۔ ان کے ہر ہر پل میں اُن کے لئے زہریلے تیر چھپے ہوئے تھے۔ اُسے کچھ پتہ نہیں چلا وہ کب پی سی او سے نکلا، کب اُس نے ہوٹل تک کا راستہ طے کیا اور کب اپنے نیم تاریک کمرے میں بند ہو گیا...... آنسو اُس کے رُخساروں پر بہتے چلے جا رہے تھے۔ اُسے ماں کے آخری الفاظ یاد آئے۔ اُنہوں نے کتنی منت سے اُسے جلدی شاد پور آنے کے لئے کہا تھا۔ پھر اُسے چچا شوکت اور علی کی طرف سے بھی یاد دہانی کے فون آئے تھے۔ اگر وہ شاد پور چلا جاتا تو شاید یہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہوا تھا۔ مگر وہ جاتا کیونکر...... وہاں تو شمیم موجود تھی اور اُس پتھر کو دیکھ کر اسد کی جان لبوں پر آنے لگتی تھی۔

پوری دنیا اُس سے ناراض نظر آنے لگی تھی اور اِس دنیا میں اُس کے اپنے پیارے بھی شامل تھے۔ وہ اپنے پیاروں کو کیونکر بتاتا کہ اُسے اُن سے دُور کرنے والی بلکہ ساری دنیا سے دُور کرنے والی ایک لڑکی ہے...... وہ اُس کی چچا زاد ہے۔ وہ اُس کو ایک ایسے انتظار کی آگ میں جلا رہی ہے جس کا کوئی اختتام نہیں ہے۔ اُس نے کئی ''صدیوں'' سے اُسے ''ضد'' کی ایک سولی پر لٹکا رکھا ہے جہاں وہ جیتا ہے نہ مرتا ہے۔ وہ اپنے کمرے میں بند رہا اور انگاروں پر لوٹتا رہا۔ اپنے والد کی سخت بے رحم آواز بار بار اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی...... وہ تصور میں اُن کی شعلہ فشاں آنکھیں دیکھ رہا تھا۔

ماں کا غم اُسے ساری رات رُلاتا رہا۔ لیکن صبح کے وقت اُس نے ایک دم خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر گھر والے اُس کی صورت دیکھنا نہیں چاہتے تو وہ بھی اُنہیں نہیں دکھائے گا...... وہ اب کبھی پلٹ کر شاد پور کی طرف نہیں دیکھے گا۔ وہ کہیں دُور نکل جائے گا۔ بہت آگے...... اور اگر پھانسی کے پھندے سے بچ گیا تو شاید اُس کی لاش بھی شاد پور نہ جائے۔ اُس نے دل ہی دل میں شاد پور کو خدا حافظ کہہ دیا۔ شاد پور کی گلیوں کو، شاد پور کے درختوں کو، اُس آنگن کو جس میں اُس نے بچپن گزارا تھا، علی کو...... نازو کو...... چچا چچی اور والد کو...... عبداللہ اور نذیر احمد کو...... اور اُس کو جو شاید آج بھی بہار کی ان خوبصورت شاموں میں اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر پڑھتی تھی اور ٹیبل لیمپ کی روشنی میں اُس کا آدھا جسم ہیرے کی طرح دمکتا تھا!

OOO

اسد کی زندگی اب ہوا کے دوش پر اُڑتے ہوئے ایک خزاں رسیدہ پتے کی طرح تھی...... وہ چند روز راولپنڈی میں رہنے کے بعد پشاور چلا گیا۔ پشاور میں اُس کا ایک دوست اخلاق جونیئر موجود تھا۔ وہ اسلام آباد کرکٹ ایسوسی ایشن کی طرف سے کھیلتا تھا اور آج کل پشاور میں ہی تھا۔ لیکن اسد اُس کی طرف جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کسی بھی دوست یا شناسا کی طرف جانے اور اُسے مصیبت میں ڈالنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ چند دن پہلے ایک پرانے اخبار میں اُس کی نگاہ اُس قتل کی خبر پر پڑی تھی جو اُس کے ہاتھوں سے ہوا تھا۔ اس خبر میں درج تھا۔

''کینال پارک کے فلیٹس میں ہونے والے قادر عرف راجا کے نامزد ملزم کا سراغ ابھی تک نہیں لگایا جا سکا ہے۔ یاد رہے کہ مقتول راجا کے زخمی دوست سجاد اور افضل کے بیان کے مطابق یہ قتل اسد نامی نوجوان نے کیا ہے۔ اسد کرکٹ کا ایک اُبھرتا ہوا کھلاڑی ہے اور قومی سطح کے کئی اہم ٹورنامنٹس میں حصہ لے چکا ہے۔ ملزم کی تلاش میں دو پولیس پارٹیاں قبائلی علاقے کی طرف روانہ کی جا رہی ہیں۔ ملازم کے قریبی دوستوں اور رشتے داروں سے پوچھ گچھ کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ باخبر ذرائع کے مطابق یہ سارا واقعہ ایک ''ف'' نامی لڑکی سے تعلقات کا شاخسانہ ہے۔''

پشاور میں سات آٹھ روز تک اسد نے ایک نچلے درجے کے ہوٹل میں قیام کیا۔ وہ کھانے پینے میں بھی بڑی کفایت شعاری سے کام لے رہا تھا مگر جمع پونجی مسلسل کم ہوتی جا رہی تھی۔ اب اسد کے پاس صرف آٹھ سو روپے بچے تھے۔ اُس کی شیو بڑھ چکی تھی، لباس خستہ حال ہو چکا تھا۔ اُسے کم از کم کپڑوں کا ایک جوڑا مزید درکار تھا۔ کپڑے اور ضرورت کی دیگر چھوٹی موٹی اشیاء رکھنے کے لئے ایک سفری بیگ کی بھی ضرورت تھی۔ مگر یہ اشیاء خرید لیتا تو پھر کھاتا کہاں سے؟ چالیس روپے روز کمرے کا کرایہ بھی تھا۔

ابھی وہ قبائلی علاقے میں داخل ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اُس کی خواہش تھی کہ کم از کم دو ہفتے مزید پشاور میں ہی گزار لے۔

سوچ بچار کے بعد اُس نے فیصلہ کیا کہ ہوٹل کا کمرہ چھوڑ دے اور پندرہ روپے روز "چارپائی بستر" والے ہوٹل میں چلا جائے۔ اُس نے اپنی اس سوچ پر عمل کیا مگر اس کفایت شعاری کا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلی ہی رات کسی نے اُس کی جیب میں سے سارے پیسے نکال لئے اور اُسے کوڑی کوڑی کو محتاج کر دیا...... یہ مرے کو مارے شاہ مدار والی بات تھی۔ اسد نے دو تین روز تو فاقے کاٹے...... پھر جب پیٹ کے جہنم نے اُسے زندہ جلانا شروع کر دیا تو اُس نے جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے مزدوری کرنے کا سوچا...... وہ زمینداروں کا بیٹا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک شہر میں آرام و آسائش کی زندگی گزار رہا تھا۔ اُس نے سوچا بھی نہ تھا کہ بڑھی ہوئی داڑھی اور پھٹے پرانے کپڑوں کے ساتھ اُسے راجوں کے پیچھے اینٹیں ڈھونا پڑیں گی۔

پہلے دن میں ہی اُسے پتہ چل گیا کہ یہ کتنا جان جوکھم کا کام ہے...... حالانکہ وہ ایک سخت جان کرکٹر تھا۔ سارا سارا دن جلتے سورج کے نیچے کرکٹ گراؤنڈ میں مار دھاڑ کرتا تھا، مگر سر پر اینٹیں رکھ کر بانس کی لرزتی کانپتی سیڑھی پر چڑھنا ایک بالکل جدا قسم کی مشقت تھی۔ پہلے دن کی مشقت کے بعد اُسے 80 روپے ملے۔ اُس نے کھانا کھایا اور باقی پیسوں سے ایک پرانی شلوار قمیض خریدی۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ پینٹ قمیض چاہے کتنی بھی خستہ حال ہو، مزدوری کے لئے نامناسب لباس ہے۔

اُس نے پندرہ بیس روز مزدوری کی۔ اس مزدوری کے دوران بشیر نامی ایک مزدور اُس کا دوست بن گیا۔ بشیر بھی اُس کی طرح پنجابی تھا۔ اُس کا تعلق چیچہ وطنی سے تھا۔ وہاں زمین کے معاملے پر اپنے تایا کے بیٹوں سے اُس کی سخت دشمنی ہوگئی تھی۔ دشمنی کی اس آگ سے بچنے کے لئے وہ یہاں پشاور آ گیا تھا اور مزدوری شروع کر دی تھی۔ وہاں گاؤں میں کھیت مزدوری کرتا تھا، یہاں راجوں کے پیچھے اینٹیں ڈھوتا تھا۔ بشیر مزدوری کی "فیلڈ" میں کافی تجربہ کار تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ سستا کھانا کہاں ملتا ہے، رات گزارنے کے لئے کون سی گراؤنڈ یا کون سی مارکیٹ کا کون سا برآمدہ بہترین ہے۔ رات کو جو پلسیے بیچارے سڑک نشینوں کو ٹھوکریں مارتے تھے اور اُن کی جیبیں ٹٹولتے تھے

اُن سے سستے داموں چھوٹنے کا ہنر بھی بشیر کو خوب آتا تھا...... بشیر کی بدولت پشاور میں اسد کی زندگی قدرے آسان ہونے لگی۔

اُن دونوں نے کچھ روز ایک فیکٹری میں اینٹیں ڈھونے کا کام ٹھیکے پر کیا۔ اس ٹھیکے میں اُنہیں فائدہ ہوا۔ 80 روپے کی دیہاڑی قریباً 125 روپے میں پڑی...... چند دن بعد بشیر نے ایک اور پھرتی دکھائی۔ اُس نے بچت کی رقم میں سے رنگ کرنے والے دو تین برش خریدے، ڈالڈا گھی کے دو تین ڈبوں کو پکڑنے کے لئے تار کے کنڈے لگوائے اور اسد کے ساتھ "رنگ ساز" بن کر اڈے پر بیٹھ گیا۔ اُس کی یہ ترکیب زیادہ کامیاب تو نہیں رہی، پھر بھی اُن کی تین چار دیہاڑیاں رنگ سازوں کے طور پر لگ گئیں۔ خوش قسمتی سے یہ کام بھی سیدھا سادا تھا۔ ایک بڑی کوٹھی کے پورچ اور گیراج وغیرہ میں رنگ کرنا تھا۔ زمین پہلے سے بنی ہوئی تھی۔ اُنہیں بس برش ہی پھیرتے جانا تھا۔ مالک بھی نسبتاً نرم دل اور لاپرواہ تھا۔

رات کو وہ دونوں سٹیشن کے قریب ایک گول چکر کی گھاس پر سوتے تھے۔ یہاں رنگ رنگ کے اور بھی درجنوں محنت کش ہوتے تھے۔ بشیر اور اسد گھاس پر چادریں بچھائے لیٹے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ بشیر عورت کے حوالے سے باتیں کر رہا تھا......

"عورت بڑی ٹیڑھی شے ہے یار...... بندے کی مت مار دیتی ہے۔ اُوپر سے کچھ ہور، اندر سے کچھ ہور۔ مجھ کو تو لگدا ہے کہ دنیا وچ زیادہ جھگڑے عورت توں ہی شروع ہوندے ہیں۔"

بشیر باتیں کرتا جا رہا تھا اور اسد اثبات میں سر ہلاتا جا رہا تھا۔ بشیرے کی سیدھی سادھی لیکن کھری باتوں نے اسد کا ذہن کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔ فریحہ کی صورت اُس کی نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔

کتنی خوبصورت اور نرم مزاج لگتی تھی وہ...... لیکن کتنی بے رحمی سے کتنا کاری وار کیا تھا اُس نے...... اسد کی بے رُخی کا بدلہ لینے کے لئے اُس نے ایک لمبا انتظار کیا تھا اور آخر بدلہ لے کر رہی تھی۔ پہلے اُس نے اسد کو اخلاقی طور پر توڑنے پھوڑنے کی کوشش کی تھی۔ اور جب ایڑی چوٹی کا زور لگا کر بھی ناکام رہی تھی تو اگلے ہی روز اُس نے پینترا بدل کر وار کر دیا تھا۔ یہ بڑا بے دریغ وار تھا...... یہ بات اب شک سے بالاتر تھی

کہ اسد کے بعد وہ سجاد سے راہ و رسم پیدا کر چکی تھی۔ اسد کے خلاف غم و غصے سے بھر جانے کے بعد اُس نے سجاد کو بھڑکایا تھا۔ اُس نے اسد پر ایک بے بنیاد الزام لگا کر سجاد کو آگ بگولا کر دیا تھا۔ سجاد کی ساری پرانی چوٹیں تازہ ہو گئی تھیں اور وہ زہریلے سانپ کی طرح پھنکارتا ہوا اسد پر جھپٹ پڑا تھا...... اُس کی یہی جھپٹ اسد کو قاتل بنا گئی تھی۔

بشیر باتیں کرتے کرتے ایک دم خاموش ہو گیا۔ اُس کا دھیان اسد کے عقب میں تھا۔ اسد نے بھی مُڑ کر دیکھا اور اُس کا دل اُچھل کر رہ گیا...... ایک پولیس پارٹی گاڑی سے اُتر کر گول چکر میں داخل ہو رہی تھی...... سارے دراز و نیم دراز مزدور اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ جو بیٹھے تھے وہ کھڑے ہو گئے۔ اسد کا رنگ زرد ہو گیا تھا اور ہونٹ کپکپانے لگے تھے۔ بشیر نے ہولے سے کہا۔ ''یار گھبرانے کی بات نئیں...... اس طرح کی چیکنگ شیکنگ ہوندی ہی رہندی ہے۔''

پولیس والوں نے کئی افراد کی تلاشیاں لیں، کچھ سے سوال جواب بھی کیے۔ وہ اسد اور بشیرے کی طرف بھی آئے، اُن کا بستر کھول کر دیکھا پھر آگے بڑھ گئے۔ اُن کے جانے کے بعد ساری مزدور برادری پھر آرام سے بیٹھ گئی۔ بشیرے نے کے ٹو کا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''یار! کیا بات ہے؟ پولیس والوں کو دیکھ کر تم ایک دم ہی گھبرا جاندے ہو۔ کوئی...... کم شم تو نئیں ڈالا ہوا تم نے؟''

''نہیں یار! ان کی شکلیں ہی ایسی ہوتی ہیں کہ بندہ پریشان ہو جاتا ہے۔''

''زیادہ پریشان نہیں ہونا چاہیدا...... نئیں تو ان کو شک پڑ جاندا ہے۔''

''میں گھبرایا نہیں تھا۔ بس پریشان ہوا تھا۔''

''پریشانی بہت رہتی ہے تجھ کو...... اچھا ایک کم کرتے ہیں۔ تیری پریشانی کا علاج کرتے ہیں۔ اِک شے میرے پاس ہے ایسی۔ ہر پریشانی اس کو دیکھ کر دوڑ جاتی ہے۔''

''وہ کیا شے ہے؟'' اسد نے بھولپن سے کہا۔

''تم ادھر ہی ٹھہرو۔ میں ابھی لے کر آندا ہوں۔''

وہ فوراً اُٹھ کر چلا گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد واپس آیا تو اُس کے پاس چرس بھرے سگریٹ تھے۔ وہی ''گرل فرینڈ'' جو اس سے پہلے بھی بے شمار مرتبہ اسد کے ہونٹوں سے لگ چکی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہ گھٹیا سگریٹ تھا اور چرس بھی ملاوٹ شدہ تھی۔ اسد

نے تین چار کش لئے تو بس ایک کش کا مزہ آیا۔ بہرحال اُس نے بشیرے پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا اور اُسے یہی باور کرایا کہ وہ پہلی دفعہ یہ مزا چکھ رہا ہے۔

بشیرے نے کہا۔ ''اس کی بو اِدھر اُدھر پھیلے گی...... اچھا یہی ہے کہ ہم وہاں اُدھر کنارے کی طرف سو جائیں۔''

اسد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ دونوں نے اپنی سونے کی جگہ تبدیل کر لی اور رات گئے تک کش لگاتے رہے۔ ایک عجیب سے سرور کے عالم میں اسد سو گیا......

صبح سویرے بشیرے نے اُسے جگایا۔ وہ اڈے پر چلے گئے۔ دیہاڑی نہیں لگی۔ گیارہ بجے کے قریب وہ اڈے سے اُٹھ گئے اور یونہی اِدھر اُدھر گھومنے لگے۔ بشیرے نے کہا۔ ''ایک بات پوچھوں انور؟'' اسد نے اُسے اپنا نام انور ہی بتایا تھا۔

''ہاں ہاں...... پوچھو!''

''پر سچی سچی بتانا۔ یاروں سے بات چھپانا ٹھیک نئیں ہوندا۔''

''ہاں یار! ٹھیک بتاؤں گا۔''

''یہ شمیم کون ہے؟''

اسد کے سر پر جیسے کسی نے بم رکھ کر چلا دیا تھا۔ وہ حیرت سے بشیرے کا چہرہ تکنے لگا۔ ''کون شمیم؟'' وہ گڑبڑا کر بولا۔

''دیکھو اب تم جھوٹ بول رہے ہو نا... تم ساری رات نیند میں بڑبڑاتے رہے ہو۔ کسی شمیم کا نام لیتے رہے ہو۔ کچھ دن پہلے بھی رات کو تم نے اسی طرح شمیم کا نام لیا تھا۔''

''پتہ نہیں تم کیا بکواس کر رہے ہو؟''

''بکواس نئیں کر رہا ہوں یارا! رات کو تم نے کم از کم دس واری شمیم کا نام لیا ہے۔ پتہ نہیں کیا کیا کہہ رہے تھے...... شمیم تو کس مٹی دی بنی ہوئی ہے؟ تجھ کو میرے اوپر ترس کیوں نئیں آندا؟ میں مر جانواں گا پھر ترس کھائے گی مجھ پر؟...... پھر اپنی ماں کا نام لیتے رہے تم...... اُس سے معافیاں مانگتے رہے۔''

بشیرے کی باتیں سن کر اسد سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ وہ اپنے طور پر شمیم کو بھلائے بیٹھا تھا لیکن وہ تو اُس کے اندر گہرائی تک اُتری ہوئی تھی۔ نہ جانے دل اور دماغ کے کس کس گوشے پر اُس کا راج تھا۔ جسم و جاں کی سلطنت پر کہاں تک اُس کی حکمرانی تھی؟ یہ کیسا

پیار تھا جو صرف رُلانا جانتا تھا۔ یہ کیسی رات تھی جس کا کوئی سویرا نہیں تھا...... کہتے ہیں کہ ہر غم کے بعد خوشی ہوتی ہے، ہر ہجر کے بعد وصال ہوتا ہے۔ لیکن یہ کیسا موسم تھا جو گزرتا ہی نہیں تھا...... اس موسم ہجراں کا آغاز ہی ہجر سے ہوا تھا۔ اسد کو شمیم کے ساتھ اپنی محبت کا ادراک اُس شام کو ہوا تھا جس شام اُس کی منگنی ہو رہی تھی۔

وہ سوچنے لگا کہاں ہو گی وہ؟ کیا کر رہی ہو گی؟ کیا اُسے اس بات کا احساس ہو گا کہ اس کی وجہ سے وہ فقیروں کے حال میں دنیا کے جنگل میں دھکے کھا رہا ہے۔ وہی تو تھی جس کی وجہ سے وہ شاد پور سے نکلا تھا۔

''کن خیالوں میں گواچ گئے ہو؟'' بشیرے نے اُس کا کندھا ہلایا۔

وہ چونک کر رہ گیا۔ اُس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ رہے تھے۔ بشیرے نے کہا۔

''یار! کبھی کبھی مجھ کو لگدا ہے کہ تو مجھ سے بہت کچھ چھپاندا ہے۔ تیری شکل صورت بڑی امیروں والی ہے۔ تیرے ہتھ بھی بڑے ملائم ہیں۔ مجھے تو لگدا ہے کہ تو یہ بھی جھوٹ بولدا ہے کہ اس سے پہلے تو لاہور میں دیہاڑیاں لگاتا رہا ہے۔''

''وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔''

بشیرا ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ جس گھر میں ہم نے رنگ کیا تھا نا، اُس کی چھوٹی میم صاحب پتہ ہے کیا کہندی تھی؟''

''کیا کہندی تھی؟''

''وہ کہندی تھی کہ تمہارا ساتھی مزدور نہیں لگدا کوئی بہروپیا لگدا ہے۔ مزدور کوئی اس طرح کے ہوتے ہیں؟ پھر وہ کتنی ہی دیر مجھ سے تمہارے بارے میں سوال جواب کر دی رہی تھی۔''

چلتے چلتے ایک دم اسد رُک گیا۔ ایک گراؤنڈ میں ہائی سکول کے لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ایک لڑکا بڑے لمبے سٹارٹ سے گیند کرا رہا تھا۔ بہت سے تماشائی بھی گراؤنڈ میں موجود تھے۔ غیر ارادی طور پر اسد کی ساری توجہ کھیل پر مرکوز ہو گئی۔ وہ بڑے دھیان سے کھیلنے والوں کا جائزہ لینے لگا اور اُن کی خوبیاں اور خامیاں نوٹ کرنے لگا۔ بشیرے نے ایک بار پھر اُس کا کندھا ہلا کر اُسے حقیقت کی دنیا میں واپس کھینچا۔

''کہاں گم ہو جاتے ہو شہزادے...... یہ امیروں کی کھیڈیں ہیں۔ ادھر ہی کھڑے

دیکھتے رہو گے تو ماسی زینب کے تندور پر دال ختم ہو جائے گی اور پرسوں کی طرح پھر گنڈے (پیاز) سے روٹی کھانی پڑے گی۔

قریباً دو ہفتے اسد اور بشیرے نے پشاور میں گزارے۔ پھر وہاں گرمی مزید بڑھ گئی۔ ویسے بھی اسد کے خیال میں اُس کا ایک ہی شہر میں زیادہ دیر رہنا مناسب نہیں تھا۔ اُس نے بشیرے سے مشورہ کیا اور وہ دونوں پشاور سے ہری پور آ گئے۔ ہری پور میں اُن دونوں نے دس پندرہ روز ایک گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی میں قلی کے طور پر کام کیا۔ یہاں بشیرے کا کمپنی کے مالک کے بیٹے سے جھگڑا ہو گیا۔ اُس نے بشیرے کو تھپڑ مارے۔ بشیرے نے تھپڑ تو کھا لئے لیکن دو دن بعد سزا کے طور پر اُس نے مالک کے گودام میں اُس ہال کمرے میں پانی چھوڑ دیا جہاں اُوپر تلے سیمنٹ کی سینکڑوں بوریاں رکھی تھیں۔ پانی کے دونل رات بھر کھلے رہے اور پانی بہہ بہہ کر ہال کمرے میں جمع ہوتا رہا۔ صبح تک دو تین سو بوری کا کباڑا ہو گیا۔

اسد اور بشیرا راتوں رات ہری پور سے نکل آئے تھے۔ اس واقعے سے اسد کو اندازہ ہوا کہ نچلے طبقے کے غریب و بے بس لوگ کبھی کبھی اپنی بے عزتی کا بدلہ کس انداز سے چکاتے ہیں۔ ہری پور سے وہ دونوں ایبٹ آباد کی طرف نکل گئے۔ یہاں ایک نئی کالونی بن رہی تھی۔ اُنہیں راجوں کے پیچھے کام کرنے کی مزدوری مل گئی۔ اُجرت کم تھی اور اکثر دیہاڑی ٹوٹ بھی جاتی تھی۔ بہر حال موسم اچھا تھا۔ یہاں اُن دونوں کو اپنے پسندیدہ سگریٹ بھی فراوانی سے مل رہے تھے۔ گلبرگ کی فیشن ایبل سوسائٹی میں جن سگریٹوں کو نوجوان بڑے لاڈ سے گرل فرینڈ کہتے تھے غریبوں مسکینوں کی سوسائٹی میں اُسے بڑی مارکہ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ اسد کی داڑھی اب کافی بڑھ چکی تھی۔ سر کے بال بھی بڑھے ہوئے تھے۔ اُس کا رنگ کچھ سانولا سا گیا تھا۔ تاہم جسمانی طور پر وہ اب بھی توانا اور کڑیل نظر آتا تھا...... ایبٹ آباد میں اُن کا قیام نو تعمیر شدہ کالونی کے احاطے میں ہی تھا۔ یہاں بھی کئی مزدور رات گزارتے تھے۔ ایبٹ آباد میں قیام کے دوران کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا سوائے اس کے کہ ایک ابر آلود رات کو اسد کو پھر وہی پراسرار آواز سنائی دی جو اکثر اُس کے دل و دماغ کو تہہ و بالا کر دیا کرتی تھی...... رات کے آخری پہر جب ورکشاپ کے شیڈ تلے سب مزدور بے خبر سو رہے تھے، اسد پر وہی مخصوص کیفیت طاری

ہوگئی۔ آواز اُس کے کانوں میں گونجنے لگی......

''تمہیں کہا تھا نا، عورت ناقابل اعتبار ہے۔ مرد اپنی طاقت اور ہمت سے چاند ستاروں کو چھو سکتا ہے لیکن اس کے پاؤں میں عورت کی وزنی بیڑی ہے۔ دُور کیوں جاتے ہو خ تمہارا حال بھی تو کچھ مختلف نہیں ہے۔ اُس لڑکی نے تمہیں کہاں سے کہاں لا پھینکا ہے۔ صرف ایک دن پہلے وہ تمہیں رِجھانے کے لئے تمہارے پاس آئی اور جب ناکام ہوئی تو تم پر جھوٹا الزام لگایا اور کھلاڑی سے قاتل بنا دیا...... اب وہ کہیں اپنے نئے یار کی بانہوں میں عیش کا جھولا جھول رہی ہوگی۔ تم یہاں زندگی کو زہر کی طرح پی رہے ہو۔ میں تمہیں کہا کرتا ہوں نا کہ جو عورت پر ترس کھاتا ہے وہ اصل میں اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے......''

وہ بولتا جا رہا تھا۔ اسد نے اُس سے مخاطب ہونا چاہا لیکن وہ اُس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر بولتا چلا گیا۔ اسد نے جھلا کر اپنے کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس لیں۔ اُس روز پہلی بار اسد پر ایک عجیب انکشاف ہوا۔ کان بند ہونے کے باوجود بھی آواز با آسانی اُس کی سماعت تک پہنچ رہی تھی۔

ناکام ہو کر اُس نے اُنگلیاں کانوں سے نکال لیں۔ اُنگلیاں ٹھونسنے سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا، اُنگلیاں نکالنے سے بھی نہیں پڑا۔ اسد کے قریب بشیرا گونجدار خراٹے لے رہا تھا۔ بیس پچیس قدم کی دُوری پر مزدوروں کی ایک اور ٹولی بے خبر سو رہی تھی۔ شیڈ کے نیچے تاریکی تھی اور تیز ہوائیں ٹین کی چھتوں پر سے سرسراتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ اسد نیند اور بیداری کی درمیانی حالت میں تھا۔ چرس کا دُھواں جیسے ابھی تک اُس کے دماغ میں بھرا ہوا تھا۔

جونہی آواز میں ذرا وقفہ پیدا ہوا، اسد نے اُسے مخاطب کر کے کہا۔ ''میں نے تمہارے بارے میں بہت سوچا ہے...... بہت غور کیا ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ میں تمہارے بارے میں جان چکا ہوں۔''

جواب میں مکمل خاموشی تھی۔ وہی خاموشی جو اسد کو بٹپٹا کر پُر غضب کر دیا کرتی تھی۔ وہ سرگوشی کے لہجے میں غرایا۔ ''میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے ہو......؟''

''کیا جواب دُوں......؟'' آواز اسد کی سماعت سے ٹکرائی۔

کامیابی کا احساس مسرت کی ایک بھرپور لہر کے ساتھ اسد کے جسم میں دوڑ گیا۔ وہ ماضی سے رابطہ کرنے میں کامیاب رہا تھا...... اجل کے پردوں کو چاک کر کے کوئی شخص اُس سے مخاطب تھا۔

''کون ہو تم؟ مجھے خود کیوں نہیں بتا دیتے ہو؟''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا...... اور نہ ہی تمہیں کوئی فائدہ ہوگا۔''

''ہوگا فائدہ...... ضرور ہوگا...... اور کچھ نہیں تو میرا دماغ چٹخنے سے بچ جائے گا۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں پاگل ہو جاؤں؟''

دوسری طرف خاموشی طاری رہی...... گمبھیر خاموشی۔ مگر دل و دماغ کی کیفیت بتا رہی تھی کہ آواز اُس کے آس پاس موجود ہے۔ ''تم خاموش کیوں ہو؟ بولتے کیوں نہیں؟''

اسد نے آنکھیں بند کئے کئے ایک بار پھر سرگوشی کی۔

''ابھی تم نے خود کہا ہے کہ تم میرے بارے میں جانتے ہو۔''

''لیکن میں تمہاری تصدیق چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے...... میں تصدیق کرتا ہوں۔''

''یعنی تم...... یعنی تم...... بھایا جی ہو......؟؟''

ایک گمبھیر توقف کے بعد جواب آیا۔ ''ہاں...... میں ہوں...... اور ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ میں تمہارا بھلا چاہتا ہوں۔''

اسد سناٹے کی سی کیفیت میں تھا، اُس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو چکے تھے۔ اُس نے لکنت زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''کیا تم...... صرف آواز ہو...... یا تمہارا کوئی وجود بھی ہے؟''

جواب ندارد...... وہی گمبھیر خاموشی...... وہی دیوانی ہوا کی تیز سیٹیاں...... اچانک اسد کو محسوس ہوا کہ وہ آس پاس نہیں ہے۔ وہ جا چکا ہے۔ اُس نے ایک دو بار اُسے پکارا، پھر وہ خاموش ہو گیا۔ اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو بشیرا جاگ گیا تھا اور اُس کے اوپر جھکا ہوا خوفزدہ نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''انور...... کیا ہو گیا ہے تم کو؟ کیا بڑبڑ لگائی ہوئی ہے...... چلو پاسا بدل کر سو جاؤ!''

اُس نے باقاعدہ دھکیل کر اسد کی کروٹ بدل دی اور خود بھی پھر سے لیٹ گیا۔ اس واقعے سے دو روز بعد ہی وہ دونوں واپس پشاور آ گئے تھے۔

ایک بار پھر وہی گلیاں اور بازار، وہی روز و شب، وہی گول چکر جس کے سبزے پر وہ رین بسیرا کرتے تھے۔ وہ ایک دو دن مزدوری کرتے اور ایک دو دن یونہی آوارہ پھرتے۔ جب جیب خالی ہونے لگتی تو پھر دو دیہاڑیاں لگا لیتے...... ان دنوں اسد کو معلوم ہوا کہ مزدور اکثر اپنے پیٹ کے حکم پر مزدوری کرتا ہے۔ جب پیٹ خالی ہو جاتا ہے تو خالی پیٹ کے اندر سے دماغ کو آرڈر ملتا ہے کہ آج ہر صورت دیہاڑی لگانی ہے۔

پشاور میں آئے ہوئے چھٹا ساتواں روز تھا جب ایک دن ڈبگری بازار کے قریب اسد اور بشیرے کی ملاقات اُسی میم صاحب سے ہوگئی جس کے ہاں اُنہوں نے رنگ ساز کے طور پر کام کیا تھا۔ وہ دونوں بڑی مارکہ لینے ایک قریبی پان شاپ کی طرف جا رہے تھے جب ایک کار نے اُن کے قریب بریک لگائے اور پھر ریورس ہو کر اُن کے قریب پہنچ گئی۔ ٹویوٹا کار کی اگلی سیٹ پر ڈرائیور اور پچھلی پر چھوٹی میم صاحب موجود تھی۔ چھوٹی میم کی عمر اٹھائیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اسد اور بشیرے کا اندازہ تھا کہ وہ غیر شادی شدہ ہے۔ وہ درمیانی شکل و صورت کی تھی۔ رخساروں پر مہاسے تھے، تاہم رنگ خوب گورا چٹا تھا۔ باہر نکلتے ہوئے وہ اکثر کالا چشمہ لگاتی تھی۔ اس وقت بھی وہ کالا چشمہ لگائے ہوئے تھی۔ تراشیدہ بال پیشانی پر جھول رہے تھے۔

اُس نے بشیرے کی طرف اپنی اُنگلی اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ''تم بشیرے ہو نا...... تم نے ہمارے ہاں رنگ کا کام کیا تھا۔''

''جی میم صاحبہ...... میں بشیرا ہوں اور یہ میرا ساتھی انور ہے۔''

''کیا کر رہے ہو آج کل؟''

''آج کل تو ویلے ہی ہیں جی...... کوئی خدمت ہمارے لئے؟''

''ٹھیک ہے... کل تم کوٹھی پر آ جانا... تھوڑا سا رنگ کا کام ہے۔ کوٹھی کا پتہ یاد ہے نا؟''

''بالکل جی......'' بشیرے نے بتیسی نکالی۔

''اوکے...... خدا حافظ۔'' چھوٹی میم نے بشیرے کے ساتھ ساتھ اسد پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈالی اور ڈرائیور کو گاڑی بڑھانے کی ہدایت کی۔

اگلے روز دونوں کوٹھی پر پہنچ گئے۔ باؤنڈری وال پر رنگ کا کام تھا۔ بس سیدھے سیدھے برش ہی پھیرنے تھے۔ کام کی نوعیت دیکھ کر بشیرے اور اسد نے اطمینان کا

سانس لیا...... کوٹھی میں چھوٹی میم صاحب کے علاوہ ایک ادھیڑ عمر شخص اور ایک درمیانی عمر کی عورت کے علاوہ بارہ تیرہ سال کی لڑکی بھی تھی۔ مرد اور عورت دراصل چھوٹی میم صاحب کے ممی ڈیڈی تھے۔ کم عمر لڑکی اُس کی چھوٹی بہن تھی۔ یہ خاصا ایڈوانس گھرانہ تھا۔ چھوٹی میم صاحب کے علاوہ بڑی میم صاحب بھی کبھی کبھی پتلون پہنتی تھی۔ اُس کے بال کٹے ہوئے تھے۔ چھوٹی میم کی طرح اُس کی ممی بھی درمیانی شکل صورت کی تھی۔ اوپر سے وہ عمر کا لحاظ کئے بغیر حلیہ بھی عجیب وضع کا بنائے رکھتی تھی۔ اکثر وہ مضحکہ خیز نظر آتی تھی۔ صاحب جی صبح سویرے اپنے کام سے نکل جاتے تھے۔ دس گیارہ بجے کے لگ بھگ بڑی میم صاحبہ بھی اپنی سوزوکی کار خود ڈرائیو کر کے چلی جاتی تھی۔ نو عمر لڑکی کو ڈرائیور سکول چھوڑ آتا تھا۔ بعد ازاں گھر میں بس چھوٹی میم صاحبہ اور دو چار نوکر ہوتے تھے۔

چھوٹی میم صاحبہ کو بھی کوئی خاص کام کاج نہیں تھا۔ وہ گیارہ بجے کے قریب بیدار ہوتی تھی۔ اُس کی بیداری کا اعلان ڈیک کی گونجدار موسیقی سے ہوتا تھا۔ وہ مائیکل جیکسن اور میڈونا وغیرہ کے گانے سنتی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ تیار شیار ہو کر باہر لان میں آتی تھی۔ اسد اور بشیرے کے علاوہ دو تین کارپینٹر بھی کام سے لگے ہوئے تھے۔ وہ آدھ پون گھنٹے میں کام کا جائزہ لیتی تھی۔ کہنے کو تو وہ کام کا جائزہ لیتی تھی لیکن محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے ''جائزے'' کی خواہش رکھتی ہے۔ کاریگر حضرات اُس کی یہ خواہش ادھوری نہیں رہنے دیتے تھے۔ وہ چور نظروں سے اُس کا جائزہ لیتے رہتے تھے۔ کسی وقت تو وہ اتنا چست لباس پہن کر آتی تھی کہ اُس کے جانے کے بعد بھی اُس کی چکا چوند قرب و جوار میں موجود رہتی تھی۔

دوپہر کے بعد چھوٹی میم صاحبہ کی ایک دو سہیلیاں آ جاتی تھیں۔ وہ بھی اسی چال ڈھال اور حلیے کی تھیں۔ شام تک خوب ہلا گلا رہتا تھا۔ شام کو اسد اور بشیرا تو واپس آ جاتے تھے۔ اس کے بعد کا اُنہیں معلوم نہیں تھا۔

دو تین دن بعد اسد نے محسوس کیا کہ چھوٹی میم صاحب جب معائنے کے راؤنڈ پر آتی ہے تو اس کے قریب دیر تک رُکتی ہے اور زیادہ بے تکلفی سے بات کرتی ہے۔ ایک دن کہنے لگی۔ ''انورے! تم اپنی شکل صورت سے کاریگر نظر نہیں آتے۔ نہ ہی تمہارے کام کاریگروں والے ہیں۔''

"جی...... میں سمجھا نہیں۔"

"دیکھو! تم نے اپنے ہاتھ کہنیوں تک رنگ سے بھرے ہوئے ہیں۔ لگتا نہیں کہ تم پہلے بھی رنگ کرتے رہے ہو۔"

"بس جی آپ کے حکم پر رنگ زیادہ پتلا کیا ہے نا اس لئے پھیل رہا ہے۔" اسد نے جلدی سے بات بنائی۔

وہ اُسے ناقدانہ نظروں سے دیکھتی رہی، پھر کچھ سوچ کر بولی۔ "تم کوئی اور کام کیوں نہیں کر لیتے؟"

"کیسا کام جی؟"

"تم ڈرائیونگ کر سکتے ہو؟"

"بالکل جی..... ملتان میں میرے چاچے کی ویگن تھی۔ میں اُس کے ساتھ کنڈیکٹری کرتا رہا ہوں۔ کبھی کبھی چلا بھی لیتا تھا۔"

"واقعی؟" چھوٹی میم بے حد حیرت سے بولی۔ اسد نے اثبات میں سر ہلایا۔

میم صاحبہ نے کہا۔ یہ تو بڑی کمال کی بات ہوئی ہے...... چلو تم ایسا کرو...... تم چھوڑو یہ برش وغیرہ۔ ابھی چھوڑو......" اُس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اسد نے کچھ تذبذب کے بعد برش نیچے رکھ دیا۔ وہ بولی۔ "میں ابھی ڈرائیور رفیق کو کہتی ہوں۔ وہ تمہیں گاڑی پر اپنے ساتھ لے جایا کرے گا اور دو چار روز میں تمہارا ہاتھ سیدھا کر دے گا......"

"لیکن......"

"ہاں ہاں کہو......" میم صاحبہ نے اُسے حوصلہ دیا۔

"میرا تو لائسنس ہی نہیں ہے۔"

وہ زور سے ہنسی۔ یوں لگا جیسے اُس کا پورا جسم ہنس رہا ہے۔ پھر پیشانی سے بال جھٹک کر بولی۔ "لائسنس کی کوئی بات نہیں۔ اگر کہو گے تو ایروپلین کا لائسنس بھی بن جائے گا۔ ایروپلین سمجھتے ہونا...... ہوائی جہاز۔"

اسد نے بتیسی نکال کر اثبات میں سر ہلایا۔

اور پھر واقعی دس پندرہ روز میں سبھی کچھ ہو گیا۔ اسد کا شناختی کارڈ بنا اور پھر لائسنس

بن گیا۔ دونوں کاغذات پر اُس کا نام انور ولد محمد طفیل تھا۔ ڈرائیونگ تو اُسے آتی ہی تھی۔ وہ ڈرائیور رفیق کے ساتھ ڈرائیونگ سیکھنے کی ایکٹنگ کرتا رہا اور پھر مشاق ڈرائیور بن گیا۔ ڈرائیور رفیق کی ضرورت چھوٹی میم صاحبہ کی ممی کو تھی کیونکہ اُنہیں آج کل رات گئے تک گھر سے باہر رہنا پڑتا تھا۔ چھوٹی میم صاحبہ کی گاڑی اب اسد نے ڈرائیو کرنی شروع کر دی تھی۔ چھوٹی میم صاحبہ کی مہربانی سے اسد کے ساتھی بشیرے کی بھی پکی نوکری لگ گئی۔ چھوٹی میم صاحبہ کے ڈیڈی فیکٹری اونر تھے۔ فیکٹری کے گودام میں بوجھ اُٹھانے کے لئے مستقل مزدور رکھے جاتے تھے۔ بشیرے کا کام وہیں بن گیا تھا۔ وہ سوتا بھی فیکٹری میں ہی تھا۔

چھوٹی میم صاحبہ کا ڈرائیور بننے کے بعد اسد کو چھوٹی میم اور اہل خانہ کے بارے میں جاننے کا زیادہ موقع ملا۔ چھوٹی میم صاحبہ کا نام نیشا تھا۔ اُس کے دو بڑے بھائی تھے اور دونوں بیرونِ ملک "سیٹل" تھے۔ نیشا کے والد صبح کے گئے ہوئے رات گئے گھر لوٹتے تھے۔ کبھی کبھی وہ کلب بھی چلے جاتے تھے۔ ایسے میں اُن کی واپسی آدھی رات کے بعد ہوتی تھی۔ نیشا کی والدہ بھی خواتین کے ایک کلب کی سرگرم ممبر تھیں۔ اُنہوں نے بہت سی سماجی مصروفیات پالی ہوئی تھیں۔ وہ بھی سارا دن گھر سے غائب رہتی تھیں۔ نیشا کی چھوٹی بہن زلیخا کیمبرج کر رہی تھی۔ وہ بھی رات گئے تک اپنی اسٹڈی میں مگن رہتی تھی۔ ویسے بھی دونوں بہنوں میں بنتی نہیں تھی۔ ان حالات میں نیشا خود کو یکسر تنہا اور بے آسرا محسوس کرتی تھی۔ اُسے لگتا تھا کہ اُس کے بڑوں نے اُسے بالکل نظر انداز کر رکھا ہے۔ اُنہیں اُس کی خوشی غمی سے کوئی سروکار ہی نہیں ہے۔

یہی وجہ تھی کہ نیشا اپنی تنہائی اور اُداسی کی شدت کم کرنے کے لئے تیز میوزک سنتی تھی۔ چیختی چنگھاڑتی موویز دیکھتی تھی اور اُوٹ پٹانگ دوستیاں پالتی تھی۔ وہ بتدریج ایک بے راہرو امیر زادی کا رُوپ دھار رہی تھی۔ نیشا کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے اسد بہت محتاط رہتا تھا۔ وہ بڑی زیرک تھی۔ اسد کے منہ سے نکلے ہوئے چند غلط الفاظ کو اُس نے فوراً نوٹ کیا تھا۔ مثلاً ایک دن نیشا اپنی دو فرینڈز کے ساتھ شاپنگ کے لئے جا رہی تھی۔ راستے میں اُنہوں نے پھول خریدے۔ اسد گاڑی سے اُترا اور نیشا کی ہدایت کے مطابق گلاب کے پھول لے آیا۔ پھول کچھ مہنگے تھے۔ نیشا نے کہا۔

"پچھلی دفعہ تو پچاس روپے کے تھے۔ آج سو کے دیئے ہیں۔"

اسد کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "پھول مہنگے بک رہے ہیں...... کل ویلنٹائن ڈے ہے نا......"

نیشا چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ پھر اسی طرح ایک دن وہ نیشا اور اُس کی ایک دوست کو ایک تیسری دوست کی طرف لے جا رہا تھا۔ ایک کار والے نے پیچھے سے آ کر اُن کی کار کو ٹکر مار دی تھی۔ اسد باہر نکل کر کار ڈرائیور سے تکرار کرنے لگا تھا۔ تکرار میں ہی اُس نے کہیں کار والے کو باسٹرڈ کہہ دیا تھا۔ بعد ازاں نیشا اور اُس کی دوست اسد کی انگریزی پر حیرت کا اظہار کر رہی تھیں۔ ایک دو بار ایسا بھی ہوا تھا کہ پچھلی نشست پر بیٹھ کر نیشا اور اُس کی فرینڈ نے کسی موضوع پر غلط سلط باتیں کی تھیں اور اسد کا دل مچل گیا تھا کہ اُن کی معلومات کو درست کرے۔ نیشا کی ایک دوست خود کو انگلش گلوکارہ میڈونا پر اتھارٹی سمجھتی تھیں اور اُس کے حالات زندگی کے بارے میں ایسی اُلٹی سیدھی باتیں بتاتی تھی کہ اسد اندر سے کھول کر رہ جاتا تھا۔

پھر ایک روز نیشا کی ایک دوست نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے کرکٹ پر بات شروع کر دی۔ وہ انگلینڈ اور پاکستان کے درمیان ہونے والی کسی پرانی ٹیسٹ سیریز کی بات کر رہی تھی۔ اور دعویٰ کر رہی تھی کہ وہ سیریز پاکستان نے دو صفر سے جیتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی وہ اس سیریز کے حوالے سے دو چار غلط باتیں کر رہی تھی۔ نیشا نے اُس کی غلطی پکڑ لی تھی مگر وہ مان نہیں رہی تھی۔ دونوں میں تکرار نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ باقاعدہ شرطیں لگ گئیں۔ کبھی وہ دونوں انگلش میں بولنے لگتیں کبھی اُردو میں...... آخر نیشا نے اسد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"انور! تمہیں کچھ پتہ ہے کرکٹ کے بارے میں؟"

"جی تھوڑا بہت۔"

"بتاؤ باؤلر کی ہیٹ ٹرک اگلے اوور میں ہو سکتی ہے یا نہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ ہو سکتی ہے جی...... اگر باؤلر اپنے اوور کی آخری دو گیندوں پر دو وکٹیں لے تو اپنے اگلے اوور کی پہلی گیند پر اُس کی ہیٹ ٹرک ہو سکتی ہے۔"

"لو جی...... خواجے کا گواہ ڈڈو......" لڑکی نے چیخ کر کہا۔ "تم اس بے چارے کو

ڈرائیونگ ہی کرنے دو تو بہتر ہے۔"

اس فقرے کے بعد اسد بھی غیر ارادی طور پر اس بحث میں شامل ہو گیا۔ اُس کی معلومات نے دو چار منٹ میں ہی بحث کرنے والی لڑکی کا منہ بند کر دیا۔

گھر جا کر نیشا نے اسد کو اپنے کمرے میں بلایا۔ اس وقت وہ اکیلی تھی۔ آدھی آستین کی قمیض اور چست پتلون میں وہ جذبات انگیز نظر آ رہی تھی۔ اپنے ناخنوں کو پالش لگاتے ہوئے اُس نے اسد کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اسد بیٹھ گیا۔ وہ بولی۔

"کتنا پڑھے ہوئے ہو؟"

اسد نے کہا۔ "ایف۔ اے کی تیاری کر رہا تھا جی۔ پھر گھریلو پریشانیوں کی وجہ سے ایک دم محنت مزدوری کی طرف آنا پڑ گیا۔"

"تم میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ تم اپنے آپ کو ضائع مت کرو۔ میرا تو مشورہ ہے کہ تم اس ملازمت کے ساتھ ساتھ اپنی پڑھائی بھی جاری رکھو۔ رات آٹھ نو بجے کے بعد تو تم فارغ ہی ہوتے ہو۔ اس کے بعد پڑھا کرو۔"

"جو آپ کا حکم......"

وہ اُٹھ کر ایک الماری کی طرف گئی اور وہاں سے آسان انگریزی کی ایک سٹوری بُک نکال لائی۔ بُک اُسے تھماتے ہوئے بولی۔ "یہاں سے پڑھو۔"

اسد جان بوجھ کر اٹک اٹک کر پڑھنے لگا۔ وہ بڑے انداز سے سامنے صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔ جسمانی خدوخال اُس کے لیٹنے کے سٹائل سے نمایاں تر ہو گئے تھے۔ ویسے تو وہ کتاب پڑھنے کو کہہ رہی تھی لیکن لگتا تھا کہ خود کو "پڑھوانا" چاہ رہی ہے۔ اسد اُس کی مرضی جانتے ہوئے دونوں کام کرتا رہا۔ آخر اُس کی وجہ سے سخت محنت مشقت سے اس کی جان چھوٹی تھی، اس کے سر کو چھت ملی تھی۔ سڑک پیمائی کے خطرات سے چھٹکارا ملا تھا۔

اگلی دو چار ملاقاتوں میں اسد پر سب کچھ عیاں ہو گیا۔ وہ اس "میدان" کا ماہر کھلاڑی تھا۔ اُسے پتہ تھا کہ آنکھیں کیسے بولتی ہیں اور اعضا کیسے مدعا بیان کرتے ہیں؟ نیشا کے خاموش اشارے بھی اُسے بادبان کھولنے کا مشورہ دے رہے تھے۔ لیکن ایک گمبھیر طوفان میں گھرنے کے بعد وہ بادبان کھولنے سے کترانے لگا تھا۔ پتہ نہیں کیا بات

تھی، اب وہ ان معاملات سے بچنا چاہتا تھا۔ اُس کے دل میں کوئی اُمنگ ترنگ باقی نہیں رہی تھی۔ رات دن پھانسی کا ایک پھندا اُس کی آنکھوں کے سامنے جھولتا رہتا تھا اور اپنے بچھڑ جانے والے پیاروں کی صورتیں اُس کی نگاہوں میں گھومتی تھیں۔ ان میں شمیم بھی شامل تھی۔ بہت پیاری بھی اور شاید بہت قابل نفرت بھی...... وہ راتوں کو روتا تھا اور سویرے اپنے آنسو خشک کر کے روز کے کام کاج میں لگ جاتا تھا۔

کہتے ہیں کہ جب عورت کسی کام کا ارادہ کر لیتی ہے تو پھر اُس کے لئے اسباب اور حالات بھی پیدا کر لیتی ہے...... نیشا نے اپنے اور اسد کے درمیان تکلف کی دیوار گرانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس کے لئے اسباب پیدا کرنے بھی زیادہ مشکل نہیں تھے۔ پتہ نہیں کہ وہ ایسے کتنے مرحلوں سے گزر چکی تھی اور اپنے والدین کی غفلت کے سبب کتنے مرحلوں سے گزرنے والی تھی؟ وہ جب بھی اسد کو دیکھتی تھی اُس کی آنکھوں میں ایک بھوک سی چمکنے لگتی تھی...... ایک روز نیشا کے ڈیڈی نے لاہور جانا تھا۔ اُنہوں نے نیشا سے اصرار کیا کہ وہ اُنہیں چھوڑنے ایئر پورٹ جائے۔ نیشا کو ڈیڈی کے پاس بیٹھنے اور اُن سے بات کرنے کا موقع کم ہی ملتا تھا شاید یہی وجہ تھی کہ وہ تیار ہو گئی۔ باپ بیٹی پیچھے بیٹھے تھے۔ اسد گاڑی چلا رہا تھا۔ نیشا کے ڈیڈی کی موجودگی میں اسد بے حد خاموش اور محتاط رہتا تھا۔ اُن کی تیز نکیلی نظر اسد کو برمے کی طرح اپنے دماغ میں گھستی محسوس ہوتی تھی۔ نجانے کیوں اُسے لگتا تھا کہ یہ بارُعب شخص کچھ دیر اُس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا تو اس کے دماغ میں موجود ہر سوچ کو پڑھ لے گا، اور پھر ایک دم قاتل قاتل کہہ کر اس کو پکڑ لے گا۔ نیشا کے ڈیڈی ایک سخت گیر شخص تھے۔ نوکر چاکر تو کجا گھر والے بھی اُن کے سامنے سہمے رہتے تھے۔

ڈیڈی کو چھوڑ کر جب وہ اور نیشا واپس آ رہے تھے، نیشا نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”انور! تمہیں دو تین بار پہلے بھی کہہ چکی ہوں یہ عادت چھوڑ دو۔“

”کک...... کون سی؟“

”چرس والی...... گندا نشہ ہے۔ آج بھی تمہارے منہ سے بو اُٹھ رہی ہے۔ یہ تو خدا کا شکر ہوا ہے کہ ڈیڈی کا دھیان اس طرف نہیں گیا ورنہ انہوں نے تمہیں چلتی گاڑی سے سڑک پر پارسل کر دینا تھا۔“

اسد نے چور نظروں سے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ غصے کے باوجود نیشا کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی تھی۔ اُس نے آج کل ڈیانا کٹ بال بنائے ہوئے تھے، کانوں میں نئے سٹائل کے بندے تھے۔ ڈیانا کٹ سٹائل اُس پر کچھ سجا نہیں تھا۔ اُس کے رخساروں کے مہاسے بھی اس کے چہرے کے مجموعی تاثر کو گہناتے تھے۔ گھر پہنچ کر گاڑی سے اُترتے ہوئے نیشا نے اسد کو ہدایت کی کہ گاڑی کو گیراج میں کھڑا کرنے کے بعد وہ اُس کے کمرے میں آئے......

اسد پہنچا تو وہ اکیلی ہی تھی۔ ”کہاں ہے وہ؟“ نیشا نے اُس کے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

”کیا کہاں ہے؟“

”وہی جو پیتے ہو...... بھرے ہوئے سگریٹ۔“

”وہ تو...... بس ویسے ہی ایک سگریٹ......“

”انور! مجھے بناؤ مت۔ ادھر میرے پاس آؤ۔“ وہ بات کاٹ کر بولی۔

اسد ایک دم آگے بڑھ گیا۔ نیشا نے بڑی بے تکلفی بلکہ بے حجابی سے اُس کی پتلون کی جیبیں ٹٹولنا شروع کر دیں۔ اُس نے اسد کی پوری جامہ تلاشی لی اور قمیض کی ایک اندرنی جیب سے ”پری مارکہ“ نکالنے میں کامیاب رہی۔ سگریٹ سونگھ کر اُس نے ناک چڑھائی اور بڑی ادا سے بولی۔ ”نشہ ہی کرنا ہے تو کوئی اچھا کرو۔ کسی کو پتہ بھی چلے تو رُعب پڑے...... اُونچی سوسائٹی کا نشہ۔“

وہ دوسرے کمرے میں گئی۔ چند لمحے بعد واپس آئی تو کوئی شے لفافے میں لپٹی ہوئی اُس کے ہاتھ میں تھی۔ یہ دیکھ کر اسد دنگ رہ گیا کہ یہ ولایتی شراب کی بوتل تھی۔ بوتل دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ کوئی بہت قیمتی شراب ہے۔ جن دنوں اسد گلبرگ والے فلیٹ میں رہ رہا تھا، ایک دو بار ماڈرن دوستوں کی محفل میں اُس نے اس ”خانہ خراب“ کا ذائقہ چکھا تھا...... لیکن بس چکھنے کی حد تک۔ آج ایک جوان لڑکی، کمرے کی تنہائی میں اُسے یہ ہوشربا چیز پیش کر رہی تھی۔ نہ صرف پیش کر رہی تھی بلکہ پینے کی دعوت بھی دے رہی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ دعوت دینے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اسد کو کسی نیکی پر راغب کر رہی ہو۔

اُس روز اسد نے پہلی بار نشے کی غرض سے شراب پی۔ وہ اپنے سرونٹ کوارٹر میں رات گئے تک جاگتا رہا اور انگور کی بیٹی سے دل بہلاتا رہا...... پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ دو چار دن میں پہلی بوتل ختم ہوگئی تو نیشا کی طرف سے دوسری مل گئی۔ اس چار دیواری میں یہ شے نایاب نہیں تھی۔ اس کوٹھی میں ہونے والی ایک محفل میں اسد نے صاحب خانہ اور اُن کے دوستوں کو بے تکلفی سے یہ شغل کرتے دیکھا تھا۔ جہاں تک اسد کا خیال تھا بڑی میم صاحبہ بھی اس علت سے پاک نہیں تھیں۔ صبح کو اُن کی آنکھیں بھی اکثر سوجھی ہوئی نظر آتی تھیں۔

شراب کے نشے میں اسد کبھی تو سب کچھ بھول جاتا تھا لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ چھوٹی سے چھوٹی باتیں بھی یاد آنے لگتی تھیں۔ ماضی کی طرف ایک کھڑکی سی کھل جاتی تھی اور اس کھڑکی میں سے گزرا ہوا ایک ایک لمحہ دکھائی دینے لگتا تھا...... وہ آرام سے لیٹ کر آنکھیں بند کر لیتا۔ ایسے میں اپنے گھر کے در و دیوار اُس کی نگاہوں کے سامنے آ جاتے۔ اہل خانہ کے چہرے تصور میں چمکتے اور وہ چہرہ بھی جو اُس کے دل کا انمٹ داغ تھا۔ وہ شمیم کے بارے میں سوچتا...... ان گنت اندیشے اُس کے ذہن میں کلبلاتے، اُن میں ایک بھیانک اندیشہ یہ بھی ہوتا کہ شاید شمیم کسی کی دُلہن بن کر کسی کے آنگن میں اُتر چکی ہو۔ اُس کے جی میں آتا کہ ایک بار...... کم از کم ایک بار شمیم کے بارے میں جاننے کی کوشش کرے۔ ٹیلیفون کے ذریعے یہ رابطہ با آسانی کیا جا سکتا تھا۔ مگر جب بھی وہ اس خیال کو عملی جامہ پہنانا چاہتا ایک دیوار سی اُس کے راستے میں حائل ہو جاتی...... یہ دیوار اسد کی اپنی ہی اُٹھائی ہوئی تھی اور اس کا مقصد اپنے حال کو اپنے ماضی سے جدا رکھنا تھا۔ یکسر جدا...... وہ اپنے ماضی کو پلٹ کر دیکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

پھر کسی وقت ماں کی شکل اُس کی نگاہوں میں گھومتی اور وہ آبدیدہ ہو جاتا۔ اُسے وہ بھیانک واقعہ یاد آتا جس نے اُس کی ماں کو اُس سے جدا کیا اور خود اُسے بھی اُڑا کر کہاں سے کہاں لا پھینکا۔ فریحہ کا خیال اُس کے ذہن میں آتا اور سینے میں انگارے بھر جاتے۔ یہ فریحہ ہی تھی جس نے اپنی ناکامیوں کا بدلہ اسد سے یوں لیا تھا کہ وہ سراپا آہ بن گیا تھا۔ سچ کہتے ہیں کہ شکلیں دھوکہ دیتی ہیں۔ اسد سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کسی سٹیج پر فریحہ ایسا سنگین قدم اُٹھا سکتی ہے۔

کرکٹ کی طرف سے اسد کا دھیان بالکل ہٹ گیا تھا۔ لیکن پھر بھی کسی وقت وہ اخبار یا ٹی وی میں کرکٹ کی کوئی جھلک دیکھتا تو اُس کے دل کے اندر خون سا رِسنے لگتا۔ ایسے میں نجانے کیوں قدیر صاحب کی تصویر اُس کے پردۂ تصور کو ڈھانپ لیتی۔ اُسے احساس ہوتا کہ اُس نے جانی بھائی کی باتوں میں آ کر اپنے حقیقی محسن قدیر صاحب سے زیادتی کی تھی اور یہ زیادتی قدیر صاحب کے ساتھ ہی نہیں اُس کے اپنے ساتھ بھی تھی۔ وہ سوچتا کاش اُس نے ''اے ون کلب'' اور قدیر صاحب کی طرف سے رُخ موڑ کر بینک ٹیم کی نحوست میں قدم نہ رکھا ہوتا۔

ایک اور تصور جو اسد کو آزردہ کر دیتا تھا اپنے دوست نذیر احمد کا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ نذیر احمد، اسد کا دوست ہی نہیں اُس کا نہایت مخلص اور دانا مشیر بھی تھا۔ اُس کے قیمتی اور سنجیدہ مشوروں نے اسد کو اکثر مشکلات میں سے نکالا تھا۔ اگر موجودہ حالات میں نذیر اُس کے ساتھ ہوتا تو شاید یہ حالات اتنے کٹھن نہ ہوتے...... اسد دل کی گہرائی سے نذیر احمد کی عزت کرتا تھا۔ گہری دوستی کے باوجود دونوں کے درمیان ایک پردہ سا موجود تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عبداللہ سے تو وہ اپنے ہر معاشقے کا ذکر مرچ مسالہ لگا کر کرتا تھا لیکن نذیر سے چھپا جاتا تھا۔ اُسے پتہ تھا کہ اگر نذیر کو معلوم ہوا تو وہ ایک سکول ماسٹر کی حیثیت سے اُس کی کلاس لے لے گا اور اخلاقیات پر ایک لمبا چوڑا لیکچر پلائے بغیر نہیں ٹلے گا...... شمیم کے حوالے سے بھی اسد اور نذیر کے خیالات کافی مختلف تھے۔ نذیر کے نزدیک شمیم ایک مشرقی لڑکی کی حیثیت سے مجبور و بے بس ہستی تھی۔ نذیر کا کہنا تھا کہ اسد نے فلموں، ڈراموں کی ہیروئنوں سے متاثر ہو کر شمیم سے نہایت غلط توقعات وابستہ کر رکھی ہیں۔

نذیر احمد کا خیال آتا تھا تو پھر کئی بھولی بسری باتیں اسد کے ذہن میں آنے لگتی تھیں اور وہ نہ چاہنے کے باوجود گھنٹوں ماضی میں گم رہتا تھا...... اسی طرح دن گزرتے جا رہے تھے۔

○

ایک روز اسد اپنے یار بشیرے سے ملنے فیکٹری گیا ہوا تھا۔ گاڑی اسد کے پاس تھی۔ وہ بشیرے کو سیر کرانے لے گیا۔ دونوں دیر تک کینٹ کے علاقے میں گھومتے رہے۔

ایک دُکان سے تکے وغیرہ بھی کھائے۔ بشیرا، اسد کی اس ترقی پر بڑا خوش تھا۔ اسد نے اُسے بتایا کچھ نہیں تھا، پھر بھی اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ چھوٹی میم اُس پر ''خاص انداز'' سے مہربان ہے۔

رات دس بجے کے قریب اسد نے بشیرے کو چپکے سے فیکٹری کے سامنے اُتارا اور گاڑی لے کر واپس کوٹھی پر آ گیا۔ ابھی سرونٹ کوارٹر میں پہنچا ہی تھا کہ اُس کے ساتھی ملازم بخشو نے اُسے بتایا۔ ''چھوٹی میم صاحب نے تمہیں بلایا ہے۔ اُن کی طرف سے دو بار تمہارے لئے پیغام آیا ہے۔''

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ اِس سے پہلے کبھی اتنی رات گئے نیشا نے اسد کو طلب نہیں کیا تھا۔ اسد کا ماتھا ٹھنکا۔ آج بڑے صاحب اور بڑی میم صاحب بھی گھر پر نہیں تھیں...... اُنہیں سہ پہر کے وقت کسی کام سے اچانک کراچی جانا پڑ گیا تھا۔ اسد کی چھٹی حس نے پکار کر کہا کہ آج دال میں کچھ کالا ہے۔ آج سے چند ماہ پہلے وہ اس قسم کے حالات میں بہت خوش ہوا کرتا تھا۔ لڑکی اُسے ایک ایسی پسندیدہ ڈش کی طرح نظر آیا کرتی تھی جسے دیکھ کر بندے کے معدے میں اُودھم مچ جاتا ہے۔ مگر اب صورتحال مختلف تھی۔ نیشا کے حوالے سے اُس کے اندر کوئی خاص طلب پیدا نہیں ہوئی تھی۔ شاید اس کی وجہ اسد کے غیر یقینی حالات تھے اور پھانسی کا وہ پھندا تھا جو ہمہ وقت اُس کی نگاہوں میں جھولتا رہتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ نیشا معمولی شکل وصورت کی لڑکی تھی، بلکہ اُسے عمر کے لحاظ سے عورت بھی کہا جا سکتا تھا۔

وہ کتنی ہی دیر سوچتا رہا، کیا کرے؟ نیشا کی طرف جائے یا کوئی بہانہ کر لے...... لیکن پھر اُس کے قدم کوٹھی کے رہائشی حصے کی طرف اُٹھ ہی گئے۔ گھریلو ملازمہ آسیہ سو چکی تھی۔ نیشا کے بیڈ رُوم کی بتی جل رہی تھی۔ اسد نے دستک دی تو نیشا ہی نے دروازہ کھولا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھی۔

''جی آپ نے بلایا تھا مجھے؟'' اسد نے پوچھا۔

''ہاں...... یہ پنکھا تیز نہیں ہوتا۔ پتہ نہیں ریگولیٹر خراب ہے۔ تم تھوڑی بہت مکینکی کر لیتے ہو۔ دیکھو ذرا......''

اسد نے سوئچ بورڈ کھولا اور تاریں وغیرہ دیکھنے لگا۔ نیشا اُس کے سامنے صوفے پر

بیٹھ گئی اور باتیں کرنے لگی۔ اُس کی ہر بات میں لگاوٹ اور دعوت نمایاں تھی۔ وہ ہر ممکن طریقے سے اسد کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ اُس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا......

اسی دوران اُس نے فریج کھولا۔ اسد نے سمجھا شاید وہ اُسے ٹھنڈا پانی پلا رہی ہے۔ لیکن جب اُس نے پیشانی سے پسینہ پونچھ کر نیشا کی طرف دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ نیشا کے گورے گورے ہاتھ میں بیئر سے لبالب بھرا ہوا کنگ سائز گلاس تھا۔

''لو پیو......'' اُس نے ادا سے کہا۔

معمولی تذبذب کے بعد اسد نے گلاس لے لیا۔ پیاس بھی لگی ہوئی تھی۔ وہ پورا چڑھا گیا۔ بڑی سرعت سے اُس کے ہاتھ پاؤں بھاری ہو گئے اور نشہ اپنا اثر دکھانے لگا۔ اسد نے اندازے سے دو تار جوڑے تو پنکھا تیز ہو گیا۔ لیکن پھر اچانک اسپارک ہوا اور کمرے کی لائٹ بجھ گئی...... یعنی ایک کام ٹھیک ہوا تو دوسرا خراب ہو گیا...... لیکن نیشا کے نقطۂ نظر سے شاید یہ بھی خراب نہیں ہوا تھا۔ یہ ''تاریک اتفاق'' اُس خلا کو پُر کرنے میں مددگار ثابت ہو گیا جو پچھلے دس پندرہ روز سے مسلسل اسد اور نیشا کے درمیان موجود تھا۔ تاریکی میں نیشا سوئچ بورڈ کی طرف بڑھی تو اسد سے ٹکرا گئی۔ خدا جانے یہ ٹکر قصداً تھی یا سہواً۔

اس ٹکر نے وہی اثر کیا جو دو غلط تاروں کے ملاپ نے کیا تھا۔ تاروں نے لائٹ کا فیوز اُڑایا تھا، جسم کی ٹکر نے ہوش وخرد کا فیوز اُڑا دیا...... وہ ایک دوسرے میں اُلجھے تو پھر اُلجھتے چلے گئے۔ اُس دن اسد کو پہلی بار پتہ چلا کہ یہ الکحل اپنے اندر کیسی گناہ آلود طغیانی رکھتا ہے۔ وہ نیشا کو اپنی بانہوں میں بھینچتا چلا جا رہا تھا...... نیشا خوب صورت نہیں تھی۔ مگر جوان تو تھی اور پھر گناہ کا اپنا ایک ''مومینٹم'' ہوتا ہے۔

اسد پہلے بھی کئی لڑکیوں کے ساتھ اس قسم کی صورت حال سے گزرا تھا۔ لیکن ایک حد پر پہنچ کر وہ اپنے قدم روک لیتا تھا۔ وہ آج بھی اپنے قدم روک لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ کیونکہ شمیم آج بھی اُس کے دل کا داغ تھی۔ وہ لاشعوری طور پر آج بھی خود کو اُس کے لئے محفوظ رکھنا چاہتا تھا...... (جس کے ملنے کا امکان دُور دُور نہیں تھا)۔ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی اپنی حد پر رُک جانا چاہتا تھا۔ لیکن قدم پھسلتے جا رہے تھے...... دماغ پر ایک عجیب سی دُھند چھائی ہوئی تھی۔ وہ اپنے اندر ہی چیخ رہا تھا، تڑپ رہا تھا۔ مگر کوئی

شے اُسے من چاہی سمت میں بہائے لئے جا رہی تھی.......انسان کے ارادوں سے کیا ہوتا ہے؟ انسان تو ایک کمزور سی شے ہے۔ ہونی کی کشش چاند تاروں کو اُن کے محور سے ہٹا دیتی ہے۔ اس کوٹھی کے اس تاریک کمرے میں اسد کا پندار ٹوٹ گیا...... وہ جو خود کو ایک چٹان سمجھتا تھا، منہ زور بہاؤ میں اوندھے منہ گرا اور ریزہ ریزہ ہو گیا......

کمرے کی گناہ آلود تاریکی میں ابھی گمراہ سرگوشیوں کی گونج باقی تھی کہ اچانک بیڈ رُوم کا دروازہ دھڑ دھڑ بجا...... نیشا تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کا دل بھی اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ رہی سہی کسر ایک بھاری بھرکم آواز نے پوری کر دی...... یہ نیشا کے ڈیڈی کی آواز تھی......

''دروازہ کھولو نیشا...... میں کہتا ہوں دروازہ کھولو......'' نیشا کے ڈیڈی نے غراتے ہوئے کہا۔

اندھیرے میں اسد، نیشا کے تاثرات تو نہیں دیکھ سکتا تھا، ہاں اپنے بارے میں اُسے معلوم تھا کہ وہ سرتا پا کانپ رہا ہے اور اس کے چہرے پر بھی ہلدی کا رنگ ہے۔ وہ زندگی میں شاید ہی کبھی اتنا خوفزدہ ہوا تھا۔ پھر اُس نے چٹخنی گرنے کی آواز سنی۔ چار و ناچار نیشا نے دروازہ کھول دیا تھا۔ دروازہ کھلا تو برآمدے کی ٹیوب لائٹ نے کمرے کو نیم روشن کر دیا۔ نیشا خوفزدہ بیڈ کے قریب کھڑی تھی۔ اسد سہا ہوا دروازے کی اوٹ میں تھا۔ وہ اس تاک میں تھا کہ اُسے راستہ ملے اور وہ دروازے سے نکل بھاگے لیکن ایسا ہونا عملاً ممکن نہیں تھا۔ نیشا کا لحیم شحیم ڈیڈی پورے دروازے کو گھیرے کھڑا تھا۔ اُس کی شعلہ بار نظریں نیشا پر مرکوز تھیں...... پھر اُس کی نگاہ اسد پر پڑی۔ آنکھوں میں بھڑکتے ہوئے شعلے ایک دم آسمان کو چھونے لگے۔ اس آگ میں حیرت کی بجلی بھی کوند رہی تھی جیسے وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا ہو ''یا خدا! میں زمین میں سما کیوں نہیں جاتا...... میری بیٹی ایک شخص کے ساتھ بند کمرے میں پائی گئی ہے، اور وہ بھی ایک نوکر کے ساتھ......''

وہ ایک قدم آگے بڑھا۔ زناٹے کا ایک تھپڑ نیشا کے گال پر پڑا۔ وہ لڑکھڑا کر دیوار کے ساتھ جا لگی۔ اُس کی آنکھوں میں خوف تو تھا لیکن ایک طرح کا باغیانہ پن بھی تھا...... پھر وہ غضب ناک شخص اسد کی طرف متوجہ ہوا۔ اسد نے پہلو بچا کر دروازے میں سے نکلنے کی کوشش کی مگر سیٹھ کے بھاری بھرکم ہاتھ نے اُس کا گریبان دبوچ لیا۔

ایک موٹی گالی دے کر اُس نے اسد کو زور سے دھکا جو دیا تو وہ بیڈ پر جا گرا...... اُس کا سارا بدن خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ الکحل کا سرور جو تھوڑی دیر پہلے تک اُس کی رگوں میں جلترنگ بجا رہا تھا اب ایک دم ہوا ہو گیا تھا......

ڈیڑھ دو سال پہلے تک اسد ایک چست اور برق رفتار نوجوان کا نام تھا۔ لیکن گزرتے ہوئے وقت نے اُس کی بیشتر چستی اور برق رفتاری چرس کے دُھویں کے ساتھ اُڑا دی تھی۔ وہ خود کو اندر سے کھوکھلا محسوس کرتا تھا...... آج اس کمرے میں نیشا کے پُرغضب باپ کے سامنے اُس کا دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے ابھی پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ نیشا کے باپ نے اُس کے سینے پر ٹانگ رسید کی اور پھر دو ہنٹر مار کر فرش پر گرا دیا۔ فرش پر گرتے ہوئے اسد نے دیکھا نیشا جان بچا کر کمرے سے نکل رہی تھی۔

اس دوران میں نیشا کے والد کی نگاہ بیڈ کے نیچے کسی شے پر پڑی۔ اُس نے جھک کر یہ شے اُٹھا لی۔ یہ ایک ہاکی تھی...... ہاکی کا پہلا وار تو اسد نے اپنی کلائی پر روکا، لیکن پھر سب کچھ اُس کے بس سے باہر ہو گیا...... شدید ضربیں اُس کے پورے جسم کو جھنجھوڑنے لگیں۔ وہ کراہ رہا تھا، قالین پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا مگر ان ضربوں سے کہیں پناہ نہیں تھی۔ اُس نے ایک دو بار سیٹھ صاحب کی ٹانگیں پکڑ کر اُٹھنے کی کوشش کی لیکن پے در پے ضربوں نے اُسے پھر سے زمین بوس کر دیا۔ وہ فریادی لہجے میں پکارنے لگا۔ ''سیٹھ صاحب! میری بات سنیں...... سیٹھ صاحب...... خدا کے لئے میری بات سنیں......''

پھر اُس نے محسوس کیا کہ ہاکی کی ایک زوردار ضرب نے اُس کے بائیں بازو کی ہڈی توڑ دی ہے...... اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ اُس کے دل نے پکار کر کہا...... ''اگر تم چند سیکنڈ کے اندر یہاں سے بھاگ نہ سکے تو یہ وحشی تمہیں یہیں قتل کر دے گا۔''

وہ اپنی رہی سہی قوت جمع کر کے ٹانگوں پر کھڑا ہوا اور ایک دم پلٹ کر بیڈ کی طرف گیا۔ بیڈ کے ساتھ ایک کھڑکی بھی تھی۔ وہ بیڈ پر چڑھا اور کھڑکی کھول کر باہر کوریڈور میں کود گیا...... اس عمل کے دوران بھی دو تین ضربیں اُس کی پیٹھ پر لگی تھیں۔

اُس نے سرونٹ کوارٹرز کی طرف سے شور کی آواز سنی۔ یقیناً سیٹھ صاحب کی چیخم دھاڑ سن کر ملازم اس خواب گاہ کی طرف دوڑے آ رہے تھے۔ اُس نے یکایک رُخ پھیر

کر عقبی لان کی طرف دوڑ لگائی۔ بھاگتے ہوئے چپل اُس کے پاؤں سے نکل گئی تھی۔ اب وہ ننگے پاؤں تھا۔ باؤنڈری وال زیادہ اُونچی نہیں تھی۔ ایک طرف کھاد کا چھوٹا سا ڈھیر بھی لگا تھا۔ اسد ڈھیر پر چڑھا، وہاں سے دیوار پر آیا اور باہر کود گیا۔ اندر سے بھاگ دوڑ کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں...... اسد کے پاؤں پر بھی چوٹ آئی تھی۔ وہ جان بچانے کے لئے لنگڑاتا ہوا مین سڑک کی طرف دوڑا۔ گہری تاریکی تھی اور سڑک سنسان ...... ورنہ کوئی دلیر راہ گیر اُسے ضرور دبوچ لیتا۔ مین سڑک سے چند گز دُور ہی اُسے ایک رکشہ کھڑا نظر آیا۔ وہ بغیر سوچے سمجھے رکشے میں گھس گیا۔

رکشے والے نے گھوم کر اُس کی طرف دیکھا۔ ''یادگار چوک چلو......'' اسد نے اپنی آواز کی لرزش پر حتی الامکان قابو پاتے ہوئے کہا۔

رکشے والا چند لمحے تذبذب میں رہا، پھر اُس نے رکشہ سٹارٹ کر دیا......!

○

جس وقت اسد مار کھا کر نیشا کے گھر سے بھاگا تھا اُس کی جیب میں صرف پندرہ روپے تھے۔ یہ پندرہ روپے اُس نے منت سماجت کر کے رکشے والے کو تھما دیئے تھے۔ اُس کے بعد جو کچھ اُس پر بیتی، وہ کچھ اُسے ہی پتہ تھا۔ بازو کی چوٹ ٹھنڈی ہو کر ناقابل برداشت ہو گئی۔ کہنی سے اُوپر بازو کی ہڈی اس بری طرح ٹوٹی تھی کہ بازو گول مٹول ہو کر رہ گیا تھا۔ اس بڑی چوٹ کے علاوہ بھی جسم پر کئی چھوٹی بڑی چوٹیں تھیں اور پھٹے ہوئے ہونٹوں سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔

بازو کی تکلیف سے لاچار ہو کر اُس کا دل چاہا کہ سرکاری ہسپتال میں چلا جائے اور خود کو کسی بیڈ پر یا ہسپتال کے فرش پر گرا دے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ہسپتال کا داخلہ بعد میں حوالات کا داخلہ بھی بن سکتا ہے اور حوالات کا داخلہ آگے چل کر اُسے پھانسی کی کوٹھڑی میں بھی داخل کر سکتا ہے......لڑکی کے معاملات میں اکثر لواحقین پولیس میں رپورٹ نہیں کرتے لیکن سیٹھ جس ٹائپ کا شخص تھا اور وہ جتنا غضب ناک نظر آ رہا تھا اُس سے کچھ بعید نہیں تھا۔ اگر وہ پولیس میں رپوٹ درج کرا چکا تھا تو پھر پولیس نے سب سے پہلے اُسے ہسپتال وغیرہ میں ہی ڈھونڈنا تھا۔

وہ گندے نالے کے ایک پل کے نیچے جا چھپا اور ساری رات وہاں شدید تکلیف

میں تڑپتا رہا۔ صبح اُجالے سے پہلے اُس غلیظ جگہ پر تین نشئی اور آ گئے۔ اُن میں سے دو تو کچھ دیر وہاں کش لے کر چلے گئے لیکن ایک جو نسبتاً بڑی عمر کا تھا، وہیں رہا۔ اُس نے اسد کے قریب آ کر اُسے سگریٹ کی پیشکش کی جو اسد نے قبول کر لی۔ یہ سگریٹ بھی بری مارکہ سے ملتا جلتا تھا۔ چند کش لینے کے بعد اسد کو بازو کی تکلیف کچھ کم محسوس ہونے لگی۔

''خو کہاں سے مار کھایا ہے تم نے؟'' اُس شخص نے پوچھا۔

''مزدوری کیا تھا......ٹھیکیدار پیسہ نہیں دے رہا تھا۔ میرا نشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ بس جھگڑا ہو گیا۔ اُس ظالم نے مار مار کر ہڈیاں نرم کر دیں۔ اُوپر سے چوری کے الزام میں پکڑانے کی دھمکیاں بھی دی تھیں۔

''ہوتا ہے...... ہوتا ہے...... ایسا بھی ہوتا ہے۔'' پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''کوئی ٹھکانہ ہے رہنے کو؟''

''نہیں...... اب تو کوئی نہیں۔''

''تو چلو آوَ امارے ساتھ......ام تم کو ٹھکانہ دے گا اور کھانا بھی۔''

اُس شخص نے اسد کو ایک میلی کچیلی چادر دی۔ یہ چادر اسد نے جسم کے گرد لپیٹ لی اور لنگڑاتا ہوا اپنے میزبان کے ساتھ چل دیا۔ اُس شخص کا نام ظفری تھا۔ وہ درمیانی عمر کا گندا سا شخص تھا۔ ایک آنکھ میں گہرا سفید داغ سا تھا۔ شکل وصورت بھی نشیوں جیسی تھی۔ وہ اسد کو قریباً ایک میل پیدل چلانے کے بعد کسی بہت بڑی فیکٹری کے پچھواڑے لے آیا۔ یہاں گڑھوں میں ہزاروں ٹن کوڑا کرکٹ پڑا تھا۔ اس کوڑے کرکٹ کو کہیں کہیں ٹریکٹروں کے ذریعے ہموار کر دیا گیا تھا۔ ایسی ہموار جگہوں پر بھوکے ننگے لوگوں نے عارضی جھگیاں سی بنا لی تھیں۔ ایسی ہی ایک جھگی ظفری کا مسکن تھی۔ یہ جھگی اندر سے کچھ زیادہ ہی گندی نظر آتی تھی۔ میلی کچیلی بدبودار چٹائیاں، ایک خستہ چارپائی، پیوند لگی چادریں، المونیم کے مُڑے تڑے برتن، ایک رسّی پر آویزاں پرانے کپڑے، ہر چیز میں جیسے چرس اور گانجے کی بو رچ بس چکی تھی۔ رسّی پر لٹکے ہوئے کپڑوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں کوئی عورت اور بچہ بھی رہتے ہیں۔ اردگرد کی جھونپڑیوں اور جھگیوں کے اندرونی مناظر بھی ایسے ہی تھے۔

دوپہر کے بعد ایک جواں سال عورت جھونپڑی میں داخل ہوئی۔ اُس کے گود

سے ایک ریں ریں کرتی کم سن بچی چمٹی ہوئی تھی۔ عورت کی طرح بچی بھی میلے کچیلے لباس میں تھی۔ عورت کھانا لے کر آئی تھی۔ کھانا دیکھتے ہی اسد کو اندازہ ہو گیا کہ یہ مانگے تانگے کا ہے۔ ایک بڑے پیالے میں سالن تھا بلکہ شاید دو تین سالن تھے۔ ایک شاپر میں نیاز کے چاول تھے۔ ایک دوسرے شاپر میں روٹیاں تھیں۔ یہ روٹیاں غالباً عورت بھیک کے پیسوں سے خرید کر لائی تھی۔

عورت اور ظفری آمنے سامنے بیٹھ گئے اور پیٹ بھر کر روٹی کھائی۔ دونوں بار بار اسد کو دعوت دیتے رہے لیکن بازو کے درد سے اُس کا برا حال تھا۔ اُس نے ابھی تک اپنے ٹوٹے ہوئے بازو کے بارے میں ظفری کو نہیں بتایا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ظفری یا کوئی دوسرا اُسے ڈاکٹر کے پاس جانے کا مشورہ دے......

عورت کی عمر پچیس چھبیس سال رہی ہوگی۔ وہ میلی کچیلی ضرور تھی لیکن میل کچیل کے اندر سے بھی اُس کی جوانی اپنی جھلک دکھا رہی تھی۔ وہ اسد کی موجودگی میں ہی گاہے گاہے بڑی بے تکلفی سے بچی کو دودھ پلانے لگتی تھی۔ پہلے دو دن تو اسد یہی سمجھتا رہا کہ تاجاں نامی یہ عورت ظفری کی بیوی ہے۔ لیکن پھر یہ عقدہ کھلا کہ وہ بیوی شیوی نہیں، ویسے ہی ظفری کے ساتھ رہ رہی ہے۔ وہ کما کر یعنی بھیک مانگ کر لاتی تھی، ظفری سارا دن جھونپڑی میں اینڈتا تھا اور چرس پیتا تھا۔ تاجاں کی مصروفیات مشکوک تھیں...... ایک دن وہ بھیک میں حلوہ پوڑی لائی۔ ایک دن سندر خانی انگوروں کے گچھے اور پچاس روپے کے تین چار کڑکڑ کتے نوٹ لائی۔ اسد سمجھ گیا کہ وہ گھوم پھر کر بھیک ہی نہیں مانگتی، نگاہِ قدر شناسی بھی مانگتی ہے۔ اُسے بھیک کا کھانا بڑی مشکل سے ہضم ہو رہا تھا۔ اب یہ بے غیرتی کا کھانا کیسے ہضم ہوتا؟ لیکن بھوک ایک ایسی بلا ہے جو اپنے تیز پنجوں سے ہر اصول اور قدر کا تیا پانچہ کر دیتی ہے۔ چوبیس گھنٹے بھوکا رہنے کے بعد اسد نے وہی کچھ کھا لیا جو اُس کے سامنے موجود تھا۔

اُس کے ٹوٹے ہوئے بازو کی تکلیف اُس کے لئے سب سے بڑھ کر عذاب ناک تھی۔ اس عذاب نے باقی سارے عذاب پس منظر میں دھکیل دیئے تھے۔ گندگی، بدبو، بے آرامی، پولیس کا خطرہ سب کچھ ہیچ محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ ساری ساری رات جاگتا تھا اور درد سے کراہتا تھا۔ اُس کی ہڈی ٹوٹ کر گوشت میں جا گھسی تھی، اندر زخم بن چکا

تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس بازو کا علاج عام پہلوانوں اور عطائیوں کے پاس نہیں، اس کے لئے اچھے سرجن کی ضرورت تھی۔ لیکن ہسپتال جانے کا خطرہ وہ کسی طور مول نہیں لے سکتا تھا۔

درد کے سمندر میں ڈوبتے اُبھرتے ہوئے اُسے رہ رہ کر وہ منظر یاد آتا تھا جب نیشا کا باپ اُسے جنونی انداز میں پیٹ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسد کا بازو ٹوٹ کر لٹک گیا ہے پھر بھی وہ اُس پر چوٹیں لگاتا جا رہا تھا۔ کسی وقت تو اسد کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ اگر وہ وہاں سے راہِ فرار اختیار نہ کرتا تو نیشا کا باپ اُسے جان سے مار ڈالتا...... رہ رہ کر نیشا کے ساتھ قرب کے لمحات اسد کو یاد آتے تھے اور اُس کے سینے میں ایک زہریلا خنجر اُتر جاتا تھا۔ اُسے لگتا تھا کہ اُس کا سب کچھ لٹ گیا ہے۔ اُس کی انا، اُس کا پندار، اُس کا عشق سب کچھ برباد ہو گیا ہے...... اور یہ سب کچھ ہوا بھی تو کس کے ہاتھوں؟ نیشا کے ہاتھوں...... وہ تڑپتا جاتا۔ اُس کی زندگی میں کیسی کیسی حسین و جمیل لڑکیاں آئی تھیں۔ فریحہ...... زاہدہ...... کنول...... ڈاکٹر فرح اور پتہ نہیں کون کون۔ مگر اسد نے اپنا سب کچھ ہارا بھی تو کہاں، نیشا جیسی معمولی لڑکی نما عورت کے روبرو۔ شاید قدرت نے اُس کے ارادوں کو ناکام کر کے اُسے اپنی موجودگی اور طاقت کا ثبوت دیا تھا۔ وہ سوچتا تھا اور آنسو خود بخود اُس کے رُخساروں پر ڈھلک آتے تھے۔ آج اتنے عرصے بعد پہلی بار...... ہاں پہلی بار اُسے یہ محسوس ہوا تھا کہ اُس نے شمیم کو ہمیشہ کے لئے کھو دیا ہے۔ وہ جو ایک وجدانی سا یقین تمام تر قباحتوں کے باوجود اُس کے اندر موجود رہا تھا کہ شمیم جہاں بھی ہے اس کی محبت کے حصار میں ہے، آج ختم ہو گیا تھا۔

اسی طرح درد کے ناقابل بیان عذاب کو جھیلتے دن گزرنے لگے..... اسد اُٹھتے بیٹھتے کراہتا رہتا تھا۔ ایک روز تاجاں شام کے بعد دیر تک نہیں آئی تو اسد نے اپنے اکلوتے بازو سے ظفری کو جھنجھوڑ کر جگایا۔ اُس نے نشے سے سرخ آنکھوں سے اسد کو گھورا اور بولا۔

''خو کیا بات ہے...... کیوں رونی صورت بنا رکھا ہے تم نے؟''

''رونی صورت تو نہیں بنا رکھی لیکن وہ تمہاری تاجاں ابھی تک نہیں آئی۔''

''آ جائے گی یارا! کہیں کوئی قدر دان مل گیا ہوگا اُسے۔''

''قدر دان؟ کیا مطلب؟''

"بھئی کوئی سخی بادشاہ...... کوئی ٹیکسی ڈرائیور، کوئی دُکاندار، کوئی کار والا یا پھر کوئی پولیس والا بھی ہوسکتا ہے۔ ایسے لوگ تاجاں کو بھیک نہیں دیتے، انعام دیتے ہیں۔ اپنے خوش ہونے کا انعام......"

"تمہارا مطلب ہے کہ تاجاں اس قسم کا دھندا کرتی ہے؟"

"اس قسم کا دھندا بھی کرتی ہے۔" ظفری نے "بھی" پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ویسے تو تمہیں پتہ ہی ہے کہ اُس کا کام صاف ستھرا ہے...... دے جا سخیا اللہ کے نام پر...... دے جا بابو مولا کے نام پر۔ شروع شروع میں وہ صرف بھیک ہی مانگتی تھی۔ لیکن یہ دنیا بڑا ظالم شے ہے۔ کسی کو سیدھے رستے پر نہیں رہنے دیتا۔ یہ تاجاں بھی آہستہ آہستہ دوسری طرف چلا گیا۔ اب جہاں کہیں موقع ملتا ہے یہ غیر مرد کا بستر گرم کر دیتا ہے اور اپنا مٹھی گرم کر لیتا ہے۔"

"اور تم اُس کی کمائی ہوئی روٹیاں توڑتے ہو؟"

"بالکل نہیں...... ام تو اپنا معاوضہ وصول کرتا ہے۔ یہ جھونپڑی امارا ہے۔ وہ اس جھونپڑی میں رہتا ہے۔ پھر اس نے اپنی بچی کی بیماری پر ام سے تین سو روپیہ قرض بھی لیا تھا۔ یہ قرض اب بڑھتے بڑھتے ڈیڑھ ہزار روپے ہوگیا ہے۔" ظفری ایک آنکھ میچ کر بولا۔ اُس کے چہرے کی خباثت ظاہر کرتی تھی کہ وہ نہ صرف تاجاں کی روٹیاں توڑتا ہے بلکہ اُس کے جسم سے اپنا سود بھی وصول کرتا ہے۔

اسی دوران تاجاں آ گئی۔ وہ بڑی تھکی تھکی اور نڈھال سی تھی۔ وہ ایک شاپر میں ڈھیر ساری بریانی لائی تھی۔ دوسرے شاپر میں فروٹ تھا۔ ان چیزوں کو دیکھ کر اُس کی تھکن کی وجہ سمجھ میں آنے لگی تھی۔ اُس کے کولہے سے چمٹی ہوئی بچی کی گردن آگے کی طرف ڈھلکی ہوئی تھی، وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ اسد جانتا تھا کہ تاجاں کبھی کبھار بچی کو افیم کھلا دیتی ہے۔ آج بھی اُس نے بچی کو افیم کھلائی ہوئی تھی۔ محنت کش عورتیں جب "محنت" کرتی ہیں تو اپنے بچوں کو ایسے ہی گہری نیند سلا دیتی ہیں۔

ظفری اور تاجاں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ اسد نے بھی چند لقمے زہر مار کئے۔ اس کے بعد ظفری پری مارکہ کے لمبے کش لینے لگا۔ اسد نے بھی اُس کا ساتھ دیا۔ چار پانچ سگریٹ پی کر ظفری مست ہو کر گہری نیند سو گیا۔ تاجاں بھی بچی کو پہلو سے لگائے

سدھ سو رہی تھی۔ اُس کے ہاتھ پاؤں کہیں کے کہیں پڑے تھے۔ ہلکی بونداباندی ہونے لگی تھی۔ اس بونداباندی سے کوڑے کرکٹ کی سڑاند میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ تھوڑے بہت چھینٹے جھونپڑی کے اندر بھی آ رہے تھے۔ بازو کے درد نے اسد کو بے حال کر رکھا تھا۔ کسی کروٹ چین نصیب نہیں تھا۔ اب تو اُسے ہلکا سا بخار بھی روزانہ ہو جاتا تھا۔ اردگرد کی جھونپڑیوں میں بھی مکمل خاموشی طاری تھی۔ بس کسی وقت کسی کتے کی آواز سناٹے کو توڑ دیتی تھی۔

اچانک...... بالکل غیر متوقع طور پر وہ آن موجود ہوا...... اُس کی جانی پہچانی آواز اسد کے کانوں سے ٹکرائی۔ "کیسے ہو دوست...... سناؤ! کیسے گزر رہی ہے؟"

اسد فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکا۔ غیر مرئی آواز نے پھر اُسے مخاطب کیا۔

"تمہیں برباد کر کے اس حال تک پہنچانے والی کون ہے؟ عورت ہے...... صرف عورت...... عورت سے انتقام لو دوست...... جہاں ملے، جس حال میں ملے...... اُسے سزا دو...... اُسے سبق سکھاؤ۔ تمہاری زندگی کا تو اب ستیاناس ہو ہی چکا ہے۔ پھر یہ عورت کیوں سکون سے بیٹھی رہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ سو دو سو عورتوں کو سزا دے کر تم سب عورتوں کو ٹھیک نہیں کر سکتے۔ لیکن قطرے قطرے سے دریا بنتا ہے۔"

اسد نے کہا۔ "میں کسی کو سزا کیا دوں گا؟ میں تو خود عبرت کی مثال بنا ہوا ہوں۔"

"دیکھو دوست! سزا دینے والے کو بھی تھوڑی بہت تکلیف سہنی پڑتی ہے۔ جو ہاتھ کوڑا چلاتا ہے، وہ بھی تو شل ہو جاتا ہے۔ ٹھیک ہے کہ تم زخمی ہوئے ہو لیکن جس ناگن کا زہر نکالتے ہوئے زخمی ہوئے ہو اُس کا زہر بھی نکل گیا ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"اُسے پوری سزا ملی ہے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں، اُس کے باپ نے اُسے گولی مار دی ہے۔ اُس کا نیچے کا دھڑ مفلوج ہو گیا ہے۔ وہ ہسپتال میں پڑی ہے۔ اُس کی ماں بڑی میم صاحب کا اپنے شوہر سے سخت جھگڑا ہوا ہے۔ وہ شوہر پر دس بار لعنت بھیج کر اپنے بھائیوں کے پاس جا بیٹھی ہے۔"

سکون کی ایک لہر سی اسد کے زخمی بازو اور نڈھال جسم میں دوڑ گئی۔ اُس کی ہڈیاں توڑنے والا بھی چین سکون سے نہیں تھا۔ نجانے کیوں اکثر اس غیر مرئی آواز کی گفتگو

اسد کے دل کے زخموں پر مرہم کا کام دیتی تھی۔ اُس کی سوچ کے بند دروازے کھلتے تھے اور گھٹن کم ہو جاتی تھی۔ اُسے محسوس ہوتا تھا کہ اس آواز کے ساتھ اس کا کوئی قدیم ناطہ ہے۔

اسد نے کانپتے ہاتھوں سے پری مارکہ کا ایک طویل کش لیا اور بولا۔ ''تم نے پچھلی ملاقات میں تسلیم کیا تھا کہ تم بھائیا جی ہو...... تم نے کہا تھا نا؟''

چند لمحے کے توقف کے بعد آواز آئی۔ ''ہاں...... کہا تھا۔''

''تو کیا میں تمہیں بھائیا جی کہہ کر مخاطب کر سکتا ہوں؟''

''تم مجھے جس نام سے چاہو مخاطب کر سکتے ہو۔''

اسد نے ایک گہری سانس لی۔ شروع شروع میں یہ پراسرار آواز سن کر اسد کے دل و دماغ پر جو خوف طاری ہو جاتا تھا وہ اب نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ اب تو کبھی کبھی اسد اس آواز کے ساتھ نارمل انداز میں بات کرتا تھا۔ اسد نے پری مارکہ کے دو گہرے کش مزید لئے اور کہا۔ ''بھائیا جی! تم میرے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو۔ یہ بھی جانتے ہو گے کہ شمیم میرے دل کا ایسا داغ ہے جو مر کر بھی نہیں مٹ سکتا۔ اُس لڑکی کی بابت تم میرے لئے کیا کر سکتے ہو؟''

چند لمحے کی خاموشی کے بعد آواز نے کہا۔ ''اس لڑکی کو حاصل کرنے کے لئے تمہیں کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ تم جب چاہو اپنے والدین سے کہہ کر اُس لڑکی کو اپنی سہاگ کی سیج پر بٹھا سکتے ہو۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ تم ایسا کرنا نہیں چاہتے۔ تم اُس لڑکی کو اپنانے سے پہلے اُس کا غرور توڑنا چاہتے ہو، اُس کی ہٹ دھرمی دُور کرنا چاہتے ہو اور اس کے لئے جو طریقہ تم نے اختیار کیا ہے، وہ بالکل درست ہے۔ وہ لڑکی اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکی ہے۔ ابھی اُسے اور ٹوٹنا پھوٹنا ہے۔ پھر وہ تمہارے قدموں میں گرے گی یا اپنی جان گنوائے گی...... لیکن میری ایک بات یاد رکھنا دوست! بولو یاد رکھو گے؟''

''ہاں...... کہو!''

''کبھی بھی عورت کو اپنی کمزوری مت بنانا...... چاہے وہ شمیم ہی کیوں نہ ہو۔ مرد کے لئے یہ بہت بہتر ہے کہ عورت کو کمزوری بنانے کی بجائے، عورت کی کمزوری بنے۔ اُس کے اشاروں پر نہ ناچے بلکہ اُسے اشاروں پر نچائے۔ جب کسی عورت کو یہ معلوم ہو جاتا

ہے کہ وہ کسی مرد کی کمزوری ہے تو پھر وہ اُسے بہت رُلاتی تڑپاتی ہے۔''

اسد نے چرس بھری نئی سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''بھائیا جی! تم میرے باپ کے دادا ہو۔ تمہیں اس دنیا سے گئے برسوں گزر چکے ہیں۔ لیکن میں تمہاری آواز سنتا ہوں۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ میں اپنے ہوش کھو بیٹھوں گا۔ یہ سب کیا ہے...... کیسے ہے؟''

''تمہیں کہا تھا نا دوست! یہ سوال جواب کا سلسلہ رہنے دو۔ یہ تمہیں پریشان کرے گا۔ جتنا زیادہ جانو گے، اُتنا ہی اُلجھو گے۔''

''کیا تم صرف آواز ہو...... یا تمہارا جسم بھی ہے...... میں نے بھٹکی ہوئی رُوحوں کے بارے میں سنا ہے۔ کیا تم بھی ایک ایسی رُوح ہو؟''

آواز میں ایک عجیب سی لرزش نمودار ہوئی۔ یوں لگا جیسے یہ آواز دھماکے سے پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔ آواز نے کہا۔ ''تمہیں کہا ہے نا کہ جستجو مت کرو...... ورنہ مجھے کھو دو گے۔ تمہارے سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔''

نشے کے تیز اثر کے تحت اسد کا سر چکرانے لگا تھا۔ اُس نے جھونپڑی کی دیوار سے پشت لگائی اور دُھوئیں کے مرغولوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہارے بارے میں ایک کہانی سنی ہے۔ کسی عورت نے تم سے بے وفائی کی تھی۔ تم نے برسوں اُس کا انتظار کیا۔ کیا یہ سچی کہانی ہے؟''

جواب نہیں ملا۔ اسد نے دو تین بار اُسے پکارا۔ لیکن وہ جا چکا تھا۔ وہ کیفیت ختم ہو چکی تھی جو اُس کی موجودگی کا ثبوت ہوتی تھی۔

اسد ہونٹ دانتوں میں دبا کر رہ گیا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ آواز خفا ہو کر واپس پلٹ گئی ہے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ خفگی عارضی ہو گی۔

بازو کا درد جو کچھ دیر کے لئے بالکل پس منظر میں چلا گیا تھا ایک بار پھر اسد کو تڑپانے لگا۔ پری مارکہ بھی اب ختم ہو چکے تھے۔ پری مارکہ سے تھوڑا سا افاقہ ہو جاتا تھا۔ لیکن اتنے سگریٹ کہاں سے آتے؟ اب تو درد کی گولیوں نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ مسلسل بوندا باندی سے جھونپڑی بھیگ گئی تھی۔ مختلف جگہوں سے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ اس گیلے پن نے گندگی اور بدبو کا احساس بڑھا دیا تھا۔ تاہم اس جھونپڑی کے پرانے مکین مزے کی نیند سو رہے تھے۔ بارش کی وجہ سے کئی کیڑے مکوڑے

جھونپڑی کے اندر رینگنے لگے تھے۔ اسد کے پاؤں پر بھی سرسراہٹ ہو رہی تھی۔ اُس نے لالٹین کی لو اُونچی کی۔ درجنوں کیچوے جھونپڑی میں موجود تھے۔ دو کیچوے معصوم بچی کی گردن پر رینگ رہے تھے۔ ایک مکوڑا ظفری کی دھوتی میں سے برآمد ہو رہا تھا۔ لیکن بچی کی طرح ظفری کی نیند میں بھی کوئی خلل نہیں پڑا تھا۔ اسد جھونپڑی کے ایک نسبتاً خشک کونے میں سمٹ گیا اور سردی سے کپکپانے لگا۔

صبح اُسے بہت تیز بخار ہو گیا...... اُس کا بازو سوج کر نیلا ہو چکا تھا اور ذرا سی حرکت دینے پر اُس کی چیخ نکل جاتی تھی۔ اُس کی جیب میں ایک پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔ ظفری نے اُسے درد روکنے والی گولیوں کے دو تین پتے لا کر دیئے تھے لیکن اب وہ بھی مزید مہربانی پر آمادہ نہیں تھا۔ اسد دوپہر تک نیم بے ہوشی کی سی حالت میں پڑا رہا۔ دو بجے کے قریب اُس کی آنکھ کھلی۔ تاجاں پھر کام پر جا رہی تھی۔ آج اُس نے نہا دھو کر ذرا بہتر کپڑے پہنے تھے۔ آنکھوں میں سُرمہ لگایا تھا اور داتن بھی کیا تھا۔ اُس کے بال اچھے تھے لیکن دیسی صابن سے دھو دھو کر اُس نے ان کا بیڑا غرق کر رکھا تھا۔ حسب معمول بچی کو کولہے سے لگا کر وہ چلی گئی...... اسد کو معلوم نہیں تھا کہ وہ اس ''بھکارن'' کو آخری بار دیکھ رہا ہے......!

کل کی طرح وہ آج بھی شام کے بعد تک نہیں آئی۔ اسد بخار کی نیم بے ہوشی میں پڑا تھا اور کراہیں خود بخود اُس کے ہونٹوں سے نکلتی جا رہی تھیں۔ اب تو اُس کا دل چاہنے لگا تھا کہ وہ ہسپتال چلا ہی جائے۔ ہسپتال جائے بغیر بھی تو وہ مر ہی رہا تھا۔ لیکن جب نینا کے باپ کا خونخوار چہرہ اُس کی نگاہوں میں آتا تھا وہ اندر سے کانپ کر رہ جاتا تھا۔ جس شخص نے بیٹی کو گولی مار کر اپاہج بنا دیا تھا وہ اسد کو کہاں معاف کرتا؟ پھر کسی وقت وہ سوچتا کہ وہ مر ہی کیوں نہیں جاتا؟ ناقابل برداشت تکلیف سہتے سہتے اب اُسے کئی ہفتے ہونے کو آئے تھے۔ جب درد انتہا کو پہنچتا تھا تو وہ تڑپتے تڑپتے بے ہوش ہو جاتا تھا۔ کسی وقت اپنے آپ اُس کے ذہن میں یہ بات آتی تھی کہ یہ ساری اذیتیں اور ذلتیں اُن بداعمالیوں کا صلہ ہیں جو وہ پچھلے تین چار سال میں کرتا رہا ہے۔

اسد نے غنودگی بھرے لہجے میں ظفری سے پوچھا۔ ''تاجاں ابھی نہیں آئی؟''

''نہیں آئی......'' ظفری خشک لہجے میں بولا۔ ''تم سو جاؤ۔ ام ابھی جاتا ہے۔ اُس کا

پتہ کر کے آتا ہے۔''

اسد کو اُمید تھی کہ شاید تاجاں آتے ہوئے اُس کے لئے درد کش گولیاں لے آئے۔ درد کش گولیوں کا انتظار کرتے کرتے وہ پھر نیم بے ہوشی کی کیفیت میں چلا گیا......

دوبارہ اُس کی آنکھ کھلی تو بونداباندی مسلسل جاری تھی۔ جھونپڑی میں اکثر اشیاء گیلی ہو چکی تھیں۔ درد کی شدید ٹیسیں اُس کے پورے وجود کو جھنجھوڑ رہی تھیں۔ ظفری اور تاجاں کا اب بھی کوئی پتہ نہیں تھا۔ اُس نے ڈوبتے ذہن کے ساتھ سوچا، پتہ نہیں وہ کہاں چلے گئے ہیں؟ سوچتے سوچتے اور درد سے لڑتے لڑتے وہ پھر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا......!

اچانک اُسے محسوس ہوا جیسے کسی خطرناک کیڑے نے اُس کی ناک میں گھس کر اُس کے دماغ میں ڈنک مارا ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا...... ایک زوردار طمانچہ اُس کے منہ پر پڑا اور وہ ڈگمگا کر رہ گیا...... اُس نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ بھیگی ہوئی اس نیم تاریک جھونپڑی میں تین چار غنڈہ صورت افراد موجود تھے۔ اُن کے لباس قیمتی تھے۔ ایک دو کے گلے میں سونے کی زنجیریں چمک رہی تھیں...... وہ غضب ناک لہجوں میں اسد پر دھاڑ رہے تھے۔ پھر اُنہوں نے اُس پر ٹھوکروں اور گھونسوں کی بارش کر دی...... ساتھ ساتھ وہ اسد سے پوچھ رہے تھے۔

''کہاں ہے وہ حرامزادی......؟ کہاں ہے وہ تیرا باپ......؟''

اسد کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اُسے تو بس یہی لگ رہا تھا کہ ابھی اُس کا زخمی بازو جسم سے علیحدہ ہو کر گر جائے گا۔ وہ ذبح ہونے والے بکرے کی طرح چیخ رہا تھا اور خود کو بچانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ مارنے والے اُسے اُٹھا اُٹھا کر بدبودار کیچڑ میں پھینک رہے تھے...... پھر اسد مکمل طور پر بے ہوش ہو گیا تھا......!

O

دوبارہ اُس کی آنکھ کھلی تو اُجالا ہو چکا تھا۔ وہ اپنی تربتر جھونپڑی ہی میں پڑا تھا۔ اُس کا بازو میلی کچیلی پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اُس کی پیشانی پھٹ گئی تھی اور ایک ہاتھ پر بھی شدید چوٹ آئی تھی۔

اس جھونپڑا بستی کے خستہ حال مُکھیا نے اسد کو جو کچھ بتایا وہ چونکا دینے والا تھا۔ اُس

کی باتوں سے اور اپنے سوالات سے اسد کو معلوم ہوا کہ کل رات تاجاں نے ایک کوٹھی میں چوری کی تھی۔ اس چوری کا پروگرام ظفری اور تاجاں پہلے سے بنا چکے تھے۔ ایک دن پہلے اسی کوٹھی میں تاجاں اپنے قدردان کے پاس ''وقت گزار'' کر آئی تھی۔ اُس قدردان کی الماری میں تاجاں نے کچھ زیور دیکھ لئے تھے اور قدردان کی لاپرواہی بھی نوٹ کر لی تھی۔ اگلے روز وہ پھر گئی اور جب قدردان...... قدردانی کے بعد مدہوش پڑا تھا وہ زیور نکال کر رفو چکر ہو گئی۔ ظفری پہلے سے وہاں موجود تھا، دونوں راہِ فرار اختیار کر گئے۔ بعد ازاں گھر والوں کو پتہ چلا۔ وہ ٹوہ لگاتے ہوئے آدھی رات کے بعد اُس جھونپڑا بستی میں پہنچے اور پہلے سے زخمی اسد کو مار مار کر نیم جان کر دیا۔ یہ مرے کو مارے شاہ مدار والی بات تھی۔ شاید وہ لوگ اسد کو مار ہی ڈالتے لیکن مُکھیا نے اُن کی منت سماجت کی اور بتایا کہ یہ لڑکا بے گناہ ہے۔ اس کا قصور صرف اتنا ہے کہ اس نے ان چوروں کی جھونپڑی میں کچھ عرصے کے لئے پناہ لی تھی۔ اس طرح بمشکل اسد کی جان بچ سکی۔

اگلے دو تین روز اسد کی زندگی کے بدترین دن تھے...... وہ زخموں سے چور ایک غلیظ جھونپڑی کی گیلی زمین پر پڑا تھا۔ وہ بخار اور درد کی چکی میں پس رہا تھا لیکن کوئی اُس کا پرسانِ حال نہیں تھا۔ بستی والے تو اُسے فوراً بستی سے دفع کرنا چاہتے تھے لیکن وہ تو اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونے کے قابل بھی نہیں تھا۔ اُنہوں نے اُسے دو چار دن کی رعایت دے دی تھی۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہے ہوں، دو چار دن میں ٹھیک ہو کر یہاں سے دفع ہو جاؤ یا مزید بیمار ہو کر مر جاؤ!

یہ بھیک مانگنے والوں کی بستی تھی۔ یہاں بھیک دینے کا رواج نہیں تھا۔ اسد نے چوبیس گھنٹے تک کچھ کھایا پیا نہیں۔ پھر کسی نے بارش سے بھیگی ہوئی باسی روٹی اور پھپھوندی لگا اچار اُس کے قریب رکھ دیا۔ اسد نے اس کھانے کو دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ مطلع مسلسل ابر آلود تھا۔ جھڑی سی لگی ہوئی تھی۔ وقفے وقفے سے بوندا باندی ہونے لگتی تھی۔ اس بوندا باندی نے جھونپڑی کو کیچڑ بنا رکھا تھا۔ کئی طرح کے حشرات الارض جھونپڑی میں اور اسد کے زخم زخم جسم پر رینگ رہے تھے۔ آوارہ کتے اُس کے آس پاس گھومتے تھے۔ اُس کا زیریں جسم بدبودار کیچڑ اور اپنے ہی پیشاب میں لتھڑا ہوا تھا۔ جوؤں بھری گیلی گدڑی پر اوندھے منہ لیٹے لیٹے وہ شدید بخار کی غنودگی محسوس کرنے لگا...... وہ

سوچنے لگا، کیا میں ہی وہ اُبھرتا ہوا کرکٹر ہوں جس کی تصویریں اخباروں مین چھپتی تھیں اور راہ چلتے لوگ مُڑ مُڑ کر دیکھتے تھے؟ کیا میں ہی وہ اسد ہوں جس پر اُونچے گھرانوں کی خوبرو لڑکیاں جان چھڑکتی تھیں...... جو اُونچی پرواز کے خواب دیکھتا تھا، جو اپنے فن کے زور سے پوری دنیا کو فتح کرنا چاہتا تھا۔

ہاں وہی تو تھا...... پھر یہ کیا ہوا ہے؟ وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ غلطی کہاں ہوئی ہے؟ راستہ کس موڑ پر گم ہوا ہے؟ وہ سوچتا رہا اور بس سوچتا رہا۔ ساری رات بس اسی طرح گزر گئی۔ کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ کوئی غمگسار نہیں تھا...... اُسے محسوس ہونے لگا کہ ساری دنیا بیگانی ہے...... لیکن نہیں، سارے بیگانے نہیں تھے...... کچھ اپنے بھی تھے۔ اچانک اسد کو محسوس ہوا کہ اُس کا سر کسی کی گود میں ہے۔ کوئی بڑی محبت سے اُس کے رُخسار پر ہاتھ پھیر رہا ہے۔ اُس کا سر چوم رہا ہے۔ اُس نے بمشکل آنکھیں کھول کر دیکھا۔ یہ بشیرا تھا۔ اُس کا مزدور ساتھی...... وہ روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''انور......! یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا لی ہے یار؟ تجھے کیا پتہ میں تجھے کتھے کتھے ڈھونڈتا رہا ہوں۔ شہر کا کونہ کونہ چھان مارا ہے اللہ دی قسمیں۔''

بشیرے کی آواز اسد کو دُور کہیں بہت دُور سے سنائی دے رہی تھی۔ وہ ابھی تک نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ بس اندھیرے اُجالے کی سی کیفیت تھی۔ یہ کیفیت پتہ نہیں کتنی دیر برقرار رہی۔ شاید ایک دن...... شاید دو دن یا پھر اس سے بھی زیادہ...... اس دوران اسد اپنے یار کو اپنے آس پاس محسوس کرتا رہا۔ کبھی وہ اُسے دوا پلا رہا ہوتا، کبھی اُس کا سر دبا رہا ہوتا، کبھی تکیے کے سہارے بٹھا کر اُسے کچھ کھلا رہا ہوتا...... پھر آہستہ آہستہ اسد کے ذہن پر چھائی ہوئی زرد دُھند چھٹنے لگی...... اُس کی بوجھل پلکیں کوشش کے بغیر حرکت کرنے لگیں۔ وہ بات کرنے اور خود سے اُٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہو گیا۔

اُس نے اندازہ لگایا کہ جب وہ بے ہوش تھا، بشیرے نے کسی ہڈی جوڑنے والے پہلوان کو بلایا تھا اور اُس نے اسد کی بری بھلی پٹی کر دی تھی۔ اس کے علاوہ بشیرا، ڈاکٹر کو اسد کی طبیعت بتا کر اُس کے لئے دوا بھی لاتا رہا تھا۔ اُس کی انہی کوششوں سے اسد کچھ سنبھل سکا تھا۔ ابھی تک اسد نے بشیرے سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ اُسے کیسے ڈھونڈ سکا ہے؟

یہ تیسرے یا چوتھے دن کی بات ہے۔ بشیرے نے کہا۔ ''چل یار! باہر نکل کر تھوڑا سا گھوم پھر لے۔ ورنہ تیری ٹانگوں میں مُڑ نے پھرنے کی ہمت نہیں رہے گی۔ چل آ جا شاباش...... اتنی دیر میں تیری پڑوسن اس جھونپڑے کی صفائی شفائی کر دے گی۔''

اسد کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن بشیرے کے کہنے پر وہ اُس کا سہارا لے کر باہر آ گیا۔ کئی دن کے بعد دُھوپ نکلی تھی۔ کوڑے کرکٹ کے گیلے ڈھیر اب سوکھنا شروع ہو گئے تھے۔ ان ڈھیروں پر اور سڑک کے کنارے، جھگی نشینوں کے ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے۔ اسد، بشیرے کے سہارے چلتا آہستہ آہستہ سڑک کی طرف آ گیا۔ بشیرا اپنے سیدھے سادھے دیہاتی انداز میں بولا۔

''کبھی کبھی تو مینوں لگتا ہے کہ تجھ کو کسی ہوائی چیز کا سایہ ہے۔ اسی واسطے تو راتوں کو اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ میں نے ایک بات سوچی ہے۔''

''کیا بات؟''

''یہاں پاس ہی گُل جی حضرت کا آستانہ ہے۔ بڑے نیک اور بڑے اللہ والے بندے ہیں۔ پشاور کے باہر سے بھی لوگ اُن سے دُعا کرانے اور دم والا پانی لینے کے لئے آندے ہیں۔ میں تجھے اُن کے پاس لے جاندا ہوں۔''

گُل جی حضرت کا نام سن کر اسد بری طرح چونکا۔ اُسے کچھ یاد آ رہا تھا۔ ایک پرانی بات...... جو اُس نے عبداللہ کے منہ سے کئی بار سنی تھی۔ اسد نے جب پہلے پہل اپنے لنگوٹیے عبداللہ کو اپنی سماعت سے ٹکرانے والی پراسرار آواز کے بارے میں بتایا تھا تو اُس نے اسی گُل جی حضرت نامی بزرگ کا ذکر کیا تھا۔ اور اسد سے کہا تھا کہ وہ اُسے لے کر ان بزرگ کے پاس پشاور جائے گا۔ عبداللہ حضرت جی کا ذکر بے حد اعتماد اور یقین کے ساتھ کیا کرتا تھا...... آج اتنے عرصے بعد اچانک بشیرے کے منہ سے یہ نام سن کر اسد کے دماغ میں جنبش سی ہونے لگی تھی۔ وہ کچھ دیر تک عجیب سی کشمکش میں رہا۔ ایک بے نام لہر سی اُس کے بدن میں دوڑنے لگی۔ اُسے یوں لگا جیسے کچھ ہونے والا ہے...... اُس نے بشیرے کی طرف دیکھ کر اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔

''کہاں رہتے ہیں گُل جی حضرت؟''

''یہاں بالکل پاس ہی رہندے ہیں یار...... زیادہ سے زیادہ دو تین فرلانگ کا فاصلہ

ہوگا۔'' بشیرے نے سامنے سڑک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اسد نے ایک گہری سانس لی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی کیفیت اُبھری۔ اُس نے کہا۔ ''چل بشیرے! مجھے حضرت جی کے پاس لے چل......!''

○

ٹھیک ایک گھنٹے کے بعد اسد ایک حجرہ نما کمرے میں گُل جی حضرت کے روبرو بیٹھا تھا...... عبداللہ کی باتیں سن سن کر اُس نے گُل جی حضرت کا جو تصور ذہن میں بنایا تھا وہ اُس کے عین مطابق تھے۔ نہایت سرخ و سپید رنگت، ماتھے پر محراب کا نشان جیسے چاند کا داغ ہو۔ اُن کی داڑھی نہایت گھنی اور نہایت سفید تھی۔ سر پر سفید رنگ کی گول ٹوپی رکھے وہ چٹائی پر دوزانو بیٹھے تھے۔

اسد کو لگا جیسے اُن کے اندر سے ایک غیر مرئی روشنی پھوٹ رہی ہے اور حجرے کو منور کر رہی ہے۔ پتہ نہیں کیا سحر تھا اُن کی شخصیت میں...... اسد نے یکا یک اُن کے سامنے سر جھکایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ایک سیلاب تھا جو آنکھوں کے بند توڑ کر بہہ نکلا تھا اور کسی طور رُکنے میں نہیں آ رہا تھا۔ حضرت جی اُسے خاموشی سے دیکھتے رہے، پھر اُن کا مہربان ہاتھ ہولے ہولے اسد کا شانہ سہلانے لگا۔ پتہ نہیں کہ یہ نفسیاتی اثر تھا یا ہاتھ کی کرامات تھی، سکون کی ایک لہر اسد کے رگ و پے میں اُتری اور اُسے محسوس ہوا کہ دل کے اندر چپکے سے ایک دروازہ کھلنے لگا ہے۔

اسد نے کسی بچے کی طرح روتے ہوئے کہا۔ ''حضرت جی! مجھے راستہ دکھائیں۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا...... مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا......!''

حضرت جی کی الوہی آواز اُس کے کانوں میں گونجی۔ ''راستہ نظر آئے گا...... ضرور نظر آئے گا۔ لیکن پہلے اپنے من کا میل صاف کرو۔ میل صاف ہو جائے گا تو سارے کام ٹھیک ہوتے چلے جائیں گے۔''

''میں کیا کروں حضرت جی......؟''

''انسان کا پیر و مرشد اُس کے اندر ہی موجود ہوتا ہے۔ کچھ لوگ اس مرشد کی باتوں پر کان دھرتے ہیں، کچھ نہیں دھرتے۔ تم نے بھی اُس کی باتوں پر کان نہیں دھرے۔ تم نے شاید کسی اور کی باتوں پر توجہ دی ہے......''

اسد کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہتے چلے جا رہے تھے۔ پتہ نہیں کیوں اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنا سر اس نورانی صورت والے فرشتے کے قدموں میں رکھ دے۔ مگر اُسے پتہ نہیں تھا کہ بزرگ اُس کی اس حرکت کو پسند فرمائیں گے یا نہیں...... اُس نے دل فگار آواز میں کہا۔

''حضرت جی! میں آپ سے اپنا ایک مسئلہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ میری یہ بات یقین کرنے کے قابل ہے یا نہیں...... اور اس میں کوئی حقیقت بھی ہے یا یہ صرف ذہنی فتور ہے۔''

''کہو...... کیا کہنا چاہتے ہو؟''

اسد نے دائیں ہاتھ سے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''حضرت جی! کئی برسوں سے مجھے ایک آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ آواز اچانک اُبھرتی ہے اور اس کا کوئی ذریعہ بھی دکھائی نہیں دیتا...... یہ آواز مجھ سے میرے مسائل اور پریشانیوں پر باتیں کرتی ہے۔ مجھے مشورے دیتی ہے، میرے دُکھ سکھ میں شریک ہوتی ہے۔''

حضرت جی نے اپنی تسبیح کو گردش دیتے ہوئے کہا۔ ''پہیلیاں مت بوجھواؤ...... مجھے اس بارے میں وضاحت سے بتاؤ۔''

اسد نے ایک سرد آہ کھینچی اور بات وہاں سے شروع کی جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ اُس نے کئی برس پہلے ڈیرے کی اُس طوفانی رات سے آغاز کیا جب پہلی بار اُس کے کانوں نے اپنے جدامجد کی آواز سنی تھی۔ وہ ہر واقعے کو وضاحت سے بیان کرتا رہا۔ پھر اُس نے شمیم کے ساتھ اپنے جذباتی تعلق کا ذکر کیا۔ اس کے بعد رنگی کا ذکر کیا۔ اُن لڑکیوں کا ذکر کیا جو وقتاً فوقتاً اُس کی زندگی میں آتی رہی تھیں۔ کرکٹ کا ذکر کیا اور حضرت جی کو بتایا کہ جو ٹوٹا پھوٹا قابل رحم لڑکا آپ کے روبرو بیٹھا ہے، وہ ماضی قریب میں ایک معروف کھلاڑی تھا...... آخر میں اُس نے ڈیرے کی اُس شام کا ذکر کیا جو اُس نے رنگی بابا اور نذیر احمد کے ساتھ گزاری تھی۔ یہ وہی شام تھی جس میں رنگی نے اسد اور نذیر احمد کو بھائیا جی کی داستان سنائی تھی۔ اسد نے مختصراً یہ داستان بھی حضرت جی کے گوش گزار کر دی۔ اس داستان کے حوالے سے ڈیرے میں لکھے ہوئے سنسکرت زبان کے شعروں کا ذکر بھی ہوا۔ اس کے علاوہ اُن مورتیوں کا تذکرہ بھی ہوا جو ایک دیوار کے

خلا سے برآمد ہوئی تھیں۔ ان میں سے چند مورتیاں ایسی بھی تھیں جن میں ایک مرد کو بڑی وحشت سے عورت کی عصمت دری کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ بھائیا جی کے حوالے سے دیگر باتیں بھی اسد نے حضرت صاحب کے گوش گزار کر دیں۔

حضرت صاحب سب کچھ توجہ اور دلچسپی سے سنتے رہے۔ اسد اپنی بات ختم کر کے خاموش ہو گیا۔ حضرت صاحب بھی خاموش بیٹھے رہے۔ یہ خاموشی اسد کو بے چین کر رہی تھی کیونکہ طویل ہوتی جا رہی تھی۔ حضرت صاحب جیسے گہرے مراقبے میں چلے گئے تھے۔ اُن کی خوبصورت پیشانی پر ایک موٹی رگ اُبھری ہوئی تھی۔

آخر حضرت صاحب کی مہربان آواز اسد کے کانوں میں گونجی۔ ''جو آواز تم سنتے ہو وہ تمہارا ذہنی فتور نہیں...... وہ حقیقت ہے...... اور یہی حقیقت ہے جو تمہاری زندگی کو بے حقیقت بنا رہی ہے۔ وہ ایک بے چین آواز ہے۔ وہ تمہاری ساری زندگی کو بھی بے چین اور بے کل کر دے گی۔ وہ تمہیں بہت خراب کر چکی ہے۔ ابھی اور خراب کرے گی۔ اگر ان خرابیوں سے بچنا چاہتے ہو تو اس آواز سے چھٹکارہ حاصل کر لو۔''

اسد کے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا۔ ''چھٹکارہ کیسے حاصل ہو گا؟''

''جب تم اُس آواز کی کہی ہوئی باتوں کو دل سے ناپسند کرنے لگو گے تو چھٹکارہ خود بخود ہو جائے گا۔ ابھی تم اُس کی باتوں کو پسند کر رہے ہو۔ تمہارے اندر کے خیالات اُس آواز کے خیالات سے میل کھا رہے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو رہا؟''

اسد نے پوری سچائی کے ساتھ اپنے دل کے اندر جھانکا اور لرزتی آواز میں کہا۔

''شاید ایسا ہو رہا ہے حضرت صاحب......!''

''کیوں ہو رہا ہے......؟''

''پتہ نہیں حضرت صاحب! شاید اس لئے کہ بھائیا جی عورت کے بارے میں وہی کچھ کہتا ہے جو میرے دل کے اندر بھی ہے۔ وہ کہتا ہے عورت ناقابل اعتبار ہے۔ وہ روزِ ازل سے مرد کو اپنا حریف سمجھتی ہے۔ اس کے اندر غرور اور ضد کی جڑیں گہرائی تک گئی ہوئی ہیں۔ وہ مرد کو اپنے سامنے جھکانا چاہتی ہے۔ وہ اس کی کمزوری بننا چاہتی ہے اور جب بن جاتی ہے تو پھر اُس کے گلے میں رسّی ڈال دیتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عورت سے پیار بے شک کرو لیکن اُس کے سامنے کبھی بھی جھکو مت۔ کیونکہ مرد ایک بار جھک

جائے تو پھر جھکتے جھکتے پاؤں کی خاک بن جاتا ہے۔''

حضرت صاحب نے کہا۔''تم پڑھے لکھے نوجوان ہو اور اُس بندے کے بارے میں سب کچھ جانتے ہو جو آواز بن کر تمہارے کانوں کے راستے تمہارے ذہن میں داخل ہوتا ہے۔ حیرت کی بات ہے، تمہیں اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آ رہی، ایک عورت نے...... صرف ایک عورت نے اُس بندے کے ساتھ زیادتی کی اور پتہ نہیں وہ زیادتی تھی بھی یا نہیں؟ اب وہ بندہ تمہارے ذریعے اُس عورت کا بدلہ بے شمار دوسری عورتوں سے لینا چاہ رہا ہے...... اور اُس نے کئی ایک سے لیا بھی ہے۔ ان عورتوں میں تمہاری محبت اور تمہاری زندگی کی سب سے بڑی آرزو تمہاری چچا زاد بھی شامل ہے۔''

اسد خاموش تھا۔ اُس کی زبان کو ایک تالا سا لگ گیا تھا...... بزرگ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔''تم صرف تصویر کا ایک رُخ دیکھتے ہو۔ تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھو! جو زیادہ حقیقی اور وسیع ہے۔ عورت اس کائنات کا حسن ہے۔ عورت نرمی، نزاکت اور شیرینی کا مرقع ہے۔ عورت سراپا محبت اور برداشت ہے۔ عورت تمہاری ماں ہے، تمہاری بہن ہے اور بیٹی بھی بنے گی۔ تصویر کا صرف ایک رُخ مت دیکھو......''

وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔''کسی وقت میں خود بھی اپنے اوپر لعنت بھیجتا ہوں، خود کو برا بھلا کہتا ہوں۔ لیکن اپنی سوچ میرے اختیار میں نہیں رہتی۔''

''تمہاری سوچ تمہارے اختیار میں کیسے رہے؟ تمہارے اندر تہہ در تہہ میل جما ہوا ہے۔ پہلے اس میل کو صاف کرو اور میل تب ہی صاف ہوگا جب اپنے نفس پر جبر کرنا سیکھو گے۔ یہ نفس ہی سب سے بڑا دشمن ہے۔ یہ سارا میل، یہ سارا گند اُسی کا پھیلایا ہوا ہے۔''

حضرت صاحب نے اُسے کوئی تعویذ نہیں دیا، نہ کوئی عمل کیا۔ بس اُس سے محبت بھرے نرم لہجے میں باتیں کرتے رہے۔ اُسے سمجھاتے رہے کہ وہ پیرومرشد نہیں ہیں۔ اُس کا پیرومرشد اُس کے اندر ہی موجود ہے۔ بس وہ اُس کی باتوں پر کان دھرے۔

حضرت صاحب کی باتوں نے اسد پر عجیب سا اثر کیا۔ اسی دوران حضرت صاحب نے اپنے ایک خادم کو بلایا اور اُس کے کان میں کچھ کہا۔ تھوڑی دیر بعد کلین شیو والا ایک جواں سال شخص بڑے احترام سے حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت صاحب نے اسد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کلین شیو والے سے کہا۔

''ڈاکٹر! اس کا بازو ٹوٹا ہوا ہے۔ اسے ذرا دیکھ لینا۔''

ڈاکٹر نے کہا۔''آپ بے فکر رہیں حضرت صاحب! میں ابھی اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔''

''لِن...... لیکن......'' اسد کے ذہن میں ایک بار پھر انجانے خدشات جاگ اُٹھے۔

''کچھ نہیں ہوگا...... انشاء اللہ کچھ نہیں ہوگا۔ تم ڈاکٹر کے ساتھ جاؤ!''

وہ بڑا عجیب دن تھا۔ اسد کو یوں لگ رہا تھا کہ اُس کے اندر ایک انقلاب کی داغ بیل پڑ گئی ہے۔ انتہائی پستی کو چھونے کے بعد وہ شاید ایک بار پھر اُٹھنا شروع ہو گیا تھا...... جس ڈاکٹر سے حضرت صاحب کے حجرے میں ملاقات ہوئی تھی اُس کا نام کاشف تھا۔ اتفاق سے ڈاکٹر کاشف کا شعبہ بھی آرتھوپیڈک تھا۔ ڈاکٹر کاشف نیم جان اسد کو بشیرے سمیت سیدھا ایک ''سیمی پرائیویٹ'' ہسپتال میں لے گیا۔ اس ہسپتال میں صرف 24 گھنٹے کے اندر اندر اسد کے بگڑے تگڑے بازو کا کامیاب آپریشن ہو گیا اور اُس کی ہڈی جوڑ کر پلاستر چڑھا دیا گیا۔ اسد کے بخار کا ٹریٹ منٹ بھی کیا گیا۔ یہ سارا علاج معالجہ ڈاکٹر کاشف کی مہربانیوں سے بالکل فری تھا۔

بس ہسپتال میں اسد کو ایک پریشانی تھا۔ ڈاکٹر کاشف گاہے گاہے اسد کو گہری نظروں سے دیکھنے لگتا تھا، جیسے اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو یا اُس کے خدوخال میں کسی شناسا چہرے کو ڈھونڈ رہا ہو...... اسد کے لئے یہ بات زیادہ پریشانی کا باعث تھی کہ ڈاکٹر کاشف کو کرکٹ سے گہری دلچسپی تھی۔ اسد کے دل میں یہ شک پروان چڑھ رہا تھا کہ شاید ڈاکٹر کاشف نے اُسے کرکٹر کی حیثیت سے کہیں دیکھا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ جب پانچ چھ روز بعد ڈاکٹر کاشف نے اُسے ہسپتال سے جانے کی اجازت دی تو اسد کو بہت سکون ملا۔ اسد بشیرے کے ساتھ طے شدہ پروگرام کے مطابق اُس کے ڈیرے پر آ گیا۔ فرنیچر کی ایک فیکٹری میں بشیرے کے گاؤں کے دو بندے کام کرتے تھے۔ بشیرا بھی آج کل مزدوری کے بعد رات وہیں گزار رہا تھا...... جس رات نیشا اور اسد پکڑے گئے تھے اور نیشا کے باپ نے اسد کی ہڈی توڑنے کے بعد نیشا کو گولی مار کر زخمی کیا تھا، بشیرا بھی بال بال بچا تھا۔ اگر نیشا کا بپھرا ہوا باپ بشیرے تک پہنچ جاتا تو شاید اُس کی ہڈیوں کا بھی سرمہ بنا ڈالتا۔ لیکن بشیرے کی کوئی نیکی کام آ گئی

تھی۔ کارخانے سے کسی نے سیٹھ صاحب کو گھر پر فون کیا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ سیٹھ صاحب نے بیٹی کو گولی ماری ہے اور بیٹی کے ڈرائیور کی ہڈیاں توڑ ڈالی ہیں۔ یہ اطلاع سنتے ہی بشیرا موقعے سے کھسک گیا۔ وہ چار پانچ دن پشاور سے باہر رہا، پھر اس ڈیرے پر آ گیا۔ اس ڈیرے کے بارے میں اُس کے کسی جاننے والے کو معلوم نہیں تھا۔ اس ڈیرے پر آنے کے بعد بشیرے نے اسد کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ کہتے ہیں کہ اگر سچے دل اور پکے ارادے کے ساتھ ڈھونڈا جائے تو خدا بھی ملتا ہے۔ بشیرے کو بھی لگتے لگتے اسد کی ٹوہ لگ ہی گئی۔

فرنیچر کی اُس ورکشاپ کا مالک ایک مہربان اور خدا ترس شخص تھا۔ گاؤں کے تقریباً چار پانچ مزدور پیشہ لڑکے وہاں رہتے تھے۔ بجلی پانی وغیرہ استعمال کرتے تھے، وہاں سوتے تھے، کھانا پکاتے تھے لیکن اُس نے کبھی کوئی تقاضہ نہیں کیا تھا۔ اسد کا بازو بتدریج ٹھیک ہو رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اُس کی دگرگوں صحت بھی بحال ہو رہی تھی...... اگلے ایک ماہ میں وہ دو تین بار حضرت صاحب کے آستانے پر گیا اور ہر مرتبہ جب واپس آیا تو پہلے سے کچھ تبدیل ہو چکا تھا...... اس عرصے میں ایک بار اُس نے ہسپتال جا کر بھی چیک اپ کرایا......

○○○

اسد کا پلاسٹر دو مہینے بعد کھلا۔ اس سارے عرصے میں وہ بے کار رہا تھا۔ بشیرے نے دوستی کا حق ادا کیا تھا اور اسد کے اخراجات برداشت کرتا رہا تھا...... حضرت صاحب کے ساتھ پیدا ہونے والے تعلّق نے اسد میں تبدیلیاں رونما کی تھیں لیکن یہ تبدیلیاں ابھی زیادہ نمایاں نہیں تھیں۔ یوں کہنا چاہئے کہ بس ایک عمل اُس کے اندر شروع ہو چکا تھا۔ اُس نے بری مارکہ سگریٹ کا استعمال بتدریج کم کر دیا تھا۔ اور اس علت کو یکسر چھوڑنے کا ارادہ بھی رکھتا تھا...... صبح سویرے اکثر وہ سیر کو نکل جاتا تھا۔ کھلی ہوا میں سانس لیتا اور ہلکی پھلکی ورزش بھی کرتا...... دو بھیانک تصورات اب بھی ہر وقت اُس کے تعاقب میں رہتے تھے...... ایک تصور فرش پر لیٹے ہوئے اُس شخص کا تھا جس کے سینے میں وکٹ گڑی ہوئی تھی اور دوسرا تصور نینیتا کے غضب ناک ڈیڈی کا تھا...... بہرحال اب یہ دونوں تصور اُسے پہلے کی طرح ''ہانٹ'' نہیں کرتے تھے۔ اُن کی شدت میں کچھ کمی واقع ہو چکی تھی۔ اسی طرح پھانسی کا وہ پھندا جو راتوں کو اکثر اُس کی آنکھوں کے سامنے لہراتا تھا اور وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتا تھا، اب ذرا کم کم نظر آتا تھا۔

صبح کی سیر کرنے کے لئے وہ اکثر ایک قریبی باغ میں جاتا تھا۔ یہاں اُسے لڑکے بالے بے فکری سے کھیلتے نظر آتے تھے۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے شادپور کا کھلا میدان آ جاتا۔ وہ صبحیں اور شامیں اُس کے تصور میں لپک جاتیں جو اُس نے وہاں گزاری تھیں۔ وہ سہانی فضائیں، وہ بے فکری کا زمانہ، علی، نازو اور شمیم کے ساتھ مل کر اُس کی خوبصورت شرارتیں...... وہ جانتا تھا کہ اب وہ سب کچھ لوٹ کر نہیں آ سکتا...... کبھی نہیں...... صبح کی سیر کرتے ہوئے کھلے میدان میں وہ نوعمر لڑکوں کو کرکٹ کھیلتے دیکھتا۔ کوئی جیسے اُس کے دل کو مٹھی میں لے لیتا۔ یہ کھیل اُسے جان سے پیارا تھا۔ جس طرح جاندار کو آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے، اسد کو کرکٹ کی ضرورت تھی۔ لیکن اب وہ اپنی

اس دل پسند مصروفیت سے اتنا ہی دُور تھا جتنا مشرق سے مغرب۔

فرنیچر کی جس ورکشاپ میں اسد اپنے دوست بشیرے کے ساتھ رات بسر کرتا تھا وہ کافی وسیع تھی۔ ورکشاپ کے عقب میں تین چار کنال کا ایک گراسی میدان تھا۔ یہاں ورکشاپ کے مالک میاں صادق کے بچوں نے کرکٹ کھیلنے کے لئے سیمنٹ کی پچ بنائی ہوئی تھی۔ اکثر ہفتے اور اتوار کو وہ یہاں آتے تھے اور اپنے دو چار دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ آئے تو اپنے ساتھ نیٹ بھی لائے۔ پھر وہ تو کھیل کر چلے گئے مگر نیٹ وہاں لگا رہا۔

اگلے اتوار وہ پھر آئے۔ اُنہوں نے نیٹ ایک طرف سے کھول دیا اور بیرونی دیوار کو باؤنڈری بنا لیا۔ وہ آپس میں تقسیم ہو کر میچ کھیلنے لگے۔ چند دوسرے فیکٹری مزدوروں کے ساتھ اسد بھی ایک کونے میں بیٹھا میچ دیکھ رہا تھا۔ میاں صادق کے بڑے لڑکے احسن نے بشیرے اور اسد کو اپنے پاس بلایا اور اُنہیں نیٹ کے عقب میں کھڑا کر دیا تا کہ اگر کچھ گیندیں نیٹ میں سے نکل کر پیچھے جائیں تو وہ پکڑ سکیں۔ عرصے بعد کرکٹ گیند کو ہاتھ میں لے کر اسد کو عجیب سا احساس ہوا جیسے کسی دیرینہ دوست کے ساتھ عرصے بعد ملا جائے...... کچھ دیر بعد لڑکوں نے دونوں ٹیموں کو بیلنس کرنے کی ضرورت محسوس کی تو ایک ٹیم میں اسد کو ڈال لیا۔ اسد کے انکار کے باوجود اُنہوں نے اُسے کھیلنے پر مجبور کر دیا...... ظاہر ہے کہ اسد کو اپنا کردار نبھانا تھا۔ اور اُس کا کردار ایک مزدور کا تھا، کرکٹر کا نہیں تھا۔ اپنی باری آنے پر اُس نے بے ڈھنگے انداز میں بلا پکڑا اور اناڑی پن سے گیند کو ہٹ کرنے کی کوشش کرتا رہا...... بعد میں فیلڈنگ بھی اُس نے اپنے کردار کے مطابق ہی کی۔ کئی مرتبہ گیند اُس نے اپنی ٹانگوں کے درمیان سے گزار دی...... اُس کے ساتھ کھیلنے والوں کو کیا پتہ تھا کہ ملک کی معروف تین بینک ٹیم کا سپر سٹار کرکٹر اُن کے ساتھ کھیل رہا ہے۔

میچ ختم ہونے کے بعد جب لڑکے چلے گئے تو بشیرے نے اُسے گھورا۔ ''تجھے کیا لوڑ پڑی تھی کرکٹ کھیلنے کی؟ مشکل سے ٹھیک ہوا ہے۔ کدھرے بازو کو چوٹ لگ جاندی تو پھر؟''

''یار! تم دیکھ ہی رہے تھے۔ احسن باؤ نے زبردستی کھلایا تھا۔''

''تم صاف کہہ دیتے کہ میرا بازو ٹوٹا ہوا ہے۔ لیکن مجھے تو لگتا ہے کہ تجھے بھی گیند بلے کا تھوڑا تھوڑا چسکا۔ ہے میرے بھائی! تجھے پہلے بھی بتایا تھا یہ امیروں کی کھیڈیں ہیں۔ ہم مزدوروں کے پاس اتنا ٹیم ہوتا ہے اور نہ اتنی فالتو طاقت......'' پھر جیسے ایک دم بشیرے کو یاد آیا۔ وہ چونک کر بولا۔ ''تم کل بھی ہسپتال گئے تھے۔ ڈاکٹر کاشف صیب نے تجھے پکی طرح کہا تھا کہ کل چیک کرانے ضرور آنا۔''

''یار! مجھے یاد ہی نہیں رہا۔''

''تو آج چلا جا۔''

''اوئے اُلو! آج تو اتوار کی چھٹی ہے۔''

بشیرے نے برا سا منہ بنایا۔ ''مجھے تو لگتا ہے کہ ڈاکٹر کاشف سے تجھے ویسے ہی خوف آندا ہے۔''

''نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں۔ اچھا کل ضرور جاؤں گا۔''

اگلے روز اسد پھر نہیں گیا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اب اُس کا بازو بہت حد تک ٹھیک ہے۔ بازو ہر طرف گھوم سکتا تھا اور مناسب وزن بھی اُٹھا لیتا تھا۔

تیسرے چوتھے روز کی بات ہے ہڑتال کی وجہ سے ورکشاپ میں چھٹی تھی۔ بشیرا دیہاڑی پر گیا ہوا تھا۔ ورکشاپ میں بس دو لڑکے تھے وہ بھی سو رہے تھے۔ اسد ٹہلتا ہوا ورکشاپ کے عقبی میدان کی طرف آ گیا۔ گراسی میدان میں نیٹ اُسی طرح لگا ہوا تھا۔ یہ ستمبر اکتوبر کے دن تھے۔ دُھوپ اچھی لگنے لگی تھی۔ اسد نے ہوا میں گھاس کی من بھاتی خوشبو کو سونگھا، ایک لمبا سانس کھینچ کر اس مہک کو اپنے سینے میں بھرا اور قدرے اُداس نظروں سے نیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔

لڑکے کرکٹ کی ایک بال برآمدے میں الماری کے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ اسد نے یونہی وہ بال نکال لی اور اُسے ہاتھوں میں اُلٹنے پلٹنے لگا۔ ایک عجیب سی فرحت اُس کے رگ و پے میں دوڑی۔ نجانے کیسا رشتہ تھا اس کے ہاتھ میں اور گیند میں؟ وہ دھیرے دھیرے چلتا نیٹ کی طرف آ گیا۔ نیٹ میں وکٹیں ابھی تک گڑی تھیں۔ اسد میکانکی انداز میں باؤلنگ کریز پر آن کھڑا ہوا۔ کچھ دیر کھوئی کھوئی نظروں سے وکٹوں کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک عجیب سا کرب اُس کی آنکھوں میں تھا۔ اُس نے محتاط انداز میں اِرد گرد

دیکھا......کوئی موجود نہیں تھا۔ ورکشاپ کا وہ دروازہ جو گراسی لان کی طرف کھلتا تھا، بند تھا۔ مشینوں والے بڑے ہال کی کھڑکیاں بھی بند تھیں۔

اسد نے ایک بار پھر بڑی محویت سے وکٹوں کی طرف دیکھا۔ تب اُس کی آنکھوں میں ایک چمک نمودار ہوئی اور وہ اسٹارٹ لینے کے لئے مخالف سمت میں مُڑ گیا۔ دس بارہ قدم دُور جانے کے بعد وہ پھر وکٹوں کی طرف مُڑا، ایک بار پھر اُس نے احتیاطاً اِردگرد دیکھا اور پھر بال پھینکنے کے لئے دوڑ پڑا...... آج اُس نے ایک مدت بعد بال پھینکی تھی۔ سرور کی ایک لہر سی اُس کے ہاتھ سے شروع ہوئی اور بدن میں پھیل گئی......

وہ دوسری گیند کے لئے مُڑا...... پھر تیسری کے لئے...... پھر چوتھی کے لئے۔ جسم کے رگ پٹھوں کو بھولی بسری کہانی یاد آ رہی تھی۔ اُس نے اپنی پسندیدہ ترین ڈلیوری کو یاد کیا، مڈل یا آف سٹمپ سے اچانک باہر کو نکلتی ہوئی وہ گیند جس نے بڑے بڑے بیٹسمینوں کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔ اسد نے محسوس کیا کہ اُس کی اس گیند میں آج بھی وہی مفلوج کر دینے والا اسپارک ہے...... یہ برق رفتار گیند وکٹ پر پڑتے ہی حیران کن طور پر کٹ ہوتی تھیں اور فرسٹ سلپ کی طرف نکلتی محسوس ہوتی تھی۔

اسد نے اپنی اس یادگار گیند کو نیٹ میں چار پانچ مرتبہ دُہرایا اور اُسے کئی بھولی بسری باتیں یاد آئیں۔ گیندیں پھینکتے ہوئے وہ کچھ دیر کے لئے اپنے اردگرد سے بھی بے خبر ہو گیا تھا...... ایک عجیب سی محویت تھی جس نے اُسے حصار میں لے لیا تھا...... اچانک وہ بری طرح چونک گیا۔ اُس کے قدم جیسے زمین نے پکڑ لئے۔ اُس کی نظر اتفاقاً ورکشاپ کے دفتر کی طرف اُٹھ گئی تھی۔ اس دفتر میں صادق صاحب بیٹھا کرتے تھے۔ دفتر کی تین کھڑکیاں گراسی لان کی طرف بھی کھلتی تھیں۔ ان میں سے ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور اُس میں ڈاکٹر کاشف کھڑا بڑی حیرت آمیز دلچسپی سے اسد کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اسد اپنی جگہ بت بنا کھڑا تھا۔ اُس نے غیر ارادی طور پر گیند ہاتھ سے چھوڑ دی تھی۔ ڈاکٹر کاشف نے کھڑکی بند کی اور دروازے کی طرف سے ہو کر گراسی لان میں آ گیا۔ وہ اسد کو بڑی گہری نظروں سے دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ اسد کو محسوس ہوا کہ اس کی پیشانی پر پسینے کی ننھی بوندیں چمکنے لگی ہیں۔ اُس کے ہونٹ خشک تھے اور وہ اُن پر زبان پھیرنا چاہ رہا تھا۔

ڈاکٹر کاشف نے اُس کے قریب آ کر سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا اور اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے عجیب سے انداز میں بولا۔

''کون ہو تم......؟''

''مم...... میں انور......'' اسد ہکلا گیا۔

''نہیں...... تم اپنی اصلیت چھپا رہے ہو۔''

''اصلیت؟ میں سمجھا نہیں......؟''

''تم...... اصل میں کون ہو؟''

''مم...... میں انور ہوں۔ آپ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں بشیرے کے ساتھ دیہاڑی کرتا ہوں۔ پتہ نہیں آپ آج ایسی باتیں کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''ممکن ہے کہ تمہارا نام انور ہی ہو۔ لیکن تم دیہاڑی دار نہیں ہو۔ نہ ہی تم بشیرے کے دوست ہو۔ تم خود کو چھپا رہے ہو۔ مجھے پہلے ہی تمہاری صورت پر شبہ تھا، اب یہ شبہ یقین میں بدل گیا ہے۔ میں نے تمہیں لاہور میں دیکھا ہے کرکٹ کھیلتے ہوئے...... کسی بہت بڑے میچ میں، بڑے بڑے کھلاڑیوں کے ساتھ۔''

اسد کی آنکھوں کے سامنے پھانسی کا پھندا لہرانے لگا...... اُس نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر جی! آپ کو کوئی وہم ہوا ہے۔''

''تم ڈرامہ کر رہے ہو۔ اپنا حلیہ، اپنی بول چال، اپنا انداز...... سب کچھ بدلا ہوا ہے تم نے۔''

''مم...... میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں......؟'' اسد نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھاگ نکلنے کی راہ بھی دیکھ رہا تھا۔

ڈاکٹر کاشف نے سگریٹ کا ایک اور گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''اچھا...... اگر تم واقعی بشیرے کے ساتھی ہو تو یہ کرکٹ کہاں سے سیکھی ہے تم نے؟''

''بب...... بس جی...... یونہی لڑکوں کو دیکھ دیکھ کر میں بھی گیند پھینک لیتا ہوں۔''

''ایسی گیند لڑکوں کو دیکھ دیکھ کر نہیں پھینکی جا سکتی۔ ایسی گیند کوئی بڑا کھلاڑی ہی پھینک سکتا ہے۔''

اسی دوران میدان کی طرف آنے والا دروازہ کھلا اور ورکشاپ کے دو تین لڑکے بھی

وہاں آ گئے۔ اسد چند لمحے پہلے ڈاکٹر کاشف کو دھکا دے کر بھاگ جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ لیکن ورکشاپ کے کاریگروں کو دیکھ کر اُسے اپنا ارادہ ڈانواں ڈول محسوس ہونے لگا۔

ڈاکٹر کاشف نے اسد کو بازو سے تھامتے ہوئے کہا۔ ''چلو آؤ...... اُدھر دفتر میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

اسد لڑکھڑاتے قدموں سے ڈاکٹر کاشف کے ساتھ چل دیا۔ ورکشاپ کے کاریگر جان چکے تھے کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بھی کاشف اور اسد کے پیچھے پیچھے آفس کے سامنے پہنچ گئے۔ ڈاکٹر کاشف اور اسد آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر کاشف بولا۔ ''قدرت کے کام نرالے ہوتے ہیں۔ میں یہاں تمہارا پتہ کرنے آیا تھا۔ میری بار بار کی تاکید کے باوجود تم چیک اپ کے لئے نہیں آئے تھے۔ سوچا خود جا کر تم سے پوچھوں۔ یہاں میاں جی کے دفتر میں پہنچا تو کھڑکی میں سے تم پر نظر پڑ گئی۔''

''میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ آپ کو کوئی غلطی لگ رہی ہے۔'' اسد نے کہا۔

''غلطی پہلے لگ رہی تھی۔ اب تو غلطی دُور ہوگئی ہے...... ویسے کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارا یہ بازو کیسے ٹوٹا تھا؟''

ایک دم اسد جھلا سا گیا۔ وہ بولا۔ ''آپ مجھ سے پولیس والوں کی طرح سوال جواب کیوں کر رہے ہیں؟ یہ ضروری نہیں ہے کہ میں آپ کے ہر سوال کا جواب دیتا جاؤں۔''

''ہر ایک کا جواب نہ دو...... لیکن چند ایک کے جواب دینا تو ضروری ہے۔''

''میں ضروری نہیں سمجھتا......'' اسد اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے آپ کا کوئی نقصان نہیں کیا ہے، کوئی جھگڑا نہیں ہے آپ کا اور میرا...... میں جا رہا ہوں۔''

وہ واپس جانے کے لئے مُڑا تو کاشف نے جلدی سے بڑھ کر اُس کا راستہ روک لیا۔ ''نہیں انور...... تم ایسے نہیں جا سکتے۔ تمہیں اپنے بارے میں بتانا ہوگا۔''

''میں تمہارا پابند نہیں ہوں...... میں جا رہا ہوں۔''

''میری بات سنو انور......!'' ڈاکٹر کاشف نے پھر اُس کا راستہ روکا۔

اسد خود کو کاشف سے چھڑاتا ہوا دفتر سے باہر نکلا اور پھر باہر سڑک پر آ گیا۔ کاشف نے ایک بار پھر دوڑ کر اُس کا بازو تھام لیا۔

کاشف، اسد کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اسد اب ہر صورت یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ دونوں کی تکرار، ہاتھا پائی کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اِردگرد لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ اچانک ایک کار اُن کے قریب رُکی۔ اُس میں سے ایک لحیم شحیم ''پہلوان نما'' شخص اُترا...... اُس نے بوسکی کی قمیض اور سفید شلوار پہن رکھی تھی۔ ہاتھوں میں انگوٹھیاں اور کندھے پر شال تھی۔ وہ بڑا دھڑلے دار شخص لگتا تھا۔ اُس کے دو تین موٹے تازے ساتھی بھی اُس کے ساتھ ہی کار سے اُتر آئے۔

پہلوان نما شخص نے ڈاکٹر کاشف کے قریب پہنچ کر کہا۔ ''کیا جھگڑا شگڑا ہو گیا ہے کاشف باؤ؟''

کاشف نے چونک کر پہلوان نما شخص کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''کچھ نہیں پارہ پہلوان! بس ویسے ہی ذرا......''

''کیا ویسے ہی ذرا؟...... تم پردے مت ڈالو۔ یہ بندہ مجھے ذرا ڈِنگا ٹِنگا لگ رہا ہے...... شاید اس کی طبیعت شبیعت ٹھیک ہونے والی ہے۔'' اس کے ساتھ ہی پارہ پہلوان نے مضبوطی سے اسد کا بازو تھام لیا۔

اسد بدحواسی کے عالم میں تھا۔ طریقے سے بات کرنے کی بجائے اُس نے خود کو چھڑانا چاہا۔ پہلوان نے اُسے گریبان سے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا، پھر دیوار سے لگا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اُس کا بھاری بھرکم ہاتھ اسد کو مارنے کے لئے اُٹھا۔ ڈاکٹر کاشف نے جلدی سے اُس کا ہاتھ روک لیا۔

''نہیں پارہ پہلوان! یہ اپنا ہی بندہ ہے۔ اسے مارنا نہیں ہے۔ بس ذرا اس کا دماغ آؤٹ ہو رہا ہے، ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔''

''آؤٹ دماغ خود ہی ٹھیک نہیں ہوتا۔ اسے ٹھیک شیک کرنا پڑتا ہے۔'' پارہ پہلوان نے ایک بار پھر اپنا مُکا فضا میں بلند کیا۔ کاشف نے ایک بار پھر اُسے بمشکل روکا۔ اسد کا گریبان مسلسل پارہ پہلوان کی گرفت میں تھا۔

ڈاکٹر کاشف کے کہنے پر پارہ پہلوان اور اُس کے ساتھی اسد کو دوبارہ آفس میں لے آئے۔ پارہ پہلوان نے جمع ہو جانے والے تماشائیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر ورکشاپ کے گیٹ کے سامنے تتر بتر کر دیا......

"یہ معاملہ شاملہ کیا ہے؟ کہیں یہ لُدھڑ کوئی شے لے کے تو نہیں بھاگا؟" پارہ پہلوان نے پوچھا۔

"نہیں پہلوان جی! ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ اپنا ہی ساتھی ہے۔ بس ایک غلط فہمی سی ہوگئی ہے۔" ڈاکٹر کاشف نے جلدی سے کہا۔

اس کے بعد ڈاکٹر کاشف جلدی جلدی ایک نمبر ڈائل کرنے لگا۔ چند سیکنڈ بعد رابطہ ہوگیا...... ڈاکٹر کاشف بولا۔ "ہیلو جمال...... میں کاشف بول رہا ہوں...... بس ٹھیک ہے...... تم سے ایک ضروری کام ہے...... نہیں نہیں...... فون پر نہیں بتا سکتا...... تم کسی طرح جمرود روڈ پر آ جاؤ...... ہاں ہاں...... یہاں میاں صادق صاحب کی فرنیچر ورکشاپ ہے...... بالکل...... بس وہیں پہنچ جاؤ...... ارجنٹ۔"

چند اور باتیں کر کے اُس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ پارہ پہلوان نے ابھی تک اسد کا گریبان دبوچ رکھا تھا۔ اسد اُسے خشمگیں نظروں سے گھور رہا تھا، یوں لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے اسد کی برداشت جواب دے جائے گی اور وہ نتیجے سے بے پرواہ ہو کر پہلوان سے گتھم گتھا ہو جائے گا، یا پھر اُسے دھکا دے کر بھاگنے کی کوشش کرے گا۔

ڈاکٹر کاشف نے پارہ پہلوان سے درخواست کی کہ وہ اسد کا گریبان چھوڑ دے۔ پارہ پہلوان نے گریبان چھوڑ دیا۔ بہرحال وہ اسد کی طرف سے پوری طرح چوکس تھا کہ اگر وہ اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش کرے تو وہ اُسے ایک دم سے دبوچ لے۔

قریباً دس منٹ بعد ورکشاپ کے احاطے میں ایک چھوٹی سوزوکی کار داخل ہوئی۔ کار میں سے ایک سمارٹ سا نوجوان اُترا۔ ڈاکٹر کاشف نے چند سیکنڈ اُس سے کھسر پھسر کی، پھر وہ دونوں آفس کی طرف آ گئے۔ اسد آفس کے شیشے میں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا...... نو وارد آفس میں داخل ہوا۔ اُس نے اسد کو سر تا پا غور سے دیکھا، پھر تفہیمی انداز میں سر ہلاتا ہوا کاشف کے ساتھ باہر چلا گیا۔ اسد نے دیکھا کہ نو وارد کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آ رہا ہے۔ وہ دونوں ایک کاغذ پر جھک گئے اور بڑے دھیان سے کچھ دیکھنے لگے۔ اسد کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ پہچان لیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی حوالات، جیل اور تختۂ دار کے تصورات اُس کے ذہن میں کھلبلی مچانے لگے تھے۔

یہ ایک دم کیا ہو گیا تھا؟...... ڈاکٹر کاشف کی تیز تیکھی نظریں اسد کو پریشان تو کیا

کرتی تھیں لیکن ایک گھنٹہ پہلے تک وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اُس کے ساتھ ایک دم ایسا کچھ ہو جائے گا۔ وہ اپنے دبے ہوئے شوق کے تحت نیٹ پر چلا گیا تھا۔ نیٹ پر اُسے ڈاکٹر کاشف نے تاڑ لیا تھا اور پھر یہ نیٹ یعنی جال اُس کے لئے مصیبت اور ابتلا کا جال بن گیا تھا۔ یہ سب کچھ اُسے ایک ڈراؤنے خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ ہر شے دُھندلی دُھندلی اور گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

دو چار منٹ بعد ڈاکٹر کاشف اپنے سمارٹ ساتھی کے ساتھ واپس آفس میں آ گیا۔ ڈاکٹر کاشف نے اسد کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "جو کچھ ہوا ہے، میں اس کے لئے معذرت چاہتا ہوں۔ جب تمہیں حقیقت کا علم ہو گا تو تمہاری یہ ناراضگی شاید برقرار نہ رہے۔"

ڈاکٹر کاشف کے ساتھی نے اسد سے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "میرا نام جمال ضیاء ہے۔ میں پشاور کرکٹ ایسوسی ایشن کی ٹیم کی طرف سے کھیلتا ہوں۔ آپ کو میں غائبانہ طور پر اچھی طرح جانتا ہوں...... بہرحال یہ باتیں بعد میں ہوں گی۔ ابھی آپ کے لئے لاہور سے ایک اہم فون آ رہا ہے، پہلے آپ یہ فون اٹینڈ کر لیں......"

ابھی جمال نامی اُس نوجوان کی بات منہ ہی میں تھی کہ فون کی گھنٹی بول اُٹھی۔ ڈاکٹر کاشف نے ریسیور اُٹھایا۔ ایک دو بار "جی ہاں...... جی سر!" کہا پھر ریسیور اسد کی طرف بڑھا دیا۔ "لو...... بات کرو۔"

اسد نے چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد ریسیور کان سے لگا کر "ہیلو" کہا۔ دوسری طرف سے جو آواز اُس کے کان میں پڑی، اُس نے اسد کو مکمل طور پر چکرا دیا...... یہ قدیر صاحب کی آواز تھی...... اُس محسن کی آواز جس نے اسد کو شادپور کے دُور دراز قصبے سے اُٹھایا تھا اور کرکٹ کی دنیا کا ایک چمکتا ہوا نام بنا دیا تھا...... وہ اس آواز کو کیسے بھول سکتا تھا؟ یہ آواز اور اسد کا فن ایک دُوجے میں یوں گھلے ملے ہوئے تھے کہ ایک کو دُوجے سے جدا کرنا مشکل تھا۔

وہ سکتہ زدہ تھا۔ آواز پھر اُس کے کانوں میں پڑی۔ "اسد...... میں لاہور سے قدیر بول رہا ہوں۔ تم کہاں کھو گئے تھے اسد؟ تمہیں پتہ ہے، میں نے ڈیڑھ سال تک تمہیں پاگلوں کی طرح ڈھونڈا ہے۔ کہاں چلے گئے تھے تم......؟" آخری الفاظ کہتے کہتے قدیر

صاحب کی آواز بھرا گئی۔

''مم...... میں آپ کو کیا بتاؤں؟ میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا۔'' اسد نے بھی گلوگیر لہجے میں کہا۔

پھر پتہ نہیں ایک دم اسد کو کیا ہوا، وہ فون پر ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ دوسری طرف سے قدیر صاحب نے تسلی تشفی کے بول بولے۔ پھر وہ اسد سے کہنے لگے۔ ''اسد! تم نے کہیں جانا نہیں...... میں ابھی لاہور سے پشاور کے لئے روانہ ہو رہا ہوں۔ تم نے کہیں جانا نہیں۔ میں تمہیں آ کر سب کچھ بتاتا ہوں۔ میں جانتا ہوں ڈیڑھ دو برس پہلے تم سے لاہور میں ایک بندہ قتل ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ تفصیل میں تمہیں آ کر بتاتا ہوں۔ تم مکمل تسلی سے میرا انتظار کرو۔ یہ ڈاکٹر کاشف وغیرہ اپنے ہی لوگ ہیں۔ ان کی طرف سے پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔''

تسلی کی دو چار مزید باتیں کر کے قدیر صاحب نے سلسلہ منقطع کر دیا...... اسد کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں...... ڈاکٹر کاشف اور قدیر صاحب میں کیا رابطہ تھا اور ڈاکٹر اپنے جمال ضیاء نامی ساتھی کے ساتھ مل کر کس کاغذ پر غور وخوض کر رہے تھے؟ اس طرح کے کئی سوالات اسد کے ذہن میں کلبلانے لگے تھے۔

ڈاکٹر کاشف، اسد کی طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرایا اور اُسے اصل نام سے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''اسد بھائی! آئیے چلیں۔ اب گھر چلتے ہیں...... قدیر صاحب بھی وہیں گھر پر ہی آئیں گے۔ وہ بائی ایئر آ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے دو گھنٹے تک وہ پہنچ جائیں گے۔''

اسد خاموش بیٹھا رہا۔ اُس کے چہرے کی ہیجانی کیفیت اب ختم ہو چکی تھی۔ پارہ پہلوان اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''کاشف باؤ! میرا خیال ہے کہ آپ لوگوں کے درمیان جو غلط شلط فہمی تھی، وہ دُور ہو گئی ہے۔ اب یہاں میری ضرورت شروع نہیں ہے۔''

کاشف اپنے دوست پارہ پہلوان اور اُس کے ساتھیوں کے ساتھ باہر چلا گیا۔ جاتے ہوئے پارہ پہلوان اور اُس کے ساتھیوں نے اسد کے ساتھ گرم جوشی سے مصافحہ

کیا اور معذرت کے کلمات بھی کہے۔ اب کمرے میں جمال ضیاء اور فیکٹری کے چار پانچ افراد ہی تھے۔ ایک بار پھر اسد کے دماغ میں کیڑا رینگا۔ اُس کا دل چاہا کہ وہ یکایک یہاں سے بھاگ نکلے اور شہر کی بھیڑ میں یوں گم ہو کہ اُس کا ''ماضی'' ہزار ہا آنکھوں سے تلاش کرنے کے باوجود اُسے ڈھونڈ نہ سکے...... لیکن پھر قدیر صاحب کا لہجہ اور اُن کے الفاظ اُس کے کانوں میں گونجے۔ اُس کے دماغ میں سرسراتا ہوا خیال ٹھہر گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ڈاکٹر کاشف اور اُس کے دوست جمال ضیاء کے ساتھ سوزوکی کار میں کسی نامعلوم مقام کی طرف جا رہا تھا...... ڈاکٹر کاشف اور جمال ضیاء کا رویہ ایک دم اسد کے ساتھ احترام اور محبت کا ہو گیا تھا۔ جمال ضیاء نے کہا۔

''اسد بھائی! آپ کو تو شاید یاد نہیں ہو گا لیکن مجھے یاد ہے۔ ڈھائی سال پہلے نومبر میں راولپنڈی میں ہونے والی چیمپئن شپ کے میچ ہماری ٹیم نے بھی کھیلے تھے۔ آپ مجھ سے کھیل میں سینئر تھے۔ پھر آپ کی باؤلنگ کی بھی زبردست دُھوم تھی۔ لڑکے چپکے چپکے کہتے تھے کہ جو اسد کو کھیل گیا سمجھو وہ سب کو کھیل گیا۔ میں نے آپ کو اُوپر تلے دو چوکے لگائے تھے، اس کے فوراً بعد آپ نے مجھے آؤٹ کر دیا تھا لیکن وہ دو چوکے میرے لئے اعزاز کی طرح تھے اور مجھے آج بھی یاد ہیں۔''

ڈاکٹر کاشف نے کہا۔ ''اُس چیمپئن شپ کے کئی میچ میں نے بھی دیکھے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ چیمپئن شپ میں جن کھلاڑیوں کا شہرہ تھا، اُن میں سے ایک آپ بھی تھے۔''

اسی طرح کی باتیں کرتے ہوئے وہ لوگ ایک کوٹھی میں پہنچ گئے۔ یہ جمال ضیاء کی رہائش گاہ تھی۔ ڈرائنگ رُوم میں کرکٹ کے نامور کھلاڑیوں کے پورٹریٹ لگے تھے۔

ٹھیک دو گھنٹے بعد قدیر صاحب لاہور سے پشاور پہنچ گئے۔ وہ پہلے سے کچھ دُبلے ہو گئے تھے۔ سر کے رہے سہے بال بھی اُتر چکے تھے۔ اُن کی عینک کے شیشے کچھ اور موٹے ہو گئے تھے۔ وہ آنکھوں میں آنسو لے کر اسد سے بغلگیر ہو گئے...... اُن کا رشتہ اُستاد شاگرد جیسا بھی تھا اور یہ رشتہ آج دُکھ اور مسرت کے آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد اسد اور قدیر صاحب ایک علیحدہ کمرے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ قدیر صاحب نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''دیکھو اسدی! اگر مجھے اپنا بڑا مانتے ہو تو پھر مجھ سے کچھ بھی چھپانا مت۔ پچھلے ڈیڑھ سال میں جو کچھ بھی ہوا ہے مجھے صاف صاف بتا دو!''

اور اسد نے واقعی اُن سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ اُس کے دل کی کیفیت کچھ ایسی ہو رہی تھی کہ اُس نے اپنا اندر کھول کر اپنے محسن کے سامنے رکھ دیا...... وہ محسن جس کے احسانوں کو اُس نے ایک عرصہ فراموش کئے رکھا تھا۔

اسد نے قدیر صاحب کے سامنے سچ بولا تھا۔ اس سچ کے انعام میں قدیر صاحب نے اُسے ایک ایسی خوشخبری سنائی کہ اسد ششدر رہ گیا۔ اس خوشخبری کو سن کر نجانے کیوں اسد کا دھیان گل جی حضرت کی طرف چلا گیا۔ شاید یہ خوشخبری حضرت صاحب کی صحبت کا نتیجہ ہی تھی۔ یہ اُن کی محبت اور توجہ کا فیض تھا کہ وہ آج اپنی زندگی کو اس نئے موڑ پر دیکھ رہا تھا...... قدیر صاحب نے خوشی سے لرزاں لہجے میں بتایا۔

''اسد! بے شک تم سے ایک بندہ مرا ہے۔ لیکن تم قاتل نہیں ہو۔''

''میں سمجھا نہیں؟''

''تمہارے ہاتھوں سجاد کا دوست مرا تھا۔ سجاد کے دوست اچھے لوگ نہیں تھے۔ اور اُن میں سے یہ سب سے برا تھا۔ اس کا اصل نام رستم راجہ تھا۔ رستم کم از کم پندرہ وارداتوں میں پولیس کو مطلوب تھا۔ ان میں قتل، ڈکیتی اور آبروریزی کی وارداتیں شامل تھیں۔ قانون رُستم کو اشتہاری قرار دے چکا تھا۔ یہ پچھلے دو سال سے قبائلی علاقے میں روپوش تھا۔ کرم اور خیبر ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹس نے اُسے زندہ یا مُردہ گرفتار کروانے والے کے لئے انعام مقرر کر رکھا تھا۔ بعد ازاں صوبائی انتظامیہ کی طرف سے بھی اس قسم کے انعام کا اعلان کیا گیا تھا۔''

قدیر صاحب نے چند لمحے توقف کر کے اسد کی آنکھوں میں دیکھا اور بولے۔

''انشاء اللہ تم قانون کی نگاہ میں سزا کے نہیں، انعام کے مستحق ٹھہرنے والے ہو۔''

اسد صمٌ بکمٌ سن رہا تھا۔ اس قسم کے ڈرامائی موڑ اُس نے کہانیوں میں پڑھے تھے اور فلموں میں دیکھے تھے۔ آج اس جیتی جاگتی زندگی میں اُس کے ساتھ ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا اور اس واقعے نے اُس کی خزاں رسیدہ ٹنڈ منڈ زندگی میں اُمید کی نئی کونپلیں کھلا دی تھیں...... قدیر صاحب اُسے تفصیلات بتا رہے تھے...... اُنہوں نے کہا۔

''شروع میں تو رستم کی شناخت ہی نہیں ہو سکی۔ اُس کی لاش چھ روز مُردہ خانے میں پڑی رہی۔ سجاد اور اُس کا دوست افضل بھی غائب رہے۔ پھر سجاد مقامی تھانے میں پیش

ہو گیا۔ اُس کی زبانی یہ بات معلوم ہوئی کہ رستم دراصل کون ہے۔ درحقیقت رستم نے اپنا حلیہ اس قدر تبدیل کر رکھا تھا اور وہ جسمانی طور پر اتنا بدل چکا تھا کہ پولیس حکام اُسے بطور رستم راجہ شناخت نہیں کر سکے تھے...... سجاد کے بیان کے بعد صورت حال ایک دم تبدیل ہو گئی۔ پولیس نے سجاد اور افضل کو حراست میں لے لیا۔ اُنہوں نے پولیس کے سامنے بک دیا کہ وہ تم پر حملے کی غرض سے فلیٹ میں گئے تھے اور تم نے جو کچھ کیا اپنے دفاع میں کیا...... شاید تمہیں معلوم نہ ہو سجاد نے ایک سال جیل کاٹی ہے۔ اسی طرح افضل بھی چند ماہ تک جیل میں رہا ہے۔ اُن پر رستم کو پناہ دینے کا الزام تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ کافی سستے میں چھوٹ گئے ہیں۔ ورنہ جس قسم کی صورت حال بن گئی تھی وہ تین چار سال کے لئے اندر جا سکتے تھے۔''

قدیر صاحب نے عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''درحقیقت تمہاری روپوشی نے سجاد اور افضل پر بنے ہوئے کیس کو نرم کر دیا تھا۔ دوسری طرف اس روپوشی نے تمہارے لئے مشکلات پیدا کیں۔ عدالت کو تمہارا بیان درکار تھا اور تم بار بار کی طلبی کے باوجود حاضر نہیں ہو رہے تھے۔ دوسرے لفظوں میں عدالت کے ساتھ تعاون نہیں کر رہے تھے۔ وکلائے صفائی نے اس صورت حال کو بڑی مشکل سے ہینڈل کیا۔''

اُس رات قدیر صاحب نے اسد سے بہت طویل گفتگو کی۔ اُن دونوں کی باتیں ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھیں۔ اسد کے گھر والوں کی باتیں...... اسد کی تلاش کی باتیں...... کھیل کے میدان میں اسد کے پیدا کئے ہوئے خلا کی باتیں...... اور بے شمار دیگر باتیں...... اسد کو معلوم ہوا کہ سب کے مایوس ہونے کے بعد بھی قدیر صاحب کس طرح شب و روز اسد کو تلاش کرتے رہے ہیں۔ وہ اُن کا پروان چڑھایا ہوا پودا تھا، وہ اُن کی تخلیق تھا۔ وہ اُن کا ماسٹر پیس تھا...... وہ اُسے کیوں نہ ڈھونڈتے؟ وہ جانی بھائی نہیں تھے کہ وقتی فائدہ اُٹھا کر اُسے بھول جاتے۔ وہ جانی بھائی کی طرح صرف اسد کی کامیابیوں کے خریدار نہیں تھے، اُس کے دُکھوں کے بھی ساتھی تھے۔ اُس کی ناکامیوں اور تکلیفوں سے بھی اُن کی سانجھ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُنہوں نے گزر جانے والے ڈیڑھ دو تاریک ترین برسوں میں بھی اسد کو یاد رکھا تھا...... اپنے دل میں ''ماں باپ'' کا سا درد لئے اسد کو گلی گلی پکارا تھا۔ شہر شہر میں اُسے آواز دی تھی۔ ایک لمحے کے لئے بھی وہ اُس کی تلاش

سے غافل نہیں ہوئے تھے۔ اُنہوں نے اسد کو وہ اشتہارات دکھائے جو وہ وقتاً فوقتاً اسد کی تلاش میں مختلف اخبارات و جرائد میں چھپواتے رہے تھے۔ پھر اُنہوں نے اُسے ایک پمفلٹ بھی دکھایا۔ روغنی کاغذ پر چھپے ہوئے اس پمفلٹ پر اسد کی تصویر بھی تھی۔ یہ پمفلٹ تقریباً پورے پاکستان کی کرکٹ تنظیموں اور کلبوں وغیرہ میں تقسیم کیا گیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں جہاں جہاں بھی منظم طور پر کرکٹ ہوتی تھی وہاں یہ پمفلٹ پہنچا تھا۔ اس پمفلٹ کا آئیڈیا قدیر صاحب کا اپنا ہی تھا۔ قدیر صاحب کو یقین تھا کہ کرکٹ اسد کے خون میں رچی بسی ہے۔ وہ کرکٹ کے بغیر زیادہ دیر نہیں رہ سکتا۔ وہ جہاں کہیں بھی ہوگا، کسی نہ کسی طور، کسی نہ کسی حوالے سے کرکٹ کی طرف آئے گا۔ یوں ممکن ہے کہ اس پمفلٹ کی وساطت سے اُس کی بازیابی کی صورت نکل آئے۔ قدیر صاحب کے اس آئیڈیا کو کئی لوگوں نے پسند کیا تھا جبکہ کئی نے اسے ''بے کار پریکٹس'' قرار دیا تھا۔ بہرحال قدیر صاحب کا اندازِ فکر درست ثابت ہوا تھا۔ آج قریباً ڈیڑھ سال بعد اس پمفلٹ کے وسیلے سے ہی اسد کا کھوج مل سکا تھا۔ ڈاکٹر کاشف کا دوست جمال ضیاء فرسٹ کلاس کرکٹر تھا۔ گراؤنڈ سے باہر بھی کرکٹ کی سرگرمیوں سے اُس کا گہرا تعلق تھا۔ پمفلٹ اور اشتہارات وغیرہ کے حوالے سے اُسے بھی اسد کی طویل گمشدگی کا علم تھا۔ جب فیکٹری کے ''بیک یارڈ'' میں اسد کو اکیلے ہی کرکٹ کھیلتے دیکھ کر کاشف نے جمال ضیاء کو بتایا تو وہ فوراً فیکٹری پہنچا اور اسد کو پہچان لیا۔

○

اس کے بعد واقعات بڑی تیزی سے رونما ہوئے۔ صبح سویرے قدیر صاحب اور جمال ضیاء وغیرہ اسد کو لے کر لاہور پہنچ گئے۔ ایک عرصے بعد لاہور کو اور اُس کے گلی کوچوں کو دیکھ کر اسد کی آنکھیں بھر آئیں۔ اُس نے خوبصورت گراسی گراؤنڈیں دیکھیں، وہاں کھیلتے کودتے نوجوانوں کو دیکھا، ہنستے مسکراتے چہرے دیکھے اور اُس کی ان گنت یادیں تازہ ہوگئیں۔

قدیر صاحب نے کرکٹ بورڈ کے ایک افسر کو ساتھ لیا اور سب سے پہلے اپنے قریبی دوست ایس پی مختار باجوہ کے پاس پہنچے۔ ایس پی کے دفتر میں ایک طویل نشست ہوئی۔ مختلف آن دی ریکارڈ اور آف دی ریکارڈ باتیں ہوئیں۔ قانونی نقطے زیرِ بحث

آئے۔ ایس پی صاحب کی خواہش تھی کہ رستم راجہ کی ہلاکت والے کیس میں ہر تاریخ پر اسد کی عدالت میں حاضری یقینی بنائی جائے۔ اس سلسلے میں قدیر صاحب نے مکمل ضمانت دی۔ اسد کا ایک طویل بیان بھی قلم بند کیا گیا۔ اس بیان میں اسد نے اپنے لاپتہ ہونے کی وجوہات بیان کیں۔ ظاہر ہے کہ ان وجوہات کا تعلق حقیقت سے نہیں تھا، قانونی تقاضوں کی تکمیل سے تھا۔ اسد نے یہ بھی بتایا کہ رستم راجہ کی ہلاکت کے بعد اُسے اپنی جان کا شدید خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔

ایس پی صاحب کی طرف سے اسد کو تین روز بعد دوبارہ دفتر آنے کی ہدایت کی گئی...... دفتر سے فارغ ہوکر قدیر صاحب نے اسد سے کہا۔

''چلو...... اب شاد پور چلیں''

اسد کے مدقوق چہرے پر زرد رنگ بکھر گیا...... اُس کے دل کی گہرائی سے آواز آئی۔

''کیسے سامنا کرو گے ابا جان کا؟ چچا شوکت کا؟ علی اور نازو کا......؟ اور کیسے دیکھ پاؤ گے ماں کا خالی کمرہ...... اور پھر...... پھر وہاں شمیم بھی تو ہے...... آہ شمیم...... جسے دیکھ کر جان نکلتی تھی اور نہ دیکھ کر بھی نکلتی تھی۔

قدیر صاحب نے اُس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہو جائے گا...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

پھر قدیر صاحب نے اسد کی تسلی کے لئے شاد پور میں اسد کے چچا کو فون بھی کر دیا تھا۔ اسد کا سن کر وہ سب اتنے جذباتی ہوئے تھے کہ سب کے سب فوراً لاہور آنا چاہتے تھے۔ قدیر صاحب نے بمشکل اُنہیں روکا تھا اور کہا تھا کہ وہ بس دو گھنٹے انتظار کر لیں، ہم خود وہاں پہنچ رہے ہیں۔

اور پھر دو گھنٹے بعد اسد واقعی شاد پور میں تھا۔ وہ اکتوبر کی نرم و خوشگوار سہ پہر تھی۔ شاد پور کی وہی سہ پہر جو اسد کو دل و جان سے عزیز تھی...... جب دن کی مسافت ختم ہونے کے قریب ہوتی تھی، لڑکے بالے کھیل کود کے لئے گھروں سے نکلتے تھے۔ چھتوں پر عورتیں نظر آتی تھیں...... بھٹیوں پر دانے بھونے جاتے تھے، چمنیوں سے دُھواں نکلنا شروع ہوتا تھا اور کھیت کھیت شام اپنے پر پھیلانے لگتی تھی۔ ہاں...... یہ ویسی ہی شام تھی...... کھیل کا میدان بارونق تھا...... کچھ نوجوان پتنگیں اُڑا رہے تھے، کچھ بابے شفیع

کے ٹیوب ویل کے پاس ٹولی کی شکل میں بیٹھے خفیہ باتیں کر رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ کسی نے اسد کو پہچانا نہیں۔ وہ پہچانے جانے کے قابل بھی کہاں رہا تھا؟ شیو بڑھی ہوئی تھی، چہرہ مدقوق ہو گیا تھا، پری مارکہ سگریٹوں نے اُس کی رنگت بھی سانولا دی تھی۔

وہ گھر میں داخل ہوا۔ ایک ایک فرد سے لپٹ لپٹ کر رویا۔ اُس کی دھاڑوں سے در و دیوار لرزنے لگے۔ والد نے تو اُسے یوں بانہوں میں جکڑا کہ کئی منٹ تک چھوڑنے کا نام نہیں لیا۔ علی عقب سے لپٹ گیا۔ چچا شوکت اُس کے رُخساروں کو چومتے چلے گئے۔

ڈیڑھ سال سے رُکے ہوئے آنسو ہر بند توڑ کر بہہ نکلے تھے اور بہتے ہی چلے جا رہے تھے۔ اسد نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا، وہ بھی رو رہی تھی جس کا دل پتھر تھا اور جو خود بھی ایک ناقابل شکست چٹان تھی۔ وہ چند قدم دُور ایک ستون سے لگی ہوئی تھی اور روتے ہوئے اُس نے اپنے ہونٹوں کو اپنے ہاتھ سے ڈھانپ رکھا تھا...... وہ آج بھی اسی طرح دلکش اور خوبصورت تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جو وقت اسد کو روندتا ہوا گزر رہا ہے، وہ شمیم کو چھوئے بغیر گزر رہا ہے۔ اُس کے بالوں کی چند لٹیں ڈھلک کر اُس کے چہرے پر آ گئی تھیں...... خم کھا کر اُس کے ہونٹوں کو چھو رہی تھیں۔

چچا شوکت نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”تجھے نہیں پتہ اسد! ہم کتنا تڑپے ہیں تمہارے لئے...... ایسا کیوں ہوا...... کیوں ہوا؟......“

اسد کا دل چاہا کہ وہ اپنی اُنگلی شمیم کی طرف سیدھی کرے اور چیخ کر کہے۔ ”ایسے اس لئے ہوا چچا جان! کہ یہ آپ کی بیٹی ہے، اس نے میری معصوم محبت کو اپنی سنگدلی کی چکی میں یوں پیسا ہے کہ ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔ یہ قدم قدم پر مجھے خون کے آنسو رُلاتی رہی ہے، تڑپاتی رہی ہے۔ آپ کے اسی گھر میں، انہی دیواروں میں میری خاموش آہ و پکار گونجتی رہی ہے۔ میرے خون کے نادیدہ چھینٹے اُڑ اُڑ کر ان در و بام کو رنگین کرتے رہے ہیں۔ میں روز مرتا رہا ہوں اور جیتا رہا ہوں اور یہ سب کچھ یہیں آپ کے سامنے ہوتا رہا ہے۔“

لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ کیسے کہہ سکتا تھا...... ان ڈیڑھ دو برسوں میں ہی علی بڑا بڑا لگنے لگا تھا۔ نازو نے بھی کافی قد نکال لیا تھا۔ ابا جان کچھ اور بوڑھے ہو گئے تھے۔ اسد سب سے پہلے والدہ کی قبر پر گیا اور رات گئے تک وہاں بیٹھا آنسو بہاتا رہا۔ چچا شوکت

اور قدیر صاحب اُسے بمشکل واپس لے کر آئے۔ علی الصبح وہ پھر قبرستان چلا گیا۔ قبرستان میں بیٹھے بیٹھے اُس کے دل میں آئی، کتنا اچھا ہو کہ وہ بھی مر کر انہی قبروں میں دفن ہو جائے۔ دنیا کے سارے دُکھوں سے چھٹکارہ پا جائے اور شمیم کے دُکھ سے بھی...... لیکن پھر فوراً ہی حضرت صاحب کی نورانی آواز اُس کی سماعت میں گونجی۔ اُنہوں نے کہا تھا۔

”مرنا دلیری نہیں۔ زندگی کا زہر پینا اور پھر بھی زندہ رہنا دلیری ہے۔ لہٰذا مرنے کی تمنا کبھی نہ کرو۔ بس خدا سے دُعا کرو کہ وہ زندہ رہنے کا حوصلہ دے اور زندگی جیسی نعمت کا شکریہ ادا کرنے کا ظرف بخشے۔

اہل خانہ میں سے کسی نے اسد سے کسی طرح کی باز پرس نہیں کی۔ نہ ہی یہ پوچھا کہ وہ کہاں رہا؟ کیسے گزر بسر کرتا رہا؟ یہاں تک کہ چچا شوکت نے بھی جو اسد سے بہت بے تکلف تھے اس حوالے سے کوئی بات نہیں کی۔ شاید اُنہوں نے پہلے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اسد نے اگر کچھ بتانا ہو گا تو خود ہی بتا دے گا، وہ اس سلسلے میں کچھ دریافت نہیں کریں گے...... قدیر صاحب چوبیس گھنٹے اسد کے ساتھ ہی شاد پور میں رہے۔ پھر وہ واپس لاہور چلے گئے۔ جاتے ہوئے وہ اسد کے چچا شوکت صاحب کی ذمہ داری لگا گئے کہ وہ ایس پی صاحب کی ہدایت کے مطابق اسد کو پرسوں لاہور لائیں گے۔

تین دن بعد اسد پھر لاہور روانہ ہو گیا۔ ایس پی صاحب کے بعد وکیل صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ اُنہوں نے اسد کو اُس کی قانونی پوزیشن سے آگاہ کیا۔ اُن کی باتیں بہت حوصلہ افزا تھیں۔ اُن کا خیال تھا کہ اسد کو عدالت میں بس دو تین پیشیاں ہی بھگتنا پڑیں گی......

اسد واپس شاد پور آ گیا۔ عبداللہ سمیت سارے پرانے دوستوں سے اُس کی ملاقات ہو گئی تھی، اگر نہیں ہوئی تھی تو نذیر احمد سے نہیں ہوئی تھی۔ نذیر احمد کے بارے میں اسد کو پتہ چلا کہ وہ کچھ بیمار ہے۔ عبداللہ دو تین مہینے کراچی رہ کر آیا تھا، اُسے بھی معلوم نہیں تھا کہ نذیر احمد آج کل کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے؟ نذیر احمد سے ملنے کو اسد کا دل مچل رہا تھا۔

گھر میں سب کچھ ٹھیک تھا۔ علی کا فرسٹ ایئر ختم ہونے والا تھا۔ نازو میٹرک میں تھی۔ نازو پہلے ہی کی طرح معصوم اور بے تکلف نظر آتی تھی۔ علی اور نازو ہر وقت اسد کا

دل بہلانے میں لگے رہتے تھے۔ چچا بھی شام کو جلدی گھر آ جاتے تھے اور اسد کے ساتھ وقت گزارتے تھے۔ ابا جان ...... چچی جان ...... سب کا رویہ نارمل تھا۔ اگر نہیں تھا تو شمیم کا۔ اُس کا رویہ جیسے پتھر پر لکیر ہو چکا تھا۔ وہ اسد کو مخاطب کرتی تھی، اُس کے سامنے اُس سے بات چیت بھی کرتی تھی لیکن وہ جو درمیان میں ہزاروں لاکھوں میل کا فاصلہ تھا وہ اپنی جگہ برقرار تھا۔ اُس نے بی اے بڑے اچھے نمبروں سے پاس کر لیا ہوا تھا۔ آج کل وہ ''بی ایڈ'' کی تیاری کر رہی تھی۔ اُس کا ارادہ ٹیچنگ کی طرف جانے کا تھا۔ وہ اپنی ایک سہیلی فرخندہ کے کیریئر سے بڑی متاثر تھی۔ فرخندہ انگلش میں ایم اے تھی اور قصبے میں لڑکیوں کا ایک سکول بڑی کامیابی سے چلا رہی تھی۔

چچا چچی اُس پر شادی کے لئے زور دے دے کر اب تھک ہار چکے تھے۔ ایک دو بار اُنہوں نے زیادہ دباؤ ڈالا تھا تو وہ سخت بیمار ہو گئی تھی۔ اس کے بعد اُنہوں نے چپ سادھ لی تھی ...... بہرحال فکر تو اُنہیں ہر وقت لاحق رہتی تھی۔ ناز وتیزی سے بڑی ہو رہی تھی۔ اب جلد ہی وہ عمر کے اُس دور میں داخل ہونے والی تھی جب لڑکیوں کے لئے رشتے آنے لگتے ہیں۔ اگر بڑی بہن غیر شادی شدہ بیٹھی ہو تو چھوٹی کی شادی کا سوچنا محال ہوتا ہے۔

لاہور سے واپس آنے کے تیسرے دن اسد اور عبداللہ اپنے پرانے یار نذیر احمد سے ملنے عباس پورہ روانہ ہو گئے۔ چچا شوکت کی جیپ پر اُنہوں نے عباس پورہ تک کا نیم پختہ راستہ طے کیا۔ ڈیرے کے قریب سے ہوتے ہوئے وہ نذیر احمد کے گاؤں احسن آباد پہنچ گئے ...... گاؤں پہنچ کر اُنہیں پتہ چلا کہ نذیر احمد تو پچھلے پانچ چھ ماہ سے سخت بیمار ہے۔ وہ دونوں نذیر احمد کے گھر پہنچے۔ وہ ایک نیم تاریک کمرے میں لیٹا تھا۔ اُسے دیکھ کر وہ دنگ رہ گئے۔ پلنگ پر نذیر احمد کی جگہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ نظر آ رہا تھا ...... اُس کے سر کے سارے بال جھڑ گئے تھے اور صرف سر ہی نہیں بھنویں اور مونچھیں وغیرہ بھی صاف نظر آ رہی تھیں۔ یہاں تک کہ اُس کی دبلی پتلی بانہوں پر بھی کوئی بال نظر نہیں آیا۔ اُس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ رنگ لیموں کی طرح زرد تھا۔

فرطِ غم سے اسد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ نذیر احمد پر جھک گیا۔ اُس کی پیشانی چومتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں کیا ہوا نذیر ...... میں تمہیں ایسا چھوڑ کر تو نہیں گیا تھا۔''

نذیر احمد کی آنکھوں میں شناسائی کی کوئی چمک نظر نہیں آئی۔ وہ بالکل انجان نظروں سے اسد اور عبداللہ کو دیکھتا رہا۔ چہرہ بالکل سپاٹ تھا جیسے اُس نے اسد کی آواز سنی ہی نہیں۔ نذیر احمد کا چھوٹا بھائی دانش آگے بڑھا اور اسد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے باہر لے آیا ...... باہر نکل کر اسد زار و قطار رونے لگا۔ عبداللہ بھی آبدیدہ ہو گیا۔ اسد نے روتے ہوئے پوچھا۔

''دانش! یہ کیا ہوا ہے نذیر کو؟''

جواب میں دانش اور دیگر گھر والوں نے جو کچھ بتایا اس سے معلوم ہوا کہ قریباً پانچ ماہ پہلے سکول سے گاؤں واپس آتے ہوئے بارش کی وجہ سے نذیر کی موٹر سائیکل پھسلی اور وہ گر گیا۔ بظاہر اُسے بہت زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔ رات کو وہ سو گیا۔ مگر صبح دیر تک نہیں جاگا۔ جب اُسے جگانے کی کوشش کی گئی تو پتہ چلا کہ وہ بے ہوش ہے۔ اُسے فوراً لاہور کے میو ہسپتال پہنچایا گیا اور وہاں سے جنرل ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔ چار دن تک وہ مسلسل بے ہوش رہا۔ پھر ہوش میں تو آ گیا لیکن بہکی بہکی باتیں کرنے لگا۔ وہ کسی کو بھی پہچان نہیں پا رہا تھا۔ گاہے گاہے اُس پر دماغی دورہ سا پڑ جاتا تھا ...... اگلے ڈیڑھ دو ماہ میں گھر والوں نے بہت بھاگ دوڑ کی لیکن نذیر احمد کی بیماری ڈاکٹروں کی سمجھ میں آئی اور نہ حکیموں اور رُوحانی معالجوں کے پلے پڑی۔

دانش نے کہا۔ ''آپ نذیر بھائی کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے ہیں لیکن ایک مہینہ پہلے دیکھتے تو زیادہ پریشان ہوتے۔ انہوں نے کھانا پینا بالکل بند کر دیا تھا اور اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ سوتے ہوئے بھی ان کی آنکھیں کھلی رہتی تھیں ...... اب تھوڑا بہت کھا لیتے ہیں ...... کسی وقت ایک آدھ لفظ بھی بولتے ہیں لیکن ہمیں پہچانتے بالکل نہیں۔ ان کے جسم کے سارے بال جھڑ گئے تھے۔ لیکن اب پھر کہیں کہیں روئیں نظر آنے لگے ہیں۔''

اسد اور عبداللہ رات وہیں احسن آباد میں رہے۔ اسد کی خواہش تھی کہ نذیر کو پھر لاہور لے جایا جائے۔ اُسے اُمید تھی کہ وہ اپنے اور قدیر صاحب کے تعلقات استعمال کر کے نذیر احمد کو علاج کی بہتر سہولتیں فراہم کر سکے گا۔ لیکن نذیر کے ایک ماموں نے اسد کو سمجھایا کہ وہ ہر طرح کی بھاگ دوڑ کر کے دیکھ چکے ہیں۔ مستند ڈاکٹروں کا بھی یہی کہنا ہے کہ وقت کے ساتھ نذیر کی حالت میں تبدیلی خود بخود آئے گی۔ نذیر کے یہ ماموں بھی

نذیر ہی کی طرح درس و تدریس کے شعبے سے تعلق رکھتے تھے اور سیالکوٹ کے مرے کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔

نذیر احمد کی حالت دیکھ کر پتہ نہیں کیوں اسد کے ذہن میں عجیب سے خیالات کلبلانے لگے تھے۔ اُسے یوں لگ رہا تھا کہ نذیر کی بیماری کے پیچھے بھی کوئی انہونی بات موجود ہے...... کوئی ایسی ''وجہ'' جس کا تجزیہ شاید عام طریقے سے نہ کیا جا سکتا ہو......

اسد جانتا تھا کہ نذیر احمد بھائیا جی والے معاملے میں بے حد متجسس تھا۔ اسد کے نہ چاہنے کے باوجود وہ اس معاملے کو کھوجنا اور اس کی گہرائی میں جانا چاہتا تھا۔ اُس نے سنسکرت کے شعروں کا ترجمہ کرایا تھا۔ رنگی بابا سے ماضی کے دریچے کھلوا کر گئے دنوں کی روئیداد سنی تھی۔ اُس نے سٹور کے ایک پوشیدہ خلا میں موجود چوبی مورتیوں کا سراغ لگایا تھا۔ اور ان سارے واقعات کو ترتیب دے کر ایک کہانی مکمل کرنا چاہتا تھا...... کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اُس کی یہی بے قرار جستجو اُس کی زندگی کو گہنا گئی ہو؟

ایسی باتوں پر اسد یقین نہیں کیا کرتا تھا۔ لیکن اب یقین نہ کرنے کا اُس کے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ جگ بیتی ہوتی یا کوئی سنی سنائی حکایت ہوتی تو وہ صرفِ نظر کرتا لیکن یہ تو آپ بیتی تھی۔ اُس کی سماعت ان گنت مرتبہ ایک غیر مرئی آواز سے ہم کلام ہو چکی تھی۔ اور یہ آواز کسی اجنبی کی نہیں تھی، اُس کے جدامجد کی تھی۔ یہ بھائیا جی کی آواز تھی۔ وہ اُس سے باقاعدہ بات چیت کر چکا تھا۔

اسد اپنے خیالوں میں گم بیٹھا تھا جب اچانک دانش نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے چونکا دیا۔ ''میں آپ کو ایک چیز دکھانا چاہتا ہوں بھائی جان!'' اُس نے کہا۔

''کیا ہے؟''

''آئیے میرے ساتھ......'' دانش نے کہا اور اسد کو اُس کمرے میں لے گیا جو نذیر احمد سٹڈی کے طور پر استعمال کیا کرتا تھا۔

یہ درمیانے سائز کا کمرہ تھا۔ پلنگ، میز کرسی، ٹیبل لیمپ وغیرہ یہاں موجود تھے۔ ایک الماری میں کتابیں تھیں جن سے نذیر کے ادبی ذوق کا پتہ چلتا تھا۔ دانش نے چابی لگا کر الماری کی ایک دراز کھولی اور نیلے رنگ کے کور والی ایک ڈائری نکال لی۔ وہ بولا۔ ''یہ بھائی جان کی ڈائری ہے۔ میرے سوا ابھی تک اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ اس

میں کئی جگہ آپ کا ذکر بھی موجود ہے۔ اکثر باتوں کا تعلق بھی آپ سے اور آپ کے ڈیرے سے ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ڈائری آپ کو دیکھنی چاہئے۔''

خوبصورت ڈائری اسد کے ہاتھ میں تھما کر دانش نے کھڑکیوں کے پردے ہٹا دیئے اور بولا۔ ''بچے آپ کو ڈسٹرب کریں گے۔ دروازہ اندر سے بند کر لیجئے اور اطمینان سے پڑھیے۔''

اسد نے دروازہ بند کر لیا اور ڈائری کی ورق گردانی شروع کر دی۔ ڈائری کی حالت بتا رہی تھی کہ یہ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ پہلے صفحے پر ہی تاریخ موجود تھی۔ اس تاریخ سے اندازہ ہوا کہ نذیر نے یہ ڈائری قریباً ڈیڑھ سال پہلے لکھنی شروع کی تھی۔ یہ وہی دن تھے جب منتقم المزاج فریحہ کی وجہ سے سجاد وغیرہ نے اُس پر حملہ کیا تھا۔ اُس کے ہاتھوں رستم راجہ ہلاک ہوا تھا اور اسے راہِ فرار اختیار کرنا پڑی تھی۔

سال کے آٹھویں مہینے کی ایک تاریخ میں اس واقعے کا ذکر بھی موجود تھا۔ نذیر احمد نے لکھا تھا۔

''پرسوں کا دن بڑا سیاہ تھا۔ میں موٹر سائیکل کے لئے ٹائر ٹیوب لینے شاد پور گیا۔ وہاں ایک روح فرسا اطلاع میری منتظر تھی۔ پتہ چلا کہ لاہور میں اسد کے ہاتھوں ایک بندہ مارا گیا ہے۔ کچھ مسلح لڑکوں نے اُس کے فلیٹ میں گھس کر اُس پر حملہ کیا تھا۔ اُس نے بڑی دلیری سے اُن کا مقابلہ کیا۔ لڑائی کے دوران ایک وکٹ ایک حملہ آور کے پیٹ میں لگی اور اُس کی جان لے گئی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کسی لڑکی وغیرہ کا چکر تھا۔ اسد کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں کہ کہاں ہے۔ کل شاد پور پولیس آئی تھی۔ اسد کے چچا اور والد کو پوچھ گچھ کے لئے لاہور لے گئی ہے۔ اس واقعے کی وجہ سے ایک اور جان بھی گئی اور یہ اسد کی والدہ کی ہے۔ وہ پہلے ہی بیمار رہتی تھیں۔ اس واقعے کی خبر سن کر انہیں دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ افسوس کہ میں اُن کے جنازے میں شرکت نہ کر سکا......''

اس کے بعد کئی تاریخوں کے روزنامچے میں اسد کی گمشدگی اور اُس کے لواحقین کی پریشانیوں کا ذکر موجود تھا۔

پھر ایک تاریخ میں لکھا تھا۔ ''آج بھی مہینے کی آخری جمعرات تھی۔ میں رات گئے تک بھائیا جی کی قبر کے پاس موجود رہا۔ لیکن وہ نہیں آئی۔ پتہ نہیں کہ اب کبھی دوبارہ

اُسے دیکھ بھی سکوں گا یا نہیں؟ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ مجھے بھائیا جی کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتی ہے۔''

اس کے بعد کی کئی تاریخوں میں بھائیا جی یا اسد وغیرہ کا ذکر نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ دو تین ماہ کے لئے نذیر احمد ان معاملات کو بھول ہی گیا تھا۔ ان دو تین مہینوں میں وہ ہر دوسرے تیسرے روز ڈائری لکھتا رہا تھا۔ پھر ایک تاریخ میں اُس نے بڑے جوش کے عالم میں بھائیا جی کے بارے میں لکھا تھا اور چار پانچ صفحات اس حوالے سے بھر دیئے تھے۔ اُس کی تحریر سے اسد کو جو کچھ معلوم ہوا وہ کچھ اس طرح تھا......

نذیر احمد نے کسی طرح سراغ لگا لیا تھا کہ کبھی کبھار ایک نہایت ضعیف عورت بڑی خاموشی سے بھائیا جی کی قبر پر آتی ہے، وہاں چراغ جلاتی ہے اور دُعا مانگتی ہے۔ نذیر احمد کئی ماہ اُس ضعیف عورت کا منتظر رہا اور پھر ایک دن اُسے بھائیا جی کی قبر پر دیکھنے میں کامیاب ہو گیا...... وہ عورت اس قدر ضعیف تھی کہ اُسے چار کہار ڈولی پر لے کر آتے تھے۔ کہار ڈولی قبرستان کی زمین پر رکھ دیتے تھے۔ وہ ڈولی کے اندر ہی بیٹھی رہتی تھی اور دُعا مانگ کر چلی جاتی تھی...... نذیر احمد نے اس ڈولی سوار ضعیفہ کا پیچھا کیا اور ایک قریبی گاؤں نواب گڑھ پہنچ گیا۔ یہ عورت وہیں کی رہنے والی تھی۔ اُسے سیداں مائی کہا جاتا تھا۔ سیداں مائی کے خانوادے میں بڑی لمبی عمریں پائی جاتی تھیں۔ اس خانوادے کے کئی بڑے سو سال یا اس سے بھی زیادہ عمر کو پہنچے تھے۔ سیداں مائی کی اپنی عمر بھی سو سے کم نہیں تھی۔ اُس کی آنکھیں بالکل بیٹھ چکی تھیں اور نگاہ ختم ہو چکی تھی۔ کانوں سے بھی بہت کم سنائی دیتا تھا۔ لیکن بولنے کی صلاحیت اُس میں باقی تھی۔ نذیر احمد کی تحقیق کے مطابق سیداں مائی اسی گاؤں کی تھی جس میں بھائیا جی کی شادی ہوئی تھی۔ بھائیا جی کی بیوی یعنی اسد کی پڑدادی کا نام نور پروین تھا۔ اُسے عام طور پر لاڈ سے پیناں کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ سیداں مائی پیناں سے عمر میں کافی چھوٹی تھی لیکن اُن کا رشتہ سہیلیوں کا سا تھا۔

اپنی تحریر میں آگے چل کر نذیر احمد نے لکھا تھا۔

''میں سیداں مائی سے ملا ہوں۔ اُس سے باتیں کی ہیں، طویل العمری کے باعث سیداں مائی سے اُس کی ساری حِسیں چھن گئی ہیں لیکن قوتِ گویائی باقی ہے۔ وہ اُونچی آواز سے بول رہی تھی اور اُس کے الفاظ آسانی سے سمجھ میں آ رہے تھے۔ اُسے بولتے

سن کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پوری ایک صدی اُس کے اندر بول رہی ہے۔ اُس کے لواحقین کا کہنا ہے کہ مائی کی عمر ایک سو دس سال ہو چکی ہے۔ بہرحال اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں مجھے اتنا یقین ہے کہ ایک دو ملاقاتوں میں، سیداں مائی کو ایسی پوزیشن میں لے آؤں گا کہ وہ مجھے بھائیا جی اور اُن کی محبوب بیوی پیناں کے بارے میں کچھ بتا سکے۔''

اگلے دو تین روز ناموں میں بھی سیداں مائی کا ذکر موجود تھا۔ چند سطور اسد کے بارے میں بھی لکھی گئی تھیں۔ ان سطور کا مفہوم یہ تھا کہ لاہور کے فلیٹ میں اسد کے ہاتھوں مارا جانے والا لڑکا ایک مفرور قاتل ثابت ہوا ہے۔ اُس پر ان گنت مقدمات تھے اور اُس کے سر کی قیمت مقرر کی گئی تھی۔ اس تحریر میں آگے جا کر قدیر صاحب کا ذکر بھی تھا۔ نذیر نے لکھا تھا کہ قدیر احمد نامی ایک صاحب اسد کو تلاش کرتے ہوئے عباس پورہ تک آئے ہیں۔ وہ اُسے ڈھونڈنے کے لئے بڑے جتن کر رہے ہیں۔ یہ قدیر صاحب وہی ہیں جو اسد کو لاہور لے کر گئے تھے اور اُسے اپنے ''اے ون'' نامی کلب میں کھلاتے رہے ہیں۔

چند صفحات کے بعد نذیر احمد کی اس ذاتی ڈائری میں پھر بھائیا جی اور اُن کی شریک حیات کا ذکر بڑی تفصیل سے موجود تھا۔ نذیر احمد نے جوش و خروش کے عالم میں لکھا تھا۔

''کل دسمبر کی بائیس تاریخ تھی۔ اس تاریخ کی طویل سرد رات میں نے سیداں مائی کے گھر گزاری ہے۔ اُن کے لحاف میں بیٹھ کر اُن کے پاؤں دباتے ہوئے...... میری اس خدمت کے صلے میں سیداں مائی نے مجھے ایک ایسی کہانی سنائی ہے جسے میں مدت سے تلاش کر رہا تھا۔ اس کہانی نے بھائیا جی اور پیناں کی زندگی کے کئی تاریک گوشوں سے پردہ اُٹھایا ہے۔ یہ پردہ شاید صرف سیداں مائی ہی اُٹھا سکتی تھی۔ کیونکہ وہ پیناں کی ہمراز بھی تھی......''

اسی تحریر میں کچھ آگے جا کر نذیر احمد نے لکھا تھا...... ''جس طرح بھائیا جی کا تعلق کھاتے پیتے زمیندار گھرانے سے تھا، اسی طرح پیناں بھی خوشحال زمیندار فیملی کی تھی بلکہ اُس کی مالی حیثیت بھائیا جی سے بھی بہتر تھی۔ بھائیا جی اور پیناں نے ایک دُوجے کو عباس پورہ کے میلے میں دیکھا تھا۔ دونوں خوبصورت اور جوان تھے۔ دونوں ایک

دُوجے کو پسند کرنے لگے۔ دونوں گھرانوں کا پیشہ چونکہ زراعت تھا، لہٰذا وہ کبھی کبھار آپس میں ملتے بھی تھے۔ بھائیا جی اور پیناں کے دل آپس میں ملے تو دونوں گھرانوں کا میل جول اور بڑھ گیا۔

بھائیا جی کی والدہ کو پیناں پسند آئی اور پیناں کے والدین نے بھائیا جی کو پسند کیا۔ بات زبانوں پر تو نہیں آئی لیکن دلوں میں یہ بات موجود تھی کہ دونوں کا رشتہ ہو جائے تو بڑی اچھی بات ہے۔ بھائیا جی کا رمضان ملک نامی ایک گہرا دوست تھا۔ بھائیا جی اپنے اور پیناں کے بارے میں ہر بات بے تکلفی کے ساتھ رمضان کو بتا دیا کرتے تھے۔ پیناں سے پہلے بھی بھائیا جی کی زندگی میں ایک دو لڑکیاں آئی تھیں۔ اُن کے بارے میں بھی رمضان ملک کو معلوم تھا۔ رمضان ملک کہنے کو تو بھائیا جی کا یار تھا۔ لیکن اندر سے ''یار مار'' تھا۔ وہ زمیندار گھرانے سے تھا اور خود بھی پیناں سے شادی کا خواہش مند تھا۔ اُس نے پیناں کے والد چوہدری خدا بخش کے سامنے بھائیا جی کی ایک ایسی تصویر پیش کی کہ دھیرے دھیرے چوہدری خدا بخش کا دل بھائیا جی سے کھٹا ہو گیا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ بھائیا جی پیناں کو دل و جان سے چاہتا ہے اور پیناں کا بھی یہی حال ہے۔

پیناں اپنے والد چوہدری خدا بخش کی بے حد لاڈلی تھی۔ دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے...... لیکن بھائیا جی کے معاملے میں باپ بیٹی کی رائے مختلف ہو گئی۔ باپ کا خیال تھا کہ بھائیا جی ایسا نوجوان نہیں جسے پورے بھروسے کے ساتھ پیناں جیسی بیٹی کا ہاتھ سونپا جا سکے۔ دوسری طرف پیناں کا خیال تھا کہ بھائیا جی ماضی میں جو کچھ بھی تھا لیکن اب وہ صرف اور صرف اُسے چاہتا ہے۔

دونوں گھرانوں کے تعلقات میں سرد مہری آتی چلی گئی اور بھائیا جی اور پیناں کے رشتے کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے سے دُعا سلام بھی ختم ہو گئی۔ بھائیا جی کو رنج اس بات کا تھا کہ پیناں نے اس موقعے پر کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ وہ بس خاموش تماشائی بنی رہی۔ اُس نے کہا کہ جہاں اُس کے والدین اُسے ہنکائیں گے وہ ہنک جائے گی۔ اُس نے بس اپنے خاندان کی عزت و ناموس کا سوچا اور بھائیا جی کی تڑپتی سسکتی محبت کی طرف سے آنکھیں بالکل بند کر لیں۔ جب دونوں گھرانوں کے تعلقات خراب ہوئے تو بھائیا جی اور اُس کے ہونے والے سسر خدا بخش کے

درمیان کچھ تلخ کلامی بھی ہوئی تھی۔ اس تلخ کلامی کا بھی خدا بخش کو رنج تھا...... اُس کی خواہش تھی کہ بھائیا جی اُس سے معافی مانگے۔ اس رشتے کے حوالے سے دو تین سال میں کئی اُتار چڑھاؤ آئے، آخر صلح ہو گئی۔ بھائیا جی نے اپنے ہونے والے سسر سے معذرت بھی کر لی۔

یہ شادی بڑے چاؤ اور زبردست دُھوم دھام سے ہوئی۔ تاہم شادی کے ڈیڑھ دو ماہ بعد ہی میاں بیوی کی پُرسکون ازدواجی زندگی میں اچانک لہریں پیدا ہونے لگیں۔ بھائیا جی نے پیناں کو طعنے دینے شروع کر دیئے تھے کہ وہ اپنے باپ کے کہنے پر ہنسی خوشی کسی اور کی ڈولی میں بیٹھنے پر تیار ہو گئی تھی۔ اگر وہ اُس سے اتنی ہی محبت کرتی جتنی وہ کرتا تھا تو کبھی بھی اس صورتحال کو برداشت نہ کرتی۔

بھائیا جی کا یہی رنج آہستہ آہستہ تلخ کلامی میں ڈھل گیا۔ بھائیا جی ہر وقت پیناں پر گرجنے برسنے لگا۔ وہ روتی رہی اور بھائیا جی کا دل موم کرنے کی اپنی سی کوشش کرتی رہی۔ پھر ایک روز یہاں تک نوبت پہنچی کہ بھائیا جی نے پیناں کو تھپڑ مار دیا۔ پیناں روتی ہوئی والدین کے گھر چلی گئی۔ جس وقت پیناں گھر سے نکلی، پیناں یا بھائیا جی کو ہرگز معلوم نہیں تھا کہ اُن کی یہ جدائی کتنی طویل ثابت ہونے والی ہے...... یہ جدائی قبر کی دیواروں تک بھی ختم ہونے والی نہیں تھی۔ اگر پیناں کو معلوم ہوتا تو وہ اپنے قدم روک لیتی۔ اگر بھائیا جی کو معلوم ہوتا تو وہ پیناں کا بازو تھام لیتے۔ لیکن ایسا کچھ نہ ہو سکا...... پیناں کبھی واپس نہ آنے کے لئے چلی گئی۔

آنے والے برسوں میں حالات نے کئی پلٹے کھائے۔ بھائیا جی کے بیٹے رب نواز کی پیدائش ہوئی، بزرگوں کی طرف سے صلح صفائی کی کوششیں ہوئیں، دونوں محبت کرنے والوں کے جذبوں نے جوش مارا لیکن نتیجہ کچھ نہ نکل سکا۔ کبھی پیناں کے سامنے اپنے باپ کی محبت آ گئی، کبھی بھائیا جی کے سامنے انا کی دیوار کھڑی ہو گئی۔ پھر ایک ایسا مرحلہ بھی آیا کہ بھائیا جی نے پیناں کو طلاق دینے کا اعلان کر دیا۔ اس موقعے پر ایک مرحلے میں تو یوں لگا جیسے اُجڑا ہوا گھر پھر سے آباد ہو جائے گا۔ لیکن ''ہونی'' نے کچھ نہ ہونے دیا...... بھائیا جی نے پیناں کو طلاق دے دی اور اس کے بعد بتدریج اُن کی زندگی میں ایک انقلاب آ گیا۔ وہ شراب میں غرق ہو کر ساری دنیا سے الگ تھلگ ہو گئے۔''

اسی تاریخ کی تحریر میں کچھ آگے جا کر نذیر احمد نے لکھا تھا......"سیداں مائی کی باتوں سے اُس بے پناہ محبت کا پتہ چلتا ہے جو پیناں اپنے بچھڑے ہوئے خاوند سے رکھتی تھی۔ اُس نے انکشاف کیا ہے کہ پیناں نے قریباً پینسٹھ سال عمر پائی۔ وہ ہر جمعرات کو بھائیا جی کے نام پر روزہ رکھتی رہی اور اس معمول میں اُس کی زندگی کی آخری شام تک فرق نہیں آیا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ پورا پورا ہفتہ یا مہینہ روزے رکھتی تھی...... وہ ہر چھوٹی اور بڑی عید پر باقاعدگی سے بھائیا جی کو خط بھیجتی تھی۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اس خط پر کچھ لکھا نہیں ہوتا تھا۔ بس وہ لفافے میں سادہ کاغذ ڈال کر بھیجتی تھی یا اُس پر دو چار آنسو گرا دیتی تھی۔ دراصل پیناں کے والد خدا بخش نے اُسے اپنی قسم دی ہوئی تھی کہ وہ بھائیا جی سے کوئی رابطہ نہیں رکھے گی۔ وہ باپ کی محبت اور قسم کی زنجیر میں بندھی ہوئی تھی اور دوسری طرف بھائیا جی کے پیار میں تڑپتی تھی۔ سیداں مائی 45 برسوں کے اُس ہر ہر پل کی گواہ ہے جو پیناں نے بھائیا جی کی محبت میں خون کے آنسو روتے ہوئے گزارا......

بھائیا جی کی موت کے قریباً پندرہ سولہ سال تک پیناں ہر ماہ کی آخری جمعرات کو بڑی خاموشی کے ساتھ نواب گڑھ سے نکلتی تھی اور عباس پورہ کے قبرستان میں بھائیا جی کی قبر پر آتی تھی۔ یہاں وہ پھول چڑھاتی تھی، اپنے آنسوؤں کے چراغ جلاتی تھیں اور پتھر کی طرح ساکت بیٹھی رہتی تھی۔ رنگی بابا کے سوا پیناں کے اس معمول کی کسی کو خبر نہیں تھی۔ جب رنگی بابا کو اس بات کی خبر ہوئی تو پیناں نے اُس سے التجا کی تھی کہ وہ یہ راز صرف اپنے تک ہی رکھے۔ پیناں کا یہ معمول اُس کی زندگی کے بس آخری دو تین برسوں میں متاثر ہوا۔ مسلسل نفلی روزوں اور معدے کی تکلیف نے اُسے کافی کمزور کر دیا تھا۔ وہ خود نہیں آ سکتی تھی تو سیداں مائی کو بھیج دیتی تھی۔ اُس سے کہتی تھی، "اپنے بھرا کو میرا سلام کہہ آ! اُس سے کہہ آ کہ وہ مرن جوگی اس بار آن جوگی نہیں ہے......"

اُس کی آخری تمنا تھی کہ مرنے کے بعد اُسے بھائیا جی کے پاؤں کی طرف قبر کی جگہ مل جائے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ تمنا کسی طور پوری نہیں ہو سکتی۔ اُس کے حالات ایسے تھے کہ وہ مر کر بھی بھائیا جی کے قریب نہیں رہ سکتی تھی۔ جب پوہ کی ایک کالی ٹھنڈی رات کو وہ مرنے لگی تو مرنے سے چند گھنٹے پہلے اُس کے پاؤں سن ہو گئے۔ وہ سیداں مائی سے بولی۔ "سیداں! کہتے ہیں کہ جان پاؤں کی طرف سے نکلتی ہے۔ لگتا ہے کہ

میرے پاؤں مر گئے ہیں...... اچھا ہوا کہ میں نے ان پاؤں کو اپنے سامنے ہی مرتے ہوئے دیکھ لیا۔ یہی پاؤں تھے جنہوں نے مجھے اپنے خاوند کی دہلیز پار کروائی تھی......" مرنے سے تھوڑی دیر پہلے اُس نے سیداں سے وعدہ لیا کہ وہ کبھی کبھار بھائیا جی کی قبر پر جایا کرے گی......

بھائیا جی کی شریک حیات پیناں کو مرے اب قریباً 45 سال ہو چکے ہیں۔ اب تو سیداں مائی خود بھی موت کی دہلیز پر ہے لیکن اُس نے اپنی سہیلی سے کیا ہوا وعدہ آخری دم تک نبھانے کی کوشش کی ہے۔ پیناں کے آنگن میں گلاب اور موتیے کے چند پودے ہیں۔ پیناں ہی کی طرح وہ ان پودوں سے پھول توڑ کر لاتی ہے اور آنسوؤں میں بھگو کر قبر پر چڑھاتی ہے۔ پہلے وہ ہر ماہ آتی تھی، اب کسی وقت نہیں بھی آ سکتی۔ لیکن کچھ بھی ہے بیماری اور غیر معمولی نقاہت کے باوجود اُس نے یہ سلسلہ ٹوٹنے نہیں دیا......"

اسد ڈائری پڑھتا رہا اور ماضی کا ایک پورا دور آنسوؤں اور آہوں میں ڈوبا اُس کے سامنے سے گزرتا رہا......

تین چار دن بعد 30 دسمبر کی تاریخ میں نذیر احمد نے لکھا تھا۔ "آج کل دل بہت پریشان سا رہتا ہے۔ پتہ نہیں کیا بات ہے، کسی وقت بیٹھے بٹھائے خوف محسوس ہونے لگتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس خوف کی کوئی وجہ بھی نہیں۔ خود پر حیران ہوتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟ بس بیٹھے بیٹھے یا لیٹے لیٹے ایک دم ڈر جاتا ہوں...... کسی وقت یوں لگتا ہے کہ کوئی میرے آس پاس موجود ہے...... کل ایک عجیب بات ہوئی۔ سکول میں چھٹی کے بعد میں موٹر سائیکل پر گھر واپس آ رہا تھا۔ اچانک یاد آیا کہ آٹھویں کلاس کے پیپر تو دفتر میں ہی بھول آیا ہوں۔ واپس سکول گیا۔ اُس وقت سکول بالکل خالی تھا۔ چوکیدار بھی کھانا کھانے گیا ہوا تھا۔ دفتر میں داخل ہوا تو ایک دم وہی کیفیت ہو گئی۔ بے وجہ ڈر لگنے لگا۔ پھر یوں لگا جیسے کسی نے قریب سے میرے کان میں سرگوشی کی ہو...... اب پتہ نہیں کہ یہ ہوا کا شور تھا یا واقعی میں نے کچھ سنا تھا؟ کل سے دل کی کچھ عجیب کیفیت ہو رہی ہے۔ آج صبح مولوی سعید صاحب سے دم بھی کرایا ہے...... پرسوں پھر سیداں مائی سے ملنے گیا ہوا تھا۔ سخت سردی پڑ رہی ہے۔ سیداں مائی کو کھانسی کی شکایت ہو گئی ہے۔ اُس کے لئے شاد پور سے دوا بھی لے کر گیا تھا۔ سیداں مائی کی سنائی ہوئی کہانی ابھی

تک دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔ سوچتا ہوں انسان ایسی چھوٹی چھوٹی غلطیاں کیوں کرتا ہے جو اُس کی ساری زندگی کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہیں؟ سیداں مائی کی باتوں سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ پیناں بھائیا جی سے بے حد محبت کرتی تھی۔ اگر وہ اپنے باپ کی دی ہوئی قسم کی اسیر نہ ہوتی تو بھائیا جی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دے دیتی۔ لیکن باپ کے سر کی قسم کھانے کے بعد وہ بالکل بے بس ہو گئی تھی۔ وہ باپ سے بڑی محبت کرتی تھی۔ اتنی کہ شاید ہی کسی بیٹی نے باپ سے کی ہو۔ ماں جلد ہی فوت ہو گئی تھی۔ ایک بہن بیاہ کر دُور جا چکی تھی۔ پیناں کی ساری محبتیں باپ کی ذات میں سمٹ آئی تھیں۔ وہ دس سال تک باپ سے لپٹ کر سوتی رہی تھی اور اس کے بعد بھی وہ ایک ننھی بچی کی طرح باپ کی گود میں لیٹتی تھی...... اس زاوئیے سے دیکھا جائے تو لگتا ہے کہ شاید اس دردناک کہانی میں پیناں کا گناہ اتنا زیادہ نہیں تھا۔ بے شک وہ بھائیا جی سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ لیکن جس وقت اُس نے بھائیا جی سے محبت کی، اُسے اپنے باپ سے محبت کرتے اٹھارہ بیس سال ہو چکے تھے۔ وہ اس نئی محبت کے لئے پرانی محبت کو یکسر فراموش کیسے کر دیتی؟ وہ بے چاری ان دو محبتوں میں بری طرح تقسیم ہو کر رہ گئی تھی۔

8 جنوری کی تاریخ میں نذیر احمد نے لکھا تھا...... ''سیداں مائی بیمار ہے۔ اُسے سینے میں بھی درد محسوس ہوتا ہے۔ اُس کا پوتا اُسے لاہور لے کر گیا تھا۔ راستے میں اُس کی طبیعت مزید خراب ہو گئی۔ بہتر تھا کہ وہ سیداں مائی کو اُدھر ہسپتال میں ہی داخل کرا دیتا......'' اس تاریخ کی تحریر میں اسد اور شمیم کا ذکر بھی تھا۔ نذیر احمد نے لکھا تھا۔ ''اسد کو لاپتہ ہوئے اب ایک سال ہونے کو آیا ہے۔ اس تمام عرصے میں اُس کی یاد ایک پل کے لئے بھی دل سے جدا نہیں ہوئی۔ پتہ نہیں کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہو گا؟ عید کے موقع پر شاد پور جانا ہوا تھا۔ عبداللہ سے ملاقات ہوئی...... اسد کی چچا زاد شمیم کو بھی دیکھا۔ اُس نے بالکل سادہ سے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اسد کی گمشدگی کی وجہ سے سب اہل خانہ نے عید بہت سادگی سے منائی۔ شمیم نے امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا ہے۔ اب وہ مقامی کالج سے بی ایڈ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ کافی ذہین لڑکی ہے اور خوش شکل بھی۔ اسد کے ساتھ اُس کی جوڑی بن جاتی تو بہت جچتی۔ لیکن اللہ کو پتہ نہیں کیا منظور ہے؟ اب تو اُن کے ملاپ کی کوئی اُمید ہی نظر نہیں آتی۔ اسد حادثات کے ریلے

میں بہتا ہوا نجانے کہاں گم ہو گیا ہے......'' اس تحریر کے نیچے نذیر نے دو دل گداز اشعار بھی لکھے تھے۔ یہ اشعار اُس کے اچھے ادبی ذوق کا پتہ دیتے تھے۔

اس کے بعد اُس نے قریباً دو ہفتے بعد 22 جنوری کو ڈائری تحریر کی تھی۔ اُس نے لکھا تھا۔ ''کل کا دن میرے لئے بہت غم ناک تھا۔ سیداں مائی تقریباً ایک ماہ بیمار رہنے کے بعد خالق حقیقی سے جا ملی...... اُس کی زندگی کی طویل اننگ کا خاتمہ 21 جنوری کی شام ساڑھے چھ بجے کے قریب ہوا......''

چند دن بعد نذیر احمد نے ایک بار پھر اسد اور شمیم کا ذکر کیا تھا...... ڈیرے کا ذکر بھی تھا...... ڈیرے کی پراسرار فضا، وہاں لکھے ہوئے سنسکرت کے شعر...... سٹور سے برآمد ہونے والی بھائیا جی کی تراشیدہ نیم عریاں مورتیاں...... چھوٹی چھوٹی باتیں اور چھوٹی چھوٹی یادیں...... یہ باتیں اور یادیں پوری ڈائری میں بکھری ہوئی تھیں...... قریباً تین ماہ بعد نذیر احمد نے آخری بار ڈائری لکھی تھی۔ اس تحریر پر مئی کی 26 تاریخ درج تھی۔ نذیر احمد نے لکھا تھا۔ ''ابھی مولوی سعید کی طرف سے آ رہا ہوں۔ مولوی صاحب نے پڑھنے کے لئے کچھ وظیفہ جات دیئے ہیں۔ اکیلی جگہ پر تنہا بیٹھنے سے بھی منع کیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ میں رات کو بھی ایسی جگہ سوؤں جہاں آس پاس دیگر افراد موجود ہوں۔ آج کل گرمی کی وجہ سے چھت پر سو رہے ہیں۔ کل تیز آندھی کی وجہ سے آدھی رات کو نیچے آ جانا پڑا۔ میں برآمدے میں لیٹا۔ ہوا شائیں شائیں کر رہی تھی۔ اس ہوا میں مجھے پھر سرگوشی سی سنائی دی۔ بڑی واضح سرگوشی تھی۔ کسی نے دو تین بار مجھ سے کہا...... ''رُک جاؤ...... رُک جاؤ......'' اب بھی جب اپنی اُس کیفیت کو یاد کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اب اس امر میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی کہ میرے کانوں میں آنے والی آواز ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آواز نے مجھے دہشت زدہ کر دیا ہے۔ میں مفلوج سا ہو کر رہ گیا ہوں......''

یہ نذیر احمد کی ڈائری کی آخری تحریر تھی۔ اس کے دو ہی دن بعد سکول سے واپس آتے ہوئے نذیر احمد کی موٹر سائیکل پھسل کر گری تھی اور اُسے شدید چوٹ آ گئی تھی۔

ڈائری پڑھنے کے بعد اسد نے ایک گہری سانس لی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس ڈائری نے اُس پر کئی حیرت انگیز انکشافات کئے تھے اور اُن

میں سے ایک یہ بھی تھا کہ نذیر احمد کو بھی غیر مرئی آواز کا وہی ہولناک تجربہ ہوا تھا جو اسد کو بقائمی ہوش و حواس پچھلے کئی برس سے ہو رہا تھا۔ اُس کے کانوں میں بھی ماضی سے تعلق رکھنے والی ایک آواز گونجی تھی...... ایک بے قرار و بے چین آواز...... ایک بھٹکی ہوئی آتما کی آواز...... جس کے بارے میں اسد کو ننانوے فیصد یقین تھا کہ وہ بھایا جی کی آواز ہے۔

اس آواز نے نذیر احمد کے ساتھ کیا، کیا تھا؟ کیا یہ آواز اور یہ آتما اسد کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی کرنے والی تھی؟ کیا کسی موڑ پر وہ اسد کو بھی زندگی اور موت کے درمیان لٹکا سکتی تھی؟ وہ سوچتا رہا اور اپنے آپ میں لرزتا رہا...... یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں تھی کہ صرف موٹر سائیکل سے گر کر نذیر احمد کی یہ حالت ہوئی ہے۔ اسد نے نذیر کی میڈیکل رپورٹس دیکھی تھیں۔ دانش کی باتیں بھی سنی تھیں۔ بظاہر اُسے کوئی جسمانی نقص نہیں تھا لیکن وہ خود سراپا نقص و عیب نظر آ رہا تھا۔ وہ اتنا بدنما اور کمزور ہو گیا تھا کہ اُس کی طرف دیکھنا محال تھا۔ پھر سوچنے کی بات یہ تھی کہ اگر بھایا جی کی بھٹکی ہوئی رُوح نے ہی نذیر احمد کی یہ حالت بنائی تھی تو کیوں؟ نذیر احمد کا قصور کیا تھا؟ کیا اُس کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ بھایا جی کے ماضی کو کھوج رہا تھا؟ یا پھر اس کا قصور یہ بھی تھا کہ وہ اسد کو راہِ راست پر لانے کی کوششیں کیا کرتا تھا؟ نذیر احمد بڑی سلجھی ہوئی طبیعت کا مالک تھا۔ لاہور میں اسد کی رُومانی مصروفیات کو وہ ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسد اُس سے ان مصروفیات کا ذکر نہیں کیا کرتا تھا۔ شمیم کے بارے میں اسد کے خیالات سے بھی وہ متفق نہیں تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اسد، شمیم سے ایسے رویے کا تقاضہ کر رہا ہے جو شمیم کے بس میں نہیں ہے۔

دروازے پر ہونے والی مدھم دستک نے اسد کو اُس کے خیالوں سے بری طرح چونکا دیا۔ اُس نے دروازہ کھولا۔ باہر دانش کھڑا تھا۔

''میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟'' اُس نے پوچھا۔

''نہیں...... میں یونہی بیٹھا تھا۔''

''ڈائری ختم کر لی آپ نے؟''

''ہاں...... ساری پڑھ لی ہے۔''

''پھر کیا محسوس کیا آپ نے؟''

اسد نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں اس بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا دانش! بہرحال پڑھے لکھے لوگ یہی کہتے ہیں کہ دنیا میں بہت کچھ ایسا ہے جسے سائنس اور عقل کی کسوٹی پر پرکھا نہیں جا سکتا۔ نذیر نے ڈائری میں اپنے جو تجربات لکھے ہیں وہ یقیناً سچ ہی ہوں گے۔ اُسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟''

دانش بولا۔ ''میں اور والد صاحب دو تین بار مولوی سعید صاحب سے بھی ملے ہیں۔ اُن کا کہنا یہی ہے کہ نذیر بھائی جان کے ذہن پر اثر ہے...... اور یہ اثر اُن آوازوں کی وجہ سے ہی ہے جو اُن کے کانوں میں پڑتی رہی ہیں۔ مولوی صاحب نے کچھ چیزیں دم کر کے دی ہوئی ہیں، وہ بھائی جان کو کھلا رہے ہیں اور پلا بھی رہے ہیں۔ اُن کے بازوؤں پر تعویذ بھی باندھے ہوئے ہیں۔''

''ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟'' اسد نے پوچھا۔

''ڈاکٹروں کا کہنا بھی یہی ہے کہ اگر کوئی مزید صدمہ نہ پہنچا تو وقت کے ساتھ ان کی حالت بہتر ہو جائے گی۔''

اسد اور دانش دیر تک ڈائری کے مندرجات پر بات چیت کرتے رہے...... سیداں مائی، پیناں اور بھایا جی وغیرہ کا تذکرہ دانش کے لئے بھی دلچسپی کا باعث تھا لیکن اُسے زیادہ دلچسپی اپنے بھائی کی تکلیف اور اُس کی صحت یابی میں تھی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اُس کا بھائی موت کے دہانے پر ہے۔ وہ اُسے جلد از جلد زندگی کی طرف واپس آتے دیکھنا چاہتا تھا...... دانش اور اسد نے فیصلہ کیا کہ وہ نذیر احمد کو گل جی حضرت کے پاس پشاور لے جائیں گے۔ عبداللہ کا مشورہ بھی یہی تھا کہ نذیر کو حضرت صاحب کی مسیحائی سے محروم نہ رکھا جائے۔

○

تین روز بعد اسد کی پیشی تھی۔ لاہور میں تاریخ بھگتنے کے بعد اسد نے قدیر صاحب سے اجازت لی اور نذیر کو پشاور لے جانے کے لئے واپس شاد پور آ گیا۔ چچا شوکت نے اُن کے لئے ایک پرائیویٹ کار کا انتظام کر دیا۔ اسد اور دانش اس کار کے ذریعے نذیر کو لاہور سے پشاور لے گئے۔ عبداللہ بھی ساتھ تھا۔

حضرت صاحب کے آستانے پر پہنچنے کے لئے اُنہیں اُسی جھونپڑا بستی کے قریب سے گزرنا پڑا جو کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر واقع تھی اور جہاں بھنبھناتی مکھیوں اور کلبلاتے کیڑوں کے درمیان اسد نے اپنی زندگی کے بدترین شب و روز گزارے تھے۔ یہیں پر جسم فروش تاجاں اور عیار ظفری سے اُس کی ملاقات ہوئی اور پھر ایک دن ایسا بھی آیا تھا کہ وہ گندگی میں لت پت نیم بے ہوش ایک خستہ حال جھونپڑے میں پڑا رہا تھا۔ اُسے اپنی برہنگی کا ہوش نہیں تھا اور اُس کے زخموں پر حشرات رینگتے تھے۔ شاید وہ اُس کے دورِ پستی کی سب سے نچلی لکیر تھی۔ اس کے بعد اُس کی ملاقات حضرت صاحب سے ہوئی تھی اور وہ بتدریج اُوپر اُٹھنا شروع ہو گیا تھا...... اس ملاقات کے بعد ہر آنے والا دن پہلے سے کچھ بہتر ہی نکلا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ اور دانش، بیمار نذیر احمد سمیت حضرت صاحب کے حضور میں حاضر تھے۔ حضرت صاحب نے نذیر کے حوالے سے اسد کی ساری بات توجہ اور تحمل سے سنی۔ اُس وقت اسد اور نذیر کے سوا حجرے میں کوئی اور موجود نہیں تھا۔ حضرت صاحب کے سرخ و سپید نورانی چہرے پر عجیب سی کیفیت تھی۔ اُنہوں نے اسد سے چند سوالات کئے پھر کچھ پڑھ کر نذیر احمد پر دم کیا...... پھر اسد کو کچھ آیات بتائیں اور ہدایت کی کہ اس کے گھر والے خود ہی پڑھ کر اس پر پھونکتے رہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ انشاء اللہ اب اسے کچھ نہیں ہوگا۔ اسد کے استفسار پر حضرت صاحب نے اشارتاً اسد کو بتایا کہ نذیر اور اسد کا مسئلہ بنیادی طور پر ایک ہی ہے۔ نذیر احمد کی سماعت میں بھی وہی آوازیں آتی ہیں جو اب تک اسد کی سماعت میں آتی رہی ہیں۔

اسد اور دانش حضرت صاحب کے ایک خادم کی مدد سے نذیر کو اُٹھا کر باہر لے گئے۔ اس کے بعد اسد اپنے لئے حضرت صاحب کے پاس حاضر ہوا۔ حضرت صاحب نے اُس کی تمام کیفیت خصوصی توجہ سے سنی۔ آخر میں اُس نے کہا۔ ''حضرت صاحب! کیا کسی طرح اس آواز سے میرا چھٹکارہ نہیں ہو سکتا؟''

حضرت صاحب نے وہی بات دُہرائی...... بولے۔ ''چھٹکارہ تمہیں خود حاصل کرنا ہے۔ اس سلسلے میں اپنی مدد تم خود ہی کر سکتے ہو۔ جب تم اس آواز کی کہی ہوئی باتوں کو دل سے ناپسند کرنے لگو گے تو چھٹکارہ خود بخود ہو جائے گا۔''

اسد نے کہا۔ ''میں...... ناپسند کرنے لگا ہوں حضرت صاحب! میں کرنے لگا ہوں۔''

''غلط کہہ رہے ہو۔ ابھی تم اس منزل سے دُور ہو۔ اپنے اندر کا میل صاف کرو...... جب میل صاف ہوگا تو نکھار تمہارے چہرے سے بھی جھلکے گا۔''

''میں کیا کروں حضرت صاحب؟''

''یہ بھی تمہیں خود ہی سوچنا ہے۔ پھر وہ کچھ دیر کے لئے مراقبے کی سی کیفیت میں چلے گئے۔ چند سیکنڈ کے بعد آنکھیں کھول کر بولے۔ ''آخری بار آواز کب سنائی دی تھی؟''

''مجھے ٹھیک سے یاد نہیں حضرت صاحب...... لیکن آپ سے ملاقات کے بعد آواز سنائی نہیں دی۔''

''یہ مت سمجھو کہ وہ تمہیں چھوڑ گئی...... وہ پھر آئے گی...... ''شکار'' جب جال توڑنے کی کوشش کرتا ہے تو شکاری حرکت میں ضرور آتا ہے۔ وہ شکار کو اپنے قبضے میں رکھنے کے لئے پورا زور لگا دیتا ہے۔ تم بھی اگر جال توڑنے کی کوشش کرو گے تو وہ پورا زور لگائے گا...... اور یہی تمہاری آزمائش کی گھڑی ہوگی۔''

''مم...... میں سمجھا نہیں حضرت جی؟''

وہ وجدانی کیفیت میں بولے۔ ''تم کسی شکاری کا ''شکار'' ہو۔ شکاری تمہیں آسانی سے جانے نہیں دے گا۔ وہ سر توڑ کوشش کرے گا۔ ابھی وہ خاموشی سے تمہارے طور اطوار دیکھ رہا ہے۔ لیکن وہ زیادہ دیر خاموش نہیں رہے گا۔''

حضرت صاحب رمزیہ انداز میں بات کر رہے تھے۔ لیکن مفہوم کچھ کچھ اسد کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ اُس کے اندر جیسے دھیرے دھیرے سے ایک کھڑکی کھل رہی تھی۔ اور اس کھڑکی میں سے وہ آگے تک دیکھ سکتا تھا۔ حضرت صاحب نے اسد کا ہاتھ اپنے نرم مہربان ہاتھ میں لے لیا اور آہستہ آہستہ سہلانے لگے۔ پھر اُنہوں نے اُسے جانے کی اجازت دے دی۔ اُن کی کہی ہوئی باتیں مسلسل اسد کے ذہن میں گونج رہی تھیں۔

عبداللہ، اسد اور دانش بیمار نذیر احمد کو لے کر احسن آباد واپس آ گئے۔ نذیر کو گاؤں میں چھوڑ کر اسد نے شاد پور کا رُخ کیا۔ یہ ہفتے کا دن تھا۔ قدیر صاحب لاہور سے آئے ہوئے تھے۔ اُن کے ساتھ اے ون کلب کے کئی کھلاڑی بھی تھے۔ یہ سب اسد کے بچھڑے دوست تھے۔ اُس کے دیرینہ ساتھی تھے۔ وہ اشک بار آنکھوں کے ساتھ اسد

سے ملے اور اُسے اپنے گرم جوش بازوؤں میں بھینچتے رہے۔

اُن کی باتوں سے معلوم ہوا کہ اسد کی واپسی نے کرکٹ کے حلقوں میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ اسد کے پرانے ساتھی اور پرستار اُس سے ملنے کے لئے بے قرار ہیں۔ وہ جلد از جلد اسد کو پھر سے کھیل کے میدان میں دیکھنا چاہتے ہیں...... اسد سے ملاقات کے لئے آنے والے دوستوں میں اُس کا گہرا دوست اشفاق بھی تھا۔ شاد پور سے لاہور منتقل ہونے کے بعد اسد، اشفاق ہی کے گھر میں رہائش پذیر رہا تھا۔ وہ اشفاق اور خالہ جان، خالو جان وغیرہ کے اپنائیت بھرے سلوک کو کیسے بھول سکتا تھا؟ یہ سب لوگ اب اُسے گھر کے افراد کی طرح ہی لگتے تھے۔ اچھی یادوں کے ساتھ ساتھ کچھ تلخ یادیں بھی اشفاق کے گھر سے وابستہ تھیں۔ ان میں سے ایک یاد کینہ پرور فریحہ کی تھی۔ یہ اشفاق ہی تھا جس کے گھر میں رہتے ہوئے فریحہ سے اسد کا افیئر شروع ہوا تھا۔ ایک ایسا افیئر جس کا نتیجہ بالآخر ایک ہلاکت کی شکل میں نکلا تھا۔

چچا شوکت نے اسد کے دوستوں کی باقاعدہ دعوت کر رکھی تھی۔ اُنہیں اپنے فارم کی مچھلی کھلائی گئی۔ ساتھ میں دیسی مرغ اور مٹن وغیرہ کی ڈشیں بھی تھیں۔ دیسی گھی کے پراٹھے، لسی اور حلوہ وغیرہ بھی لنچ کا حصہ تھے۔ سب نے بہت انجوائے کیا۔ اسد کے سارے پرانے ساتھیوں کی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد ''اے ون'' کلب میں اُن کے ساتھ شریک ہو جائے۔

سہ پہر کے بعد سب لوگ واپس چلے گئے تاہم اشفاق وہیں رہا۔ اسد کے علاوہ عبداللہ وغیرہ سے بھی اُس کی گہری دوستی ہو چکی تھی۔ رات کو بیٹھک میں اسد اور اشفاق کے درمیان دیر تک گفتگو ہوئی۔ وہ پرانی یادیں دُہراتے رہے اور ہر موضوع پر بات کرتے رہے۔ اشفاق کی باتوں سے پتہ چلا کہ جیل سے رہائی کے بعد سجاد آج کل پھر کرکٹ کھیل رہا ہے۔ وہ بینک کی ٹیم میں ہی تھا۔ بینک کی ٹیم کے رُوحِ رواں جانی بھائی نے قدیر صاحب کے ساتھ دشمنی کا رشتہ نبھاتے ہوئے اُنہیں نیچا دکھانے کا کوئی موقع ضائع نہیں جانے دیا تھا۔ جانی بھائی نے اے ون کلب کے کئی اہم کھلاڑی زیادہ معاوضے اور سہولتوں کا لالچ دے کر توڑ لئے تھے۔ وہ کرکٹ میں ''جائز اور ناجائز'' کے چکر میں نہیں پڑتا تھا۔ اُس کا اوّلین مقصد زیادہ سے زیادہ روپیہ کمانا ہی تھا۔ اس مقصد

کے لئے وہ جواء کھیلنے سے بھی نہیں چوکتا تھا۔ کرکٹ میں جوئے کی لعنت کے فروغ میں جانی بھائی کا اہم کردار تھا۔ وہ اس مقولے کا قائل تھا کہ روپے سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے اور اُس نے کسی حد تک ثابت بھی کیا تھا۔ تمام تر غلط کاریوں کے باوجود بینک کی ٹیم اس وقت کافی آگے جا رہی تھی۔ وہ وننگ کارکردگی دکھا رہی تھی اور حال ہی میں اُس نے دو تین ٹورنامنٹ بڑے اچھے مارجن سے جیتے تھے......

دوسری طرف اے ون کلب کی ٹیم اسد کے نکلنے کے بعد نیچے ہی نیچے گئی تھی۔ کچھ تو اسد کے نکل جانے کا نفسیاتی اثر بھی تھا۔ پھر یہ بھی ایک ٹھوس حقیقت تھی کہ اسد کلب کا سپر سٹار تھا اور اُس نے کلب کی کارکردگی کا نصف بوجھ تنہا اپنے کندھوں پر اُٹھا رکھا تھا۔ اے ون کلب کے زوال پذیر ہونے کے بعد اُس کی مالی حالت بھی کافی ابتر ہو گئی تھی۔ سینئر کھلاڑیوں کے معاوضے پہلے ہی کم تھے، اب مزید کم ہو گئے تھے۔ تین سپانسرز میں سے ایک اہم سپانسر کلب کا ساتھ چھوڑ گیا تھا اور دیگر بھی چھوڑنے کے لئے پر تول رہے تھے۔ درحقیقت یہ قدیر صاحب ہی تھے جن کی انتھک کوشش نے کلب کو زندہ رکھا ہوا تھا۔ وہ اپنی عمر اور صحت کی پرواہ کئے بغیر شب و روز اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ اے ون کے مُردہ تن میں زندگی دوڑا سکیں۔

اشفاق نے غم ناک لہجے میں کہا۔ ''اسد! اس وقت ''اے ون کلب'' کو تمہاری شدید ضرورت ہے۔ ''اے ون کلب'' نے تمہیں شاد پور سے اُٹھا کر بلندی تک پہنچایا اور تمہارا نام پورے ملک میں روشن کیا۔ آج اے ون کلب خود اندھیروں میں ڈوب رہا ہے۔ اُسے تمہارے روشن نام کی ضرورت ہے...... ہم سب کو ضرورت ہے۔''

''لیکن اشفاق......''

''انکار مت کرنا اسدی!'' اشفاق نے تیزی سے اُس کی بات کاٹی۔ ''لوٹ آؤ...... اپنے پرانے ساتھیوں میں واپس لوٹ آؤ...... قدیر صاحب نے زبان سے نہیں کہا اور شاید وہ کہیں گے بھی نہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں، پچھلے چار سال میں اُن کی نگاہیں گراؤنڈ میں ہر وقت تمہارا راستہ دیکھتی رہی ہیں۔ شاید تمہیں پتہ نہ ہو قدیر صاحب نے تمہارا بیٹ، تمہارے دستانے اور جوتے ابھی تک سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں۔ وہ کسی لڑکے کو اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ ان چیزوں کو ہاتھ بھی لگائے...... وہ ہم سب کو اپنے بچوں

کی طرح سمجھتے ہیں اسدی...... اور خاص طور سے تمہیں...... جب ہم سب تمہاری طرف سے نا اُمید ہو چکے تھے وہ پھر بھی مایوس نہیں تھے۔ اُنہیں یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن تم ضرور واپس آؤ گے...... ''اے ون'' کی طرف سے کھیلو گے۔ پھر تم اپنی چیزیں استعمال کرو گے...... وہ اسی طرح تم کو ڈانٹیں گے اور شاباش بھی دیں گے۔ سب کچھ اُسی طرح ہو جائے گا جیسا پہلے کبھی تھا۔''

اسد کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ اشفاق نے کچھ ایسے انداز میں بات کی تھی کہ اسد کے دل کے نرم گوشے وسیع تر ہو گئے تھے۔

اشفاق اور اسد کافی دیر اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ اسد کے دل کا موسم کافی حد تک بدل گیا تھا...... اُس کے اندر کرکٹ کے حوالے سے ایک ترنگ سی پیدا ہونے لگی تھی۔ یہی ترنگ تھی جو کھیل کے میدان میں اُس کی طاقت بنتی تھی اور اُسے دوسروں سے مختلف کھلاڑی بناتی تھی۔

اسد اور اشفاق کی طویل گفتگو کے دوران مختلف موضوعات پر بات ہوئی۔ باتوں باتوں میں فریحہ کا ذکر بھی آیا۔

اشفاق کی باتوں سے پتہ چلا کہ رستم راجہ کے قتل کیس میں چونکہ فریحہ کا نام بھی آ گیا تھا لہٰذا اُن لوگوں کی کافی بدنامی ہوئی۔ فریحہ اور اُس کے والدین کو تھانے کچہری کے چکر سے گزرنا پڑا۔ سجاد نے پولیس کے روبرو اعتراف کیا تھا کہ فریحہ کے ساتھ اُس کا ملنا جلنا ہے اور فریحہ کے اُکسانے پر ہی وہ اپنے دوستوں کے ساتھ اسد کو زدوکوب کرنے گیا تھا...... اشفاق نے اسد کو بتایا۔ ''اس معاملے سے بمشکل جان چھڑانے کے بعد فریحہ اور اُس کے والدین لاہور سے کراچی منتقل ہو گئے تھے۔ بعد میں فریحہ کے ڈیڈی افضال صدیقی صاحب نے لاہور والی کوٹھی فروخت کر دی...... کوئی تین مہینے پہلے پتہ چلا ہے کہ وہ لوگ انگلینڈ مائیگریٹ کر گئے ہیں۔''

''فریحہ کی شادی ہوئی یا نہیں؟'' اسد نے پوچھا۔

''جتنی بدنامی ہو چکی تھی اس کے بعد لاہور میں تو مناسب رشتہ ملنا مشکل ہی تھا۔ سنا ہے کہ کراچی کے کسی میمن گھرانے میں دونوں بڑی بہنوں کی منگنیاں ہوئی تھیں۔ اس کے بعد کچھ پتہ نہیں...... اُن لوگوں کے انگلینڈ چلے جانے سے یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ

وہ منگنیاں ختم ہو گئی ہوں۔''

پھر گفتگو کا رُخ سجاد کی طرف مُڑ گیا۔ اشفاق نے بتایا۔ ''رستم راجہ سے سجاد کی دوستی جوئے کے چکر میں ہی ہوئی تھی۔ رستم کرکٹ میچوں کا پرانا سٹے باز تھا۔ رستم کی موت کے بعد اُس کے تین چار ساتھی سٹے باز بھی پکڑے گئے۔ اُن میں سے دو بندوں پر تو سنگین قسم کے کیس بھی تھے۔ اُن دونوں کو لمبی جیل ہوئی ہے۔ اُن کا ایک ساتھی بعد میں ایکسیڈنٹ میں مارا گیا تھا۔ ایک دو باہر بھاگ گئے۔ اُن کا زور بالکل ٹوٹ گیا ہے۔ سجاد بھی اب بندے کا پتر بن کر کرکٹ کھیل رہا ہے۔ چھڈے بازی کافی کم کر دی ہوئی ہے۔ پھر بھی وہ کیا کہتے ہیں، چور چوری سے جاتا ہے، ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔''

اشفاق اور اسد آدھی رات تک جاگتے رہے۔ بعد ازاں عبداللہ بھی آ کر اُن کے ساتھ گفتگو میں شریک ہو گیا۔ اشفاق کی طرح عبداللہ کی بھی پر زور خواہش تھی کہ اسد جلد سے جلد کرکٹ شروع کر دے...... اور اے ون کی طرف سے شروع کرے۔

○

یوں لگتا تھا کہ گیا ہوا وقت آہستہ آہستہ پھر پلٹ رہا ہے۔ چچا شوکت نے بے حد اصرار کے ساتھ اسد کو قدیر صاحب کے ساتھ لاہور بھیج دیا تھا۔ لاہور میں قدیر صاحب نے اسد کو اُسی محبت اور توجہ سے اسپورٹ کیا جس طرح آج سے قریباً چار سال پہلے کیا تھا۔ اُنہوں نے اُسے لاہور میں اجنبیت کا احساس ہی نہیں ہونے دیا۔ اسد کے قیام کا انتظام ایک بار پھر اشفاق کے گھر ہو گیا تھا۔ اشفاق کے والد کا تو انتقال ہو گیا تھا تاہم والدہ یعنی خالہ جان کی محبت پہلے کی طرح اسد کو حاصل ہوئی۔ اسد کو وہ اپنی ماں کی طرح لگتی تھیں اور ماں کی ابدی جدائی کے بعد تو یہ احساس اور بھی شدت اختیار کر گیا تھا۔

اپنے مہربان اُستاد اور کوچ قدیر صاحب کی زیرنگرانی اسد نے ایک بار پھر اپنی گیم شروع کی۔ آغاز میں وہ صبح کے وقت ہلکی پھلکی ورزش کرتا تھا اور شام کو تھوڑی سی نیٹ پریکٹس۔ پھر بتدریج اُس نے اپنے اس معمول کو بڑھانا شروع کر دیا۔ قدیر صاحب کی ہدایت پر وہ اپنی خوراک اور عمومی صحت پر بھی بھرپور توجہ دے رہا تھا۔ پری مارکہ سگریٹ تو اُس نے پشاور میں ہی چھوڑ دیئے تھے۔ اب وہ عام سگریٹ سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کرکٹ میں اسد کی واپسی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ دو تین بڑے کلبوں کی طرف سے اُسے کھیلنے کی پیشکش کی گئی تھی۔ وہ پہلے سے جانتا تھا کہ ایسی پیشکشیں آئیں گی۔ اُس نے شکریئے کے ساتھ یہ آفرز قبول کرنے سے انکار کر دیا......
اُسے احساس تھا کہ ماضی میں اُس نے قدیر صاحب کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ اب وہ یہ فاش غلطی دُہرانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنی غلطیوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا اور خدا سے دُعا گو تھا کہ وہ اپنے دوستوں اور قدر دانوں کی توقعات پر پورا اُتر سکے...... اسد اپنے دیرینہ دوست نذیر احمد کی طرف سے بھی پوری طرح باخبر رہتا تھا۔ وہ احسن آباد کے تین چار چکر لگا چکا تھا۔ نذیر کی صحت میں معمولی سی بہتری آئی تھی۔ تاہم اب بھی وہ کسی کو پہچانتا تھا نہ بات کرتا تھا۔

اسد کو بہتر فارم حاصل کرنے میں کافی دُشواری پیش آ رہی تھی۔ ایک تو بازو کی چوٹ اُس کے راستے میں حائل تھی، دوسرے وہ پورے ڈیڑھ سال تک کرکٹ سے یکسر دُور رہا تھا...... نشے کی علت نے بھی اندرونی طور پر اُسے کافی متاثر کیا تھا۔ دو ڈھائی ماہ کی جدوجہد کے باوجود وہ کلب میں کوئی نمایاں کارکردگی نہیں دکھا سکا۔ اُس کی باؤلنگ میں تیزی تو موجود تھی مگر لائن اینڈ لینتھ اور ورائٹی کا فقدان نظر آتا تھا۔ اور یہ کمی ''پریکٹس'' سے دُور رہنے کے سبب تھی۔ اُس کے ساتھی اُس کی مسلسل حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ وہ اُس سے کسی دھماکہ خیز رزلٹ کی توقع کر رہے تھے مگر یہ رزلٹ فی الحال برآمد ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔

ایک روز بینک کی بی ٹیم کے ساتھ اے ون کا میچ ہوا۔ اے ون کی ٹیم بینک کی بی ٹیم کے ساتھ حال ہی میں ایک میچ جیت چکی تھی۔ اب اے ون کو توقع تھی کہ اسد کی موجودگی میں وہ ایک بڑے مارجن سے جیتیں گے۔ مگر نتیجہ خلافِ توقع نکلا۔ اس مرتبہ اے ون ہار گئی۔ اسد بھی کوئی خاص کارکردگی نہ دکھا سکا۔ بیٹنگ میں وہ صفر پر آؤٹ ہو گیا تھا۔ باؤلنگ میں اُس نے تین اہم وکٹ تو لئے مگر سکور بھی کافی دے دیا۔

اس میچ کے بعد اسد شدید مایوسی کے عالم میں بیٹھا تھا جب قدیر صاحب آئے۔ اسد کا خیال تھا کہ وہ ڈانٹ ڈپٹ کریں گے۔ مگر آج اُن کا موڈ کچھ اور طرح کا تھا۔ اُنہوں نے اسد کے قریب کرسی سنبھالی اور بولے۔

''دیکھو اسد! میں تمہیں اپنے دل کی بات بتا رہا ہوں۔ تمہاری واپسی سے تمہارے ساتھی بڑے پُر جوش تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ تم آتے ساتھ ہی چھکے چھڑانے لگو گے اور اے ون دیکھتے ہی دیکھتے نمبر ایک ٹیم بن جائے گی...... لیکن میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا اور نہ سوچتا ہوں۔ انہونیاں ضرور ہوتی ہیں لیکن ہر وقت انہونیوں کی توقع کرنا بیوقوفی ہے۔ بے شک تم اچھے کھلاڑی ہو۔ لیکن جو وقت تم نے گنوایا ہے اُس کے اثرات تو فوراً ختم نہیں ہوں گے۔ ان اثرات کا مقابلہ تمہیں حوصلے اور مستقل مزاجی سے کرنا ہوگا۔''
اسد نے کہا۔ ''جناب! کسی وقت تو مجھے لگتا ہے کہ شاید میں کرکٹ جاری نہ رکھ سکوں۔ مجھ سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر لی گئی ہیں۔ ان توقعات کا دباؤ مجھے کچھ کرنے نہیں دیتا۔''

''دیکھو بھئی! توقعات اور اُمیدوں کا دباؤ تو کھلاڑی کی زندگی کا حصہ ہوتا ہے۔ کھلاڑی جتنا اُونچا جاتا ہے اُس سے توقعات بھی اُتنی ہی بڑھ جاتی ہیں۔ ہمیں ایسے پریشرز کے ساتھ ہی جینا ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری اس دلیل میں کوئی وزن نہیں ہے۔''
''لیکن جناب......''
''لیکن کچھ نہیں...... صرف مستقل مزاجی...... سر جھکا کر اپنا کام جاری رکھو۔ بس یہی تمہارا کام ہے۔''
اسد نے گیم جاری رکھی۔ وہ اب ہر ہفتے شاد پور جاتا تھا۔ اگر کسی ہفتے نہ جاتا تو چچا شوکت خود آ جاتے۔ وہ اب ایک لمحے کے لئے بھی اسد کی طرف سے غافل رہنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اسد سے ہر معاملے پر ڈسکس کرتے تھے۔ غالباً اُن کی خواہش تھی کہ اسد کے ذہن میں کوئی اُلجھن ایسی نہ ہو جو اُس کے ذہنی انتشار کا باعث بنے۔ چچا کا مطمع نظر سمجھتے ہوئے اسد بھی اُن سے ہر چھوٹی بڑی بات کہہ دیتا تھا۔ وہ ایک دوست کی طرح اُس کی بات سنتے تھے اور مناسب مشورہ دیتے تھے۔ تاہم اُنہیں معلوم نہیں تھا کہ ایک اُلجھن ایسی ہے جو اسد اُن سے بیان نہیں کرتا اور نہ شاید کبھی کر سکتا ہے۔ اور وہی اُس کی زندگی کی سب سے بڑی اُلجھن ہے...... اُس اُلجھن کا نام شمیم ہے اور وہ اُن کی بیٹی ہے۔

کسی وقت اسد کو یوں لگتا تھا کہ وہ اسد سے شمیم کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن کہتے کہتے پھر رک جاتے تھے۔ ایک ویک اینڈ پر اسد شاد پور نہ جا سکا۔ حسب توقع چچا شوکت آ گئے۔ وہ اُس کے لئے قصبے سے تازہ گڑ، ساگ اور مکئی کا آٹا وغیرہ لائے تھے۔ رات کو چچا بھتیجا دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اشفاق بھی اُن کے ساتھ بیٹھا رہا۔ پھر وہ تو سونے کے لئے چلا گیا مگر وہ جاگتے رہے۔ چچا نے بے تکلف لہجے میں کہا۔

''اسدی! گھر کی اُداسی بڑھتی جا رہی ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ اب تیرے لئے کوئی لڑکی شڑکی ڈھونڈ لینی چاہئے۔''

وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''آپ کیسے کہہ سکتے ہیں چاچو! کہ میری شادی کے بعد اُداسی ختم ہو جائے گی؟''

''اوئے گدھے! شادی کا تو مطلب ہی خوشی ہے...... اور جہاں خوشی ہوتی ہے وہاں اُداسی نہیں ہوتی۔''

''شاید...... میری شادی خوشی والی شادی نہیں ہوگی۔'' اسد نے کہا۔

''کیا مطلب ہے تیرا؟'' چچا شوکت ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئے۔

نجانے کیوں اسد کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ وہ چچا کی طرف سے رُخ پھیر کر بولا۔ ''بس چاچو! ابھی دل نہیں چاہتا شادی کو۔''

چچا نے اُس کی آنکھوں کی نمی دیکھ لی تھی۔ وہ خاموش بیٹھے کئی سیکنڈ تک اُسے گھورتے رہے۔ پھر اُنہوں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اسدی! ایک بات پوچھوں؟ سچ سچ بتاؤ گے؟''

''میں نے آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا چاچو!''

''تم اور شمی آپس میں بہت کھچے ہوئے رہتے ہو۔ شاید تمہیں گمان ہو کہ دوسروں کو یہ بات معلوم نہیں...... لیکن ایسا ہرگز نہیں۔ مجھ سمیت سبھی جانتے ہیں کہ تمہارے درمیان گہری ناراضگی ہے۔ بظاہر دوسروں کے سامنے تم نارمل نظر آنے کی کوشش کرتے ہو لیکن حقیقت میں نہیں ہو۔''

آج ایک بہت طویل عرصے بعد چچا شوکت کے منہ سے یہ بات نکلی تھی۔ اسد کا دل چاہا، ایک دم چچا سے لپٹ جائے اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دے۔ وہ سارے

دُکھ بیان کر دے جو اُس نے شمیم کے حوالے سے اکیلے سہے تھے...... مگر پھر اُس نے خود پر ضبط کیا۔ شکوؤں شکایتوں اور دُکھوں کا جو سمندر اُس کے اندر لہریں لیتا تھا وہ چچا کے لئے نہیں تھا، شمیم کے لئے تھا۔ اُس نے آنسوؤں کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں چاچو...... دراصل پہلے بچپنا تھا۔ ہر وقت ہنستے کھیلتے رہتے تھے۔ اب بڑے ہو گئے ہیں۔ ایسے میں تھوڑی سی جھجک آ گئی ہے۔''

چچا شوکت خاموشی سے اُسے دیکھتے رہے۔ اُن کے تاثرات گواہ تھے کہ اُنہوں نے اسد کی بات پر مطلق یقین نہیں کیا۔ اُنہوں نے سگریٹ کا چھوٹا سا کش لیتے ہوئے اپنی پیشانی مسلی اور بولے۔ ''لگتا ہے کہ خوشی ہمارے گھر کا راستہ بھول گئی ہے...... شمیم سے سر کھپا کھپا کر ہار گئے ہیں۔ وہ کہتی ہے مجھے ابھی پڑھنا ہے، میری شادی کی بات مت کریں۔ تم بھی کہتے ہو کہ ابھی شادی نہیں کرنی ہے۔''

''مجھ سے تو آج آپ نے پہلی دفعہ بات کی ہے۔ شمی پر تو آپ تین چار برسوں سے زور دے رہے ہیں۔ اُسے آپ کی بات مان لینی چاہئے۔''

''جس طرح تمہارے پاس بات نہ ماننے کے کئی جواز ہے، ویسے ہی اُس کے پاس بھی ہوں گے۔'' چچا شوکت نے کہا اور سگریٹ کے سلگتے ہوئے سرے کو گھورنے لگے۔ کمرے کی خاموشی بوجھل ہونے لگی۔ اسد نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ چچا نے براہِ راست اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''اسدی! میری ایک بات یاد رکھنا۔ ہمارے ہاں جو لڑکی پائی جاتی ہے یہ فلموں، ڈراموں اور قصے کہانیوں والی لڑکی نہیں ہوتی۔ یہ بڑی مجبور اور لاچار لڑکی ہوتی ہے۔ یہ اکثر اپنے اندر ہی سلگ سلگ کر ختم ہو جاتی ہے۔'' آخری الفاظ ادا کرتے کرتے چچا شوکت کی آواز بھرا سی گئی۔ وہ ایک دم اپنی جگہ سے اُٹھے اور کمرے سے باہر چلے گئے۔

چچا کے الفاظ نے اسد کو اندر تک جھنجھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا اور چچا کی بات پر غور کرتا رہا۔ اُس کی مختلف جہتوں کو پرکھتا رہا۔ اگلے روز چچا تو واپس شاد پور چلے گئے لیکن اپنی ''بات'' اسد کے اندر ہی چھوڑ گئے......

یہ اُس سے اگلی رات کی بات ہے۔ ایک طویل وقفے کے بعد بھائیاجی کی آواز ایک بار پھر اُس کے کانوں میں گونجی...... وہ بھی ایک ابر آلود رات ہی تھی۔ اسد نے نوٹ کیا

تھا کہ اکثر بھایا جی بادوباراں کے موسم میں ہی اُس کے ذہن میں داخل ہوتا ہے۔ پہلے اسد پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہوئی، پھر آواز نے اُسے مخاطب کیا۔

''تم بھٹک رہے ہو...... تم اپنے راستے سے ہٹ رہے ہو...... میں دیکھ رہا ہوں تمہارے دل کے موسم میں تبدیلی آئی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کسی دن تم بالکل بدل جاؤ۔ اُس عورت کے سامنے جھک جاؤ جس کی زندگی کا مقصد ہی تمہیں اپنے سامنے جھکانا ہے...... اس بات کو فراموش مت کرنا۔ یہ جھکنے اور جھکانے کی جنگ ہے۔ تم اس میں ہار گئے تو پھر زندگی بھر ہارے ہی رہو گے۔ بھیک میں ملی ہوئی محبت سے بہتر ہے کہ وقار کے ساتھ جدائی کا زہر پی لیا جائے۔''

اسد نے کہا۔''ایک بار تم نے کہا تھا کہ اگر میری محبت میں طاقت ہوگی تو میں شمیم کو جھکا لوں گا۔ اس طرح یہ بھی تو ممکن ہے کہ شمیم کی محبت میں زیادہ طاقت ہو اور وہ مجھے جھکا لے۔ کیا ایسا ممکن نہیں؟''

''ایسا ممکن نہیں۔ حسن و عشق کی جنگ میں عورت کا ہتھیار حسن ہوتا ہے۔ تم اُسے اپنی محبت سے جھکاؤ گے، وہ تمہیں اپنے پُرغرور حسن سے جھکائے گی۔ کیا تم اُس کے پُرغرور حسن سے شکست کھانا پسند کرو گے؟''

''نہیں...... میں ایسا نہیں چاہتا۔''

''تو پھر اُس راستے کے بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دو جو تمہیں ذلت اور پستی کے گڑھے میں گرائے گا۔ اپنا حوصلہ بلند رکھو۔ بہت جلد وہ ٹوٹ جائے گی۔ اُسے ٹوٹنا پڑے گا۔ اگر نہ ٹوٹے گی تو اُس کی زندگی موت سے بدتر ہو جائے گی۔''

اسد نے کہا۔''ایک بات پوچھوں؟''

''ہاں پوچھو......!''

''تمہیں اُس کے ٹوٹنے سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟''

''مجھے ہر اُس عورت کے ٹوٹنے اور بکھرنے سے دلچسپی ہے جو مرد کے سینے میں آگ بھڑکا کر اُس کے تڑپنے کا تماشا دیکھتی ہے۔ اُسے اپنے قدموں میں گرانا چاہتی ہے۔''

''تو کیا پھر وہ کہانی سچی ہے؟''

''کون سی کہانی؟''

''تمہاری کہانی۔''

''میں کسی کہانی کو نہیں جانتا...... میری کوئی کہانی نہیں۔''

''تم چھپا رہے ہو...... میں جانتا ہوں تم نے......'' اچانک اسد خاموش ہو گیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ اُس کی بات نہیں سن رہا...... وہ شاید وہاں موجود ہی نہیں تھا...... وہ جا چکا تھا۔ اچانک ہی وہ کیفیت بھی ختم ہو گئی جو اسد کو اُس کی موجودگی کا احساس دلاتی تھی۔ اسد سٹپٹا کر رہ گیا۔ وہ پیاز کی طرح تہہ در تہہ تھا۔ ایک چھلکا اُترنے سے دوسرا چھلکا سامنے آ جاتا تھا...... وہ اُس سے نذیر احمد کے بارے میں بھی بات کرنا چاہتا تھا۔ اُس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اُس نے اُسے زندہ درگور کیوں کر دیا ہے؟ وہ اُسے کس جرم کی سزا دے رہا ہے؟ لیکن اس بات کی نوبت آنے سے پہلے ہی وہ چلا گیا تھا۔

بھایا جی کی آواز کئی ماہ بعد اُس کے کانوں میں گونجی تھی۔ اس آواز نے اسد کے پُرسکون خیالات کو ایک بار پھر مدوجزر کا شکار کر دیا تھا۔ وہ مسلسل دو دن تک بھایا جی اور اُس کے ناقابلِ فہم رویئے کے بارے میں سوچتا رہا۔ اُس نے بڑی توجہ سے ماضی پر نگاہ دوڑائی اور نوٹ کیا کہ بھایا جی نے آواز کی وساطت سے ہر اُس موقعے پر مداخلت کی ہے جب اسد نے اپنے خیالات میں نرمی اور لچک پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ شمیم سے دُور ہونے کے بعد کئی لڑکیاں اسد کی زندگی میں آئی تھیں، اُن میں سے کچھ واقعی معصوم اور قابلِ ترس تھیں۔ اسد نے اُن کے ساتھ اچھا رویہ اپنانے کی خواہش کی تھی لیکن اکثر موقعوں پر وہ بھایا جی کے خیالات سے متاثر ہوا تھا اور رومانس میں مطلب پرستی اور بے وفائی کے اصولوں پر قائم رہا تھا...... وہ سوچتا رہا اور کڑی سے کڑی ملتی رہی۔

اگلے ویک اینڈ کے موقعے پر تین چھٹیاں اکٹھی آ گئیں۔ اسد پہلے شادپور گیا اور وہاں سے جیپ پر نذیر احمد کو دیکھنے احسن آباد چلا گیا۔ نذیر بدستور ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ پہلے تو اُس کے جسم پر کہیں ایک بال بھی نظر نہیں آتا تھا لیکن اب سر پر ہلکا سا رواں موجود تھا۔ اُسے بڑی مشکل سے کھانا کھلایا جاتا تھا۔ کوئی مشروب پیتا تھا تو وہ اکثر باچھوں سے بہہ جاتا تھا۔ اُس کے گھر والے اُس کی حالت دیکھ دیکھ کر روتے تھے۔ شک تو اسد کو شروع سے تھا مگر نذیر کی ڈائری پڑھنے کے بعد اُسے یقین ہو گیا تھا کہ نذیر احمد کی موجودہ حالت کا سبب یہ ہے کہ وہ بھایا جی کے ماضی کو گہرائی تک کھنگال رہا تھا۔

اور دوسرے یہ کہ وہ اسد کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرتا رہا ہے۔

ایک رات احسن آباد رہنے کے بعد اسد کے قدم جیسے خود بخود ڈیرے کی طرف اُٹھ گئے۔ وہ گیارہ بجے کے قریب عباس پورہ پہنچا اور پھر ڈیرے پر آ گیا۔ ڈیرے کا گرد و نواح سیم وتھور سے اٹا ہوا تھا۔ اس بربادی پر اسد نے سوچا کہ شاید یہ بھی بھائیا جی کے اندر کی نفرت ہی ہے جو تھور وسیم کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے۔ رنگی بابا اور اُس کے بیٹے صغیر نے اُس کا استقبال کیا۔ رنگی بابا ہمیشہ کی طرح قدموں میں بچھا جا رہا تھا لیکن صغیر تھوڑا سا کھچا ہوا نظر آتا تھا۔ اُس کا کھچاؤ قابلِ فہم تھا۔ یہاں حویلی میں اُس کی بہن کے ساتھ اسد نے جو کچھ کیا تھا وہ صغیر کو بھی معلوم ہو چکا تھا...... اسد کے ساتھ چند روزہ تعلقات کا خمیازہ زاہدہ عرف گڑیا کو یوں بھگتنا پڑا تھا کہ رنگی بابا نے اُس کی شادی آناً فاناً ضلع میانوالی کے ایک دُور دراز دیہہ میں کر دی تھی۔ کوئی رنڈوا خوانچہ فروش تھا جس کے پلے باندھ کر اُسے دیس نکالا دے دیا گیا تھا...... اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔

رنگی بابا اور اُس کی بیوی نے حسبِ معمول ڈیرے میں اپنے چھوٹے مالک کی خوب خاطر تواضع کی۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد اسد دیر تک حویلی کے طول وعرض میں گھومتا رہا۔ آج اُس کے دل کی کیفیت عجیب سی تھی۔ نذیر احمد کی ڈائری سے اُسے بھائیا جی کی تقریباً ساری ہی کہانی معلوم ہو چکی تھی۔ وہی پیار...... وہی انا کی فلک بوس دیوار...... وہی جنموں کے فاصلے...... یہ ایک چاندنی رات تھی۔ کبھی کبھی بادل کا کوئی ٹکڑا چند لمحوں کے لئے چاند کے چہرے کو چھپا لیتا، پھر بادل کے کناروں سے چاندنی کی کرنیں نمودار ہوتیں اور در و بام کو بتدریج روشن کر دیتیں۔ اسد کو لگا جیسے کچھ دیر کے لئے وہ ماضی کی طرف لوٹ گیا ہے۔ اُس نے تصور کی نگاہوں سے دیکھا...... اُس کی آنکھوں کے سامنے حویلی پھر آباد ہو گئی۔ اُس نے بھائیا جی کو نوبیاہتا پیناں کے رُوبرو دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں کدورت کی تپش تھی۔ وہ پیناں کو بری طرح جھڑک رہا تھا۔ پیناں رحم طلب نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ ہاتھ جوڑ کر اُسے منانے کی کوششیں کر رہی تھی......

پھر ایک اور منظر میں اُس نے بھائیا جی کو دیکھا۔ وہ غصے سے آگ بگولا نظر آ رہا تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر پیناں کے پھول سے رُخسار پر تھپڑ مارا...... تھپڑ کی آواز حویلی کی چھتوں

کے نیچے دُور تک گونجی۔ خوبرو دُلہن نے ایک دلدوز سسکی لے کر بھائیا جی کی طرف دیکھا پھر وہ تیزی سے ایک طویل برآمدے میں دوڑتی چلی گئی۔ اُس کی پازیبوں کی آوازیں بھی سسکیوں سے مشابہ تھیں......

پھر اسد نے اپنے تخیل کے پردے پر دیکھا، پیناں اپنے والدین کی طرف جا رہی تھی۔ وہ رُکے رُکے قدموں سے ڈیرے کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ رو رہی تھی اور مُڑ مُڑ کر دیکھ رہی تھی، جیسے اُسے اُمید ہو کہ بھائیا جی آگے بڑھ کر اُسے روک لے گا...... گلے سے لگا لے گا۔ لیکن بھائیا جی ایک پاؤں کرسی پر رکھے اکڑا کھڑا رہا اور اپنی مونچھیں مروڑتا رہا...... پھر اسد نے اپنے تصور کے زور پر ایک اور منظر دیکھا...... بھائیا جی کی صورت اُجڑی ہوئی تھی۔ وہ شراب کے نشے میں چور، حویلی کی راہداریوں میں لڑکھڑا رہا تھا۔ اُس کے ہونٹوں سے کراہیں نکل رہی تھیں۔ وہ پیناں کو آوازیں دے رہا تھا۔ دیواروں پر نوبیاہتا دُلہن کی تصویریں آویزاں تھیں اور جا بجا دیگر نشانیاں نظر آ رہی تھیں...... ایک دم اسد کے کانوں میں شیشہ ٹوٹنے کے چھناکے گونجنے لگے۔ بھائیا جی تصویریں اُٹھا اُٹھا کر زمین پر پٹخ رہا تھا۔ کھڑکیوں کے شیشے اور آئینے توڑ رہا تھا۔ پردے کھینچ کھینچ کر پھاڑ رہا تھا...... پھر اسد نے بھائیا جی کو لکڑی کی نیم عریاں مورتیاں بناتے دیکھا۔ وہ کسی تنہا کمرے میں بند تھا۔ اُس کے اِردگرد لکڑی تراشنے کے اوزار تھے اور برادے کا ڈھیر تھا۔ عمرِ رفتہ نے بھائیا جی کے چہرے پر لکیریں ڈال دی تھیں، تاہم اُس کے چہرے پر عجیب سی وحشت اور بے رحمی نظر آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ لکڑی نہیں تراش رہا، کسی نوجوان عورت کے زندہ جسم کو تراش رہا ہے......

ایک دم اسد اپنے آپ میں واپس آ گیا...... وہ بے آباد پرانی حویلی کی بے رنگ دیواروں کے درمیان کھڑا تھا۔ قوتِ تخیل نے اُسے جو چمکتی دمکتی حویلی دکھائی تھی وہ ماضی کا حصہ تھی...... چاند نصف نہار پر آ گیا تھا، سائے مختصر تر ہو گئے تھے۔ احاطے میں برگد کا بوڑھا درخت اور اُس کے نیچے گھومتی بلیاں پُراسرار لگ رہی تھیں۔ اسد بڑے سٹور کی طرف آ گیا۔ لالٹین جلا کر وہ سٹور میں داخل ہوا اور بھائیا جی کے ماضی کی باقیات دیکھنے لگا۔ بھائیا جی کی کہانی معلوم ہونے کے بعد اُسے ان بیکار اشیاء میں زیادہ دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید ویسا ہی تجسس اسد کے اندر جاگ گیا تھا جیسا کچھ عرصہ پہلے نذیر احمد

کے اندر جاگا ہوا تھا۔ بھائیا جی کا ٹوٹا پھوٹا حقہ، تصویروں کے شکستہ فریم...... چند خستہ
حال ڈیکوریشن پیس جو شاید پیناں کے جہیز کا حصہ ہوں گے۔ چمڑے کا گلا سڑا ہولسٹر،
شاید مرنے سے پہلے اسی ہولسٹر سے پستول نکال کر بھائیا جی نے کھڑکی پر گولیاں چلائی
تھیں۔ اس کھڑکی سے بھائیا جی کو کیا دشمنی تھی؟ شاید یہ دشمنی تھی کہ اُس نے کبھی بھائیا جی
کو وہ منظر نہیں دکھایا تھا جس کے لئے وہ ساری زندگی ترستے رہے تھے۔ اس کھڑکی میں
سے جھانک کر بھائیا جی نے کبھی یہ نہیں دیکھا تھا کہ پیناں اپنے کسی عزیز کے ساتھ تانگے
پر سوار ہو کر ڈیرے واپس آ رہی ہے...... اسد سٹور میں گھومتا رہا اور چھوٹی چھوٹی اشیاء
کے ذریعے ماضی سے ناطہ جوڑتا رہا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا کہ ماضی کی ہر چھوٹی بڑی شے
میں بھائیا جی کی وحشت اور اُس کا غضب سرایت کر چکا ہے...... اسد نے زور لگا کر خود
ہی تینوں جستی صندوق اپنی جگہ سے سرکائے اور تختہ ہٹانے کے بعد پوشیدہ خلا میں موجود
چوبی مورتیوں کو دیکھنے لگا۔ اگر کہا جائے کہ یہ شرمناک مورتیاں تھیں تو غلط نہ ہو گا۔ ہر
مورتی میں مرد کا غیض وغضب اور عورت کی تذلیل مجسم تھی۔ کچھ مورتیاں تو ننگی گالیوں
اور غلیظ خیالات کی طرح قابل نفرت تھیں۔ اسد حیران ہو رہا تھا کہ بھائیا جی کے اندر
محبت کا جذبہ بتدریج کیسے نفرت کے بھیانک قالب میں ڈھل گیا تھا؟ پھولوں،
خوشبوؤں اور تتلیوں کے رنگوں سے شروع ہونے والے جذبے نے جب ناکامی کا زہر
پیا تھا تو آہستہ آہستہ فحش گالی بن گیا تھا۔

اسد نے وہ لکڑی کا چھوٹا سا ڈبہ بھی دیکھا جس میں کچھ پرانی اشیاء کے علاوہ سادہ
کاغذوں کے بہت سے پرزے پڑے تھے۔ اسد نے چند پرزے اُٹھائے اور اُنہیں
دھیان سے دیکھنے لگا۔ وہ اب ان پرزوں کے بارے میں جانتا تھا۔ یقیناً یہ وہی سادہ
کاغذ تھے جو پیناں عیدین پر بھائیا جی کو ارسال کیا کرتی تھی۔ اسد کو یقین تھا کہ ان
کاغذوں میں کہیں اُس بے بس لڑکی کے مجبور آنسو بھی جذب ہوں گے۔ یہ کاغذ ایک
خاموش چیخ تھے، لیکن یہ چیخ بھائیا جی نے سنی ہی نہیں۔ وہ اپنی ہی وحشتوں میں
سرگرداں رہا اور کہیں کا کہیں نکل گیا۔ کاغذ کے ان بے بس پرزوں کو دیکھ کر ایک عجیب
سی رقت اسد پر طاری ہو گئی...... کچھ ایسا احساس ہوا جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔
یہ کاغذ کے پرزے نہیں تھے۔ یہ خاموش چیخیں تھیں۔ ان چیخوں میں ہیر کی تڑپ، سسی

کی پکار اور سوہنی کی فریاد تھی...... اپنے دامن میں ہزار ہا ناکام محبتوں کا نوحہ لئے یہ
چیخیں بلند ہو رہی تھیں اور اسد کے اردگرد پھیلتی جا رہی تھیں...... اسد کو یوں لگا جیسے یہ
کربناک آوازیں اُفق تا اُفق گونج رہی ہیں۔ وہ لرز اُٹھا...... وہ اندر سے ہل گیا۔
اُسے محسوس ہوا ان چیخوں میں شمیم کی آواز بھی شامل ہے...... ہاں ان میں اُس کی آواز
بھی شامل تھی......

وہ جب سٹور سے نکلا تو پسینے سے شرابور تھا...... اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے اُس کے
سینے کے اندر کوئی نہایت ٹھوس چیز نرم ہو رہی ہے...... ہولے ہولے پگھل رہی ہے۔ یہ
کیسی کیفیت تھی؟ ایسی کیفیت تو اُس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اُس کے سینے
کے اندر جو شے نرم ہو کر بکھر رہی تھی کیا یہ دل کا وہی میل تو نہیں تھا جس کے بارے
میں حضرت صاحب نے کہا تھا کہ جب یہ میل نکل جائے گا تو سب کچھ خود بخود ٹھیک
ہونے لگے گا.... شاید یہ وہی تھا۔ اسی لئے تو اُس کے دل کا موسم بڑی تیزی سے تبدیل
ہو رہا تھا۔

آخر شب کی گھڑیوں میں وہ بے چین قدموں سے حویلی کے اندر ٹہلنے لگا اور سوچنے
لگا...... مرتے وقت پیناں نے کتنی حسرت سے کہا تھا کہ اُسے اپنے مرے ہوئے پاؤں کو
دیکھ کر خوشی ہوئی ہے۔ یہی پاؤں تھے جنہوں نے اُسے شوہر کی دہلیز پار کرائی تھی۔ ایسے
ہی ان گنت پچھتاوے بھائیا جی کو بھی آخری سانس تک تڑپاتے رہے تھے۔ وہ کھڑکی
میں بیٹھ کر حویلی کے گیٹ کو دیکھا کرتا تھا اور سوچا کرتا تھا کہ اُس نے جاتی ہوئی دُلہن کو
روک کیوں نہ لیا؟ اُس وقت اُسے روکنا کتنا آسان تھا لیکن بعد میں واپس لانا کتنا
مشکل...... وہ انہی در و دیوار میں رات بھر لڑکھڑاتا تھا اور رو رو کر اپنی دُلہن کو پکارتا
تھا...... وہ آخری ہچکی تک اُس کی راہ دیکھتا رہا تھا۔ لیکن گیا وقت پلٹ کر نہیں آ سکا......
بھائیا جی کے لئے اور نہ پیناں کے لئے۔

اسد نے سوچا، کیا وہ اور شمیم بھی اسی طرح زندگی بھر گئے ہوئے وقت کا ماتم کرتے
رہیں گے؟ کیا وقت کا بے رحم قلم ایک اور بھائیا جی...... اور ایک اور پیناں کی کہانی لکھنے
والا ہے؟ اُن کے اندر سے کسی نے پکار کر کہا...... ابھی وقت ہے، ابھی سب کچھ ہاتھ
سے نکلا نہیں ہے۔ ابھی یہ کہانی بہت آگے نہیں گئی ہے۔ ابھی اس کے کچھ ورق پھاڑ کر

پھینکے جا سکتے ہیں۔ ابھی عنوان بدلے جانے کی گنجائش موجود ہے...... اُسے محسوس ہوا جیسے آج پھر پیناں کے رُکے رُکے قدم حویلی کے پھاٹک کی طرف اُٹھ رہے ہیں...... آج پھر بھائیا جی برآمدے میں کھڑا اُسے جاتے دیکھ رہا ہے۔ مگر اس مرتبہ ابھی قدم حویلی سے نکلے نہیں ہیں۔ اس مرتبہ اُنہیں روکا جا سکتا ہے......

سردی کے باوجود اسد کی پیشانی پسینے سے تر ہوگئی۔ پھر ایکا ایکی وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ اُس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ کسی اہم فیصلے پر پہنچ چکا ہے......!

OOO

صبح ابر آلود تھی۔ اسد، چچا کی جیپ پر بڑی تیزی سے شاد پور کی طرف جا رہا تھا۔ ابھی وہ ڈیرے سے پانچ چھ میل دُور ہی تھا کہ تیز بارش شروع ہوگئی۔ کچے پکے راستے پر گاڑی پھسلنا شروع ہوگئی۔ ونڈ اسکرین پر وائپر تیزی سے چل رہے تھے۔ کھیت کھلیان، پگڈنڈیاں، گھروندے سب کچھ پانی کی دبیز چادر میں چھپا ہوا تھا۔ یکایک بھائیا جی کی کرخت آواز اسد کے کانوں میں گونجی۔

''رُک جاؤ...... کہاں جا رہے ہو؟ یہ راستہ ٹھیک نہیں ہے۔''

''میرا خیال تم سے مختلف بھی ہو سکتا ہے۔'' اسد نے کہا۔

''دیکھو...... میں تمہارا دشمن نہیں خیر خواہ ہوں۔ تم جانتے ہو میں نے کبھی تمہیں غلط مشورہ نہیں دیا۔''

''میں نے کہا ہے نا میرا خیال تم سے مختلف بھی ہو سکتا ہے۔''

''تو تم اس عورت کے سامنے گھٹنے ٹیکنے جا رہے ہو...... ایک جیتی ہوئی جنگ کو ذلت آمیز طریقے سے ہارنے جا رہے ہو۔''

''میں اسے جنگ نہیں سمجھتا اور نہ شمیم کے پاس جانے کو اپنی ہار سمجھتا ہوں۔''

''تم خود کو زندگی کا سب سے بڑا فریب دے رہے ہو۔ میں نے تمہیں کچھ دن پہلے ہی بتا دیا تھا کہ تم اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے جا رہے ہو۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟ وہ بندہ تمہیں راستے سے بھٹکا رہا ہے۔ ایسے ہی بیوقوف دوستوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان سے دشمن اچھے ہوتے ہیں۔ وہ بندہ تمہیں چوپایہ بنا کر تمہاری پیٹھ پر تمہاری چچا زاد کو سواری کرانا چاہ رہا ہے۔ میں سب جانتا ہوں۔ ہوش میں آ جاؤ! میں تمہیں اس طرح رُسوا ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ یہ ساری مرد ذات کی توہین ہے۔ تمہیں کئی بار بتا چکا ہوں مرد کی پہچان اُس کے ارادے کی پختگی اور طبیعت کی سختی ہے۔

عورت کی شناخت اُس کی نرمی اور لچک ہے۔ تم مرد ہو کر عورت بن رہے ہو۔ وہ عورت ہو کر مرد بن رہی ہے۔''

اسد نے کہا۔ ''میں اُس کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیک رہا۔ کسی سے بات کرنا، اُس کا خیال معلوم کرنا گھٹنے ٹیکنا نہیں ہوتا۔''

بھائیا جی کا زہریلا قہقہہ اسد کے کانوں میں گونجا۔ ''بہت خوب...... اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ تم اپنے آپ کو بھی دھوکہ دے رہے ہو۔ تم تھوکے ہوئے کو چاٹ رہے ہو۔ یاد ہے تم نے اپنی چچازاد سے کیا کہا تھا؟ تم نے کہا تھا اگر وہ اپنی ضد پر قائم رہے گی تو پھر کبھی تمہاری دُلہن نہیں بنے گی۔ اور وہ اپنی ضد پر قائم ہے۔ ایک انچ بھی اپنی جگہ سے نہیں سرکی۔''

''لیکن......''

''لیکن کچھ نہیں۔'' بھائیا جی نے اُس کی بات قطع کی۔ ''تم شکست فاش کھا رہے ہو۔''

جیپ کی رفتار اپنے آپ سست ہو گئی۔ اسد ایک گھنے پیپل تلے رُک گیا۔ بھائیا جی ہمیشہ کی طرح اُس کے ذہن پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ اسد اُس کی بات کو اہمیت دینے پر مجبور تھا۔

اُس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے اسٹیئرنگ پر جمے تھے۔ آنکھیں سامنے موسلا دھار بارش میں دُھندلائے ہوئے راستے کو دیکھ رہی تھیں۔ نگاہوں کے سامنے شمیم کی صورت گھومنے لگی۔ شمیم کی آنکھوں مین اٹل خاموشی تھی۔ وہی خاموشی جو اسد کو اندر سے شعلہ فشاں کر دیتی تھی...... گاڑی گیئر میں تھی لیکن وہ اُسے آگے نہیں بڑھا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسد کی طرح اُس کی گاڑی بھی شدید تذبذب کا شکار ہو گئی ہے۔

پھر اسد کو حضرت صاحب کی بات یاد آئی۔ اُنہوں نے کہا تھا۔ ''شکار...... جب جال توڑنے کی کوشش کرتا ہے تو شکاری حرکت میں ضرور آتا ہے۔ وہ شکار کو اپنے قبضے میں رکھنے کے لئے پورا زور لگا دیتا ہے۔ تم بھی اگر جال توڑنے کی کوشش کرو گے تو وہ پورا زور لگائے گا...... اور یہی تمہاری آزمائش کی گھڑی ہوگی......''

ایک دُھندسی اسد کے ذہن میں بھر گئی۔ اُس نے ایک مصمم کوشش کے ساتھ تمام خیالات ذہن سے جھٹکے اور گاڑی پھر آگے بڑھا دی۔ اُونچے نیچے راستے پر جیپ طوفانی

رفتار سے اُچھلتی کودتی چلی گئی۔ کیچڑ کی وجہ سے جگہ جگہ ٹائر پھسل رہے تھے لیکن اسد نے اسٹیئرنگ کو قابو میں رکھا ہوا تھا۔ ابھی وہ کچھ آگے گیا تھا کہ بھائیا جی پھر آن وارد ہوا۔ اب اسد کے لئے وہ ایک ٹھوس حقیقت بن چکا تھا۔ اُس کے آنے جانے سے اسد کو مُطلق حیرانی نہیں ہوتی تھی۔ بھائیا جی نے کہا۔

''تمہیں ایک بات بتاؤں؟ تمہیں معلوم ہے تم کھیل میں کیوں پیچھے رہ گئے ہو؟ کیوں آگے نہیں بڑھ پا رہے ہو؟'' اسد خاموش رہا...... بھائیا جی نے خود ہی جواب دیا۔ ''تم اس لئے آگے نہیں بڑھ پا رہے ہو کہ تمہاری نیت میں فرق آ گیا ہے۔ تم اندر سے ہار گئے ہو۔''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''تمہاری طاقت تمہاری انا اور آن تھی۔ شمیم سے اپنا آپ منوانے کی شدید خواہش تمہیں توانائی دیتی تھی۔ تمہاری محرومی سے جو غیظ وغضب پیدا ہوتا تھا وہ تمہارا ہتھیار ہوتا تھا...... تم اپنے مقابلے میں آنے والے کے چھکے چھڑا دیتے تھے۔ اب تم کسی سے اپنا آپ منوانا نہیں چاہتے، خود مان جانا چاہتے ہو۔ کسی کو جھکانے کی بجائے خود جھک رہے ہو۔ تم اندر سے ہار گئے ہو اس لئے اب باہر بھی جیت تمہارے ہاتھ نہیں آتی۔''

اسد نے حوصلہ جمع کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہاری بات پر یقین نہیں رکھتا۔ لیکن اگر ایسی بات ہے بھی تو مجھے ایسی جیت نہیں چاہئے جس کے لئے کسی کو زندہ درگور کرنا شرط ہو۔''

''تو کیا تم اپنی توانائیاں کھو کر ایک گمنام کھلاڑی بننا پسند کرو گے؟''

''شاید...... یہ بھی کر لوں گا۔''

چند لمحے خاموشی رہی، پھر بڑے تاسف سے کہا گیا۔ ''کاش اُس بندے سے تمہاری ملاقات نہ ہوتی۔ تمہارے دماغ میں یہ اُسی کا پیدا کیا ہوا فتور ہے۔ وہ تمہارے گلے میں ایک ایسی رسّی ڈال رہا ہے جس کا دُوسرا سرا ساری زندگی تمہاری چچازاد کے ہاتھ میں رہے گا۔''

اسد جانتا تھا کہ ''اُس بندے'' سے بھائیا جی کی کیا مراد ہے؟ وہ حضرت جی کا تذکرہ کر رہا تھا۔ قریباً ایک منٹ تک مکمل خاموشی رہی۔ بھائیا جی کچھ بولا نہ اسد۔ بہرحال

اپنے اندر کی کیفیت اسد کو بتا رہی تھی کہ بھائیا جی ابھی گیا نہیں تھا۔ گاڑی اُچھلتی کودتی شاد پور کی طرف دوڑتی رہی۔ ایک بار پھر بھائیا جی کی آواز اسد کے کانوں میں گونجی۔ اس مرتبہ آواز میں کرختگی قدرے کم تھی۔ بھائیا جی نے کہا۔

''تم نادانی کر رہے ہو۔ لیکن اگر تم ایسا کرنے کا تہیہ کر ہی چکے ہو تو پھر کوئی ایسا طریقہ اختیار کرو جو کم شرم ناک ہو۔ اُس مغرور عورت کے سامنے ناک رگڑنے کی بجائے اپنی عزت کا کچھ بھرم رہنے دو۔ کوئی ایسا راستہ اختیار کر لو جس میں تمہاری شکست فاش نظر نہ آئے۔ میری بات سمجھ رہے ہو تم؟''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''خود اُس سے بات مت کرو۔ کسی کو درمیان میں لاؤ۔ یوں لگے جیسے کسی تیسرے نے تم دونوں کو قریب لانے کی کوشش کی ہے۔ کچھ تو بات رہ جائے تمہاری۔''

بھائیا جی کی بات میں اسد کو تھوڑا سا وزن محسوس ہوا۔ وہ بولا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے ...... مجھے کیا کرنا چاہئے؟''

وہ بولا۔ ''ابھی اپنے گھر مت جاؤ...... واپس پلٹ جاؤ۔ اس بارے میں دھیان سے سوچو...... ایک نہیں کئی راستے تمہاری سمجھ میں آ جائیں گے۔''

جیپ کی رفتار پھر دھیمی ہونے لگی...... ایک دوراہے پر پہنچ کر اسد نے جیپ روک دی۔ ایک راستہ شاد پور کی طرف جاتا تھا ایک احسن آباد کی طرف...... اسد کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ جیسے کراہ کر رہ گیا۔ اُس نے نشست کی پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں...... آسمان سے چھاجوں پانی برس رہا تھا۔ جیپ کے شیشے بند تھے۔ بھائیا جی آس پاس ہی موجود تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ جیپ کے اندر ہی موجود ہے۔ شاید اُس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہے۔ شاید پچھلی سیٹ پر براجمان ہے۔

اسد نے عجیب کھوئی کھوئی سی آواز میں کہا۔ ''بھائیا جی! تمہاری پوری کہانی سننے کے بعد ہی یہ بات میری سمجھ میں آئی ہے کہ عورت کتنی بے بس ہوتی ہے۔ تم نے اپنی بیوی کو اس بات کی سزا دی کہ وہ اپنے باپ سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ اُس کے خلاف بغاوت نہیں کر سکتی تھی۔ تم نے اُسے تھپڑ مارا تھا نا؟ بولو! مارا تھا نا؟'' جواب میں مکمل خاموشی رہی...... لیکن بھائیا جی گیا نہیں تھا، اُس کے آس پاس ہی موجود تھا۔ اسد نے

بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جب وہ تھپڑ کھا کر روتی ہوئی تمہاری حویلی سے نکل رہی تھی تو کتنا اچھا ہوتا کہ تم اُسے روک لیتے۔ لیکن...... تم اُسے روک سکے نہ اُس لمحے کو...... اور جب لمحہ نکل جاتا ہے تو پھر کبھی کبھی قبر کی دیواروں تک واپس نہیں پلٹتا...... کیا تم چاہتے ہو کہ ایک بار پھر وقت بھائیا جی اور پیناں کے ہاتھوں سے نکل جائے؟''

اس بار بھی کوئی جواب نہیں آیا۔ جب بھی اسد نے بھائیا جی اور پیناں کے بارے میں براہِ راست بات کی تھی، کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ شاید بھائیا جی کی بھٹکی ہوئی آتما اس بارے میں بات کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اسد نے نرمی سے کہا۔

''مجھے تمہاری بہت سی باتوں سے اتفاق ہے بھائیا جی...... لیکن بہت سی باتوں سے اختلاف بھی ہے۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو بھائیا جی...... مجھے اپنی زندگی جینے دو۔ میں تمہارا خون ہوں...... تمہاری اولاد ہوں۔ میرے بارے میں بھائیا جی بن کر نہیں، ایک بزرگ بن کر سوچو......!''

''ایسے ہی سوچ رہا ہوں۔ اسی لئے تو تمہیں روک رہا ہوں۔ رُک جاؤ! اور جیسا تمہیں کہا ہے، ویسا کرو۔''

اسد کی پیشانی پسینے سے تر تھی۔ وہ تذبذب کی جان لیوا سولی پر لٹک رہا تھا۔ ایک بار پھر ایک لہر سی اُس کے اندر سے اُٹھی۔ اُس نے منہ زور خیالات کو جھٹک کر خود سے دور کیا اور کلچ چھوڑ کر ایکسیلیٹر دباتا چلا گیا...... وہ ہیجانی انداز میں گاڑی چلا رہا تھا...... ناہموار راستے پر رفتار اتنی تیز تھی کہ گاڑی اُلٹنے کا خدشہ پیدا ہو گیا تھا۔ پھسلن اور بارش کے سبب گاڑی کبھی راستے کے ایک کنارے پر چلی جاتی تھی کبھی دوسرے پر...... وہ اب رُکنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ اُڑ کر شاد پور پہنچ جائے۔ آواز...... نہایت کرخت آواز ایک بار پھر اُس کے کانوں میں گونجی۔

''تو تم نہیں رُکو گے؟''

اسد کی خاموشی اُس کا جواب تھی......

ایک پھنکار سی اسد کے کانوں میں گونجی۔ ''اپنے دوست کی حالت دیکھی ہے تم نے؟''

اسد کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بھائیا جی نیم جان نذیر احمد کی بات کر رہا تھا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' اسد نے پوچھا۔

"تمہاری حالت اُس سے دس گنا بدتر ہو سکتی ہے۔"

بھائیا جی کی آواز پھنکار سے مشابہ تھی۔ اسد کو محسوس ہوا جیسے یہ گھنی مونچھوں والے اُسی سفاک شخص کی آواز ہے جو لکڑی کی مورتیوں میں ایک مجبور عورت پر ستم کے پہاڑ توڑتا نظر آتا تھا...... اسد کو ایک بار پھر حضرت جی کی بات یاد آئی...... "تم بھی اگر جال توڑنے کی کوشش کرو گے تو وہ پورا زور لگائے گا۔ ہر حربہ آزمائے گا۔"

اسد نے مصمم ارادے کے ساتھ نفی میں سر ہلایا اور جیپ کو دوڑاتا چلا گیا......

"رُک جاؤ...... میں کہتا ہوں رُک جاؤ!" ایک مرتبہ پھر شعلہ بار لہجے میں کہا گیا۔

اسد نے اپنے جبڑے زور سے بھینچ لئے تھے۔ اسٹیئرنگ پر اُس کے ہاتھوں کی گرفت بڑی مضبوط تھی......!

○

اسد ابھی شاد پور سے چار پانچ میل دُور ہی تھا کہ چھوٹی نہر کے پاس سامنے سے آنے والی ایک ٹویوٹا کار نے اسد کی جیپ کو کراس کیا۔ اسد نے اُس کار پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ ویسے بھی تیز بارش نے ہر طرف پانی کی چادر سی تان رکھی تھی۔ وہ ٹویوٹا کار کچھ آگے جا کر رُک گئی۔ اُس نے یوٹرن لیا اور تیزی سے اسد کی جیپ کے پیچھے روانہ ہو گئی...... اس جیپ میں خطرناک صورتوں والے چار نوجوان سوار تھے، پانچواں ڈرائیور تھا۔ یہ لوگ اسد کا تعاقب کرنے لگے۔ گوروں کے قبرستان کے قریب اُنہوں نے اسد کی جیپ کو روک لیا۔

اسد نے تحیر سے کار سوار افراد کو دیکھا۔ اُن میں سے کوئی صورت شناسا نہیں تھی۔ اس سے پہلے کہ اسد کچھ کرتا یا سمجھتا، ایک شخص نے جیپ کا دروازہ جھٹکے سے کھولا اور اسد کو گریبان سے پکڑ کر باہر کھینچ لایا۔ تیز بوچھاڑوں نے لمحوں میں اسد کو شرابور کر دیا۔

"کیا بات ہے؟" اسد نے خوف آمیز حیرانی سے پوچھا۔

ابھی اُس نے فقرہ مکمل نہیں کیا تھا کہ ایک شخص نے ریوالور کا دستہ اسد کے چہرے پر مارا۔ اسد کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے...... وہ اُلٹ کر کیچڑ میں گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، دو افراد نے اُسے ٹانگوں سے پکڑا اور کیچڑ آلود زمین پر تیزی سے گھسیٹتے ہوئے قبرستان کے اندر لے گئے...... ان لمحات میں اسد کے ذہن میں یہ بات

گونجی کہ ہو نہ ہو ان غنڈوں کا تعلق سجاد اور رستم راجہ وغیرہ سے ہے۔

قبرستان میں پہنچنے کے بعد ایک حملہ آور چنگھاڑ کر بولا۔ "آج یہیں پر قبر بنا دو اس حرامزدے کی...... مار ڈالو اسے۔"

دو تین افراد نے اُسے دبوچ لیا اور بری طرح مارنے لگے۔ چند شدید چوٹیں کھانے کے بعد اسد سنبھلا۔ اُس کے ہاتھ ایک ٹوٹی ہوئی موٹی شاخ آ گئی...... اُس نے شاخ کی پہلی ضرب ریوالور والے کے ہاتھ پر لگائی اور ریوالور اُس کے ہاتھ سے چھڑا دیا۔ دوسری ضرب لمبے بالوں والے ایک لمڈھینگ کے سر پر لگی۔ وہ اپنی جیکٹ کی جیب سے کوئی ہتھیار نکالنے جا رہا تھا۔ لمبے تڑنگے اسد کے جسم میں جیسے بجلی کوندنے لگی تھی۔ اُس نے مضبوط شاخ کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہوئے قریباً ایک منٹ تک اپنا بھرپور دفاع کیا اور حملہ آوروں کو دن میں تارے دکھا دیئے۔ وہ بہت کم لڑتا جھگڑتا تھا۔ لیکن جب کہیں "میچ" پڑ ہی جاتا تھا تو پھر سرتاپا قہر بن جاتا تھا...... مگر یہ ایک اور پانچ کا مقابلہ تھا۔ ایک زخمی حملہ آور نے عقب سے آ کر پختہ اینٹ اتنے زور سے اسد کے سر پر ماری کہ اُسے اپنی کھوپڑی ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی...... وہ لہرا کر گھٹنوں کے بل گرا۔ اسی دوران دوسری اینٹ اسد کے سر کے عقبی حصے میں لگی...... بے ہوش ہو کر اوندھے منہ گرنے سے قبل اسد نے جو آخری منظر دیکھا وہ ایک اسٹیشن ویگن کا تھا۔ کیچڑ میں لتھڑی ہوئی یہ ویگن تیزی سے رُکی...... اُس میں سے بہت سے مسلح لڑکے چھلانگیں لگاتے ہوئے نیچے اُترے...... اُن لڑکوں میں اسد کو اشفاق اور عبداللہ وغیرہ کی صورتیں نظر آئیں...... اس کے بعد اسد کا ہر احساس فنا ہو گیا......

اسد پر بعد کے دنوں میں عجیب نیم بے ہوشی اور نیم غنودگی کی سی کیفیت طاری رہی۔ اُن دنوں کی یادیں جیسے کسی زردی مائل سفید دُھند میں چھپی ہوئی تھیں۔ کبھی وہ محسوس کرتا کہ وہ کسی ہسپتال میں ہے۔ اُس کے نتھنوں سے دواؤں کی تیز بوئیں ٹکراتیں۔ اُسے اپنے اردگرد ڈاکٹر اور نرسوں کی موجودگی کا موہوم احساس ہوتا...... کبھی وہ چچا شوکت کی آواز سنتا...... وہ اُسے کہیں دُور سے پکار رہے ہوتے...... اسدی! منہ کھولو...... اسدی! دوا کھا لو...... پانی پی لو! پھر ایک دن اُسے لگا کہ وہ اب اپنے گھر میں ہے۔ اس کے اردگرد اہل خانہ موجود ہیں۔ وہ جلد از جلد ہوش میں آنا چاہتا تھا۔ وہ شمیم

کی خاطر ہوش میں آنا چاہتا تھا اس نیم بے ہوشی کی کیفیت میں بھی اُس کے ذہن میں یہ خیال موجود تھا کہ کہیں بہت دیر نہ ہو جائے۔ کہیں وہ لمحے ہاتھوں سے نکل نہ جائیں جو بھائیا جی کے ہاتھوں سے نکل گئے تھے...... کہیں ایک بار پھر روتی ہوئی پیناں ڈیرے کی دہلیز پار نہ کر جائے...... وہ اپنی غنودگی سے لڑ رہا تھا...... یہ بڑی سخت لڑائی تھی۔ اسد کو لگتا تھا کہ وہ آگ اور برف کے سات سمندر پار کر رہا ہے...... نیم بے ہوشی کے عالم میں اُس کے ذہن میں بار بار حضرت جی کی کہی ہوئی باتیں بھی آتی تھیں۔ حوصلے کی باتیں...... جرأت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنے کی باتیں...... یہ باتیں اُس کا سہارا بن رہی تھیں۔ پھر ایک دن اُس کے ذہن پر چھائی ہوئی دُھند چھٹ گئی...... اُسے اپنے کمرے کی چھت صاف نظر آنے لگی۔ سامنے دیوار پر آویزاں کیلنڈر بھی صاف دکھائی دینے لگا...... اُس نے اپنے اردگرد اپنے اہل خانہ کو دیکھنا شروع کر دیا۔ ابا جان کو، چچا شوکت کو اور چچی سلطانہ کو، علی اور نازو کو...... اگر نہیں تھی تو وہ نہیں تھی۔ وہ کہاں تھی؟ کہیں وہ...... کہیں وہ روتی ہوئی حویلی کا پھاٹک پار تو نہیں کر گئی تھی؟ اُس کے ذہن میں ان گنت اندیشے کلبلانے لگے......

ایک دن اسی طرح گزر گیا...... یا شاید دو دن...... وہ اپنی نحیف آواز میں نازو سے یا علی سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کہاں ہے...... لیکن پھر اچانک وہ خود ہی نظر آ گئی۔ اُس نے رسمی انداز میں اسد کا حال پوچھا، اسد نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔ وہ حسب عادت ایک طرف خاموش کھڑی ہو گئی۔ اسد کی آنکھوں کے گوشے بھیگنا چاہتے تھے۔ اُس نے بمشکل ان گوشوں کو بھیگنے سے روکا......

آنے والے دنوں میں اسد کی حالت تیزی سے بہتر ہوئی۔ وہ اب نحیف آواز میں بولنے لگا تھا۔ تھوڑی سی دقت کے ساتھ خود سے اُٹھ کر بیٹھ بھی جاتا تھا۔ اُس کے سر کے دو زخموں پر کوئی تیس ٹانکے لگے تھے۔ اُسے لاہور کے میو ہسپتال لے جایا گیا تھا، پھر جنرل ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ وہاں دو دن تو بے ہوش رہا، پھر ہوش میں تو آ گیا لیکن گہری غنودگی میں رہا اور ذہنی حالت بھی درست نظر نہیں آئی۔ عبداللہ کا کہنا تھا کہ اس وقت ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ بھی نذیر احمد کی طرح ہو گیا تھا...... لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ سنبھلنے لگا۔ چھ سات دن بعد وہ لوگ اُسے گھر لے آئے۔ یہاں بھی اُسے باقاعدگی سے دوائیں

دی جا رہی تھیں۔ قدیر صاحب نے نہ صرف لاہور میں اسد کے لئے بے حد بھاگ دوڑ کی بلکہ وہ شاد پور کے بھی تین چار چکر لگا چکے تھے۔ ہر دفعہ جب وہ آتے تھے تو اُن کے ساتھ لاہور سے ڈاکٹر آتا تھا جو اسد کا تفصیلی معائنہ کرتا تھا۔

اگلے دن قدیر صاحب آئے تو اُن کے ساتھ اشفاق بھی تھا۔ اشفاق کی ٹھوڑی پر ابھی تک پٹی موجود تھی۔ یہ پٹی اُس لڑائی کی نشانی تھی جو دو ہفتے پہلے طوفانی بارش میں گوروں کے قبرستان میں ہوئی تھی...... ممکن تھا کہ اُس روز واقعی اسد کو قتل کر کے گوروں کے قبرستان میں دفن کر دیا جاتا۔ یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ اُس کے ساتھی بر وقت موقعے پر پہنچ گئے تھے۔

اشفاق نے اسد کو تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''بینک ٹیم کا ایک کھلاڑی عاطف میرا گہرا دوست ہے۔ وہ بھی میری ہی طرح اسپورٹس کے سامان کی دُکان کھولنا چاہتا ہے اس لئے اکثر میری دُکان پر بیٹھا رہتا ہے۔ اُس روز صبح سویرے وہ بڑا ہانپتا ہوا میرے پاس پہنچا۔ اُس نے بتایا کہ تمہاری جان خطرے میں ہے۔ اُس کی اطلاع کے مطابق دو سال پہلے مرنے والے رستم کا گہرا یار ''ٹونی کلب والا'' جیل سے رہا ہوا تھا اور کئی دن سے لاہور میں تھا۔ ٹونی کلب والے نے دو چار اور غنڈوں کو ساتھ ملا کر تمہارے ہاتھ پاؤں توڑنے کا منصوبہ بنایا تھا...... عاطف نے مجھے بتایا کہ وہ لوگ بذریعہ کار بس شاد پور کے لئے روانہ ہوا ہی چاہتے ہیں۔ یہ اطلاع ملتے ہی میں نے فوراً فون پر شاد پور رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر طوفانی بارش کی وجہ سے لائنیں ڈیڈ ہو چکی تھیں۔ میں نے کچھ دوستوں کو ساتھ لیا اور عمیر کی اسٹیشن وین پر شاد پور کی طرف دوڑ لگا دی۔ جانے سے پہلے میں نے قدیر صاحب کو بھی فون کر دیا۔ ہم تیز بارش میں سفر کرتے شاد پور پہنچے تو پتہ چلا کہ تم تو احسن آباد گئے ہوئے ہو...... یا پھر عباس پورہ میں ٹھہرے ہوئے ہو۔ ہم نے اُسی وقت عباس پورہ کا رُخ کیا۔ شاد پور سے عبداللہ کے علاوہ چار پانچ مزید لڑکے وین میں گھس گئے۔ جب ہم شاد پور سے نکلے تو ہمیں اطلاع ملی کہ ایک سرخ ٹویوٹا کار جس میں مشکوک صورتوں والے پانچ بندے سوار تھے بڑی تیزی سے عباس پورہ کی طرف گئی ہے۔ جب ہم چار پانچ میل آگے قبرستان کے قریب پہنچے تو تمہاری جیپ اور سرخ ٹویوٹا آگے پیچھے کھڑی

نظر آئیں۔ پھر ہم نے تمہیں چوٹ کھا کر زمین پر گرتے دیکھا۔ ہم ایک درجن سے زیادہ لڑکے تھے۔ ہمارے پاس ڈنڈے، ہاکیاں اور کلہاڑیاں تھیں۔ ہم غنڈوں پر پل پڑے۔ چار پانچ منٹ تک خوب لڑائی ہوئی۔ اس دوران میں کھیتوں سے بھی لوگ بھاگ بھاگ کر موقع پر پہنچ گئے۔ دو حملہ آور بھاگ گئے، تین کو ہم نے پکڑ لیا...... اُن میں سے بھی ایک کو گہرے زخم آئے تھے۔ تمہیں اُس زخمی سمیت جیپ میں ڈال کر لاہور کی طرف دوڑا دیا گیا۔ باقی دو حملہ آوروں کو ہم یہاں شادپور لے آئے۔ قدیر صاحب بھی پولیس کو لے کر پہنچ گئے تھے۔ اُنہیں پولیس کے حوالے کر دیا گیا...... ''ٹونی کلب والے'' کے سوا باقی وہ سب کرائے کے غنڈے تھے۔ قدیر صاحب کا فرمانا ہے اب یہ بھاڑے کے ٹٹو دو دو سال سے پہلے باہر نہیں آئیں گے۔ ٹونی کلب والا لاہور بھاگ گیا تھا وہاں اُس نے ایک سینئر جج کے بیٹے پر فائرنگ کر دی اور پکڑا گیا۔ اب اُس کے خلاف قتل کا ایک پرانا کیس بھی نکل آیا ہے۔ اُس کی جان بھی اب آسانی سے چھوٹتی نظر نہیں آتی۔''

اسد بظاہر اشفاق کی باتیں سن رہا تھا لیکن اُس کا ذہن کہیں دُور بھٹک رہا تھا۔ اشفاق کی زبانی یہ روئیداد سننے کے بعد اُسے اپنے بے ہوش ہو کر گرنے سے پہلے کے واقعات پھر سے یاد آ گئے تھے۔ بارش سے بھیگے ہوئے راستے پر اُس کا اندھا دُھند جیپ بھگانا اور بھائیا جی کا بار بار اُس کی ساعت میں داخل ہونا...... اُسے بار بار روکنے کی کوشش کرنا اور پھر ناکام ہو کر غضب ناک ہو جانا۔ بھائیا جی کے آخری الفاظ اُس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ ''تم نے اپنے دوست کی حالت دیکھی ہے؟؟'' اور اُس کی دھمکی کے کچھ ہی دیر بعد گوروں کے قبرستان کے پاس اسد پر حملہ ہو گیا تھا......

اسد سوچنے لگا کیا بھائیا جی کی غضب ناکی اور ''ٹونی کلب والا'' کا حملہ ایک ہی سلسلے کی کڑیاں تھیں؟ لیکن اگر ایسا تھا تو پھر وہ نذیر احمد کی طرح قابل رحم حالت کو پہنچنے سے بچ کیوں گیا؟ کیا بھائیا جی کا وار اوچھا پڑا تھا یا پھر کسی مددگار نے اُس کی مدد کی تھی...... کسی اللہ والے سے پیدا ہونے والے مضبوط تعلق نے اُسے بچایا تھا؟ اسد نے اس انداز میں سوچا تو حضرت صاحب کی نورانی صورت اپنے آپ اسد کی نگاہوں میں گھومنے لگی۔ اُس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ اُس کے دل کے اندر کہیں گہرائی

سے آواز اُبھری...... تم بچ گئے ہو...... شاید اس لئے کہ تم نذیر احمد کی طرح بے وارث نہیں تھے...... تمہاری پشت نذیر کی طرح خالی نہیں تھی...... ایک عجیب سی رقت اُس پر طاری ہو گئی۔ پندرہ بیس روز پہلے دل میں نرمی اور گداز کا جو چشمہ حویلی کے سٹور روم میں پھوٹا تھا وہ کچھ اور بھی رواں دواں ہو گیا...... اُس کا شفاف پانی، اسد کی رُوح کو سیراب کرنے لگا۔ اُس کے اندر کی کثافتیں دھونے لگا......

گورا قبرستان والے واقعے کو دو ماہ ہونے کو آ گئے تھے۔ بھائیا جی کی آواز دوبارہ اسد کے کانوں میں نہیں آئی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اسد کے دل میں یہ خوشگوار احساس جاگزیں ہو گیا تھا کہ شاید اب بھائیا جی دوبارہ اُس کی ساعت کو مجروح نہ کرے...... اسد کی صحت اب قریباً معمول پر آ گئی تھی۔ وہ اب پوری خوراک کھانے لگا تھا۔ مٹھی بھر دواؤں کی جگہ اب روزانہ بس ایک گولی لینا ہوتی تھی۔ گھر والے ہر طرح اُس کی دلجوئی کر رہے تھے۔ چچا شوکت اپنا سارا فارغ وقت اسد کے ساتھ گزارتے تھے۔ نازو کو سکول سے چھٹیاں تھیں وہ اور علی ہر وقت اسد کے پاس بیٹھے رہتے۔ چٹکلے سناتے، لڈو کھیلتے اور بیت بازی ہوتی۔ بڑا پیارا موسم تھا۔ قصبے کے کھیتوں میں گندم کے بوٹوں میں سنہری رنگ گھلنے لگا تھا۔ درختوں پر بور آ رہا تھا۔ ہوا کی چال میں کسی الہڑ دوشیزہ کا سا لوچ اور بانکپن آ گیا تھا۔

بڑی عید کی آمد آمد تھی۔ ایسی ہی ایک عید پر شمیم اور اسد کے راستے جدا ہوئے تھے۔ اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے پھوٹے تھے۔ اب پھر وہی عید تھی۔ لیکن اسد چاہتا تھا کہ اب کی بار اس تہوار کا عنوان کچھ مختلف ہو۔ وہ جو بات کہنے کے لئے ڈیرے سے شادپور آ رہا تھا وہ ابھی تک اُس کی زبان کی نوک پر تھی۔ اگر اُس طوفانی صبح کو وہ خون میں نہا کر اور ہوش کھو کر ہسپتال نہ پہنچ جاتا تو یہ بات کب کی اُس کی زبان سے اُتر کر شمیم کی ساعت میں داخل ہو چکی ہوتی۔ دانا کہتے ہیں کہ قدرت کی طرف سے ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ شاید اس بات کا بھی ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ اسد موقع ڈھونڈ رہا تھا کہ وہ شمیم سے یہ بات کر سکے۔ ابھی تک اُسے موقع ملا نہیں تھا۔ وہ یہ بات عام سے موقعے پر سرسری انداز میں نہیں کر سکتا تھا۔ اس خاص بات کے لئے خاص موقعے کی ضرورت تھی۔

شمیم دن میں ایک آدھ بار اُسے نظر آ جاتی تھی۔ کبھی اسد کے گھر میں، کبھی اپنے گھر میں...... وہ دوسروں کی موجودگی میں اسد سے مختصر بات بھی کر لیتی تھی مگر وہ جو ایک اجنبیت کا احساس تھا، وہ بدستور تھا۔ کسی وقت اسد دزدیدہ نگاہوں سے اُسے دیکھتا تو اُس کی حسین آنکھیں متورم نظر آتیں۔ اسد کو یوں لگتا جیسے وہ روئی ہوئی ہے۔ ایسے میں پتہ نہیں کیوں اسد کو بھائیا جی کی پیناں یاد آ جاتی۔ وہ سوچتا، جب وہ بے بسی کے عالم میں بھائیا جی کو ''سادہ خط'' بھیجتی ہو گی تو شاید اُس کا چہرہ بھی ایسے ہی غم ناک اور رنجور نظر آتا ہوگا۔ حویلی سے آخری بار نکلتے ہوئے وہ بھی اسی طرح لڑکھڑا سی گئی ہو گی جس طرح شمیم اُسے دیکھ کر لڑکھڑاتی ہے۔

کسی وقت اسد کے دل سے ایک ہوک سی بھی اُٹھتی تھی۔ وہ اُن لمحوں کا سوچ کر غمزدہ ہو جاتا تھا جب اُسے خود پہل کر کے شمیم سے بات کرنا تھی...... اپنی پہلی اور آخری شرط سے دستبردار ہونا تھا۔ اسد جانتا تھا کہ یہ مرحلہ کٹھن ہوگا۔ اُس کی انا پر چوٹ پڑے گی۔ لیکن وہ یہ چوٹ سہنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اُسے بھائیا جی نہیں بننا تھا...... بھائیا جی بن کر نفرت انگیز جنسی مورتیاں نہیں بنانی تھیں۔ اُسے اسد بننا تھا۔ اُسے محبت کی تتلی کے رنگ دیکھنا تھے۔

عید کی آمد آمد تھی۔ تیاریاں ہو رہی تھیں۔ قصبے کے بازار میں دُکانیں بھری پڑی تھیں اور خریداروں کا ہجوم نظر آتا تھا۔ اکثر گھروں میں قربانی کے جانور آ گئے تھے۔ اسد اور چچا شوکت کے گھر بھی دو خوش شکل بکرے اٹکھیلیاں کرتے پھرتے تھے۔ علی اور نازو دیگر بچوں کے ساتھ مل کر دونوں گھروں میں بکروں کو دوڑاتے پھرتے تھے۔ ان مناظر نے اسد کے ذہن میں کئی بھولی بسری یادیں تازہ کر دی تھیں۔ وہ اس مرتبہ تین سال بعد اپنے گھر میں بڑی عید منا رہا تھا۔

شام کے وقت اسد کے صحن میں بہت سی لڑکیاں جمع ہو گئیں۔ یہ سب نازو کی ہم عمر تھیں۔ شوخ نازو اُن کے درمیان لیڈر بنی بیٹھی تھی۔ وہ سب ایک دُوجے کو عید کی مہندی لگا رہی تھیں۔ گاہے گاہے اُن کے چنچل قہقہے پورے گھر میں گونج جاتے تھے۔ چچی دیوار کی دوسری طرف سے بار بار نازو کو آوازیں دے رہی تھیں۔ ''او نازو کی بچی! اب آ جا...... گھر کی صفائی بھی کرنی ہے۔''

عید کو ابھی دو دن باقی تھے لیکن سارے گھر کی صفائی کا بھوت چچی پر ابھی سے سوار ہو گیا تھا۔ نازو، ماں کو جواب دینا ضروری نہیں سمجھ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ماں کی سماعت کمزور ہے۔ اُس کا جواب ماں کے کانوں تک نہیں پہنچ سکے گا۔

کچھ دیر بعد چچی کی جھلائی ہوئی آواز اسد کے کانوں میں پڑی۔ وہ شمیم کو بلا رہی تھیں۔ ''شمی کی بچی! تو کہاں دفع ہو گئی ہے؟ یہ نہیں کہ ماں کا تھوڑا سا ہاتھ بٹا دے۔ پڑھ پڑھ کر اپنا دماغ خالی کر لے گی سارا...... تیرا بننا بنانا کچھ نہیں ہے۔''

چچا شوکت صحن میں بیٹھے ریڈیو پر خبریں سن رہے تھے۔ بیوی کو ٹوکتے ہوئے بولے۔ ''چھوٹی پر بس نہیں چلا تو اب بڑی کے دوالے ہو جا بیوقوفے! وہ پڑھ ہی رہی ہے نا...... کچھ حاصل ہی کر رہی ہے۔''

''کون جا رہا ہے حاصل پور......؟'' چچی نے زور سے پوچھا۔

چچا شوکت نے جھلا کر ریڈیو کی آواز فل اُونچی کر دی۔

عید سے ایک دو دن پہلے اسد کی بڑی باجی بھی بچوں کے ساتھ اُن کے ہاں آ جایا کرتی تھیں۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے وہ پہنچ گئیں۔ گھر کی رونق میں اضافہ ہو گیا...... ہر طرف چہل پہل نظر آنے لگی...... جب باجی اور فلک شیر بھائی آتے تھے تو اسد کو اکثر اُوپر برساتی میں سونا پڑتا تھا۔ اب بھی اُسے اپنا بستر بوریا اُوپر لے جانا پڑا۔ وہ جب سے واپس لوٹا تھا بس ایک دو بار ہی چھت پر گیا تھا۔ اور برساتی میں تو ایک بار بھی نہیں گیا تھا۔ آج ایک مدت بعد اُسے پھر برساتی میں سونا پڑا۔ وہی برساتی جس کی کھڑکی میں سے چچا کے گھر کا آدھا صحن نظر آتا تھا...... اور شمیم کے کمرے کی کھڑکی نظر آتی تھی اور شمیم نظر آتی تھی اور ٹیبل لیمپ کی روشنی میں ہیرے کی طرح دمکتا ہوا آدھا بدن...... اس برساتی سے اُس کی بے شمار دلگداز اور تلخ یادیں وابستہ تھیں۔ اُسے یوں لگتا تھا کہ اس برساتی کی ایک ایک اینٹ...... ایک ایک ذرّے میں کسی کا انتظار مجسم ہے۔ لیکن اب وہ یہ ساری یادیں اپنے ذہن سے کھرچ دینا چاہتا تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے بستر پر لیٹ گیا۔ اُس نے بازو موڑ کر آنکھوں پر رکھ لیا۔ ہلکی آواز میں ریڈیو لگا ہوا تھا۔ غزلوں کا پروگرام آ رہا تھا۔

تم سے اُلفت کے تقاضے نہ نباہے جاتے...... ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جاتے......

دُور کہیں کھیتوں میں ٹریکٹر کی مانوس آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہوا میں بیتتے ہوئے ماہ و سال کی خوشبو تھی۔ رات کے ساڑھے دس بج گئے تھے۔ دن بھر کے ہنگامے سرد ہو گئے تھے۔ لیٹے لیٹے اسد کے دل میں آئی کہ وہ اپنی ایک پُرانی یاد تازہ کرے۔ برساتی سے نکل کر چچا کے صحن میں جھانکے۔ اُس نے چھت پر سے چچا کے صحن میں جھانکا تو اُسے شمیم کا ہیولا نظر آیا۔ وہ صحن میں ٹہل رہی تھی۔ اتنی رات کو اُس کا صحن میں ٹہلنا اسد کو عجیب سا لگا۔ اسد دیوار کے ساتھ لگ گیا کہ کہیں شمیم کی نگاہ اُس پر نہ پڑ جائے۔ ٹہلتے ٹہلتے شمیم نے ایک دو بار اچٹتی سی نگاہ چھت کی طرف ڈالی، پھر گھر کے برآمدے کی طرف چلی گئی۔ اُس کی حرکات وسکنات سے گھبراہٹ مترشح تھی۔

دس پندرہ سیکنڈ اسی طرح گزرے، پھر اسد نے شمیم کو تیزی سے سیڑھیوں کی طرف آتے دیکھا...... ''تو کیا وہ چھت پر آ رہی ہے؟'' یہ سوال برق کی طرح اسد کے ذہن میں کوندا...... وہ جلدی سے واپس برساتی کے اندر چلا گیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ پتہ نہیں وہ کس کام سے چھت پر آئی تھی؟ شاید دُھلے ہوئے کپڑے اُتارنے یا پھر چارپائیاں شیڈ کے نیچے رکھنے...... اچانک اسد کے جسم میں ایک تیز سنسناہٹ دوڑ گئی۔ اُسے اپنی سماعت پر اور اپنے آپ پر یقین نہیں آ رہا تھا...... یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ رات کے سناٹے میں شمیم کے قدموں کی مدھم چاپ سن رہا تھا...... اور یہ چاپ برساتی کی طرف آ رہی تھی۔ شاید وہ کوئی سپنا دیکھ رہا تھا۔ اُس کے دل کی دھڑکن رُک سی گئی تھی۔ وہ بایاں بازو آنکھوں پر رکھے بے حرکت لیٹا تھا...... چند لمحوں میں صدیاں بیت گئیں...... پھر دروازہ کھلنے کی مدھم آواز آئی اور کوئی دھیرے سے اندر آ گیا۔ اسد کو محسوس ہوا جیسے وہ زمانوں سے اسی طرح لیٹا اس لمحے کا منتظر تھا۔ اُس نے آنکھیں کھولیں، اُس کے سامنے شمیم کھڑی تھی۔ بلب کی مدھم روشنی میں اُس کی آسمانی رنگ کی اوڑھنی کے روپہلی تار چمک رہے تھے۔ ہلکے آسمانی لباس کے نیچے اُس کے گلابی پاؤں ننگے تھے۔ اُس کے ہونٹ تھرا رہے تھے اور حسین آنکھوں میں نمی تھی۔ وہ کمرے کے تقریباً وسط میں بے حرکت کھڑی تھی۔

اسد جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ چند لمحے وہ بھی ساکت رہا، پھر اُس کے ہونٹوں سے لرزتی آواز نکلی۔ ''شمی...... تم یہاں؟''

اُس نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی سسکی روکی اور بولی۔ ''تم یہی چاہتے تھے نا...... اسی بات کے لئے پانچ برسوں سے...... مجھے اور سارے گھر والوں کو رُلا رہے ہو نا...... لو! میں آ گئی ہوں......''

اسد ایک ٹک اُسے دیکھتا رہا۔ پھر اُس کے ہونٹوں سے نکلا۔ ''اتنی سی بات کے لئے اتنی دیر شمی...... اتنی دیر......؟''

''جو چل کر آ جائے...... اُسے معاف کر دیتے ہیں...... مجھے بھی معاف کر دو!''

اسد نے جلدی سے اُس کے ہاتھ تھام لئے۔ وہ سر تا پا لرز رہی تھی۔ اسد نے بے اختیار اُسے گلے سے لگا لیا۔ وہ اُس کی بانہوں میں سما گئی...... اُس کے سینے کا تلاطم گواہ تھا کہ وہ ہچکیوں سے رو رہی ہے۔ وہ بولی۔ ''تمہیں کیا پتہ اسد! میں کتنا تڑپی ہوں تمہارے لئے...... کتنا روئی ہوں...... میں نے...... ہر پل سولی پر کاٹا ہے اسد...... پتہ نہیں کتنی بار زندہ ہو کر کتنی بار مری ہوں...... تم جیت گئے ہو اسد! میں ہار گئی ہوں۔''

اسد نے اُس کے لرزتے جسم کو مضبوطی سے اپنا سہارا دیا۔ اُس کے ہونٹ بے اختیار اُس کے ریشمی بالوں کو سہلانے لگے۔

یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیوں ہو رہا ہے...... وہ بے پناہ حیرت کے عالم میں سوچ رہا تھا۔ یہ تو ایک خیال تھا، ایک تصور اور سپنا تھا، لیکن یہ مجسم حقیقت بن کر اس رات کے سناٹے میں اُس کے سامنے تھا۔ یہ سپنا اپنے سارے گداز اور ساری حرارت کے ساتھ اسد کے بازوؤں میں سمایا ہوا تھا۔ اُس کے کانوں میں حضرت صاحب کے الفاظ گونجے۔ اُنہوں نے کہا تھا۔ ''جب تمہارے اندر کا میل صاف ہو جائے گا تو سب کچھ اپنے آپ ہی ٹھیک ہو جائے گا۔''

اُس کے اندر کا میل صاف ہو گیا تھا...... وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ صاف ہو گیا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ نتیجہ اُس کے سامنے آ گیا تھا...... وہ آئندہ دو دنوں میں شمیم سے بات کرنے کا اور تعلقات کی تجدید کرنے کا پختہ ارادہ رکھتا تھا...... لیکن اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے ہی وہ کچھ ہو گیا تھا جو پچھلے پانچ سال میں نہیں ہو سکا تھا اور جس کی اب اسد کو ہرگز توقع نہیں تھی...... ہاں! جب دل کا میل صاف ہوتا ہے تو پھر ایسا ہی ہوتا ہے...... کسی نے اسد کے اندر سے پکار کر گواہی دی۔

شمیم اُس سے لپٹ گئی تھی۔ اپنی ساری جھجک اور حیا کے باوجود وہ اُس کی بانہوں میں سما گئی تھی۔

وہ برساتی جس نے آج تک بس انتظار کے آنسو ہی دیکھے تھے، ہجر کی سسکیاں ہی سنی تھیں، آج دو پیار کرنے والوں کو ملتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اُن کی سرگوشیاں اور تیز سانسیں ایک میٹھے نغمے کی طرح برساتی کے در و دیوار میں سرایت کر رہی تھیں۔

ایک لمحے کے لئے......صرف ایک لمحے کے لئے اسد کے دل میں آیا کہ وہ خاموش رہ جائے......اپنے اُس ارادے کے بارے میں شمیم کو کچھ نہ بتائے جو اُسے کھینچ کر ڈیرے سے شاد پور لایا تھا...... یہ ارادہ اب بھی اسد کے سینے میں موجزن تھا۔ اگر آج شمیم اُس کے پاس نہ آتی تو آئندہ دو روز کے اندر اُسے خود شمیم کے پاس جانا تھا۔ اُس کے پاس جا کر اُس کی چپ کو توڑنے کی کوشش کرنا تھی...... اُسے بتانا تھا کہ اب اُسے دُلہن بنانے کے لئے اُس کی کوئی شرط نہیں ہے......

لیکن اب وہ خود آ گئی تھی۔ ایک لمحے کے لئے اسد کے دل میں آیا کہ وہ اپنے اُس ارادے کے بارے میں شمیم کو کچھ نہ بتائے۔ جو فتح اُسے حاصل ہوئی ہے اس کی چمک دمک برقرار رہنے دے......لیکن اگلے ہی لمحے اُس نے اپنے خیال کو رد کر دیا...... اگر اُس کے دل کا میل صاف ہو گیا تھا تو پھر یہ دُھندلاہٹ اُس کی سوچ میں کیوں آئی تھی؟ اس دُھندلاہٹ کے لئے اب اُس کے ہاں کوئی جگہ نہیں تھی۔

چند ساعتوں کے اندر اُس نے فیصلہ کر لیا کہ اُسے شمیم کو اپنے ارادے کے بارے میں بتانا ہے۔ وہ شمیم کو اپنے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے بولا۔

''شمی! ایک بات بتاؤں؟''

''بتاؤ......!'' وہ جیسے کہیں دُور سے بولی۔

''ہاری تم نہیں ہو...... ہارا میں ہوں۔'' اُس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

وہ خاموش رہی۔

''ہاں شمی! میں ہارا ہوں...... بتاؤں کس طرح؟'' اُس نے شمیم کا چہرہ اپنے سینے سے جدا کرتے ہوئے پوچھا۔

''کس طرح؟'' اُس نے آنکھیں بند کئے کئے پوچھا۔

''تم میری بات پر یقین کرو گی نا؟''

وہ خاموش رہی۔

وہ بولا ''دیکھو یقین کرنا...... کیونکہ جھوٹ بولنے سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور نہ سچ بولنے سے نقصان۔ میں جو کچھ تمہیں بتا رہا ہوں، اپنی مرضی سے بتا رہا ہوں۔''

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

اسد اُسے لے کر صوفے پر آ بیٹھا۔ شمیم کے گال سرخ تھے اور آنکھیں تر بتر تھیں...... وہ فرش کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اسد نے کہا۔ ''شمی! میں سچ کہتا ہوں۔ تم نہیں ہاری ہو، میں ہارا ہوں... تم جانتی ہو کہ جس دن مجھے چوٹیں آئیں، میں سخت طوفانی موسم میں ڈیرے سے شاد پور کی طرف کیوں بھاگا چلا آ رہا تھا؟''

شمیم سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔

اسد نے کہا۔ ''میں تمہاری طرف آ رہا تھا...... تم سے ملنے، تم سے بات کرنے...... تمہیں یہ بتانے کہ میں تمہیں پیار کرتا ہوں...... تمہیں اپنانا چاہتا ہوں۔ میں تمہارے سامنے یہ اعتراف کرنے آ رہا تھا کہ میری طرف سے تم پر زیادتیاں ہوئی ہیں...... پھر تم جانتی ہو، راستے میں مجھ پر حملہ ہوا اور میں کئی ہفتوں کے لئے بستر سے لگ گیا... اب میں کئی دن سے کسی ایسے موقعے کا انتظار کر رہا تھا جب میں تم سے بات کر سکوں۔ اگر آج تم سے ملاقات نہ ہوتی تو آئندہ دو دن کے اندر اندر میں نے خود تم سے بات کرنا تھی...... میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں شمیم...... اور اس لئے کہہ رہا ہوں شمیم! کہ اب کوئی بات تم سے چھپا کر رکھنا نہیں چاہتا۔ میں تمہارے سامنے ایک شفاف شیشے کی صورت آنا چاہتا ہوں۔''

شمیم ایک بار پھر بے اختیار ہو کر اُس کے سینے سے لگ گئی۔ وہ روتے ہوئے بولی۔

''شاید ہم دونوں ہی ہارے ہیں اور دونوں ہی جیتے ہیں۔'' کتنی خوبصورت بات کی تھی اُس نے......شاید دونوں ہی ہارے ہیں اور دونوں ہی جیتے ہیں...... چند لمحوں کے اندر اسد خود کو اس بات سے متفق محسوس کرنے لگا۔ وہ آنسوؤں سے بوجھل آواز میں بولا۔

''ہاں شمی...... دونوں ہارے ہیں اور دونوں جیتے ہیں۔ اس بار جیت میں جس شے کو

زندگی ملی ہے، وہ ہماری محبت ہے۔ اس محبت کو اب کبھی مرجھانے نہ دینا۔“

”یہ محبت تو میری جان ہے اسد! اسے کچھ ہوا تو میری جان بھی چلی جائے گی۔“ وہ جذبات کی رو میں یہ مشکل بات کہہ گزری۔

اسد نے اُس کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”اب کبھی دُور تو نہیں جاؤ گی شمی؟“

”نہیں... زندگی کی آخری سانس تک نہیں۔“ وہ جذبات سے بوجھل آواز میں بولی۔

”کوئی شکوہ، کوئی گلہ تو نہیں اب؟“ اسد کا لہجہ بھی اشکبار تھا۔

”نہیں اسد! کچھ نہیں...... کچھ بھی نہیں۔“

”کیسے یقین کروں......؟“

”یہ دیکھو......!“ اُس نے جذباتی انداز میں اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اسد کے سامنے کر دیا۔

اسد نے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ خوبصورت ہتھیلی پر وہی مہندی تھی جو کبھی اسد نے اُس کے ہاتھ پر لگائی تھی۔ چھوٹی چھوٹی پتیوں والا وہی خوبصورت ڈیزائن جو شمیم نے اسد سے ناراضگی کے بعد کھرچ کھرچ کر اُتار دیا تھا اور پھر جب ایک عید کے موقع پر اسد نے شمیم سے پوچھا تھا کہ اُس نے صرف ایک ہاتھ پر مہندی کیوں لگائی ہے؟ وہ بولی تھی کہ دوسرے پر مہندی نہیں لگائی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دوسرے ہاتھ پر جب بھی لگاؤں گی وہی ڈیزائن لگاؤں گی جو کبھی اسد نے بنایا تھا۔

......اور اس عید پر شمیم کی خوبصورت ہتھیلی پر وہی بھولا بسرا ڈیزائن نظر آ رہا تھا...... یہ مہندی شاید اُس نے آج ہی کسی وقت لگائی تھی۔ اُس کا رنگ چمکیلا اور روشن تھا۔ اسد نے بے اختیار ہتھیلی کو چوم لیا۔ حنا کی تازہ خوشبو اُس کی رُوح میں اُترتی محسوس ہوئی۔ وہ نشاط کے عالم میں آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہو گیا۔

○

وہ عید واقعی عید تھی۔ اسد کو یوں لگ رہا تھا کہ شاید اُس نے زندگی میں پہلی بار یہ تہوار منایا ہے۔ وہ دل کی گہرائیوں سے خوش تھا۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کسی اُونچی جگہ پر چڑھ جائے پھر لوگوں کو سنانے کے لئے پکار پکار کر کہے۔ ”سنو لوگو! محبت ہرانے کا نہیں، ہارنے کا نام ہے...... یہ انکار و ضد کا نام نہیں تسلیم و رضا کا نام ہے۔ محبت کے چشمے کو نرم زمین دو تا کہ وہ روانی سے بہہ نکلے، گنگنائے، لہرائے اور تمہاری رُوحوں کو

سیراب کرے۔ اگر اسے سخت زمین دو گے تو یہ چشمہ اندر ہی اندر بھٹکتا رہے گا۔ سڑ کر بدبودار پانی بن جائے گا...... وہ بھائیا جی بن جائے گا۔ پھر وہ کسی ڈیرے کی راہداریوں میں بے چین روح کی طرح بھٹکے گا اور چیخے گا۔ پھر وہ سیال آگ اپنے اندر اُنڈیلے گا اور شرمناک مورتیاں بنائے گا...... لوگو! محبت کو خوشبو، رنگ اور نغمہ رہنے دو۔ اسے بدبو، آگ اور چیخ مت بناؤ...... اسے بھائیا جی کی مورتی مت بناؤ۔“

بڑے عرصے بعد اُن کے آنگن میں سچی خوشی کی آمد ہوئی تھی۔ شمیم نے ہلکے گلابی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ بال حسب عادت ڈھیلی ڈھالی چوٹی کی صورت میں باندھ رکھے تھے۔ وہ اسد کی باجی آمنہ کے چھوٹے بیٹے کو گود میں اُٹھائے، اُس کا منہ چومتی صحن میں آئی تو اسد اُسے دیکھتا رہ گیا۔ ہلالی کلیجی کی جو بوٹی اُس نے منہ میں ڈالنے کے لئے اُٹھائی تھی، چٹکی میں ہی دبی رہ گئی۔

باجی نے کن انکھیوں سے اسد کو دیکھا۔ جب شمیم ننھے احسن کے ساتھ اندر کمرے میں چلی گئی تو باجی نے اسد کو ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔

”لگتا ہے کہ چراغ تلے جو اندھیرا تھا وہ ختم ہو گیا ہے۔“

”کیا مطلب آپ کا؟“

”تمہیں اب قریب کی چیزیں نظر آنے لگی ہیں۔“

”میری قریب کی نظر کبھی کمزور نہیں تھی۔“ اسد نے کہا۔

”پھر تم جان بوجھ کر نہیں دیکھ رہے تھے...... شاید تم دونوں کے درمیان چپکے سے کوئی بات چل گئی تھی...... اب وہ بات چپکے سے ختم بھی ہو گئی ہے۔“ باجی نے اسد کو معاملہ فہم نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

”ویسے باجی! تم ہو بڑی چالاک۔“

”شکریہ......!“ باجی نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سلام کیا۔ ”کہو تو مزید کوئی چالاکی دکھاؤں؟“

”میں سمجھا نہیں۔“

”ابا جان اور چچا کو بتاؤں کہ تمہیں قریب کی چیزیں نظر آنے لگ گئی ہیں۔“

اسد مسکرا دیا۔ اُس کی مسکراہٹ سے رضامندی جھلک رہی تھی۔

آئندہ چند دنوں میں بڑی تیزی سے پیش رفت ہوئی۔ تمام اہل خانہ کو پتہ چل گیا کہ اسد شمیم سے شادی کا خواہش مند ہے۔ یہ بات جیسے گھر کے ہر فرد کے دل کی بات تھی۔ اس بات کی راہ میں کسی طرح کی رُکاوٹ موجود نہیں تھی۔ جو تھوڑی بہت کسر تھی وہ باجی اور نازو نے مل جل کر پوری کر دی۔ دونوں گھرانوں میں مسرت کی وہ خوبصورت لہر دوڑ گئی جس کا بڑے عرصے سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ طے یہ ہوا کہ چند ہفتے کے اندر اسد اور شمیم کی منگنی ہو جائے گی۔

اسد یوں تو بہت خوش تھا لیکن کبھی کبھی جب وہ تنہا ہوتا تھا ایک خیال سے اُس کا دل لرزا جاتا تھا۔ یہ بھائیا جی کا خیال تھا...... کہیں وہ پھر تو ساعت کے رستے اُس کے دل و دماغ کو جھنجھوڑنے کی کوشش نہیں کرے گا؟ یہ سوال بارہا اسد کے ذہن پر ضرب لگا چکا تھا۔ عید سے دو ہفتے بعد اسد اپنے بیمار دوست نذیر سے ملنے احسن آباد گیا۔ تمام تر علاج معالجے کے باوجود نذیر احمد کی حالت جوں کی توں تھی۔ کچھ عرصہ پہلے اُس نے اِکا دُکا الفاظ بولنے شروع کر دیئے تھے لیکن اب پھر وہ خاموش رہتا تھا۔

اسد دو دن احسن آباد رہ کر شاد پور واپس آ گیا۔ نذیر احمد کی حالت نے اُسے بہت دل گرفتہ کیا تھا۔ بھائیا جی کے حوالے سے جو انجانا خوف اُس کے دل میں جاگزیں تھا وہ کچھ اور گہرا ہو گیا...... ایک دن شاد پور میں بادل گھر کر آئے۔ بیٹھے بٹھائے اسد کے جسم میں سرد لہر دوڑنے لگی۔ وہ جانتا تھا کہ بھائیا جی اکثر و بیشتر باد و باراں کے موسم میں ہی اُس سے رابطہ کیا کرتا تھا...... کہیں آج وہ پھر اُس پر وارد تو نہیں ہو جائے گا؟؟

جتنی دیر تک بادل برس کر چلے نہیں گئے اسد شدید گھبراہٹ کا شکار رہا۔ جب مطلع صاف ہو گیا تو اُس کی بے چینی بھی قدرے کم ہو گئی۔ ان دیکھی آفت کا خوف انسان کے اعصاب کو زیادہ متاثر کرتا ہے۔ بھائیا جی کا خوف ایک ان دیکھی آفت ہی تھا۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ چند ہفتے بعد ایک پُر تکلف اور خوبصورت تقریب میں اسد اور شمیم کی منگنی ہو گئی۔ منگنی سے ایک روز قبل رات کو برساتی میں ہی بیٹھ کر اسد نے شمیم کو وہ سب کچھ بتا دیا جو بعد ازاں اُن کی ازدواجی زندگی کو متاثر کر سکتا تھا۔ اُس نے شمیم کے سامنے کھلے دل سے اعتراف کر لیا تھا کہ لاہور میں قیام کے دوران اُس کے لڑکیوں سے تعلقات رہے ہیں۔ اُس نے شمیم کو یہ بھی بتایا کہ یہ تعلقات ایک حد پر پہنچ

کر ختم ہو جاتے تھے کیونکہ اس حد پر اُسے شمیم کھڑی نظر آتی تھی۔ پھر دل پر جبر کر کے اسد نے شمیم کو ''نیشا'' والے آخری واقعے کے بارے میں بھی بتا دیا۔ اُس نے کہا۔

''شمیم! ایک بہت ہی غیر معمولی اور برگزیدہ ہستی نے کہا تھا کہ میں نے خدا کو اپنے ارادوں کی ناکامی سے پہچانا ہے...... شاید خدا نے مجھ جیسے حقیر بندے کو بھی اسی وسیلے سے اپنی پہچان کرائی ہے۔ میں لڑکیوں کے قریب رہ کر بھی صرف تمہاری خاطر اُن سے دُور رہتا تھا اور اپنے ارادے کی مضبوطی پر فخر کرتا تھا...... قدرت نے نیشا نامی اُس معمولی سی لڑکی کے ذریعے میرے غرور کو خاک میں ملا دیا......'' چند لمحے توقف کے بعد اسد نے دلگیر لہجے میں کہا۔ ''میں اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہوئے تم سے معافی کا طلب گار ہوں شمی! اُمید ہے تم مجھے معاف کرو گی۔''

اور شمیم نے معاف کر دیا تھا۔ اسد کے سینے سے لگتے ہوئے اُس نے ریشم جیسی سرگوشی کی۔ ''ہم ایک دوسرے کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں...... اور سب کچھ معاف کر چکے ہیں۔''

اپنی منگنی کی تقریب میں اسد نے اپنے بدترین وقت کے دوست بشیرے کو خاص طور سے پشاور سے بلوایا تھا۔ اُس نے بڑے فخر کے ساتھ اپنے اس مزدور دوست کا تعارف اپنے دیگر دوستوں سے کرایا اور اُنہیں بتایا کہ اگر وہ آج زندہ سلامت ان لوگوں کے درمیان کھڑا ہے تو خدا کے بعد یہ اس مخلص دوست کی مہربانی ہے۔ اسد نے بلا جھجک اپنے احباب کے سامنے وہ واقعہ بیان کیا، جب وہ زخموں سے چور اور گندگی میں لتھڑا ہوا کوڑے کے ڈھیر پر بے ہوش پڑا تھا۔ یہ پیارا دوست ہی اُسے تلاش کرتے ہوئے وہاں تک پہنچا تھا اور اُس کا سارا بوجھ اُٹھا کر اُسے زندگی کی طرف واپس لایا تھا۔

منگنی کے فوراً بعد ہی شادی کی باتیں ہونے لگیں۔ اسد کی صحت تیزی سے بحال ہو رہی تھی۔ زخمی ہونے کے بعد اُس کا سر مونڈھ دیا گیا تھا۔ اب اُس کے سر پر خوبصورت بال نظر آنے لگے تھے۔ ایک دن وہ حسبِ عادت کمرے میں لیٹا تھا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ صحن کی طرف سے کھٹ پٹ کی آواز آئی۔ اسد سمجھا کہ کام کرنے والی ماما حمیدن ہے۔ مگر پھر اُسے یاد آیا کہ ماما حمیدن تو سبزی لینے بازار گئی ہوئی ہے۔ اتنے میں جلترنگ کی طرح کھنکتی ہوئی آواز آئی۔ یہ شمیم کی آواز تھی۔ وہ پکار کر بولی۔

’’حمیدن! یہ بیمار چوہوں کی بو کہاں سے آ رہی ہے؟‘‘

اسد زیرِ لب مسکرا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ شمی اُسے چھیڑنے کے لئے یہ بات کیا کرتی ہے۔ غالباً اُسکا خیال تھا کہ حمیدن اور علی وغیرہ گھر میں ہی ہیں۔ ورنہ وہ یوں دندناتی ہوئی اندر نہ آ جاتی۔ منگنی کے بعد اُس نے آنا جانا بہت کم کر دیا تھا۔

وہ علی کے کمرے میں گئی تو اسد نے عقب سے دبے پاؤں آ کر اچانک اُسے بانہوں میں لے لیا۔ اُس کا رنگ سرخ ہو گیا اور وہ کسمسا کر رہ گئی۔ ’’چھوڑو.....کوئی آ جائے گا۔‘‘ اُس نے اسد کے بے تاب ہونٹوں سے بچنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

’’کوئی نہیں ہے گھر میں۔‘‘ اسد نے کہا۔ ’’اور دوسری بات یہ ہے کہ اب تمہیں آنے والے دنوں میں چوہوں کی اس بو کے ساتھ ہی گزارا کرنا پڑے گا۔‘‘

وہ بمشکل اسد کو خود سے دُور ہٹا پائی تھی۔ دُور ہٹتے ہوئے وہ بولی۔ ’’تمہیں کیا پتہ یہ بو میرے لئے کتنی پیاری ہے۔‘‘

اتنے میں علی بھی ہاتھ میں بیٹ لہراتا ہوا آ گیا۔ اُس کے آنے سے یہ ہوا کہ شمیم جو فوراً واپس جانے کی فکر میں تھی رُک گئی۔ اسد کرسی پر بیٹھ گیا۔ شمیم اُس سے کچھ فاصلے پر ستون کے پاس کھڑی ہو گئی۔ علی اب کافی سمجھدار ہو گیا تھا۔ اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ بھائی اور باجی آپس میں بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ وہ اُن کے قریب بیٹھنے کی بجائے صحن میں گلاب کے پودوں کو پانی دینے لگا۔

شمیم نے کہا۔ ’’بہت دنوں سے سوچ رہی تھی کہ تم سے ایک بات کہوں۔ اگر کہوں تو مان لو گے؟‘‘

’’ہاں کہو.....!‘‘

’’تم.....کرکٹ پھر سے شروع کیوں نہیں کر دیتے؟‘‘

’’یہ سوال میں خود سے بھی کئی مرتبہ کر چکا ہوں کہ میں کرکٹ پھر سے شروع کیوں نہیں کر دیتا۔‘‘

’’پھر کیا جواب ملا؟‘‘

’’کچھ بھی نہیں۔‘‘ اسد نے کہا۔

’’یہ کیا بات ہوئی؟ آخر کوئی تو وجہ ہے جو تم نہیں کھیل رہے۔ تمہارے ساتھی،

دوست اور خود قدیر صاحب کتنی خواہش رکھتے ہیں کہ تم کھیل میں نام پیدا کرو۔‘‘

اسد نے گہری سانس لی اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ ’’کچھ عرصہ پہلے کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس لئے اچھا کھیلتا رہا ہوں کہ میرے حالات اچھے نہیں تھے۔ میرے اندر ایک آگ روشن تھی۔ یہ محرومی اور ناکامی کی آگ تھی۔ میں تم سے دُور تھا اور تمہیں اپنی شرطوں پر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ تمہیں حاصل کرنے کے لئے میں شعلہ جوالا بنا ہوا تھا۔ لیکن اب ایسا نہیں ہے۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘

’’اب میرے اندر خودسری کی جگہ نرمی نے لے لی ہے۔ تمہارے حوالے سے میرے مزاج میں طغیانی نہیں رہی۔ اس لئے میرے کھیل میں بھی طغیانی نہیں رہی۔ اور میرا خیال ہے کہ اُس شخص نے جو کہا، وہ ٹھیک ہی تھا۔ تمہیں پتہ ہی ہو گا، پشاور سے واپس آنے کے بعد میں کھیلتا رہا ہوں۔ کئی موقعوں پر اچھا بھی کھیلا ہوں۔ لیکن شمی! وہ جو ایک ترنگ اور تڑپ سی میرے کھیل میں تھی، وہ مجھے نظر نہیں آئی اور نہ شاید دوسروں کو نظر آئی ہے۔‘‘

شمیم نے ادا سے اسد کی آنکھوں میں دیکھا اور بولی۔ ’’کس شخص نے یہ بات کہی تھی تم سے؟‘‘

اسد کیسے بتاتا کہ یہ کوئی شخص نہیں تھا، صرف آواز تھی.....اور آواز بھی سو سال پرانی.....اُس نے کسی نہ کسی طرح شمیم کو ٹال دیا۔ اُس نے بس اتنا بتایا کہ یہ اُس کا کوئی پرانا دوست ہے جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی۔

شمیم نے ایک مرتبہ کن انکھیوں سے علی کو دیکھا۔ وہ بڑے انہماک سے پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ وہ جذباتی انداز میں بولی۔ ’’مجھ سے پیار کرتے ہو نا اسد؟‘‘

’’سولی پر چڑھ کر بھی اس کا جواب ’’ہاں‘‘ میں دے سکتا ہوں۔‘‘

’’تو پھر میرے لئے کھیل پھر سے شروع کر دو۔‘‘

’’لیکن شمی.....!‘‘

’’پلیز اسد! اب کچھ اور مت کہنا۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ تم آگے نکلو گے۔ ہو سکتا ہے کہ اُس شخص کی بات بھی درست ہو اور تمہارے اندر کی آگ ہی تمہارے کھیل

کونکھار رہی ہو...... ٹھیک ہے کہ اب وہ آگ نہیں ہے...... وہ نفرت نہیں ہے...... لیکن میرا پیار تو ہے۔ اور پیار نفرت سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے شمیم کے چہرے پر حیا کے رنگ بکھر گئے۔

اسد نے کہا: ''تمہارا مطلب ہے کہ اب تمہارا پیار میرا سہارا بنے گا؟''

اُس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ''ہاں...... اور میری قسمت بھی۔''

پھر وہ تیزی سے واپس پلٹ گئی۔

اس واقعے کے ٹھیک تین دن بعد اسد نے لاہور یونیورسٹی گراؤنڈ میں ''اے ون کلب'' کی طرف سے ایک معروف ٹیم کے خلاف میچ کھیلتے ہوئے اپنا پہلا اوور پھینکا تھا...... اپنے اس اوور میں اسد کو وہی نیا پن نظر آیا تھا جس کی اُسے تلاش تھی...... اور یہ نیا پن اسد کو ہی نہیں، گراؤنڈ میں موجود ہر فرد کو نظر آیا تھا...... ان چھ گیندوں میں اُسی دو سال پہلے والے اسد کی جھلک تھی جو بیٹسمینوں کے لئے ڈراؤنا خواب بنا ہوا تھا۔ ان چھ گیندوں نے آنے والے تہلکہ خیز دنوں کے بارے میں ایک ہلکا سا لیکن بڑا یقینی اشارہ دیا تھا۔

یونیورسٹی گراؤنڈ میں ہونے والا یہ میچ جب ختم ہوا تو اسد فرسٹ کلاس کرکٹ میں کم از کم سکور پر آدھی ٹیم کو آؤٹ کرنے کا ریکارڈ بنا چکا تھا...... اُس روز اسد کے ساتھیوں کے چہروں پر سچی خوشی نظر آئی اور قدیر صاحب کے منہ سے بھی ''ویل ڈن بوائے'' کے الفاظ نکلے۔ یہی الفاظ تھے جنہیں سننے کے لئے عرصے سے اسد کے کان ترس رہے تھے......!

○

آنے والے دنوں میں اسد نے بہترین فارم حاصل کر لی۔ اُس کی برق رفتار گیندوں نے کرکٹ کے حلقوں میں سنسنی پھیلا دی۔ ماہرین اسد کو مستقبل کے ایک سٹار کرکٹر کے طور پر دیکھ رہے تھے۔ اسد کا بہترین ہتھیار اُس کی وہ مخصوص گیند تھی جو باہر کو نکلتی تھی اور ماہر ترین بلے بازوں کو بھی مشکل میں ڈال دیتی تھی۔ قدیر صاحب کی زیر نگرانی اسد اپنے اس ''ہتھیار'' کو مزید موثر بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ قدیر صاحب اسد کی کارکردگی پر مسرور تھے۔ ''اے ون کلب'' کے نیم جان جسم میں اسد کی شاندار

کارکردگی کے باعث نئی زندگی دوڑ گئی تھی۔

سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا...... لیکن کبھی کبھی بھائیا جی کا خیال اچانک ہی اُس کے ذہن میں گھس آتا تھا اور اُس کو اندر سے ویران کر دیتا تھا۔ یہ خیال ایک تیز دھار تلوار تھی جو مسلسل اُس کے سر پر لٹکتی رہتی تھی۔ اسد ہر دوسرے ہفتے احسن آباد کا چکر بھی لگا رہا تھا۔ کبھی وہ اکیلا ہوتا تھا کبھی اُس کے ساتھ عبداللہ یا اشفاق ہوتے تھے۔ نذیر احمد اب اُٹھ کر چلنے پھرنے لگا تھا، مگر ابھی تک وہ فاتر العقل تھا۔ کسی کو پہچانتا تھا نہ ڈھنگ کی بات کرتا تھا۔ کسی وقت اُس پر اعصابی دورہ بھی پڑتا تھا اور ہاتھ پاؤں مڑ جاتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ختم ہو رہا ہے۔

ایک دن شاد پور میں بیٹھے بٹھائے اسد کے ذہن پر ایک عجیب سا خوف سوار ہو گیا۔ اُس نے اکثر سنا تھا کہ جو شخص غیر مرئی چیزوں کے اثر میں ہوتا ہے اکثر اُس کے لواحقین کو بھی ان چیزوں سے خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ خاص طور سے اُس کے بیوی بچوں کو...... مثلاً اگر کوئی نوجوان کسی چیز کے اثر میں ہے تو وہ چیز شادی کے موقع پر اُس کی دُلہن کو یا پیدائش کے موقعے پر اُس کے بچے کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اسد ایسی باتوں پر زیادہ یقین نہیں رکھتا تھا لیکن پچھلے برسوں میں جو کچھ اُس کے ساتھ پیش آ چکا تھا، اس کے بعد وہ ان باتوں کو یکسر رد بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اُس نے اپنی شادی کے بارے میں اور شمیم کے بارے میں سوچا تو اُس کی پیشانی پسینے سے تر ہونے لگی...... وہ سوچنے لگا، کہیں ایسا تو نہیں ہو گا کہ بھائیا جی کی بے چین رُوح شمیم کو نقصان پہنچا جائے؟ اُس کے تصور میں نذیر احمد کی حالت زار آئی اور وہ کانپ گیا......

اگلے ہفتے اسد نے فیصلہ کیا کہ وہ حضرت صاحب کے نیاز حاصل کرنے پشاور جائے گا۔ اُس نے نذیر احمد کو بھی ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ نذیر احمد کا چھوٹا بھائی دانش بھی ساتھ تھا۔ وہ لوگ بذریعہ کار پشاور پہنچے اور حسب سابق گُل جی حضرت کے آستانے پر حاضر ہو گئے۔ حضرت صاحب نے پہلے نذیر احمد کو دیکھا، اُس پر دم کیا اور دم کیا ہوا پانی بھی دیا۔ نذیر کے بعد اسد کی باری آئی۔

اسد نے اپنے دل کا احوال کھول کر حضرت صاحب کے سامنے بیان کر دیا۔ جو

شکوک اور اندیشے اُس کے ذہن میں اُبھرتے تھے سب حضرت صاحب کے گوش گزار کر دیئے اور اس کے ساتھ ساتھ بھایا جی سے آخری ملاقات کی تفصیل بھی بیان کر دی۔

حضرت صاحب نے اپنی تسبیح ہاتھ کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔ ''تو تمہیں اپنی ہونے والی دُلہن کی طرف سے اندیشہ ہے؟''

اسد نے سر جھکا کر اثبات میں جواب دیا۔

حضرت صاحب نے کہا۔ ''ابھی تک بھایا جی کی طرف سے کسی عورت کو براہِ راست نقصان نہیں پہنچا۔ شاید وہ اس پر قادر نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ تمہیں اپنا آلہ کار نہ بناتا...... لیکن اُس کا اندیشہ بہرحال موجود ہے۔''

یہی اندیشہ میرے لئے سوہانِ روح ہے حضرت صاحب!'' اسد نے عاجزی سے کہا۔ ''میں شمی کی جان کے لئے کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔''

حضرت صاحب گہرے مراقبے میں چلے گئے۔ حجرے میں بس تسبیح کے دانے گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ اسد اور نذیر احمد کے سوا حجرے میں بس حضرت صاحب ہی تھے۔ اسد، حضرت صاحب کے سامنے دو زانو بیٹھا تھا۔ نذیر احمد چٹائی پر بے حرکت لیٹا تھا اور خالی خالی نظروں سے چھت کو گھور رہا تھا۔ کتنی ہی دیر اسی کیفیت میں گزر گئی۔ خاموشی بوجھل ہوتی چلی جا رہی تھی۔ حضرت صاحب کی پیشانی پر ایک موٹی رگ اُبھر آئی تھی۔ آخر اُن کے ہونٹوں سے مدھم آواز بلند ہوئی۔

''ڈیرے کو اور اُس کی حویلی کو جلا دو...... اور بھایا جی کی وہ ساری نشانیاں بھی جو وہاں موجود ہیں۔ نفرت کی اس کہانی کو آگ لگا دو۔''

اسد نے ایک نگاہ حضرت صاحب کے چہرے پر ڈالی اور بولا۔ ''آپ کا حکم ہے تو میں ایسا ہی کروں گا۔''

''لیکن یہ کام اتنا آسان بھی نہیں ہے...... تمہیں بتایا تھا نا کہ جب شکاری کے جال کو توڑنے کی کوشش کرو گے تو وہ حرکت میں ضرور آئے گا۔''

''مجھے یاد ہے حضرت صاحب!''

''اس میں جان کا خطرہ بھی لاحق ہو سکتا ہے۔ لیکن ارادہ مضبوط ہو اور سچ پر ایمان ہو تو برائی کی قوتوں کی ''تیز دھار'' کند ہو جاتی ہے۔ یہ دھار ایک دفعہ پہلے بھی کند ہوئی

ہے۔ ورنہ شاید تم گوروں کے اُس قبرستان سے زندہ نہ نکلتے۔''

حضرت صاحب نے خاموش ہو کر سر جھکا لیا۔ اُن کے ہاتھوں میں تسبیح پھر سے گردش کرنے لگی۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ اب وہ باہر جا سکتے ہیں۔ اسد نے نذیر احمد کو اُٹھایا۔ دانش بھی جوتی اُتار کر حجرے میں آ گیا۔ دونوں نے نذیر احمد کو سہارا دیا اور باہر لے آئے۔ اُسی روز وہ واپس لاہور آ گئے اور پھر شاد پور پہنچ گئے۔

اسد کی شادی کے دن قریب آ رہے تھے۔ جوں جوں وقت کم ہو رہا تھا اسد کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک خوف ہر گھڑی سائے کی طرح اُس کے ساتھ رہتا تھا۔ شمیم کے ساتھ ہی بھایا جی کی کرخت تصوراتی شکل اُس کے سامنے آ جاتی...... اور وہ سب مورتیاں بھی جن میں بھایا جی کے اندر چھپی ہوئی نفرت اور گندگی مجسم ہو گئی تھی۔

اسد اپنے دل میں تہیہ کر چکا تھا کہ حضرت صاحب کے مشورے پر عمل ضرور کرے گا۔ وہ جلد از جلد شمیم کو اپنی دُلہن بنانا چاہتا تھا۔ لیکن اس سے پہلے وہ اپنے ذہن میں چھائے ہوئے اندیشوں کا قلع قمع کرنا چاہتا تھا...... وہ بھایا جی کے خوف سے آزاد ہو کر اپنی ''شبِ عروسی'' کو خوش آمدید کہنا چاہتا تھا۔ اور اُسے یقین تھا کہ اپنی محبت کی طاقت سے وہ ایسا کر گزرے گا۔

مطلع ابر آلود تھا...... دو دن بوندا باندی ہوتی رہی۔ اسد کے دل میں یہ خیال پختہ ہو چکا تھا کہ بھایا جی بادوباراں میں زیادہ فعال ہوتا ہے۔ اسد نے مطلع صاف ہونے کا انتظار کیا۔ وہ مارچ کی ایک پُر بہار رات تھی۔ تاریک آسمان پر چاند تارے ہمیشہ سے زیادہ روشن نظر آ رہے تھے۔ شمیم کے گھر ڈھولک بجنا شروع ہو گئی تھی۔ اس وقت بھی نازو آس پاس کی لڑکیوں کو اپنے گرد اکٹھا کئے بیٹھی تھی اور گیت گا رہی تھی۔ چچا کے برآمدے سے اُبھرنے والے گیت کی آواز پورے گھر میں پھیل رہی تھی اور اسد کے گھر میں بھی گونج رہی تھی۔

اسد نے علی کے کان میں سرگوشی کی۔ علی دوڑتا ہوا چچا کے گھر گیا اور دو منٹ میں شمیم کو چھت پر بلا لایا۔ اسد پہلے سے چھت پر موجود تھا۔ ''کیا بات ہے؟ اب چند دن کا صبر بھی نہیں ہوتا ہے؟'' شمیم اُسے دیکھ کر شوخی سے بولی۔

اسد بولا۔ ''تمہیں پتہ ہے سارا دن روزہ رکھنے والا افطار سے تھوڑی دیر پہلے کتنا

بے چین ہو جاتا ہے۔''

اسد نے اُسے بانہوں میں لے لیا۔ اُنہوں نے چند محبت بھری سرگوشیاں کیں۔

کچھ دیر بعد شمیم حیران سی نیچے چلی گئی۔ اُسے اس بے وقت کی راگنی کی حقیقت معلوم نہیں تھی۔ وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ اسد ایک خطرناک ارادے کے ساتھ ڈیرے کی طرف جا رہا ہے۔

اسد نے الماری میں سے خاموشی کے ساتھ ابا جان کا ریوالور نکالا اور چیک کر کے قمیض کے نیچے لگا لیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ چچا کی جیپ پر عباس پورہ کی طرف اُڑا جا رہا تھا۔ اُس نے چچا سے لاہور جانے کا بہانہ کیا تھا مگر اُس کا رُخ ڈیرے کی طرف تھا۔ اُس نے جیپ کی پچھلی نشستوں کے نیچے پٹرول کے دو گیلن بھر کر رکھے ہوئے تھے...... یہ پٹرول آج ڈیرے پر استعمال ہونے والا تھا۔ اُس کا ارادہ تھا کہ جاتے ساتھ ہی سب سے پہلے رنگی اور اُس کے اہل خانہ کو حویلی سے نکالے گا۔ اُن کی بھینس بکریوں اور مرغیوں وغیرہ کو نکالنا بھی ضروری تھا۔ اس کے علاوہ وہ کچھ بھی بچانا نہیں چاہتا تھا۔ اُس کا ارادہ تھا کہ حویلی کو اُس کے تمام سامان سمیت جلا دے۔ ابا جان اور چچا جان کو وہ اس حوالے سے بعد میں سمجھا بجھا سکتا تھا۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ جیپ اُونچے نیچے راستے پر دوڑی چلی جا رہی تھی اور اسد کا ذہن بھی اسی رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ حضرت صاحب نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ جو کام اسد کرنا چاہتا ہے اس میں خطرہ پوشیدہ ہے۔ لیکن خطرے کی نوعیت اور قسم اُنہوں نے نہیں بتائی تھی...... ابھی اسد ڈیرے سے دو تین میل دُور ہی تھا کہ اُسے تاریک اُفق پر سرخ روشنی دکھائی دی۔ یوں لگا کہ کہیں آگ لگی ہوئی ہے۔ وہ کچھ اور آگے گیا تو شعلوں کے بالائی سرے بھی نظر آنے لگے......

ایک دم اسد کو اپنا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا محسوس ہوا۔ اُس کو یوں لگا جیسے یہ آگ ڈیرے پر ہی لگی ہوئی ہے۔ اُس کی جیپ کی رفتار طوفانی ہو گئی۔ وہ ڈیرے کے قریب پہنچا تو اُسے آگ کی وسعت اور شدت کا اندازہ ہوا۔ قرب و جوار کے دیہاتی سائیکلوں پر اور پیدل ڈیرے کی طرف بھاگے چلے جا رہے تھے۔ کئی فرلانگ دُور سے ہی آگ کی حدت محسوس کی جا سکتی تھی۔ پھر اسد نے ڈیرے کو دیکھا۔ کئی کنال پر واقع ڈیرے کی

ساری عمارت شعلوں میں گھری ہوئی تھی...... عمارت میں لکڑی کثرت سے استعمال ہوئی تھی لہٰذا پوری عمارت خشک بھوسے کی طرح جل رہی تھی۔ پہلی منزل تو نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ دوسری بھی مکمل طور پر شعلوں میں لپٹی ہوئی تھی۔

لوگ بارشی جھیل میں سے بالٹیوں اور کنستروں میں پانی بھر بھر کر لا رہے تھے اور آگ کو بجھانے کی یکسر ناکام کوشش کر رہے تھے۔ ایک جگہ بہت سے لوگ جمع تھے۔ وہ ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر چیخ رہے تھے۔ اسد اُن کے پاس پہنچا۔ اُنہوں نے چیختے ہوئے بتایا کہ ایک بندہ آگ میں گھرا ہوا ہے۔ چند سیکنڈ پہلے بانس کی ایک لمبی سیڑھی بالائی منزل کی کھڑکی سے لگائی گئی تھی کہ شاید اس طرح اندر پھنسا ہوا بندہ باہر نکل سکے۔ لیکن اب وہ سیڑھی بھی دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔ اچانک ایک ساتھ کئی چیخیں گونجیں...... اسد نے بھی پھٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ ایک شخص آگ میں لپٹا ہوا تھا اور چیخ رہا تھا۔ اُس کی آواز انتہائی کرب ناک تھی۔ وہ کچھ کہہ بھی رہا تھا لیکن شعلوں کی پھنکار کے سبب الفاظ سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ پھر وہ دیوار سے ٹکرایا اور چکر کھا کر شعلوں کے اندر گر گیا......

کمزور دل کے بے شمار لوگوں نے اپنے رُخ پھیر لئے تھے اور کانوں پر ہاتھ دھر لئے تھے...... آدھ پون گھنٹے کے اندر اندر حویلی جل کر راکھ ہو گئی۔

اسد سکتے کی سی حالت میں کھڑا تھا۔ وہ جو کام کرنے آیا تھا وہ کسی اور نے کر دیا تھا۔ کون تھا وہ اور کہاں تھا؟ کئی سوال اسد کے ذہن میں اُبھر رہے تھے۔ رنگی بابا اور اُس کے اہل خانہ کی طرف سے بھی اسد کو تشویش تھی۔ تاہم جلد ہی یہ تشویش دُور ہو گئی۔ رنگی بابا آیا اور روتا ہوا اسد سے لپٹ گیا۔

''یہ کیا ہو گیا چھوٹے مالک...... ہمارے پرکھوں کی نشانی راکھ ہو گئی...... سب کچھ ختم ہو گیا......''

رنگی کی باتوں سے پتہ چلا کہ وہ اور اُس کے اہل خانہ بس اپنی ہی جان بچا سکے تھے۔ بھینسیں بکریاں وغیرہ سب اندر ہی رہ گئی تھیں۔

''یہ کیسے ہوا رنگی؟'' اسد نے پوچھا۔

''آپ کو یقین نہیں آئے گا چھوٹے مالک!'' رنگی نے لرزتی آواز میں کہا۔

''کیا یقین نہیں آئے گا؟'' اسد نے کہا۔

رنگی نے ڈری ہوئی نظروں سے حویلی کی سلگتی راکھ کو دیکھا اور بولا۔ ''یہ آپ کے دوست نذیر احمد نے کیا ہے۔ میں نے...... خود اپنی آنکھوں سے نذیر احمد کو دیکھا ہے۔ وہ نیچے سیڑھیوں کے پاس کھڑا تھا اور ایک چھوٹے ڈبے سے تیل چھڑک چھڑک کر دروازوں کو آگ لگا رہا تھا۔ میں اُسے روکنے کے لئے دوڑا لیکن ایک دم بہت سی آگ بھڑک اُٹھی۔ میں نے دیکھا نذیر احمد آگ کے درمیان کھڑا ہنس رہا تھا۔ وہ بالکل پاگل نظر آ رہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے کھڑکیوں دروازوں کی طرح وہ خود بھی آگ میں چھپ گیا۔ صغیر نے بھی اُسے آگ میں جلتے اور سیڑھیوں کے پاس گرتے دیکھا ہے۔''

اسد سکتے کی سی حالت میں رہ گیا۔ اُسے رنگی کی بات پر مطلق یقین نہیں آ رہا تھا۔ مگر چند لمحے بعد صغیر بھی وہاں پہنچ گیا۔ اُس نے بھی رنگی کی تصدیق کی۔ اسد بے دم سا ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ رنگی، صغیر اور دیگر لوگ اُسے واقعے کی تفصیل بتانے لگے۔ یہ تفصیل سنسنی خیز تھی۔

اسد نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے ایک بندہ سیڑھیوں کے پاس اور دوسرا اوپری منزل پر مرا ہے۔''

''مجھے کچھ پتہ نہیں چھوٹے مالک! میں نے تو بس نذیر صاحب کو ہی دیکھا ہے۔''

سب منہ کھولے رنگی بابا کی بات سن رہے تھے۔ اسد ابھی تک سکتہ زدہ تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ رنگی کی بات پر یقین کرے یا نہیں؟ کیا اُس کا پیارا دوست واقعی اس دنیا میں نہیں تھا؟

رنگی کے بیٹے صغیر نے روتے ہوئے کہا۔ ''میں نے خود نذیر صاحب کو جلتے اور گرتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ بڑے کمزور تھے۔ پتہ نہیں احسن آباد سے چل کر یہاں کیسے پہنچ گئے؟''

چند گھنٹے بعد جب ملبہ قدرے سرد ہوا تو سیڑھیوں کے قریب سے نذیر احمد کی کوئلہ لاش مل گئی۔ اُس کے قریب ہی ٹین کا چھوٹا سا ڈبہ ملا۔ اسد نے اپنے بدنصیب دوست کو اُس کی دھاتی فریم والی عینک سے پہچانا۔ یہ مڑی تڑی عینک ابھی تک نوجوان ماسٹر نذیر احمد کے چہرے پر موجود تھی...... اسی دوران میں نذیر احمد کے اہل خانہ بھی اُسے تلاش کرتے ہوئے احسن آباد سے ڈیرے پہنچ گئے...... وہ رات آٹھ بجے کے بعد سے اپنے

کمرے سے غائب تھا۔ نذیر احمد کی لاش دیکھ کر اُس کے اہل خانہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے تھے۔

اب بالائی منزل کے ملبے میں دوسری لاش کی تلاش شروع ہوئی۔ جس جگہ وہ شخص بے تحاشا چیختے چلانے کے بعد گرا تھا وہاں کوئی لاش نہیں ملی۔ یہ دوسری لاش کہیں موجود ہی نہیں تھی...... مختلف چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ شاید وہ نذیر احمد ہی تھا جو جان بچانے کے لئے چند لمحوں کے لئے دوسری منزل پر آیا تھا اور پھر سیڑھیاں اُترنے کی کوشش میں نیچے جا گرا تھا۔

یہ بات کسی طور سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔ بالائی منزل پر مرنے والے بدنصیب کو چیختے چلاتے اور گرتے اسد نے خود دیکھا تھا۔ وہ جس طرح گرا تھا اس کے بعد اتنی گنجائش ہی نہیں تھی کہ وہ پھر سے اُٹھ سکتا۔ وہ وہیں ہال کمرے میں مرا تھا...... اگر وہ وہاں مرا تھا تو پھر اب کہاں تھا؟ لاش بھسم بھی ہو جائے تو بعض ہڈیاں اور کھوپڑی سلامت رہتی ہے۔ اس دوران میں دو تھانوں کی پولیس بھی موقعے پر پہنچ چکی تھی۔ تفتیش و تحقیق کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا...... اسد کو سب سے زیادہ فکر سٹور رُوم کے خلاء میں چھپی ہوئی عریاں مورتیوں کی تھی۔ یہ فحش مورتیاں یا اُن کی کچھ باقیات پولیس کے ہاتھ لگ جاتیں تو اسد کے پورے خانوادے کے لئے بدنامی کی بات تھی...... وہ سلگتے ہوئے ملبے کو پھلانگتا ہوا سٹور رُوم تک پہنچا تو یہ دیکھ کر اُسے اطمینان کا عجیب سا احساس ہوا کہ پورا سٹور رُوم راکھ کا ڈھیر بن گیا ہے۔ آگ چونکہ سٹور رُوم کے پاس سے شروع ہوئی تھی اس لئے یہاں ایک تنکا باقی نہیں بچا تھا۔ وہ ''خلا'' جہاں مورتیاں جمع کی گئی تھیں ایک جلے ہوئے ٹرنک کے عقب سے نظر آ رہا تھا۔ یہاں بس راکھ تھی اور چند بے شکل کوئلے تھے......

○

یادیں کتنی بھی تلخ ہوں آہستہ آہستہ ذہن سے محو ہونے لگتی ہیں۔ ہنس مکھ اور بہت پیارے نذیر احمد کی موت بھی اسد کے لئے ایک بڑا سانحہ تھی۔ یہ سانحہ اس اعتبار سے اور بھی جگر پاش ہو جاتا تھا کہ حویلی کو نذرِ آتش کر کے نذیر نے وہ کام انجام دیا تھا جو اسد کو انجام دینا تھا...... اس کام میں جان کا خطرہ تھا...... اور یہ خطرہ حقیقت ثابت ہوا تھا۔

نذیر احمد نے یہ کام کیوں اور کیسے کیا؟ اس کے بارے میں یقین سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ غالب گمان یہی تھا کہ حضرت صاحب کے حجرے میں نذیر احمد نے نیم دیوانگی کے عالم میں وہ باتیں سنی تھیں جو حضرت صاحب نے اسد سے کہی تھیں۔ یہ باتیں مخبوط الحواس نذیر احمد کے ذہن کے کسی گوشے میں نقش ہوگئی تھیں...... بعدازاں وہ نیم دیوانگی کے ہی عالم میں ڈیرے میں جا پہنچا تھا اور اُسے راکھ کا ڈھیر کر دیا تھا...... اس عمل میں اُس کی اپنی جان بھی گئی تھی۔ یہ ایک مخبوط الحواس دوست کی وہ قربانی تھی جو اسد مر کر بھی نہیں بھول سکتا تھا۔

......ہاں یادیں کتنی بھی تلخ ہوں آہستہ آہستہ ذہن سے محو ہونے لگتی ہیں۔ چھ سات ماہ بعد ایک خوبصورت شام کو اسد اور شمیم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ اسد کو یوں لگا جیسے کائنات کا سارا حسن اُس کی بانہوں میں سمٹ آیا ہے...... تاہم خوشی کے اس چاند میں ایک گہن بھی تھا اور یہ نذیر کی جدائی کا گہن تھا...... پروگرام کے مطابق اپنی شادی کے ایک ہفتے بعد اسد حضرت صاحب سے ملنے پشاور روانہ ہوا۔ نو بیاہتا شمیم بھی اُس کے ساتھ تھی...... پچھلے پانچ چھ ماہ میں دو سوال بڑی شدت سے اسد کے ذہن میں کلبلاتے رہے تھے۔ پہلے سوال کا تعلق آتشزدگی کی رات سے تھا۔ پولیس کا اور بعض لوگوں کا خیال یہی تھا کہ اُس رات حویلی میں ایک ہی بندہ جلا تھا...... اور وہ نذیر احمد تھا۔
اگر ایسا تھا تو پھر وہ شخص کون تھا جسے درجنوں لوگوں نے بالائی منزل پر رقص بسمل کرتے دیکھا تھا۔ اُس کی کرب ناک چیخیں ابھی تک اسد کے کانوں میں گونجتی تھیں۔ بالفرض وہ نذیر احمد تھا بھی تو پھر شعلوں میں گرنے کے بعد یہ کیسے ممکن ہوا کہ وہ دوبارہ نچلی منزل پر گر گیا اور پچیس تیس گز کا فاصلہ طے کر کے بھسم ہوا۔ دوسرے اُس تڑپتے پھڑکتے شخص کو درجنوں لوگوں کی طرح اسد نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ غیر معمولی قد کاٹھ کا شخص تھا جبکہ نذیر احمد کا قد کاٹھ عام تھا۔
اس انداز سے سوچتے ہوئے اسد کے دل کی گہرائیوں سے آواز آتی تھی کہ وہ نذیر احمد نہیں تھا...... وہ بھائیا جی تھا...... اُس کا بھیانک عکس تھا۔ جل کر گرنے سے پہلے وہ منہ کھول کر چلا رہا تھا۔ اسد اُس کی آواز نہیں سن سکا تھا۔ شاید کوئی اور بھی نہیں سن سکا تھا۔ لیکن پتہ نہیں کیوں اسد اپنے وجدان کے زیر اثر جانتا تھا کہ بھائیا جی کیا پکار رہا

تھا...... وہ پیناں کو پکار رہا تھا۔ اپنی روٹھی ہوئی دُلہن کو آوازیں دے رہا تھا۔
پچھلے پانچ چھ ماہ میں جو دوسرا سوال اسد کے ذہن میں کلبلاتا رہا تھا وہ یہ تھا کہ کیا بھائیا جی اب بھی ''ایگزسٹ'' کرتا ہے؟ کیا اب بھی وہ یہ طاقت رکھتا ہے کہ کسی کی زندگی کو متاثر کر سکے؟
اسد یہ دونوں سوال حضرت صاحب سے پوچھنا چاہتا تھا۔ اُس کی یہ خواہش پوری تو ہوئی مگر آدھی۔
وہ حضرت صاحب کے آستانے پر پہنچے۔ حضرت صاحب خواتین سے پردے میں بات کرتے تھے اور وہ بھی کسی محرم کی موجودگی میں۔ باری آنے پر حضرت صاحب نے نو بیاہتا دُلہن پر پڑھ کر پھونکا اور اُسے دُعائیں دیں۔ اس کے بعد اسد نے اپنی گزارشات پیش کیں۔ وہ اپنے دو سوالوں کے جواب حضرت صاحب سے لینے کا متمنی تھا۔ حضرت صاحب اپنی اندرونی کیفیت کے اعتبار سے بات کرتے تھے، کسی وقت زیادہ کسی وقت کم۔ اُنہوں نے کہا۔
''دونوں میں سے کسی ایک سوال کا جواب لے لو۔'' اُن کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔
اسد نے ادب سے کہا۔ ''دوسرے کا جواب عنایت کر دیجئے حضرت صاحب! کیا بھائیا جی اب بھی ضرر پہنچانے کی طاقت رکھتا ہے؟''
''نہیں...... اب نہیں۔'' حضرت صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ جا چکا ہے۔''
چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولے۔ ''لیکن...... تمہیں بتایا تھا نا کہ وہ شکاری ہے...... اور شکاری زندگی میں صرف ایک شکار نہیں کرتا۔ بھائیا جی نے بھی صرف تمہیں شکار نہیں کیا تھا۔''
''آ...... آپ کا مطلب ہے کہ......''
''ہاں...... اُس نے اور شکار بھی کئے ہوں گے۔ یہ شکار ہو سکتا ہے کہ تمہارے خاندان کے اندر ہی ہوں...... لیکن وہ باہر سے بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ خوبصورت نوجوان ہوں گے۔ اُن میں عورتوں کے لئے کشش ہوگی۔ وہ ضدی ہوں گے اور جس عورت کو چاہیں گے اُس سے غلط توقعات وابستہ کریں گے۔ وہ اپنی محبت کو ہٹ دھرمی اور انا کی سولی پر چڑھائیں گے۔ پھر جب محبت کی ''خوشبو'' ناکامی کا زہر پی کر ہوس اور جنس کی

''سڑانڈ'' بن جائے گی تو وہ اپنا ماتم آپ کرنا شروع کر دیں گے۔ ہر ایک کو مرنا ہے ظاہر ہے آج سے بیس، تیس یا پچاس سال بعد وہ بھی مر جائیں گے۔ اور اُن میں سے کئی مر کر مکمل بھائیا جی بن جائیں گے...... یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا۔''

ایک لمحہ توقف کر کے حضرت صاحب نے کہا۔ ''اپنے اِردگرد نگاہ رکھو۔ خاص طور سے اپنے خاندان کے اندر...... تمہیں ضرور کوئی نہ کوئی ایسا شخص نظر آ جائے گا جو بھائیا جی بن رہا ہو گا...... اُس کے آس پاس کوئی پیناں بھی موجود ہو گی۔ اُس شخص کو بھائیا جی بننے سے روکنے کی کوشش کرو۔ یہ بہت بڑی نیکی ہو گی...... بہت بڑی نیکی۔''

اسد چونک کر بولا۔ ''میں ایسا کروں گا حضرت صاحب...... میں ضرور کروں گا۔''

حضرت صاحب نے اسد کا شانہ تھپک کر سر جھکا لیا۔ اُن کے ہاتھ تسبیح پر گردش کرنے لگے۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اب وہ باہر جا سکتا ہے۔

وہ بڑے احترام سے اُٹھ کر باہر آ گیا۔ باہر شمیم اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ دونوں اپنی رہائش گاہ سے پیدل ہی حضرت صاحب کے آستانے پر آئے تھے۔ دونوں نے ایک دُوجے کا ہاتھ تھاما اور ایک بل کھاتے راستے پر واپس روانہ ہو گئے۔ شمیم کی خوشبو اسد کے دماغ کو معطر کرنے لگی۔ سورج اُن کے عین سامنے پہاڑیوں میں ڈوب رہا تھا۔ مدھر ہوا چل رہی تھی۔ وہ شانے سے شانہ ملائے چلتے گئے۔ وہ راستہ طے کرتے ہوئے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے رہے۔

گفتگو کے دوران شمیم نے کہا۔ ''آپ نے ایک بات نوٹ کی ہے اسد؟''

''کیا؟''

''علی...... اور نازو شاید ایک دُوجے میں دلچسپی لیتے ہیں۔''

''واقعی؟''

''ہاں...... میں نے کئی بار دیکھا ہے۔ لیکن اب......'' شمیم کہتے کہتے رُک گئی۔

''اب کیا؟'' اسد نے پوچھا۔

''اب کچھ گڑبڑ لگتی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''پچھلے ڈیڑھ دو ماہ سے اُن دونوں کی بول چال بند ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ علی کسی بات

پر نازو سے ناراض ہے۔ ایک دن وہ اُسے کسی وجہ سے جھڑک بھی رہا تھا۔''

اسد چونک کر شمیم کی طرف دیکھنے لگا۔ شمیم بولی۔ ''ویسے بھی وہ کچھ چپ چپ رہتا ہے۔ پتہ نہیں اُسے کیا ہے؟''

اسد کے کان سائیں سائیں کرنے لگے...... آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھیں...... بہت گہری سوچ میں......!

(ختم شد)